انتخاب مقالات غالب نامہ

تحقیقات

مرتبہ

پروفیسر نذیر احمد

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دھلی

تحقیقات

انتخاب مقالات غالب نامہ

تحقیقات

مرتبہ

پروفیسر نذیر احمد

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

سالِ اشاعت : ۱۹۹۷ء
قیمت : ۱۵۰/ روپے
طباعت : عزیز پرنٹنگ پریس، دہلی
بہ اہتمام : شاہد ماہلی

ناشر
غالب انسٹی ٹیوٹ
ایوانِ غالب مارگ، نئی دہلی ۲

فہرست

اندر کمار گجرال

اردو ادب کے تہذیبی تقاضے

میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے منتظمین کا ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھ ناچیز کو فخر الدین میموریل لیکچر کے لیے منتخب کیا ہے۔ یہ میرے لیے باعث عزت ہے۔ میں منتظمین کے اس امر کی بھی سراہنا کرنا چاہتا ہوں کہ انھوں نے اردو میں ان لیکچروں کا سلسلہ شروع کیا ہے۔

فخر الدین صاحب کی عظیم ہستی نے جس ہمت اور دلیری کے ساتھ قومی جنگِ آزادی میں حصہ لیا تھا، وہ کوئی سہل کام نہیں تھا۔ خاص کر اُس دور میں جب ہندوستان کے مسلمانوں کے دل اور ذہن پر ملک کی تقسیم والوں نے زور ڈالا تھا۔ اُس وقت مولانا آزاد کی رائے میں مضبوطی دیکھنے والے بہت نہیں تھے۔ اُن کے پیچھے یا ساتھ چلنے کے لیے دور نظری، وطن دوستی اور سانجھے قومی رشتے میں وشواس کی پختگی ضروری تھی۔ بعد کی تواریخ نے تو ثابت کیا کہ پر چلت (POPULAR) دھارا کے ساتھ بہہ جانا تو آسان تھا لیکن جن مردوں میں لہر کو روکنے کی ہمت ہوتی ہے، وہی راہبر کہلانے کا حق رکھتے ہیں۔

فخر الدین صاحب کی ہمہ گیر شخصیت کو مختلف لوگوں نے الگ الگ پہلوؤں سے دیکھا ہے۔ یہ اُن کی نظرِ کرم تھی کہ اُنھوں نے مجھے بھی اپنے قریب میں رہنے کے مواقع دیے۔ شروعات تو سیاسی تھیں لیکن آہستہ آہستہ اِس میں ذاتی دوستی کا رنگ چڑھتا گیا۔

دورانِ وزارت میں اور بعد میں صدرِ ہند کے ناتے انھوں نے ہمیشہ مجھے اپنی نظرِ

کرم سے نوازا۔ دو ایک واقعات نے تو اور بھی قربت پیدا کر دی۔ گجرال کمیٹی کی رپورٹ کو مرتب کرنے کے دوران میں اُن سے میری تفصیل سے بات ہوتی رہتی تھی اور شاید یہ کہنا کسی راز کو افشا کرنا نہیں ہوگا کہ رپورٹ کو اُن کی کُلّی حمایت حاصل تھی اور جب سیاسی مصلحتوں کی بنا پر رپورٹ کو سرکاری سرد خانوں میں بند کر دیا گیا تو اُن کو قلق ہوا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بل نے اُس زمانے کی سیاست کو بہت جھنجھوڑا تھا۔ عوامی رائے بٹی ہوئی تھی، اِسی لیے فیصلہ کرنے میں تاخیر اور مشکلات تھیں۔ میرے محکمے کا سیدھا تعلق علی گڑھ سے تو نہیں تھا لیکن عوامی رائے سے ضرور تھا۔ اس لیے شریمتی اندرا گاندھی نے مجھے اِس میں ڈال دیا۔ قانون کیسا بنے، وائس چانسلر کون ہو، علی گڑھ کن بنیادی قدروں کی ترجمانی کرے۔ ہمارے چھوٹے سے گروپ میں اس کے متعلق اکثر بحث ہوتی تھی کبھی اندراجی کے بنا، زیادہ تر اُن کے ساتھ۔ کوشش یہ ہی تھی، گو اس میں کامیابی قدرے کم ہوئی کہ ہندوستان کی علم گاہیں موجودہ دَور کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ملک کی سوچ بنانے میں راہبری کر سکیں۔

اُردو زبان کے موجودہ بحرانی دور کی تواریخ مکمل نہیں ہو سکتی جب تک اُس میں فخرالدین صاحب کا ذکر نہ آئے۔ اِس کے پُنر جیون (RENIASENCE) میں اُن کی خدمات عظیم ہیں۔

بد قسمتی سے تقسیم وطن کے بعد کا ماحول ہی ایسا بنتا ہے کہ ہم قومی وراثت کو بھی تعصب کی رنگین عینک پہن کر دیکھتے ہیں۔ اِس ماحول میں غالبؔ اور اُس کی لیکھنی کو سانجھا قومی ورثہ منوانا کوئی سہل کام نہیں تھا۔ لیکن فخرالدین صاحب نے اِس کو نفاست اور خوب صورتی سے نبھایا۔

غالبؔ کی چھبی (IMAGE) پر سے جب گرد جھڑ گئی تو ملک کو اُس کی عظمت اور خوبصورتی کا احساس ہوا۔ اِس کے ساتھ اُردو زبان کے متعلق تعصبات کو ختم نہیں ہو پائے لیکن ماحول میں تبدیلی ضرور آئی۔

اِس بدلے واتاورن میں ہی ساحر نے ہمت کر کے قوم کی حِس کو جھنجھوڑا۔ جب اُس

تنقید کرتے ہیں۔ لیکن یہ اشعارہ جوں کہ انگریزی زبان میں ہیں۔ اس لیے
زبان کے موجودہ مسائل پر بھی غور کرتے ہیں اور زبان تو لوگ بولتے
ہیں اس لیے لوگوں کی بات کرنے سے بھی گریز نہیں کیا جاسکتا۔ اور
لوگ تو سماجی بندھنوں اور مجبوریوں میں رہتے ہیں اِس لیے یہ کتاب
آج کے سماجی مسائل اور اُن کے ارتقا کے ساتھ بھی منسوب ہے۔"

بات خوب تھی۔ اسی لیے ذکر ہے۔ اردو ادب کا ہو یا تہذیبی ماحول کا، اس کو عام لوگوں کی سوچ سمجھ تمناؤں اور مجبوریوں سے الگ نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی ہم اس کو تواریخ کے حادثات سے پرے لے جاسکتے ہیں۔

۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کو تواریخی طور پر ایک واقعہ GREAT نہیں سمجھنا چاہیے۔ وہ ایک لمبے اور دُکھ ایک سلسلے (PROCESS) کا اختتام تھا جس نے دلوں کو، ذہنوں کو، سوچ کو، تصورات کو، تمناؤں اور مایوسیوں کو مذہب کے نام پر بانٹ دیا تھا۔ جب ایک ہی زبان کو بولنے والے ایک ہی تہذیب اور اتہاس کے وارث اپنے کو دو قومیں سمجھنے لگ جائیں تو یہ اسنبھو (ATTITUDES) تھا کہ سب سے گہری چوٹ اُسی زبان کو لگے جو مشترکہ سنسکرتی کی ضامن تھی۔

یہ کیسے ہوتا کہ اردو بولنے والے تو پہلے اوّلاً ہندو یا مسلمان کہنے لگیں۔ اُن کا عزیز وطن مذہب کے نام پر بٹ جائے اور زبان کی سالمیت اور عافیت قائم رہے۔ ایسے معجزے ہوتے نہیں۔ ہر سیاست کا ایک ادبی اور تہذیبی پہلو ہوتا ہے۔ صرف کبوترانہ رویہ ہی اِس اصلیت سے آنکھ بند کر سکتا ہے۔

ملک کیوں بٹا، کیسے بٹا، کن طاقتوں نے بانٹا، اِس کا اپنا اتہاس ہے۔ محققین اب بھی اِس کا تجزیہ کر رہے ہیں۔ یہ جستجو پچھلے ایک سال سے اور بڑھی ہے۔ جب سے نئے حقائق سامنے آ رہے ہیں۔

گو تقسیم نے بنگالی، پنجابی اور سندھی پر بھی چوٹ لگائی تھی لیکن اردو اور اردو بولنے والوں پر اس مذہب کے کئی اتی رکت ATTITUDES پہلو بھی تھے۔

دہلی ہو لکھنؤ، حیدرآباد ہو یا پٹنہ، اردو بولنے والے مسلمان کی ایلیٹ ELITE زیادہ طور پر پاکستان چلی گئی۔ وہاں کے اقتصادی ماحول نے اِن کو مواقع فراہم کیے تھے اور جذباتی طور پر اُن میں اکثریت "دو قومی" نظریے کو ماننے لگی تھی۔

جو پریشان حال یہاں رہ گئے، فسادات نے اُن کے حوصلے پست کر دیے۔ تعلیمی اور اقتصادی بے حالی تو پہلے ہی تھی، اب تعصب کا پہاڑ اُن کی ترقی کے راستے میں حائل ہو گیا۔

چند چیدہ ہستیاں، جن کا آزادی کی جدوجہد کے ساتھ گہرا تعلق تھا، یہاں تھیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد تھے، ذاکر صاحب تھے، آصف علی تھے، فخرالدین تھے۔ لیکن جنوں کے طوفانی دور میں اُن کی سنی کس نے تھی۔

مولانا آزاد کی تاریخی تقریرِ آزادی کے بعد جس میں انھوں نے مسلمانوں کی اُس بے رُخی کا ذکر کیا تھا، آج کے حالات کو سمجھنے میں مدد دے سکتی ہے۔ سب سے اہم بات جو مولانا آزاد جیسے دانشور بھانپ گئے تھے وہ یہ تھی کہ سامراجی دور میں ہندوستانی مسلم سماج میں ایسی تحریکیں بہت کم پیدا ہوئیں جو آزادانہ (LIBRAL) سوچ اور فکر کو بڑھاوا دے سکتیں۔ گو مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ ہندوستان کی جنگِ آزادی کے ساتھ جُڑا ہوا تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ اُن فرقہ ورانہ طاقتوں کو بڑھاوا مل رہا تھا جو ان میں سے اکثریت کو اِس دھارے سے پرے لے جا رہی تھیں اور یوں بھی جب کبھی جدوجہد سے تعاون ہوا بھی تو اس شکل میں جیسے دو دھارے آپس میں COALITION کر رہے ہوں مدغم نہیں ہوئے۔

لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ ان رجحانات کے باوجود اردو زبان، اس کی نثر، کہانی، اور شاعری اشتراکیت کی تحریک کی نہایت اہم سادھن بنی۔ "انقلاب زندہ باد" اسی زبان کی دین ہے۔ "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" بھی اِسی زبان نے گایا۔ بسمل اور بھگت سنگھ اسی زبان میں "خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں" کہہ کر پھانسی پر جھول گئے تھے۔

منشی پریم چند کی کہانیوں "میدانِ عمل" اور "رنگ بھومی" نے ایک پوری پیڑھی کی سوچ کو بدل دیا تھا۔

ہیں۔ اسی لیے ذرا جھجک کے ساتھ میں یہ مدّا اُٹھانے سے میں مفکروں کو دعوتِ فکر اور سوچ دے سکوں تو مجھے تسلّی ہو جائے گی۔

جہاں تک میری سوچ کا تعلق ہے میرے خیال میں ہندوستان میں سیکولرازم کا تصور سانجھی تہذیب کے ارتقا سے ہی پیدا ہوا ہے۔

چاہے ہم اس کو نظر انداز کریں، لیکن یہ تو تاریخی اصلیت کہ کئی صدیوں تک جب گنگا جمنا کی وادیوں میں تہذیبی لہریں ملی تھیں تو ان میں تضاد بھی تھا، جھگڑا بھی تھا، ٹکراؤ بھی تھا لیکن آہستہ آہستہ یہ رگڑ کم ہوتی گئی۔ تو بھی ملائمت اور رواداری کا ئیگ بیک وقت نمودار نہیں ہوا۔ آہستہ آہستہ اس نے اس پُر خار دھرتی پر سفر طے کیا۔ اس ہمواریت کا دور آنے میں تین بنیادی رکاوٹیں سدِ راہ تھیں۔

پہلا پہاڑ تو سیاست کا تھا۔ وسط ایشیا، ایران اور افغانستان کی ٹکڑیاں بہت دفعہ تلوار اور تاج کج کلاہی کے ساتھ آئی تھیں اور یہاں کی زبانوں، تہذیبوں اور کلچر میں اپنی توانائی تھی۔ ایک دوسرے سے کیسے مخاطب ہوں ع

زبانِ یار من ترکی و من ترکی نمی دانم

کے مسائل تھے۔ بنیادی قدریں مختلف تھیں۔

اِس تضاد میں جب ہمواری آنے لگی تو یہاں ہی سے ایک نئی کلچرل دھارا پھوٹی۔

امیر خسرو نے یہاں کی انفرادیت کو پہچانا۔ رحیم خان خاناں نے فارسی اور برج بھاشا کی ملاوٹ سے ایک نئی قسم کی شاعری کا اختراع کیا۔

یہاں کی زبانوں نے غزل کو اپنایا۔ تُرک فنکاروں نے یہاں کی موسیقی، ناچ اور فلسفی میں ایک نئی قسم کی تازگی پائی۔

اکثر تواریخ کے باب اور کلچرل جاگرن (RENAISCENCE) کی لہریں بادشاہوں کے نام سے منسوب ہو جاتی ہیں۔ اچھائیوں اور بُرائیوں کا سہرا صاحب حکومت کو اپنے سر باندھنا ہی پڑتا ہے۔

اسی لیے تو ماننا پڑتا ہے ہر مغل بادشاہ کا ہندوستان کی سانجھی تہذیب کے متعلق

تصور الگ الگ تھا۔ اِس وقت میرا مقصد کسی کو اچھا یا بُرا کہنے کا نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی کئی دفعہ قیاس آرائی کے لالچ (TEMPTATION) کو روکا نہیں جاتا۔ اور سوچتا ہوں کہ شاید اس برِصغیر کی سیاسی اور تہذیبی تواریخ دوسری ہوتی اگر دارا شکوہ دہلی کے تخت پر بیٹھا ہوتا۔

میں یہ صرف اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اُن صدیوں میں ہندوستانیت کے تصور کی دھارا بڑی پتھریلی زمین سے گزر رہی تھی۔ ہر چٹان چھوٹی یا بڑی اِس کی رفتار کو دھیما کر رہی تھی اور ٹکراوسے ویسا ہی غُل پیدا ہو رہا تھا۔ جو پہاڑی نالوں کے پاس رہنے والے اکثر سُنتے ہیں۔ یہ ہی اِس دور کا دوسرا پہلو تھا۔

تیسرا پہلو اور بھی ٹیڑھا تھا۔ مذہبوں کے تضاد تھے۔ اُن کے آپسی رشتوں میں ہمواری اور رواداری لانے کا راستہ تو پُرخار تھا۔ تصوف اور بھگتی واد نے اِس میں کافی مدد کی۔ انگریزی تسلط کے ہونے ہونے تک کافی حد تک اِن دو تہذیبوں نے آپسی رشتوں کو نشچت (DEFINE) کر لیا تھا۔

اردو زبان، دکنی، ہندی بھاشا۔ اِن میں شاعری، سوچ اور کہانی بہت حد تک سانجھی ہو گئی تھی۔ ہندوستانی موسیقی، ناچ اور گیت اِس برِصغیر کی پرمکھ (DOMINANT) کلچرل دھارا بن گئے تھے۔ گو سیکولرازم کا لفظ تو ابھی ہندوستانی لغات (DICTIONARY) میں شامل نہیں ہوا تھا۔ لیکن اس کا مفہوم آپسی میل جول اور رواداری کے روپ میں پرچلت ہو گیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگِ آزادی نے سانجھی ہندوستانی قومیت کو اُبھارا۔ ہار تو ہو گئی لیکن قوم پرستی نے ہندوستانیوں کے من میں اپنی جگہ بنا لی اور اسی سے سانجھا بن گیا۔

انگریزی راج کے دوران دو نئی باتیں سامنے آئیں۔ پہلی دفعہ ایک طاقت ور اور پُراثر مرکزی سرکار بنائی گئی جس کا سکہ اور حکم تمام برِصغیر میں چلتا تھا۔ جدید قسم کی ریلوں، ٹیلی فون اور تار سے فاصلے سُکڑ گئے۔ ہندوستانی حدود کی ذہنی تصویر میں بھی ایک دور رس تبدیلی ہوئی۔

مرکز کی سرکاریں تو ہماری لمبی ہسٹری میں کئی دفعہ بنی تھیں لیکن ذرائع آمد و رفت پُرانے تھے۔ اس لیے آپسی میل جول کی سرحدیں بھی گاؤں یا شہر تک ہی محدود ہو جاتی تھیں۔ اسی کلچر کا منبع (FOUNTANHEAD) دربار ہی رہتا تھا۔ عوامی کارکردگی کا اِس میں بہت کم دخل تھا۔

لیکن ان رکاوٹوں کے باوجود، اسلام کے پیروکار چاہے کسی پچھڑے ہوئے گاؤں میں رہتے ہوں یا قصبہ میں، اُن کو ملک سے باہر حج پر جانے کی خواہش ایک بین الاقوامی نظریہ دے دی تھی۔ گو وقت کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے اندر بھی زیارت گاہیں ظہور میں آگئیں لیکن مکہ شریف اور خلیفہ کا تقدس اُس کلچر کا اہم حصہ تھا۔

گو یہ برصغیر سیاسی طور پر چھوٹی بڑی ریاستوں میں ایک عرصۂ دراز تک بٹا رہا لیکن ہندو دھرم، بدھ مت، سنسکرت اور پراکرت نے یہاں کے لوگوں کے قومی تصور کو ہمیشہ ہی (CONTINENTAL) روپ دیا تھا۔ کیوں کہ ہر کونے میں رہنے والا بدھی متی (INTELLECTUAL) سنسکرت میں لکھتا پڑھتا تھا۔ اس لیے ایک بہت بڑی ایلیٹ میں سانجھے پن کا احساس۔ ان خیالات اور وچار دھاراؤں کو کنبھ جیسے بڑے میلے اور تیرتھ استھان تقویت اور توانائی دیتے تھے۔

انگریزی سامراج صرف راج کرنے یا اقتصادی فائدہ مندی کے لیے ہی نہیں آیا تھا، یہ یہاں کی تہذیبوں اور کلچر پر بھی بہت بڑا حملہ تھا۔

نئے حاکم، نئی زبان اور نئے ڈھنگ کے رہنے سہنے کے طریقے لے کر آئے تھے۔ اُن کی کلچرل APPROACH پہلے لوگوں سے الگ تھی۔ وہ دو تہذیبوں کے ملن سے کوئی نئی تہذیب پیدا نہیں کرنا چاہتے تھے۔

اسی لیے وقت کے تقاضے بدل گئے۔ یہاں کے لوگوں کے سامنے ایک غیر معروف مسئلہ تھا، کیوں کہ سوال صرف انگریزی زبان سیکھنے کا ہی نہیں تھا بلکہ کس ڈھنگ سے اِس نئے کلچر کے ساتھ راضی نامہ کیا جائے۔

انگریزی زبان یا مغربی طرزِ زندگی ایک جدید سائنسی یُگ کی نمائندگی بھی تو کرتا تھا۔ اِس سے ناطہ ورتن کر کے ہمارے سماج صرف پچھڑے ہی رہ سکتے تھے اور اِس کے کئی عناصر رہ بھی گئے۔

ہندو سماج نے اِس کرانتی کاری یُگ میں کئی ایک نئی سوشل ریفارم کی تحریکات کو جنم دیا۔ برہمو سماج، راما کرشنا مشن، آریہ سماج وغیرہ۔ جن کا پہلا کام تو ایک محدود

تک (RITUALISM) کے بندھنوں سے مُکت کرونا تھا اور ساتھ ہی ساتھ ایسی سنستھاؤں کو جنم دینا جو انگریزی زبان کو پڑھنے اور اپنانے میں معاون ثابت ہوں۔

سر سید احمد نے مسلمانوں کے نظریات کو بھی اِسی ڈھنگ میں ڈھالنے کی مہم کو شروع کیا۔ اُن کی کامیابی مقابلتاً محدود تھی اور اُس کی کئی وجوہات بھی تھیں لیکن پچھلی صدی کے آخر تک اور اس صدی کی شروعات تک ہندوستانی ELITE نے عام طور پر انگریزی اور جدیدیت کے ساتھ ایک رشتہ قائم کر لیا تھا۔

انگریزی راج نے ایک طرف اور کانگریس پارٹی کے جنم نے دوسری طرف جدید ہندوستانی قومیت کا تصور اُبھارا۔ میں نے انگریزی راج اس لیے کہا کیوں کہ اپنی مجبوریوں سے مجبوراً انھوں نے یہاں انڈسٹریل ئزیشن شروع کیا۔

سائنس کے قوانین کا علم، نئی قسم کی بھاپ اور بجلی کی (ENERGY) انرجی، ریلوے اور جہاز جو اب تیل اور بھاپ سے چلنے لگے تو دنیا کے اور ملکوں کی طرح یہاں کے رہنے والوں کی سوچ میں ایک بڑی تبدیلی لا رہے تھے۔

یوں یورپ میں بھی قوم اور (NATION-STATE) کا تصور انڈسٹریل انقلاب کے بعد آیا تھا۔ اسی لیے جہاں جہاں صنعتی انقلاب پہنچا وہاں کی سماجی، سیاسی اور اقتصادی تنظیمیں (ORGANISATION) بدلنے لگیں۔ جہاں کے قبائل کی زبان اور کلچرل تواریخ ایک تھی جیسے فرانس میں یا جرمنی میں، وہاں کا قومیت کا تصور دوسرا تھا۔ لیکن جہاں جہاں پھیلتے سامراجوں نے مختلف زبانوں، تہذیبوں، گروہوں کو ایک جا کرنے کی کوشش کی تھی وہاں کا تصور ذرا الگ تھا۔

NATION-STATE کے آنے ساتھ ساتھ ہی یورپ میں CHURCH REFORM کا بھی دور آیا۔ اور پہلی دفعہ SECULARISM بطور ایک آدرش کے اُبھرا۔ ملک کی حکومت کو نہ صرف پادریوں کے بندھن سے آزاد کرنے کا مقصود تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ لوگوں کے رویے ATTITUDES میں تبدیلی لانی بھی ضروری تھی۔ کوئی صنعتی انقلاب، سائنسی ئیگ، رجعت پرستی کی زمین میں نہیں پنپ سکتا۔ اسی لیے مذہب کو چھوڑا نہیں گیا۔ لیکن عیسائیت کو RITUALISM کی بجائے WAY OF LIFE بنانے کی جدوجہد شروع ہوئی۔

ہندوستانی جنگ آزادی کے رہبر صرف انگریزی سامراج سے نجات کا ہی نہیں سوچتے تھے۔ اُن کا تصور آنے والی NATIONSTATE کے متعلق یورپیوں EUROPEAN کی طرح جدید اور سائنٹفک تھا۔ اِس لیے اُن کے مورچوں کے دو رُخ تھے سیاسی اور سماجی۔

جوں جوں قومی محاذ آگے بڑھنے لگا، رجعت پرست طاقتوں نے اِن تصورات کے خلاف کمر باندھنی شروع کی۔ سامراج شاہی جوں جوں پسپا ہوتی گئی، اُس کی دوستی اور سہایتا اِن طاقتوں کو بڑھاوا دیتی گئی۔ سیکولرازم کا ترجمہ کچھ لوگوں نے "دھرم نرپیکشتا" کہہ کر کیا ہے۔ یہ اِس کا مکمل مفہوم نہیں۔ آزادی سے پہلے بھی اور اب بھی اِس کا تصور زیادہ کُلّی COMPERHENSIVE تھا۔ نہ صرف یہ کہ سرکار مذہب کے معاملوں میں دخل نہ دے اور نہ ہی مذہب سرکاری پالیسیوں میں مداخلت کرے۔ اِس کے ساتھ ہی ساتھ تعلیم اور کلچر کے ذریعے سے وچار دھارا کو سائنسی نظر دی جائے۔ اِسی لیے جواہر لال بار بار SCIENTIFIC TEMPER پر زور دیتے تھے۔

بات ذرا لمبی ہو گئی ہے اس لیے باقی پہلوؤں سے ہٹ کر صرف اپنے مضمون کی طرف مڑتا ہوں۔

آزادی، آزادانہ طور پر بولنے اور لکھنے کا حق۔ جمہوریت، اقتصادی ترقی نے ملک میں ایک نئی تہذیب اور تمدن کو جنم دیا ہے۔

مختلف نظریوں، زبانوں، مذاہب نے اپنے اپنے ڈھنگ سے اس نئے تمدن کے ساتھ اپنے رشتے قائم کیے ہیں۔

اِس نئے تمدن میں نظریے میں جدیدیت ہے اور سماج کے سبھی انگوں سے پچھڑاپن نکالنے کا عزم۔ جن جن خطوں یا انگوں نے ان عزائم کو سمجھا ہے یا اپنایا ہے، انھوں نے اِس سے بیشتر فائدہ اٹھایا ہے۔ اردو بولنے والے ایسا لگتا ہے کہ وہ ابھی دوراہے پر کھڑے ہیں۔ سب نہیں لیکن بیشتر حصہ۔

بدقسمتی یہ ہے جو ایلیٹ ELITE پڑھ لکھ کر آگے آئی بھی ہے، اُس کا اردو سماج پر

اثر کم ہے۔ اور اُن عناصر کا زور زیادہ ہے جو رجعت پرستی اور رو ڈ واد FANDAMENTALISM کے ترجمان ہیں۔ جوں جوں وقت گزرتا ہے، یہ پچھڑا پن بڑھتا ہے۔ اُس کی بہت سی بیرونی وجوہات بھی ہیں لیکن اندرونی بھی کم نہیں۔

اردو ادب کی خوبصورتی اور ہمہ گیری کے متعلق کوئی دو رائیں نہیں ہوسکتیں۔ لیکن سوال یہی ہے کہ کیا پچھلے یُگوں کی طرح یہ زبان پراگریسو طاقتوں اور رجحانوں کی ترجمانی یا نمائندگی کر رہی ہے یا رجعت پرستانہ عناصر کی۔

میں کسی کے خلاف یا کسی کے شان میں کوئی گستاخی نہیں کرنا چاہتا، صرف یہی کہنا چاہتا ہوں کہ ہم اردو نوازوں اور اردو دوستوں کو زبان اور اُس کے جدید تہذیبی تقاضوں پر ذرا گہرائی لیکن ہمدردی سے غور کرنا چاہیے۔

جیسا میں نے شروع میں کہا تھا، زبان کی حالت اور اس کی قسمت زبان بولنے والوں کے مستقبل اور حال کے ساتھ بندھی ہوئی ہے اور تمدن کا مطلب سیدھا اور صاف ہے۔

اقبالؔ نے شاید ان ہی حالات کی پیش خیمی کی تھی جب اُس نے کہا تھا ؎

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہ ہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

یہی نقشہ ہے اُن تہذیبی تقاضوں کا جو اردو والوں سے جواب طلب ہیں۔

ڈاکٹر اقتدار حسین صدیقی

عہدِ غالب کے سیاسی اور سماجی حالات (پس منظر)

ہندوستان کی تاریخ میں اٹھارھویں صدی عیسوی بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس صدی میں سلطنت مغلیہ جو سیاسی، فوجی اور تہذیبی اعتبار سے دنیا کی عظیم ترین سلطنتوں میں سے تھی تیزی سے زوال پذیر ہوئی۔ اٹھارھویں صدی کے نصف اول کے ختم ہوتے ہوتے مغلیہ سلطنت کے ثقافتی مراکز دہلی اور آگرہ مختلف قوتوں کے حملوں کے باعث تباہ ہوگئے تھے لیکن ان مراکز کی تباہی کے بعد اُن کا تہذیبی رول علاقائی اہمیت کے بعض دوسرے شہروں نے ادا کیا۔ ان نئے مراکز میں روہیلکھنڈ کے علاقے میں رامپور اور نجیب آباد، اودھ میں فیض آباد اور لکھنؤ، بہار میں عظیم آباد (پٹنہ) بنگال میں مرشد آباد اور دکن میں حیدرآباد قابلِ ذکر ہیں۔ دہلی کے دانشور، شعرا، فضلا اور فنکار انھیں شہروں میں جا بسے۔

اٹھارھویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستان کے سیاسی افق پر ایک بیرونی طاقت نمودار ہوئی۔ یہ نئی طاقت انگریزی سامراج کی تھی۔ انگریزوں نے مختلف ہندوستانی فرماں رواؤں کی باہمی کشمکش سے فائدہ اٹھاکر پورے ہندوستان میں اپنا سیاسی اقتدار قائم کرلیا۔ اس سیاسی تبدیلی کے نتیجے میں سیاسی انتشار اور لوٹ مار کے بجائے غیر متوقع طور پر امن و امان قائم ہوگیا۔ ۱۸۰۳ء میں جب انگریزوں نے مرہٹوں پر فتح پائی تو مغل بادشاہ، شاہ عالم ثانی سندھیا کے بجائے انگریزوں کی پناہ میں چلا گیا۔ ابتدا میں انگریزوں نے مغل بادشاہ کو ہر طرح خوش رکھنے کی کوشش کی اور اس کا مقررہ وظیفہ

پوری طرح ادا کرتے رہے۔ انگریزوں نے دہلی کے سربرآوردہ لوگوں سے بھی اچھے تعلقات قائم کیے اور بہت سے علما اور فضلا کی مدد معاش سے متعلق آراضیاں بحال کردیں جن کو مرہٹوں نے ضبط کرلیا تھا۔ انگریزوں کی اس حکمت عملی کی وجہ سے شاہجہاں آباد کا پرانا کھویا ہوا وقار واپس آنا شروع ہوا اور کچھ ہی عرصہ کے بعد وہ دوبارہ ایک ثقافتی مرکز کی حیثیت سے ابھرنے لگا۔ شاہجہاں آباد میں صوفیہ کی خانقاہیں اور مدرسے آباد ہوگئے اور یہاں طلبہ اور ارادت مند ملک اور بیرون ملک سے کثیر تعداد میں آکر فیضیاب ہونے لگے۔ تجارت میں بھی ترقی ہوئی اور پرانی صنعتوں کو فروغ ملا۔ ایک بار پھر دہلی میں بیرونی ممالک خصوصاً ایران اور وسط ایشیا کے تجار نظر آنے لگے۔ غرض ان تبدیلیوں کی وجہ سے انیسویں صدی کا نصف اول دہلی کی تاریخ میں اُس نشاۃ ثانیہ کا عہد قرار دیا جاتا ہے[1]۔

مُغلیہ سلطنت کا تیزی کے ساتھ زوال کسی طویل سلسلۂ اسباب کا نتیجہ نہیں تھا، بلکہ اورنگ زیب کے بعد امرا کی گروہ بندی اور بادشاہوں کی امور سلطنت سے لاپروائی اس زوال کا سبب بنی۔ ان اسباب نے ایک طرف بیرونی حملہ آوروں کو ہندوستانی سرحدوں میں داخل ہونے اور بڑے شہروں کو لوٹنے کا موقع دیا تو دوسری طرف علاقائی قوتوں کی مرکز سے سرکشی کی ہمت افزائی کی۔ علاقائی قوتوں کے علاوہ دہلی کے آس پاس کے زمیندار بھی باغی ہوگئے۔ انھوں نے لگان کی ادائیگی روک دی اور لوٹ مار میں مصروف ہوگئے۔ امرا اس سیاسی انتشار کو فرو کرنے اور سلطنت سے وفاداری ظاہر کرنے کے بجائے تخت پر بادشاہوں کو بدلتے رہے اور اپنے سیاسی حریفوں کے خلاف باغی سرداروں کو دہلی آنے کی دعوت دیتے رہے۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد بارہ سال کے مختصر زمانے میں چھ بادشاہ تخت پر بٹھائے گئے جب کہ اس سے پہلے ڈیڑھ سو سال کی مدت میں صرف چھ مغل بادشاہ ہندوستان کے حکمراں رہے۔

ہندوستان کے بگڑتے ہوئے سیاسی حالات سے سب سے پہلے نادر شاہ، فرماں روائے ایران نے

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے

C. F. Andrews, Zakaullah of Delhi, 1929, P. 43

اینڈریوز انگلینڈ سے دہلی آئے تھے جہاں پر انھوں نے ذکاءاللہ کے علاوہ دوسرے پرانے لوگوں سے قدیم دہلی کے واقعات ۱۸۵۷ء میں معلوم کیے تھے۔ انیسویں صدی کے نصف اول کو دہلی کی نشاۃ ثانیہ کا عہد کہتے ہیں۔۔

فائدہ اٹھایا۔ نادر ۱۷۳۹ء میں کرنال کے میدان میں مغل فوج کو شکست دینے کے بعد فاتح کی حیثیت سے دہلی میں داخل ہوا۔ اس نے شہر میں قتلِ عام کا حکم دیا۔ پھر مغل بادشاہ، امرا اور شہر کے تمام رئیسوں کی دولت ضبط کر لی اس لوٹ کھسوٹ میں تختِ طاؤس، کوہِ نور ہیرا اور دوسرے بیش بہا جواہرات کے علاوہ ایک سو اسی کروڑ روپیہ نادر شاہ کے ہاتھ آیا۔ نادر شاہ واپس ہوا تو محمد شاہ نے دریائے سندھ کے پار کے صوبے بھی اس کے حوالے کر دیے۔ (۱)

نادر شاہ کے حملے نے مغلیہ سلطنت کو مالی اور فوجی اعتبار سے بے حد کمزور کیا تاہم ہندوستان میں مغل شہنشاہ کا سیاسی وقار بڑی حد تک قائم رہا۔ اب بھی بڑے بڑے صوبے دار اسی کو اپنا قانونی اور اخلاقی آقا مانتے تھے۔ ایک صوبے دار کی موت پر اس کا بیٹا یا قریبی وارث شہنشاہ کی عطا کی ہوئی خلعت، خطاب اور فرمان کی بدولت صوبے پر حکومت کرنے کا مجاز ہوتا تھا۔ ان سب کے حصول کے لیے وہ شہنشاہ کو بھاری رقم اور تحائف پیش کش کرتا تھا، لیکن ۱۷۴۸ء میں محمد شاہ کی موت کے بعد مغل شہنشاہ کا رہا سہا وقار بھی ختم ہو گیا۔ دہلی میں ایرانی اور تورانی امرا کی باہمی کشمکش کی وجہ سے صوبے آزاد ہو گئے اور دہلی کی آبادی تباہ ہو گئی۔

۱۷۵۱ء میں ایرانی گروہ کے سردار اور مغلیہ سلطنت کے وزیر صفدر جنگ نے تورانیوں کے خلاف سورج مل جاٹ سے مدد طلب کی۔ آخر الذکر پندرہ ہزار سواروں کے ہمراہ دہلی میں داخل ہوا۔ اُس کے آنے پر صفدر جنگ نے شاہ جہاں آباد کا محاصرہ شروع کر دیا لیکن چھے مہینے تک جدوجہد کے باوجود اُس کو کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ چنانچہ صفدر جنگ نے انتقامی جذبے کے تحت سورج مل جاٹ کو پُرانی دہلی لوٹنے کا حکم دیا۔ پُرانی دہلی سات قدیم شہروں کا مجموعہ بھی اور شاہ جہاں آباد کی فصیل کے باہر پھیلی ہوئی تھی۔ سورج مل جاٹ اور اُس کے سواروں نے لوگوں کو لوٹا اور قتل کیا۔ گنجان آباد علاقے ویران ہو گئے۔ بعد میں لوگ اتنے کم تعداد میں باقی رہ گئے تھے کہ پرانی بستیاں دیہات میں تبدیل ہو گئی تھیں (۱)۔ جاٹوں کی اس لوٹ مار کو بعد میں جاٹ گردی کے نام سے پکارا جانے لگا۔

۱۔ آنند رام مخلص، وقائع آنند رام مخلص، م۔ ورق ۸۰ الف تا ۱۹۱ الف۔ و تاریخ محمد شاہی م۔ اوراق ۲۰۱ الف تا ۲۰۴ الف

۱۔ ملاحظہ کیجئے "شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات"، مرتبہ خلیق احمد نظامی، ص ۰۹

صفدر جنگ ۱۷۵۴ء میں اودھ چلا گیا۔ اس کے بعد نظام الملک آصف جاہ کے پوتے، عماد الملک کا اثر ورسوخ اتنا بڑھا کہ اس نے محمد شاہ کے بیٹے اور جانشین احمد شاہ کو قتل کر کے عالم گیر ثانی کو تخت پر بٹھایا۔ اگرچہ عماد الملک خود عالم شائستہ، شجاع، علم دوست اور مدبر تھا مگر وہ اپنی طاقت کو مستحکم کرنے میں ناکام رہا۔ دراصل ۱۷۵۴ء کے بعد احمد شاہ ابدالی (فرمان روائے افغانستان) کے حملوں اور مرہٹوں کی شمال کی جانب پیش قدمی نے اس کی ساری تدابیر پر پانی پھیر دیا۔ ۱۷۵۷ء میں احمد شاہ ابدالی نے پنجاب پر تسلط حاصل کرنے کے بعد دہلی پر حملہ کیا۔ فوجی طاقت نہ ہونے کی وجہ سے عماد الملک نے مجبوراً دہلی کو اُس کے حوالہ کر دیا۔ دہلی میں داخل ہو کر ابدالی نے جو مال واسباب لوٹا اُس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ مال غنیمت میں ابدالی کا اپنا حصہ ۲۸ ہزار ہاتھیوں، خچروں اور بیل گاڑیوں پر لادا گیا تھا۔ اسی طرح محمد شاہ کی بیوی اور اس کی بیٹی حضرت محل کا جس سے احمد شاہ نے شادی کر لی تھی سامان دو سو اونٹوں پر لادا گیا۔ ایک ہم عصر شہادت کے مطابق دہلی میں گدھا بھی باقی نہیں بچا تھا جس پر سامان لادا جائے۔ (۱)

دو سال بعد دہلی میں مرہٹے داخل ہوئے مرہٹوں نے لال قلعہ کے دیوان خاص سے چاندی کی چھت اور رنگ محل سے قیمتی پتھر نکال لیے۔ مرہٹوں کے علاوہ دہلی اور آگرہ کے اطراف کو جاٹوں اور سکھوں نے بھی لوٹا۔ شاہ ولی اللہ نے اِن حالات کا تذکرہ اپنے ایک خط میں جو نجیب الدولہ کے نام ہے اس طرح کیا ہے: ”ایک اہم بات یہ ہے کہ مسلمانان ہندوستان نے خواہ وہ دہلی کے ہوں خواہ اس کے علاوہ کسی اور جگہ کے ..... کئی صدمات دیکھے ہیں اور چند بار لوٹ مار کا شکار ہوئے ہیں۔ چاقو ہڈی تک پہنچ گیا ہے۔ رحم کا مقام ہے۔“ (۲)

۱۷۶۱ء میں مرہٹوں اور احمد شاہ ابدالی کے درمیان پانی پت کی تیسری لڑائی ہوئی۔ ابدالی کی فتح نے شمالی ہندوستان میں مرہٹوں کے اثر کو کچھ عرصہ کے لیے ختم کر دیا۔ مرہٹے ہارنے کے بعد دکن لوٹ گئے۔ ابدالی نے دہلی کو اپنے معاون نجیب الدولہ کے سپرد کر دیا۔ چنانچہ ۱۷۷۰ء سے تک نجیب الدولہ نے دہلی پر شاہ عالم ثانی کے نام پر حکومت کی۔ اس زمانہ میں شاہ عالم بہادر

۱۔ سر جادو ناتھ سرکار، فال آف دی مغل امپائر، ج ۲، ص ۹۳

۲۔ حوالے کے لئے ملاحظہ کیجئے، خلیق احمد نظامی، تاریخ مشائخ چشت، ص ۳۳۱-۳۳۲۔

الہ آباد میں رہا۔

نجیب الدولہ نے دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد اس کو دوبارہ آباد کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں اس کو دہلی کے با اثر بزرگوں، جیسے حضرت مظہر جان جاناں، حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے بیٹے شاہ عبدالعزیز کا تعاون بھی حاصل تھا۔ نجیب الدولہ نے اپنے محدود وسائل کے باوجود ایک مضبوط فوج بنائی اور اس کی مدد سے دہلی سے سہارنپور تک دوآبہ پر قبضہ کرلیا اور ہر جگہ امن و امان قائم کیا۔ اس کی انتھک کوششوں کی وجہ سے علاقہ میں خوش حالی پھیل گئی۔ اس نے ہر شہر اور قصبے میں مدرسے قائم کیے جہاں معلموں کو سرکاری خزانے سے تنخواہ دی جاتی تھی۔ اس نے سورج مل جاٹ کا مقابلہ کیا۔ لڑائی میں جاٹ سردار مارا گیا۔ اس کے بعد جاٹوں، سکھوں اور مرہٹوں کے حملے سے بھی دہلی کو بچایا۔ لیکن ۱۷۷۰ء میں نجیب الدولہ کی موت نے دہلی کو پھر بے سہارا کر دیا۔ نجیب الدولہ کا بیٹا ضابطہ خان باپ کی طرح اہل ثابت نہیں ہوا۔

۱۷۷۲ء میں شاہ عالم ثانی مرہٹوں کی مدد سے دہلی میں داخل ہوا۔ لیکن اس نے حکومت کی باگ ڈور نجف خاں کے سپرد کردی اور خود عیش وعشرت میں پڑگیا۔ بادشاہ نے مندرجہ ذیل اشعار بظاہر اسی زمانے میں کہے ہوں گے۔

صبح تو جام سے گزرتی ہے
شب دل آرام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے
اب تو آرام سے گزرتی ہے

نجف خان ایک نہایت قابل فوجی جنرل تھا۔ اس نے دہلی کے قرب وجوار اور دوآبہ میں امن وامان قائم کرنے کے بعد آگرہ پر حملہ کیا اور اسے جاٹوں سے آزاد کرالیا۔ اس طرح مغل سلطنت کے دونوں قدیم مراکز دوبارہ باغیوں سے پاک ہوگئے۔ نجف خاں کا دورِ اقتدار ۱۷۷۲ء سے ۱۷۸۲ء تک رہا۔ اس زمانہ میں دہلی اور آگرہ میں شیعہ سنی اختلافات بڑھے۔ کہتے ہیں کہ حضرت مظہر جان جاناں کی شہادت اسی اختلاف کا نتیجہ ہے اور حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی کو اسی کی وجہ سے شہر بدر ہونا پڑا تھا۔ (۱)

۱۔ خلیق احمد نظامی۔ تاریخ مشائخ چشت۔ ص۔ ۴۹۳

حکومت اور طاقت کے نشے میں چور نجف خاں لہو ولعب کا شکار ہوگیا۔ عیش پرستی نے اس کی صحت خراب کردی۔ وہ پھیپھڑوں کے عارضہ میں مبتلا ہوا اور ۴۵ سال کی عمر میں ۱۷۸۲ء میں مرگیا۔ نجف خاں کی موت سے دہلی میں نظم ونسق بگڑ گیا اس کے رفقائے کار میں اقتدار اعلیٰ کے لئے رقابت شروع ہوگئی۔ دہلی کو خانہ جنگی سے بچانے کے لئے شاہ عالم نے سندھیا کی خدمات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ ۱۷۸۵ء میں شاہ عالم نے دہلی اور دوآبہ کی حکومت سندھیا کے حوالے کردی۔ اس کے بدلہ میں سندھیا نے بادشاہ کے لئے ساڑھے چھ لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کیا۔ لیکن یہ رقم کبھی پوری ادا نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ سے بادشاہ، شاہ زادے اور سلاطین تنگ دست ہوگئے۔

۱۷۸۸ء میں نجیب الدولہ کے پوتے غلام قادر نے دہلی پر قبضہ کرلیا۔ اس نے فوجی تیاری اور مرہٹوں نے شمالی ہندوستان آزاد کرانے کے لیے شاہ عالم سے روپیہ طلب کیا۔ بادشاہ نے روپیہ دینے کی بجائے سندھیا سے خفیہ طور پر مدد مانگی۔ جب اس بات کی اطلاع غلام قادر کو ملی تو اس نے غصہ میں آکر شاہ عالم کو اندھا کردیا اور قلعہ میں جو بھی دولت تھی اس کو لوٹ لیا۔ کچھ عرصہ کے بعد سندھیا نے غلام قادر کو شکست دے کر قتل کردیا۔ لیکن سندھیا کے زمانۂ اقتدار میں دہلی رو بزوال اور بادشاہ کی مالی حالت خستہ رہی۔ شاہی عمارتوں اور باغوں کی مرمت نہیں ہوئی۔ لہٰذا شاہ جہاں آباد کے باغات اجڑنے لگے۔ باغات کے اندر خوشنما عمارتیں، فوارے اور پھولوں کے تختے جھاڑیوں اور کھنڈرات میں تبدیل ہونے لگے۔ قلعہ کا خوبصورت حویلیاں خستہ ہو چلیں ان میں علی مردان خاں، قمرالدین خاں، غازی الدین خاں اور سعادت خاں برہان الملک کی حویلیاں مشہور تھیں۔ برہان الملک کی حویلی کا حمام بھی عالیشان تھا۔ سرسید احمد خاں نے آثار الصنادید میں ان کی خستہ حالت کا ذکر کیا ہے۔ پرانی سرایوں کا بھی قریب قریب یہی حال تھا۔ ۱۷۹۴ء میں ٹوئننگ دہلی آیا۔ اس نے یہاں پر تاریخی عمارتوں اور باغات کی سیر کی۔ اس کے مطابق قدسیہ باغ، تیس ہزاری باغ، پائیں باغ، اور لال قلعہ سے نزدیک شاہ باغ اجڑی ہوئی حالت میں تھے۔ شاہ جہاں کا تعمیر کیا ہوا شالیمار باغ جو شاہ جہاں آباد سے تقریباً تین میل کے فاصلہ پر تھا اور جس کو گرمیوں میں شاہ جہاں کی قیام گاہ ہونے کا شرف حاصل تھا برباد ہوچکا تھا۔ (۱)

۱۔ سرسید احمد خاں۔ آثار الصنادید۔ ص۔ ۲۵۳۔ TRAVELS IN INDIA PP. 237-8,

عمارتوں اور باغوں کی طرح دہلی اور آگرہ کی آبادی پر بھی بہت بُرا اثر پڑا۔ یورپ کے سیاحوں کے بیان کے مطابق اٹھارہویں صدی کی ابتداء میں دہلی اور آگرہ عظیم شہر تھے۔ ان کی آبادی پیرس اور لندن کے برابر تھی۔ ان کے اندازے کے مطابق دہلی کی آبادی دس لاکھ سے زیادہ تھی۔ نادر شاہ کے حملے کے بعد دہلی کی آبادی صرف ۵ لاکھ رہ گئی۔ اس کے بعد اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں گھٹ کر صرف ایک لاکھ ہو گئی۔ (۲) لیکن آگرہ کی حالت دہلی سے بھی خراب تھی۔ ولیم ہوجز جو ۱۷۸۰ء سے ۱۷۸۴ء تک ہندوستان کی سیاحت میں مصروف رہا۔ آگرہ کو کھنڈرات کا شہر کہتا ہے۔ تاج محل اور اس کے قریب کی بستی تاج گنج کے متعلق لکھتا ہے "وہ آگرہ شہر کے جنوب مشرق میں ..... (تاج محل) ایک خوبصورت یادگار عمارت ہے۔ شہر سے اب یہ دو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ حالاں کہ اس سے پہلے وہ اس کے قریب تھی۔ اس یادگار عمارت کے متصل ہندوستانی اور بیرونی ممالک کی عمدہ ترین مصنوعات کے لئے چھ الگ الگ حصوں پر مشتمل مواد دار برساتیوں سے محیط ایک بڑا بازار پایا جاتا تھا۔ لیکن اب اس عمارت کا کوئی نشان باقی نہیں رہا۔" (۱)

ولیم ہوجز کی تصدیق نظیر اکبرآبادی کی نظم "شہر آشوب" سے بھی ہوتی ہے۔ نظیر کے زمانہ میں آگرہ جاٹ گردی کے سبب بُری طرح برباد ہو چکا تھا۔ وہاں طوائف الملوکی اور لوٹ مار کا دور دورہ تھا۔ نظیر اکبرآبادی بڑے رنج و غم کے ساتھ اس کا ذکر کرتے ہیں کہ حویلیاں تباہ ہو گئیں شہر پناہ توڑ دی گئی ہے اور باغات ویران ہو چکے ہیں۔ قلعہ بھی لوگوں کی دست بُرد سے نہیں بچ سکا۔

۱۸۰۳ء سے دہلی اور اس سے متعلق علاقوں کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس سال انگریزوں نے جنرل لیک کی قیادت میں مرہٹوں کو شکست دے کر دہلی پر قبضہ کر لیا۔ شاہ عالم نے جنرل لیک کا خیر مقدم کیا۔ ۱۶ ستمبر ۱۸۰۳ء کو جنرل لیک نے بادشاہ کے دربار میں حاضری دی۔ اب تک مغل بادشاہ کا ہندوستان میں کافی وقار تھا لہٰذا انگریز گورنر جنرل لارڈ ولزلی نے ہر قیمت پر شاہ عالم کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس نے ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے بادشاہ، شہزادے عد

۲۔ دیکھئے تفصیل کے لئے:

PERCIVAL SPEAR, TWILIGHT OF THE MUGHULS, P. 194

۱۔ ولیم ہوجز: ہندوستان اٹھارویں صدی میں (اردو ترجمہ۔ ڈاکٹر محمد عمر) ادارۂ ادبیات دلی۔ ۱۹۸۰ء۔ ص ۔ ۲۴۹ تا ۲۵۹۔

سلاطین کے لیے ساڑھے گیارہ لاکھ روپیہ سالانہ کا وظیفہ مقرر کیا۔ اس کے علاوہ یہ بھی طے پایا کہ گورنر جنرل اور کمانڈر ان چیف کی طرف سے سالانہ پیش کش بھی دی جائے گی۔ شاہی باغات اور دہلی کے نزدیک خالصہ کی اراضی اور دیہات کی آمدنی بھی بادشاہ کی ذاتی ملکیت مان لی گئی۔ قلعۂ معلی اور اُس سے ملحقہ بازار کو انگریزی حکومت کی مداخلت سے آزاد چھوڑ دیا گیا۔ دہلی شہر میں مغل شاہ زادے اور سلاطین قانون سے بالاتر تصور کئے جاتے تھے۔ دوآبہ میں مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لئے عدالتیں میں قاضی اور مفتی تعینات کئے گئے تاکہ مروجہ دستور کے مطابق نظم ونسق جاری رہے۔ اسی معاہدے کی رو سے ریزیڈنٹ اور دوسرے اعلیٰ انگریز افسران مغل دربار کے آداب اور طور طریقوں کا احترام کرتے اور ضروری موقعوں پر حاضری بھی دیتے تھے۔ (۱)

۱۸۰۶ء میں شاہ عالم ثانی کے انتقال پر اُس کا بیٹا اکبر شاہ ثانی تخت نشین ہوا۔ اُس کے عہد میں انگریزوں نے بادشاہ کا وظیفہ ساڑھے گیارہ لاکھ سے بارہ لاکھ کر دیا۔

دہلی اور دوآبہ میں انگریزوں کی حکومت قائم ہونے کے بعد امن و امان کا دور دورہ شروع ہوا۔ انھوں نے علاقہ کی خوش حالی بڑھانے میں دلچسپی لی اس وجہ سے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد دہلی دوبارہ ایک ثقافتی، تجارتی اور صنعتی مرکز کی حیثیت سے اُبھرنا شروع ہوئی اسی طرح پورے علاقے میں زراعت کی بھی ترقی ہوئی۔ وہ جو دیہات ۱۷۸۲ء کے مہلک قحط کے باعث غیر آباد ہو گئے تھے۔ دوبارہ آباد ہو گئے ان تمام خوش گوار تبدیلیوں کی وجہ سے شاہ جہاں آباد کی آبادی میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ فصیل کے باہر کی بستیاں بارونق ہو گئیں۔ پچاس سال کے عرصہ میں دہلی اور شاہ جہاں آباد کی آبادی ایک لاکھ سے بڑھ کر دو لاکھ ہو گئی۔ بہت سے لوگ دوسرے شہروں سے آکر یہاں آباد ہو گئے تھے۔ (۲)

ہندوستانی مصنوعات، خاص طور پر سوتی کپڑا، نیل اور شکر افغانستان، بخارا اور خیوا برآمد ہونے لگی۔ ہندو اور مسلم سوداگر وسط ایشیا کے ملکوں کا سفر کرنے لگے جہاں پر وہ اپنا مال فروخت

۱۔ TWILIGHT OF THE MUGHULS, PP. 37-8

۲۔ ایضاً۔ ص ص۔ ۱۹۴ تا ۱۹۵۔

کرکے واپسی پر ریشم اور گھوڑے ہندوستان لاتے تھے۔ اس تجارت کے سبب سے دہلی میں دولت کی فراوانی شروع ہوگئی۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس زمانہ میں ہندوستانی شرفا اُونی کپڑوں کا استعمال غیر شریفانہ سمجھتے تھے۔ بلکہ موسم سرما میں ریشم کے کپڑے جن کے اندر روئی بھری ہوتی تھی پہنتے تھے۔ (۱) یہ ریشم زیادہ تر بخارا اور چین سے درآمد ہوتا تھا۔ (۲) دہلی اور اس کے نزدیک شہروں اور قصبوں میں یورپ کی مصنوعات کی کھپت نہ ہونے کے برابر تھی۔ کیوں کہ یہ مصنوعات کلکتہ سے کشتی کے ذریعہ آگرہ لائی جاتی تھیں اور پھر گھوڑوں پر لاد کر دوسری جگہ بھیجی جاتی تھیں۔ اُن پر کرایہ کافی صرف ہوتا تھا اور مصنوعات کی قیمتیں بڑھ جاتی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستانی مصنوعات خود بہت اعلیٰ درجہ کی تھیں لہٰذا لوگ زیادہ تر دہلی کی بنی ہوئی چیزوں کو ترجیح دیتے تھے۔ (۳) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دہلی میں یورپ کی مصنوعات میں سے صرف شراب کافی پسند کی جاتی تھی۔ (۴)

دہلی میں عام خوش حالی، دولت کی فراوانی اور تجارت کی ترقی کا اس بات سے بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ صوفیا اور مشائخ کی خانقاہوں میں خاصی دولت فتوح کی شکل میں آنے لگی تھی۔ چنانچہ بہت سے صوفیا نے بڑے پیمانے پر لنگر قائم کئے جہاں غریبوں اور مسافروں کو مفت کھانا کھلایا جاتا تھا۔ سر سید احمد خاں ایک نقش بندی بزرگ مرزا مظہر جان جاناں کے خلیفہ شاہ غلام علیؒ کی درگاہ کے بارے میں لکھتے ہیں: "میں نے حضرت کی خانقاہ میں اپنی آنکھ سے روم (ترکی) اور شام اور بغداد اور مصر اور چین اور حبش کے لوگوں کو دیکھا ہے کہ حاضر ہو کر بیعت کی ۔ ۔ ۔ ۔ اور قریب قریب کے شہروں کا مثل ہندوستان (مشرقی علاقے) اور پنجاب اور افغانستان کا تو کچھ ذکر نہیں کہ ٹڈی دل کی طرح اُمڈے آتے تھے"

۱۔ ذکاء اللہ آف دہلی ص ۵، ۶

۲۔ موہن لال، ٹریولز ان پنجاب ص ۴۸

۳۔ ذکاء اللہ آف دہلی ص ۶

۴۔ ٹوی لائٹ آف دی مغلز ص ۶۴

"حضرت کی خانقاہ میں پانچ سو فقیر سے کم نہیں رہتا تھا اور سب کا روٹی کپڑا آپ کے ذمہ تھا۔ اور باوجودے کہ کہیں سے ایک حبہ مقرر نہ تھا، اللہ تعالیٰ غیب الغیب ست سب کام چلاتا تھا۔" (۱)

دوسرے مشہور اور ہر دل عزیز بزرگ جن کے ارادت مند بادشاہ اور عوام سبھی تھے میاں نصیر الدین عرف کالے صاحب تھے۔ اُن کی آمدنی کے ذرائع میں خاندانی املاک اور فتوح کے علاوہ شاہی وظیفہ بھی تھا۔ کالے صاحب راہبانہ انداز سے زندگی بسر کرتے تھے۔ اُن کی دوسری شادی بھی ایک مغل شاہ زادی سے ہوئی تھی (۲) سر سید احمد خاں نے اُن کے وقار اور شہرت کا اِن الفاظ میں ذکر کیا ہے: "اس زمانے میں ایسا نامی گرامی شیخ نہیں ہے۔ حضور والا اور تمام سلاطین و جمیع امراء عظام آپ کے نہایت معتقد ہیں۔ جس مجلس میں آپ تشریف لاتے ہیں ہر شخص بے اختیار دوڑتا ہے اور قدموں پر گرتا ہے۔ اور اپنی سعادت بڑی سمجھتا ہے" (۳) غالب بھی کالے صاحب سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ (۴) اپنے بزرگوں کی طرح کالے صاحب بھی تفضیلی اور وحدت الوجود کے دلدادہ تھے۔ اُن کی شخصیت اور عقائد کا اثر ان کے ارادت مندوں پر کافی تھا۔

ان بزرگوں کے علاوہ بہت سے صوفیا، فضلا، ادبا، شعرا، خطاط، اطبا، موسیقار، مصور نقاش اور دوسرے فنکار دہلی میں جمع ہو گئے تھے۔ سر سید احمد خاں نے آثار الصنادید میں ان ۱۱۹ نامور اشخاص کا ذکر کیا ہے جن کے کمال کا ہر خاص و عام معترف تھا۔ ان کے علاوہ کثیر تعداد اُن باکمال لوگوں کی بھی تھی جو معاصرین کی تصانیف میں کسی وجہ سے جگہ نہ پا سکے۔ ان کی تعداد بہادر شاہ ظفر کے عہد میں کافی بڑھ گئی تھی۔ اگرچہ بادشاہ کے ذرائع آمدنی محدود تھے لیکن بہادر شاہ کی فیاضی، ہنر پروری اور علم دوستی بے مثال تھی۔ شعرا، علما، اور فنکار سب ہی اس کے دربار میں رسائی رکھتے تھے اور اُن کی عنایات سے مستفیض ہوتے تھے۔ مثال کے طور پر شاعروں اور موسیقاروں کے علاوہ دہلی کے مشہور مصور راجہ جیون رام اور حسین ناظر شاہی دربار سے وابستہ تھے (۵) غرض کوئی ایسا قدیم فن یا صنعت نہ تھی جو

---

۱ - تذکرہ اہل دہلی ص ۱۶ - ۱۷ - انجمن ترقی اردو پاکستان نے آثار الصنادید کا چوتھا باب جو صوفیائے کرام وغیرہ سے متعلق تھا تذکرہ اہل دہلی کے نام سے شائع کیا ہے۔

۲ - تاریخ مشائخ چشت - ص - ۵۱۷ -

۳ - تذکرہ اہل دہلی - ص - ۲۷ -

۴ - اردوئے معلّٰی - حصہ دوم - ص - ۱۷ -

۴ - ٹوی لائٹ آف دی مغلز ص ۹۳

دوبارہ زندہ نہ ہوئی ہو۔ انھیں اسباب کی بنا پر انیسویں صدی کے نصف اول کو دہلی کے نشاۃ ثانیہ کا عہد کہا جا سکتا ہے۔

اہلِ دہلی اور انگریزوں کے درمیان روابط

تاریخی شواہد سے پتا چلتا ہے کہ ۱۸۰۳ء میں انگریزی حکومت کے قیام نے دہلی کے مسلم دانشوروں میں بے چینی پیدا کر دی تھی۔ وہ اپنے شہر میں انگریزوں کے داخلے کو شبہہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اُن کو اندیشہ تھا کہ انگریز دوسرے علاقوں کی طرح دہلی پر بھی معاہدہ کے خلاف غاصبانہ قبضہ کر لیں گے اور پھر دوسرے لوگوں کی طرح اُن کو بھی ناخوش گوار نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔ غالباً اسی وجہ سے شاہ عبدالعزیز نے ۱۸۰۳ء کے بعد انگریزوں کے خلاف فتویٰ دیا تھا۔ اس فتوے میں انھوں نے دہلی اور اس سے متعلق علاقہ کو دارالحرب قرار دیا تھا۔ (۱) لیکن انگریزوں کی حکمت عملی نے جلد ہی فضا کو اپنے موافق بنا لیا۔ انھوں نے دہلی کے بااثر لوگوں سے دوستانہ تعلقات پیدا کیے۔ خود شاہ عبدالعزیز کے رویہ میں تبدیلی پیدا ہونے کا پتا چلتا ہے۔ لاہور آرکائیوز میں محفوظ دستاویزات میں شاہ عبدالعزیز کی انگریز ریذیڈنٹ کے نام عرضی موجود ہے۔ جس میں انھوں نے اپنے والد شاہ ولی اللہ کی مددِ معاش کی بحالی کے لیے درخواست کی تھی۔ یہ مددِ معاش زمین پالم کے پاس تھی اور اس کی سالانہ آمدنی ۲۷ روپیہ تھی۔ اس کو نجف خاں نے ضبط کر لیا تھا۔ مرہٹوں کے زمانہ تسلط میں بھی یہ بحال نہیں ہو سکی تھی۔ انگریزوں نے پوری اراضی شاہ صاحب کو واپس دیدی۔ (۲)

شاہ صاحب اور انگریزوں سے متعلق مشہور روایات سے بھی اس امر پر روشنی پڑتی ہے کہ انگریز افسران اور شاہ صاحب کے درمیان اچھے روابط قائم ہو گئے تھے۔ انگریزوں کو ان کے علمی اور سماج میں اثر اور رسوخ کا احساس تھا۔ بہت سی روایتیں ایسی ہیں جن میں شاہ صاحب کا عیسائی مبلغین سے مناظرہ دکھایا گیا ہے۔ ہر مناظرہ میں شاہ صاحب کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی ــــ

---

۱ ــ فتاویٰ عزیزی ـ دہلی ـ ص ص ـ ۱۶، ۱۷، ۱۸۵ ـ

۲ ــ اطہر عباس رضوی، شاہ عبدالعزیز اور انگریز حکومت ـ مقالہ انگلش میں جو کہ ہسٹری کانگریس کے سالانہ جلسہ منعقدہ حیدرآباد ۱۹۰۸ء میں پڑھا گیا تھا۔

لیکن ۱۸۲۳ء میں شاہ عبدالعزیز کی وفات کے بعد عیسائی مُبلغین کی مہم میں شدت آنی شروع ہوگئی تھی۔ وہ اسلام اور ہندو مذہب پر حملے کرتے تھے اور اس کے نتیجے میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت پیدا ہونے لگی تھی۔

مناظروں میں عیسائیوں کے خلاف کامیابی حاصل کرنے کے لیے مسلم علماء عیسائی لٹریچر کا مطالعہ کرنے لگے۔ مناظروں کی شدت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ۱۸۳۲ء میں وزیر خان آگرہ سے سرکاری وظیفہ پر انگلش طریقہ کے مطالعہ کے لیے انگلینڈ گئے تو انھوں نے وہاں فرصت کے اوقات میں قدیم یونانی زبان اس لیے سیکھی کہ عیسائی مذہب پر قدیم لٹریچر کا مطالعہ کر سکیں اور پھر واپسی پر ہندوستان میں اسلام کے دفاع کے لئے کامیاب طریقہ پر مناظروں میں شرکت کر سکیں۔ ان کے ۱۸۵۴ء کے مشہور مناظرے کی روداد اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ عوام و خواص سبھی انگریزوں کے خلاف ہو گئے تھے۔ (۱) بہرحال انگریزوں کے خلاف نفرت اور مسلمانوں کے کھوئے ہوئے سیاسی اقتدار کو دوبارہ حاصل کرنے کی خواہش نے جہاد تحریک کو تقویت دی۔ اس تحریک کو چلانے کا سہرا شاہ عبدالعزیز کے مرید اور شاگرد سید احمد شہید اور شاہ صاحب کے خاندان کے لوگوں کے سر رہا ہے۔

بہرحال مسلم علماء کے عیسائیوں سے مناظرے اور جہاد تحریک سے برآمد ہونے والے نتائج میں اُردو نثر کا ارتقا تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ عیسائی مُبلغین نے اپنے مذہب کو پھیلانے کے لیے اپنا تبلیغی لٹریچر آسان اُردو میں چھاپ کر ہندوستانیوں میں بانٹنا شروع کر دیا۔ یہ مسلم علماء اور فضلاء کے لیے ایک چیلنج تھا۔ چنانچہ شاہ عبدالقادرؒ نے قرآن شریف کا آسان اردو نثر میں ترجمہ کیا۔ ان کے علاوہ شاہ محمد اسمٰعیل شہید نے بھی اپنی کتاب "تقویت الایمان" آسان اردو نثر میں لکھی۔ موخرالذکر کتاب کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ابتداء میں ان دونوں بزرگوں کا اسلوب نگارش زیادہ مقبول نہیں ہوا لیکن بعد میں ان تصانیف کے اثر سے اردو میں جدید نثر کا آغاز ہوا۔

بہادر شاہ کے عہد کو، دہلی کی نشاۃ ثانیہ کی تاریخ میں بڑی اہمیت ہے۔ اس زمانہ میں علم وفضل کی ترقی کے ساتھ ساتھ شاہجہاں آباد اور پرانی دہلی کی خوش حالی میں مزید اضافہ ہوا۔ خاص طور پر قصبہ مہرولی کو حیات نو ملی۔ یہاں پر بہادر شاہ نے موسم گرما گزارنے کے لیے رہائشی محل اور دوسری

۱۔ "البحث الشریف فی اثبات النسخ والتحریف" ڈاکٹر وزیر خاں فخر المطابع، دھلی۔

عمارتیں بنوائیں۔ بادشاہ کی طرح اس کے امرا اور دہلی کے روسا اور تجار نے بھی اپنے لیے مکان تعمیر کرائے۔ برسات کے خاتمہ پر مہرولی ہی میں پھول والوں کی سیر کا تہوار منایا جاتا تھا اس موقع پر ہندو مسلمان پنکھوں کا جلوس نکالتے تھے۔ جلوس کے خاتمہ پر ہندو حضرات جوگ مایا کے مندر کی طرف چلے جاتے تھے اور مسلمان شیخ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی درگاہ کی طرف رخ کرتے تھے۔(۱)

بہادر شاہ بڑے مہذب، تعلیم یافتہ اور فیاض بادشاہ تھے وہ مغل بادشاہوں کی روایات اور مغل دربار کے آداب اور طور طریقوں کو قائم رکھنے کی پوری کوشش کرتے تھے آمدنی کے ذرائع محدود ہونے کے باوجود وہ تہواروں، شادی بیاہ کے موقعوں اور یوم تخت نشینی کو شاندار طریقے پر مناتے تھے۔ ان موقعوں پر بادشاہ کے ہاتھیوں اور گھوڑوں کا جلوس لائق دید ہوتا تھا۔ ہاتھیوں اور گھوڑوں کے اوپر سونے اور چاندی سے کڑھے ہوئے ریشمین کپڑے پڑے ہوتے تھے۔ یہ شاہی جلوس اہلِ دہلی کو کو تفریح کا موقع فراہم کرتے تھے۔ بچے، جوان اور بوڑھے سبھی جلوس دیکھنے کے لیے گھروں سے باہر نکل آتے تھے۔ بہادر شاہ کو باغات سے بھی کافی دلچسپی تھی۔ انھوں نے پرانے باغات کی مرمت کرائی خاص طور پر روشن آرا باغ، تیس ہزاری باغ اور قدسیہ باغ بادشاہ کی توجہ کا مرکز بنے۔ قدسیہ باغ کے عالیشان اور بلند دروازے اور اس کے اندر کی عمارتوں کی مرمت کرائی گئی۔ ان باغات کے علاوہ بادشاہ نے خود دو نئے باغ مغل طرز پر لگوائے تھے۔ ایک باغ لال قلعہ کے قریب جمنا کے کنارے لگایا گیا تھا اور دوسرا شاہدرہ میں۔ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہیں کہ بہادر شاہ دہلی کی زندگی میں ایک سماجی اور ادبی ادارے کی حیثیت رکھتے تھے۔ (۲)

بہادر شاہ کے عہد میں شاہجہاں آباد کی شہر پناہ مکمل تھی۔ صبح کو اس کے دروازے کھل جاتے تھے اور سورج غروب ہونے پر سب دروازے مقفل کر دیے جاتے تھے۔ عام طور پر لوگ شہر سے باہر کم جاتے تھے۔ کبھی کسی بزرگ کے مزار کی زیارت یا پھر سفر کے لیے فصیل سے باہر لوگوں کا جانا ہوتا تھا۔ کشمیری گیٹ کے باہر کچھ مکانات تعمیر ہوئے تھے لیکن دہلی دروازہ کے باہر کوئی مکان نہیں تھا۔ دہلی دروازہ کے باہر سے پرانے شہر کے کھنڈرات کا سلسلہ دور تک چلا جاتا تھا۔ شاہ جہاں آباد

۱۔ ذکاء اللہ آف دہلی صہ ۳۷

۲۔ ایضاً۔ ص۔ ص۔ ۱۷۴۔ ۱۷۵۔

کے اندر گنجان آبادی تھی جس جگہ آج کل ریلوے اسٹیشن موجود ہے وہاں سب سے زیادہ گنجان آبادی تھی۔ اسی طرح جامع مسجد اور لال قلعہ کے درمیان جو وسیع میدان ہے وہاں بھی گنجان آبادی تھی۔ متوسط طبقہ کے لوگوں کے علاوہ کچھ امرا کی حویلیاں بھی تھیں۔ چاندنی چوک کا شمار دنیا کے مشہور بازاروں میں ہوتا تھا۔ چاندنی چوک کے درمیان سے نہر بہشت گزر کر قلعہ میں جاتی تھی۔ نہر کے دونوں طرف کانیں تھیں لیکن سڑک پختہ نہیں تھی۔ اس میں جہاں تہاں گڈھے تھے۔ برسات کے ایام میں سڑک پر کیچڑ رہتی تھی۔ عموماً لوگ کانوں کے سامنے بچھے ہوئے پتھروں کی سلوں پر چلتے تھے۔

زراعت کی ترقی کی وجہ سے ضروری اشیا کی قیمتیں کم ہوگئی تھیں گیہوں ایک روپیہ کا چالیس سیر فروخت ہوتا تھا اور گھی ایک روپیہ میں چار سیر ملتا تھا۔ زیادہ تر ہندوستان میں بنا ہوا سوتی کپڑا استعمال ہوتا تھا۔ اور اس کی قیمت کم ہوتی تھی۔ ضروری اشیا کی قیمتیں کم ہونے کی وجہ سے غریب لوگ بھی بآسانی زندگی بسر کرتے تھے۔ (۱)

یہاں یہ مسئلہ بھی توجہ طلب ہے کہ آیا ۱۸۵۷ء سے پہلے انگریزی تہذیب، افکار اور اداروں کا اثر شمالی ہندوستان کے دانشوروں اور کلچر پر کہاں تک ہوا۔ ہم اپنے مطالعہ کی بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ مغربی تہذیب کا اثر ساحلی علاقے کے شہروں کلکتہ، مدراس اور بمبئی تک محدود تھا۔ شمالی ہندوستان میں دہلی اور دوسرے شہروں میں ہندو اور مسلم دونوں اپنی قدیم ثقافتی روایات کے دلدادہ تھے۔ اس علاقہ میں قدیم زمینداروں اور جاگیرداروں کا اثر بدستور قائم تھا۔ علاوہ ازیں رقاصائیں اور طوائفیں شہر کی تہذیبی اور سماجی زندگی پر کسی حد تک اثر انداز ہوتی تھیں۔

عام طور پر یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ انیسویں صدی کے شروع میں دہلی کالج کے قیام نے دہلی میں یورپ کے جدید علوم اور افکار کو مقبول بنایا۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ۱۸۲۶ء تک اس کالج میں عربی اور فارسی کے شعبے تھے۔ ان زبانوں کے علاوہ سائنس اور دوسرے علوم اُردو میں پڑھائے جاتے تھے۔ ۱۸۲۷ء میں ریذیڈنٹ کے حکم سے انگریزی کا شعبہ کھولا گیا۔ اس شعبے میں مسلم طلبہ داخل نہیں ہوتے تھے۔ انھیں یہ غلط فہمی تھی کہ اس شعبے کے کھولنے سے انگریز حکومت کا منشا

---

(۱)۔ ذکاءاللہ آف دہلی ص ۴، ۶

ہندوستانیوں کو اُن کے اپنے مذہب سے برگشتہ کرکے عیسائی بنانا ہے۔ (۱)

اس سلسلے میں دہلی کالج کے ریاضی کے پروفیسر رام چندر کی خود نوشت سوانح ہماری مدد کرتی ہے۔ پروفیسر رام چندر دہلی کے دانشوروں کی جدید علوم سے نفرت اور دہلی کالج کے طلبہ کی اُن علوم سے دلچسپی کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں" قدیم فلسفہ اور فلسفیوں کے افکار اور نظریات جن کی تعلیم عربی زبان کے ذریعہ دی جاتی تھی اور جو جدید سائنس کے تجربات کی بنا پر باطل ثابت ہو گئے تھے۔ مثلاً یہ تصور کہ زمین جامد ہے، کالج کے اونچے درجوں کے طلبہ کے لئے مذاق کا موضوع تھا یہی حال شعبہ انگریزی کے طلبہ کا تھا۔ شہر کے فضلا بھی جدید نظریات کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ یونانی نظریات کے حامی تھے اس لیے کہ صدیوں سے انھیں نظریات پر لوگوں کا ایمان تھا۔" ۲

دہلی کالج میں شعبہ انگریزی سے تعلق رکھنے والے طلبہ غیر مسلم ہوتے تھے۔ مسلم طلبہ عربی اور فارسی پڑھتے تھے۔ ڈاکٹر نذیر احمد کے مطابق مسلمان عیسائیوں کی صحبت سے پرہیز کرتے تھے۔ خود انھوں نے اور مولوی ذکاء اللہ نے ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزی سیکھنی شروع کی۔ (۳)

دورِ حاضر کے کچھ محققین نے ۱۸۵۷ء سے پہلے کی دہلی پر مغربی تہذیب کا اثر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر بی۔ اے۔ ڈار نے اپنی کتاب 'THE RELIGIOUS THOUGHT OF SAYYID AHMAD KHAN" میں آثار الصنادید کے پہلے دو ایڈیشنوں میں فرق کی بنا د سرسید پر انگریزی تہذیب اور افکار کا اثر دکھایا ہے۔ اُن کے خیال میں آثار الصنادید کا پہلا ایڈیشن جو ۱۸۴۷ء میں شائع ہوا تھا اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ سرسید احمد خاں اس وقت تک قدیم روایات اور اقدار کے حامی تھے۔ کیوں کہ اس ایڈیشن میں سرسید احمد خاں نے ایک ضخیم باب دہلی کے علماء، مشائخ، شعراء، قاری، مصور وغیرہ کے حالات پر شامل کیا تھا اور اُس میں سید احمد شہید، شاہ محمد اسمٰعیل شہید اور مولانا شاہ اسحاق کی اصلاحی کوششوں اور ان کی جہاد تحریک کو سراہا تھا۔ لیکن دوسرے ایڈیشن سے جو ۱۸۵۴ء میں

---

۱ - ذکاء اللہ آف دہلی ص ۶۰۴

۲ - ایضاً۔ ص - ۴۴

۳ - ایضاً۔ پیش لفظ۔ ص - ۱۲ - اینڈریوز کی کتاب میں نذیر احمد صاحب کا پیش لفظ ہے۔

شائع ہوا یہ باب نکال دیا کیوں کہ اس وقت تک ہندوستان کی سیاسی فضا بدل گئی تھی اور سرسید کے نظریات میں بھی تبدیلی واقع ہو چکی تھی۔ اب وہ انگریزوں کی مخالفت کرنے کے بجائے انگریزوں کی موافقت کو مفید سمجھتے تھے۔ وہ محسوس کرنے لگے تھے کہ قدیم اقدار اور افکار کی بنا پر معاشرے کی اصلاح بے سود ثابت ہوگی۔ درحقیقت وہ عقلیت پسندی کو اصلاح کی بنیاد بنانا چاہتے تھے۔ (۱)

مگر تاریخی شواہد اس بیان کے خلاف جاتے ہیں۔ دراصل آثار الصنادید میں تبدیلیاں دوسرے اسباب کی بنا پر کی گیئں تھیں۔ مثلاً سرسید کے دوست رابرٹ آسٹین آرتھر نے جو شاہجہاں آباد کے کلکٹر اور مجسٹریٹ تھے سرسید کی مدد سے عمارات سے متعلق آثار الصنادید کے حصے کو انگریزی میں ترجمہ کرنا شروع کیا لیکن انھیں مسجع اور مقفع عبارت کی وجہ سے کافی وقت کا سامنا کرنا پڑا۔ انھوں نے سرسید کو آسان نثر لکھنے کا مشورہ دیا۔ اس کے بعد سرسید کو اُن کے انگریز دوستوں نے ۱۸۵۲ء میں دہلی آرکیالوجی کل سوسائٹی کا اعزازی ممبر بھی بنا لیا۔ یہاں بھی ان کے ساتھیوں نے سرسید کو مشورہ دیا کہ وہ آثار الصنادید کا دوسرا ایڈیشن آسان اُردو میں لکھیں اور اس میں صرف عمارتوں اور باغات سے متعلق حصے چھاپے جائیں تاکہ اس کا انگریزی میں ترجمہ ممکن ہو سکے۔ (۲)

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ دہلی کے دانشوروں کے برخلاف دہلی میں انگریز افسران مغل کلچر سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اُن میں سے کئی ایک نے ہندوستانی نوابوں کی وضع اختیار کر لی تھی۔ (۳) مٹکاف برادران نے ہندوستانیوں سے دوستانہ تعلقات قائم کیے۔ چارلس مٹکاف کے چھوٹے بھائی ٹامس مٹکاف نے دہلی ہی میں سکونت اختیار کر لی اور مغل طور طریقوں کو بھی اپنا لیا۔ وہ ہندوستانی کھانوں کا اس قدر شوقین تھا کہ دہلی کے بہت سے اچھے باورچی اس کے ملازم تھے۔ وہ رقص و سرود کی محفلوں میں بھی شریک ہوتا تھا۔ اُس نے دہلی میں دو مکان بھی تعمیر کرائے تھے۔ ایک مکان علی روڈ پر تھا اور دوسرا مہرولی میں۔ مہرولی کے مکان کا نام دلکشا تھا۔ (۴)

۱۔ بی۔ اے۔ دار، دی ریلیجس تھاٹ آف سید احمد خاں، لاہور ۱۹۷۱ء صہ ۳۴، ۸۱

۲۔ کرسچن ڈبلیو۔ ٹرال: اے نوٹ آثار الصنادید، جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن، نومبر ۲، ۱۹۷۲ء

۳۔ اسپیروی انڈین نواب

۴۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں، غالب اور آہنگِ غالب، صہ ۱۷

انگریزوں کے خلاف ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے ناکام ہونے کے بعد شمالی ہندوستان میں انگریزی تہذیب اور افکار کا اثر تیزی سے بڑھا۔ اپنے ہم وطن ہندوؤں کی طرح (۱) مسلمانوں نے بھی محسوس کیا کہ بغیر انگریزی حکومت کا اعتماد حاصل کیے اُن کا مستقبل روشن نہیں ہوگا۔ اب بہت سے دانشور انگریزی زبان اور جدید علوم سے واقفیت حاصل کرنے کو ترقی کے لیے ضروری سمجھنے لگے۔ اس سلسلے میں سر سید احمد خاں اور اُن کی علی گڑھ تحریک نے اہم رول ادا کیا۔

---

۱ - موہن لال کشمیری جو دہلی کے رہنے والے تھے اُن کو سنہ ۱۸۴۴ میں انگلینڈ میں اپنے زمانہ قیام کے دوران یہی بات محسوس ہوئی تھی۔ انھوں نے اس تاثر کو ان الفاظ میں بیان کیا: "ہندوستان کی ترقی صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہندوستان کے تمام رہنے والے انگریزی زبان سیکھیں اور برطانوی حکومت کے مطیع اور فرماں بردار بن جائیں۔"

ڈاکٹر حنیف نقوی

غالبؔ کا سفرِ کلکتہ

غالبؔ کا سفر کلکتہ ان کی زندگی کے چند اہم ترین واقعات میں سے ہے، لیکن آج تک ان کے سوانح نگار اس سفر کی تفصیلات کے سلسلے میں کسی متفقہ نتیجے پر پہنچنے میں ناکام رہے ہیں۔ اس عدم اتفاق کا اصل سبب خود غالبؔ کے وہ مبہم بیانات ہیں جو ان کے اصل مخاطبین کے لیے وضاحت طلب نہ تھے لیکن بعد کے قارئین کے لیے عقدہ ہائے لاینحل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اختلاف کا ایک سبب یہ بھی ہے ان واقعات کی تفصیل میں خود غالبؔ نے مختلف مواقع پر مختلف قسم کی باتیں کہی ہیں اور جس سوانح نگار کو جو نیا نکتہ ہاتھ آگیا ہے اس نے اس کی ایک نئی تعبیر و تفسیر پیش کر کے اپنے طور پر ایک مختلف فیہ نتیجہ اخذ کر لیا ہے۔ اس ضمن میں اس حقیقت کو بھی بالعموم نظر انداز کیا جاتا رہا ہے کہ غالبؔ صداقت شعار اور قابل اعتبار راوی نہیں۔ ان سے جہاں اپنی زندگی کے بعض اہم واقعات کے بیان میں محض سہو و نسیان کی بنا پر غلطیاں ہوئی ہیں وہیں انھوں نے بعض مواقع پر مصلحت اور موقع شناسی کے تحت دیدہ و دانستہ غلط بیانی اور افسانہ طرازی سے بھی کام لیا ہے۔ اس کے علاوہ اس سفر کے آغاز سے قبل اور اثنائے سفر میں جو اہم واقعات پیش آئے انھیں صحیح تاریخی پس منظر میں دیکھنے کی بجائے محض قیاسات اور اندازوں کا سہارا لیا گیا ہے اور یہ قیاس آرائیاں اکثر غلط نتائج کا پیش خیمہ ثابت ہوئی ہیں۔

عموماً یہ معلوم ہے کہ غالبؔ کا یہ سفر اپنی خاندانی پنشن کے مقدمے کے سلسلے میں تھا۔ ان کو یہ

پنشن نواب احمد بخش خاں والیِ فیروز پور جھرکہ کے خزانے سے ملتی تھی۔ غالبؔ کا یہ خیال تھا کہ نواب صاحب نے انگریز حکام کی مرضی اور منشا کے خلاف اپنے طور پر خواجہ حاجی کو ان کے چچا نصراللہ بیگ کے وارثوں میں شامل کر کے ان کے ساتھ ناانصافی کی ہے اور اس طرح انہیں اور ان کے دیگر اعزہ کو ایک بڑی رقم سے غلط طور پر محروم کر دیا ہے۔ اپنے بیان کے مطابق غالبؔ کلکتہ روانہ ہونے سے قبل اس حق تلفی کے خلاف برابر احتجاج کرتے اور نواب صاحب کو اس کی تلافی کی طرف متوجہ کرتے رہے تھے۔ خواجہ حاجی کے انتقال کے بعد بھی جب نواب صاحب نے اپنے وعدے کے مطابق غالبؔ اور ان کے دیگر افرادِ خاندان کو پوری تنخواہ ادا نہیں کی تو وہ انتہائی مایوسی کے عالم میں فیروز پور ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ نواب صاحب نے اس موقعے پر اپنی بعض مجبوریوں اور جنرل اختر لونی (رزیڈنٹ دہلی) سے تعلقات کی ناخوش گواری کا عذر پیش کر کے انھیں حالات کے سازگار ہونے تک مزید چند روز تحمل سے کام لینے پر آمادہ کر لیا اور وہ بے نیلِ مرام دہلی واپس چلے آئے۔ اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد جنرل اختر لونی کا انتقال ہو گیا (۱۵ جولائی ۱۸۲۵ء) اور ان کی جگہ سر چارلس مٹکاف کے تقرر کی خبر موصول ہوئی۔ اس کے بعد پیش آنے والے واقعات جو اس سفر سے متعلق بعض اہم امور کے تعین میں کلیدی حیثیت رکھتے ہیں، متنہ پنشن کے عرضی دعوے کے حوالے سے خود غالبؔ کی زبان میں بالتفصیل سطور ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں:

"سر چارلس مٹکاف کے آنے کے بعد بھرت پور کا معاملہ پیش آ گیا اور وہ راجا بھرت پور کو بچانے اور راج کے شورہ پشتوں کو سزا دینے میں مصروف ہو گئے۔ چونکہ نواب احمد بخش خاں بھی وہاں جا رہے تھے۔ انھوں نے ساتھ چلنے کو کہا۔

میں اس زمانے میں اپنے بھائی کی بیماری کی وجہ سے ایک مصیبت میں گرفتار تھا۔ مزید برآں قرض خواہوں نے تقاضوں سے میرا ناک میں دم کر رکھا تھا اس لیے میں اس سفر کے لیے کسی طرح تیار نہ تھا۔ اس کے باوجود اس توقع پر کہ مجھے مٹکاف صاحب کی خدمت میں سلام کرنے کا موقع مل جائے گا، میں نے اپنے بھائی کو بخار اور ہذیان کی حالت میں چھوڑا اور چار آدمیوں کو اس کی نگہداشت کے لیے مقرر کیا۔ کچھ قرض خواہوں کو طرح طرح کے وعدوں سے چپ کرایا، دوسروں کی نظر سے چوری چھپے، بھیس بدل کر، کسی طرح کا ساز و سامان لیے بغیر ہو مشکلوں سے میں نواب احمد بخش خاں کے ساتھ بھرت پور کے لیے روانہ ہو گیا۔ میرے بار بار کہنے کے باوجود نواب احمد بخش خاں نے سر چارلس سے میرا تعارف نہ کرایا۔ اس اثنا میں نواب صاحب کے منہ پر لقوہ ہو گیا۔ کچھ مدت کے بعد ڈاکٹر ڈنکن کے علاج سے وہ ٹھیک ہو گئے اور فیروز پور واپس چلے آئے۔ ۔ ۔ ۔ چونکہ سر چارلس مٹکاف بھی

تین دن وہاں فیروز پور میں رہے اور میں بھی روزانہ نواب احمد بخش خاں سے درخواست کرتا رہا، انھوں نے مجھے سر چارلس کی خدمت میں پیش نہیں کیا۔

جب مٹکاف صاحب بہادر دلی واپس چلے گئے، تو اب میں نواب احمد خاں سے بالکل مایوس ہوگیا۔ پھر میں نے دل میں خیال کیا کہ انصاف پسند حکمراں اپنے متعلقین میں سے ہر ایک کا خیال رکھتے ہیں آخر مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں ان کا وسیلہ اور واسطہ تلاش کروں کیوں نا کسی تیسرے آدمی کے بغیر میں خود ہی سر چارلس مٹکاف کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنے تمام معاملات شروع سے لے کر آخر تک ان کے گوش گزار کردوں! لیکن قرض خواہوں کے شور و غوغا کے ڈر سے میرا دلی جانا ممکن نہیں تھا۔ مجھے اپنی عزت کا خیال آیا اور میں نے ارادہ ترک کردیا۔

اس کے علاوہ انھی دنوں نواب گورنر جنرل بہادر کے ورود کی خبر پھیلی۔ یقین تھا کہ سر چارلس مٹکاف بھی ان کی پذیرائی اور استقبال کے لیے ضرور جائیں گے۔ لہٰذا میں نے فیصلہ کیا کہ کان پور جاؤں اور وہاں سے ان کی معیت میں واپس آؤں اور راستے میں کسی مناسب موقع پر ان کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنی مصیبت اور قرض کی ساری رام کہانی ان سے کہوں اور انصاف کا طالب ہوں۔

غرض میں اس ارادے سے فرخ آباد اور کان پور کی طرف روانہ ہوگیا۔ بدقسمتی سے جوں ہی کان پور پہنچا میں وہاں بیمار پڑگیا۔ یہاں تک کہ ہلنے جلنے تک کی سکت بھی جاتی رہی۔ چونکہ اس شہر میں کوئی ڈھنگ کا معالج نہ ملا، مجھے مجبوراً ایک کرایے کی پالکی میں گنگا پار لکھنؤ جانا پڑا۔ یہاں میں پانچ مہینے سے کچھ اوپر بستر پڑا رہا۔ یہیں میں نے نواب گورنر جنرل بہادر کے ورود اور بادشاہ اودھ کے ان کے استقبال کو جانے کی خبر سنی لیکن ان دنوں میں چارپائی سے اٹھنے کے قابل نہیں تھا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ لکھنؤ کی آب و ہوا بالکل میرے راس نہیں آئی۔

میرے بزرگوں کے اور نواب ذوالفقار علی بہادر (باندہ) کے باہمی پرانے تعلقات تھے.... اس لیے میں جوں توں کرکے گرتا پڑتا باندہ (بندیل کھنڈ) پہنچ گیا۔ یہاں میں تقریباً چھ مہینے تک نواب صاحب کے مکان پر رہا۔ خدا کے کرم اور نواب صاحب کی ہمدردی اور تیمارداری اور توجہ سے مجھے اس خطرناک بیماری سے نجات ملی۔

اب باتیں ختم ہوگئی تھیں اور نواب گورنر جنرل بہادر بھی کلکتے مراجعت فرما چکے تھے۔ میں فیروز پور

ے تو دلی جا نہیں سکا تھا، اب باندے سے کیسے اور کیونکر اس کی جرأت کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے خیال کیا کہ آخر دلی اور کلکتہ دونوں جگہ قانون تو ایک ہی ہے، مجھے سارا معاملہ حکومت کے انصاف پر چھوڑ دینا چاہیے۔ چونکہ کشتی سے سفر کرنے کی میری مقدرت نہیں تھی، مجھے مجبوراً خشکی کے راستے گھوڑے کی سواری سے کلکتے جانا پڑا۔ دو تین ملازم میرے ساتھ تھے لیکن میں بہت کمزور اور تھکا ماندہ تھا۔ زاد راہ اور کوئی آسائش کا سامان بھی نہیں تھا۔

مرشد آباد پہنچا تو یہاں مجھے نواب احمد بخش خاں کی رحلت اور شمس الدین احمد خاں کی جانشینی کی خبر ملی چونکہ میرا دعویٰ احمد بخش خاں کی جاگیر سے متعلق تھا، میں نے سوچا وہ زندہ ہوں یا مردہ، اس سے میرے معاملے پر کیا اثر پڑ سکتا ہے اور کلکتے پہنچ گیا۔"[۱]

غالب کی بیان کردہ اس روداد سفر کی بعض اہم شقوں پر بحث سے قبل اگر ان سوالات کے جواب تلاش کر لیے جائیں کہ چارلس مٹکاف کا رزیڈنٹ کے عہدے پر تقرر کب عمل میں آیا، وہ دہلی کس تاریخ کو پہنچے، بھرت پور کی مہم پر کب روانہ ہوئے، اس مہم سے فراغت کے بعد کب دہلی واپس ہوئے، نواب گورنر جنرل کے ورود کی خبر کب عام ہوئی، وہ کس تاریخ کو کان پور میں وارد ہوئے اور بادشاہِ اودھ کو کب ان کی خدمت میں باریابی حاصل ہوئی، تو بہت سے اختلافی مسائل از خود حل ہو جائیں گے۔

جان ولیم کلے (J. W. KAYE) کی "دی لائف اینڈ کرسپانڈینس آف چارلس لارڈ مٹکاف" (THE LIFE AND CORRESPONDENCE OF CHARLES LORD METCALFE) جلد اول سے معلوم ہوتا ہے کہ مٹکاف کو ۲۶ر اگست ۱۸۲۵ء کو دہلی کا رزیڈنٹ اور سول کمشنر اور گورنر جنرل کا ایجنٹ برائے راجپوتانہ مقرر کیا گیا تھا۔ ۱۲ر اکتوبر ۱۸۲۵ء کو وہ کلکتے سے دہلی پہنچے۔ نومبر کے اوائل میں فصیلِ شہر کے باہر ان کے خیمے نصب ہوئے اور اس کے ساتھ بھرت پور پر فوج کشی کے لیے تیاری کا آغاز ہوا۔ ۶ر دسمبر ۱۸۲۵ء کو یہ قافلہ متھرا پہنچا، ۱۰ر دسمبر کو قلعۂ بھرت پور کا محاصرہ ہوا اور ۱۸ر دسمبر کو یہ معرکہ سر کر لیا گیا۔ اس کے بعد مٹکاف ریاست کے نظم و نسق کی بحالی میں مصروف رہے۔ حتیٰ کہ موسم کی تبدیلی اور گرم ہواؤں کے زور نے انھیں دہلی کی طرف لوٹنے پر مجبور کر دیا (THE SETTING IN HOT WINDS CERTAINLY COMPLLED HIS RETUSN TO THE IMPERIAL CITY)[۲] دہلی پہنچنے کے بعد وہ یہاں کے انتظامی امور کی نگرانی اور اصلاح کی طرف متوجہ ہوئے۔ برسات کا موسم شروع ہوتے ہی انھوں نے دوبارہ راجپوتانہ کے دورے کا آغاز کیا اور اس دورے سے

واپس آنے کے بعد گورنر جنرل کے استقبال کی تیاریوں میں منہمک ہو گئے۔

رولرز آف انڈیا سیریز (RULERS OF INDIA SERIES) کی تصنیف "ارل ایمہرسٹ" (EARL AMHERST) کی ورق گردانی سے اس سلسلے کے جو واقعات سامنے آتے ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ لارڈ ایمہرسٹ ۱۴ر اگست ۱۸۲۶ء کو اپنے متعلقین و ملازمین خاص کے ساتھ کلکتے سے شمالی ہند کے دورے پر روانہ ہوئے۔ مختلف مقامات پر مختصر قیام اور سیر و تفریح کرتا ہوا یہ قافلہ ۱۸ر نومبر ۱۸۲۶ کو کان پور پہنچا۔ جہاں گورنر جنرل کا استقبال کیا گیا۔ ۲۰ر نومبر کو شاہ اودھ (غازی الدین حیدر) مع بائیس افراد خاندان کے ان کی خدمت میں باریاب ہوئے۔ دوسرے دن گورنر جنرل بازدید کی غرض سے شاہ اودھ کے خیمے میں تشریف لے گئے اس کے بعد یہ قافلہ فتح گنج، لکھنؤ، سورون، آگرہ، فتح پور سیکری، ڈیگ، کوسی اور فیروز پور جھرکہ ہوتا ہوا دہلی میں وارد ہوا۔ مارچ کا مہینہ دہلی میں گزارنے کے بعد شملہ کی طرف روانگی عمل میں آئی۔ ۱۵ر جون کو شملے سے روانہ ہو کر انبالہ ہوتے ہوئے ۲ر جولائی کو میرٹھ پہنچے۔ میرٹھ میں چند روز کے بعد کلکتے کی طرف مراجعت کے لیے سفر کا آغاز ہوا۔

ان تفصیلات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ غالب نواب احمد بخش خاں کی معیت میں نومبر ۱۸۲۵ کے اواخر میں دہلی سے بھرت پور روانہ ہوئے ہوں گے، اور مٹکاف کی بھرت پور سے دہلی کی طرف واپسی گرمی کا موسم شروع ہو جانے کے بعد بگمانِ غالب اپریل ۱۸۲۶ء کے اواخر میں عمل میں آئی ہوگی — غالب اس وقت فیروز پور میں موجود تھے۔ چونکہ وہ نواب صاحب کی جانب سے قطعاً مایوس ہو چکے تھے اس لیے انھوں نے سوچا کہ دہلی جا کر اپنے معاملات خود مٹکاف کے گوش گزار کریں لیکن قرض خواہوں کے شور و غوغا کے ڈر سے وہ ایسا نہ کر سکے اور بدستور فیروز پور میں مقیم رہے یہاں تک کہ برسات کا موسم (جون کا مہینہ) شروع ہو گیا اور مٹکاف دہلی سے راجپوتانہ کے دورے پر روانہ ہو گئے۔ اسی زمانے میں گورنر جنرل (لارڈ ایمہرسٹ) کے ورود کی خبر عام ہوئی اور مٹکاف نے اپنا دورہ مکمل کر کے ان کے خیر مقدم کی تیاریاں شروع کر دیں۔ گورنر جنرل کی کلکتہ سے روانگی ۱۴ر اگست ۱۸۲۶ء کو عمل میں آئی۔ یقین ہے کہ ان کے سفر سے متعلق اطلاعات اس کے بعد ہی فیروز پور پہنچی ہوں گی۔ واقعات کی اس رفتار کے پیش نظر ہمارا اندازہ یہ ہے کہ غالب اگست ۱۸۲۶ء تک بہر حال فیروز پور میں موجود تھے۔ فیروز پور سے مولانا فضل حق کے نام انھوں نے صنعتِ تعطیل میں جو خط لکھا تھا، اس سے ان کے ذہنی انتشار کا اندازہ ضرور ہوتا ہے لیکن فیروز پور میں قیام کی مدت کے بارے میں کوئی اشارہ نہیں

ملتا ۔ البتہ رائے چھج مل کے نام کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مدت خاصی طویل تھی۔ نواب احمد بخش خاں اس اثنا میں الور کے معاملات میں الجھے رہنے کی وجہ سے کافی دنوں تک فیروز پور سے غیر حاضر رہے تھے اور غالب نے ان کی معاودت کے انتظار میں تنہائی کے یہ دن انتہائی کرب اور اذیت کے عالم میں گزارے تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:-

"ہر تندی جوشم کہ دامن جہد آوارگی بہ کمر بزنم، دست قدرت زیر سنگ آمدہ است ۔ ۔ ۔ ۔
۔ ۔ ۔ ۔ چارۂ سخت بے دلی معدوم و پایانِ کار نامعلوم۔ پیداست کہ از قفس جستہ بدام افتادہ را چہ حال خواہد بود ۔ ۔ ۔ ۔ جلائے وطن وعزم سفر و آلام غربت نصیبے است کہ نصیب ہیچ آفریدہ مباد ہرچند در وطنم لما قرب وطن نیز تنہایست است ہنوز با اہل کاشانہ راہ نامہ و پیام واست۔ ہرچہ دیدہ می شد، آشوب چشم بند و ہرچہ شنیدہ می شود، زحمت گوش ست۔ نیم جانے کہ ازاں ورطہ بیروں آوردہ ام، مگر ودیعت خاکِ فیروز پور ست کہ با ایں ہمہ اقامتِ اضطراری اتفاق افتاد و مرگے کہ منش بہ ہزار آرزو از خدا می خواہم مگر در ہمیں زمیں موعود ست کہ ایں قدر درنگ در اقامتش رو داد۔ ہرچہ از اخبار معاودت نواب شنیدہ می شود، راہے بحرفِ مدعائے من ندارد چہ سراسر آں افسانۂ نکبت الوریاں و آرائش صفوفِ قتال و وا شگوں گشتن کارہاے اعداء و درست آمدن فال خیر سگالان دولت قاہرہ است۔ کلمۂ مختصرے کہ نواب صاحب کے بندہ رونق افزائے فیروز پور خواہند گشت، از کسے شنیدہ نمی شود و دلِ مضطر تسلی نمی پذیرد ۔ ۔ ۔ ۔ طاقتِ ستم کشی سپری گشت و انتظار از حد گذشت۔ بمرد ماتم کہ در کار زار ۔ ۔ ۔ پاشی زخم کاری برداشتہ باشد کہ اگر گریزد، ننگ در گریخت و اگر خود را بر جائے دارد، نتواند ایستاد۔"

(کلیات نثر غالب ص ۱۵۵ و ۱۵۶)

ان حالات میں ستمبر ۱۸۲۶ء سے قبل فیروز پور سے کلکتہ کے لیے غالب کی روانگی خارج از امکان نظر آتی ہے۔ فیروز پور سے براہ فرخ آباد کان پور تک کی مسافت اندازاً ایک ماہ میں طے ہوئی ہوگی۔ وہ لارڈ ایمہرسٹ کے کان پور میں ورود (۱۸ نومبر ۱۸۲۶ء) سے قبل بہر حال وہاں پہنچ چکے تھے۔ ابتدا میں چونکہ کان پور تک کا سفر ان کے پیش نظر تھا، اس لیے انھوں نے یقیناً گورنر جنرل کی آمد کی امکانی تاریخوں کے

کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کر لی ہوگی۔ محتاط طور پر یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ اکتوبر کے مہینے میں وہاں پہنچے ہوں گے۔ کان پور پہنچتے ہی وہ سخت بیمار ہو گئے اور بغرض علاج لکھنو جانے پر مجبور ہوئے۔ ۲۰ نومبر ۱۸۲۶ء کو بادشاہِ اودھ کی گورنر جنرل کے حضور میں باریابی کے وقت وہ لکھنؤ میں مقیم اور صاحبِ فراش تھے۔ لکھنؤ میں غالب کا قیام پنجشنبہ ۲۵ ذی قعدہ (۱۲۴۲ھ) مطابق ۲۱ جون ۱۸۲۷ء تک رہا۔ جمعہ ۲۶ ذی قعدہ (۱۲۴۲ھ) مطابق ۲۲ جون ۱۸۲۷ء کو وہاں سے روانہ ہوئے اور چوتھے روز یعنی ۲۹ ذی قعد مطابق ۲۵ جون کو کان پور پہنچے۔ رائے چھج مل کو لکھتے ہیں:

”بتاریخ بست و ششم ذی قعدہ روز جمعہ از ان سم آباد (لکھنؤ) برآمدم و بتاریخ بست و نہم در دارالسرور کان پور رسیدم“ (کلیاتِ نثر ص ۱۵۸)

غالب نے مقدمۂ پنشن کے عرضی دعوے میں جس کا اقتباس گزشتہ سطور میں پیش کیا جا چکا ہے لکھنؤ میں پانچ مہینے سے کچھ اوپر بستر پر پڑے رہنے کا ذکر کیا ہے لیکن بمالک رام صاحب کے حسب روایت ابن حسن خاں کے نام کے ایک خط میں لکھنؤ میں قیام کی مجموعی مدت پانچ ماہ بتائی ہے[۵۳]۔ یہ خط ہمارے پیش نظر نہیں اس لیے اس کے مندرجات کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا دشوار ہے۔ جہاں تک عرضی دعوے کا تعلق ہے، اس کی بنیاد پر صرف مدتِ علالت کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ لکھنؤ میں قیام یقیناً اس سے زیادہ عرصے تک رہا۔ ہمارے اندازے کے مطابق یہ مدت تقریباً آٹھ ماہ (اواخر اکتوبر یا اوائل نومبر ۱۸۲۶ء تا ۲۱ جون ۱۸۲۷ء) قرار پاتی ہے۔ اس کے برخلاف ڈاکٹر اکبر حیدری کا خیال یہ ہے کہ غالب اواخر ذی الحجہ ۱۲۴۱ھ (جولائی ۱۸۲۶ء) سے ۲۵ ذی قعدہ ۱۲۴۲ھ (۲۱ جون ۱۸۲۷ء) تک تقریباً گیارہ ماہ لکھنؤ میں قیام پذیر ہوئے۔ جناب کاظم علی خاں نے اپنے ایک مضمون میں یہ مدت پندرہ ماہ کے قریب (شعبان المعظم ۱۲۴۱ھ تا ۲۲ ذی قعدہ ۱۲۴۲ھ) قرار دی ہے[۵۴]۔ گزشتہ سطور میں ہم یہ ثابت کر چکے ہیں کہ فیروز پور سے غالب کی روانگی گورنر جنرل کے ورود کی خبر عام ہونے اور ۱۸۲۶ء کا موسم برسات ختم ہونے کے بعد کا واقعہ ہے، اس لیے قیاسات کی ان غلطیوں پر کسی مزید بحث کی ضرورت باقی نہیں رہتی البتہ غلط فہمی کے اُس سرچشمے کی نشان دہی ضروری ہے جس سے یہ غلط نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔

لکھنؤ پہنچنے کے بعد غالب نے سبحان علی خاں، میر نیاز حسین خاں اور بعض دوسرے ”دوستانِ جدید“ کے ایما سے معتمد الدولہ آغا میر کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے ایک عرضداشت تحریر کی تھی[۵۵]۔ تشکیلاتِ

نثرِ غالب میں اس عرض داشت کے اختتام پر تاریخ تحریر "دوم محرم الحرام" لکھی ہوئی ہے۔ اسے دوم محرم الحرام ۱۲۴۲ھ (مطابق ۶ اگست ۱۸۲۶ء) مان کر رائے قائم کرلی گئی ہے کہ غالب اس تاریخ سے قبل لکھنؤ پہنچ چکے تھے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ تاریخ کا یہ اندراج مذکورہ عرضداشت سے قطعاً غیر متعلق اور بعد کا اضافہ ہے۔ "گلِ رعنا" کے ایک قلمی نسخے مملوکہ خواجہ محمد حسن (لاہور) میں یہ عرضداشت "محرر دعاگو محمد اسد اللہ" پر ختم ہو جاتی ہے۔ یہ نسخہ غالب کے ایک معاصر عزت اللہ دہلوی نے خود مصنف کے نسخے سے نقل کیا تھا اور اس کی کتابت ۲۰ ذی قعدہ ۱۲۵۲ھ (۲۶ فروری ۱۸۳۷ء) کو مکمل ہوئی تھی[۸]۔ "نامہ ہائے فارسی غالب" کے قلمی نسخے میں جو الحاق و تصرف کے امکانات سے بڑی حد تک پاک ہے یہ آخری الفاظ بھی موجود نہیں۔ "دوم محرم الحرام" کا اضافہ کس زمانے میں کیا جانا قرین قیاس ہے، یہ بحث آگے آئے گی، یہاں اس طرف اشارہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جن حضرات نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے وہ یا تو اس اختلاف نسخ سے بے خبر رہے ہیں یا عدم اعتنا کی بنا پر اسے نظر انداز کر گئے ہیں۔

یہ مسئلہ بھی اب تک طے نہیں ہو سکا ہے کہ قیامِ لکھنؤ کے زمانے میں غالب نے غازی الدین حیدر کی مدح میں کوئی قصیدہ کہا تھا یا نہیں۔ مولانا غلام رسول مہر کا خیال ہے کہ اس قیام کے دوران انھوں نے شاہِ اودھ کے لیے کوئی قصیدہ نہیں کہا تھا[۹]۔ مالک رام صاحب کا ارشاد ہے کہ انھوں نے غازی الدین حیدر کے لیے قصیدہ تو کہا تھا مگر وہ اسے نامکمل ہونے کے باعث وزیر اودھ آغا میر کی خدمت میں پیش نہ کر سکے تھے[۱۰]۔ ان دونوں کے برخلاف کاظم علی خاں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ غالب نے ۱۴ اگست ۱۸۲۶ء مطابق ۱۰ محرم ۱۲۴۲ھ تک شاہ اودھ غازی الدین حیدر کے لیے ایک قصیدہ کہہ کر راجا صاحب ام کے وکیل اور سبحان علی خاں کے ذریعے وزیر اودھ آغا میر کے پاس بھیجا تھا نیز اس قصیدے کے صلے سے سفر کلکتہ کے لیے زادِ راہ فراہم کرنا چاہتے تھے[۱۱]۔

مختلف شہادتوں کا ان کے صحیح تاریخی پس منظر میں جائزہ لینے کے بعد ان تینوں دعووں میں مولانا غلام رسول مہر کا بیان زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے لیکن یہ خیال کہ غالب نے اس زمانے میں مطلقاً کوئی قصیدہ نہیں کہا تھا، درست نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ آغا میر کی مدح میں ایک سو دس شعر کا قصیدہ کہہ کر اسے انکی خدمت میں پیش کرنے کے لیے مناسب وقت کے منتظر تھے لیکن عرضداشت وزیر موصوف کی خدمت میں گزرنے کے بعد باریابی کے لیے جو شرائط قرار پائیں وہ ان کے لیے ناقابل قبول تھیں اس لیے یہ قصیدہ پیش نہیں کیا جا سکا۔

کلکتہ پہنچنے کے بعد مولوی محمد علی خاں صدر امین باندہ کے نام پہلے ہی خط میں لکھتے ہیں:

"قصیدہ کہ در مدح آغا میر گفتہ ام، خدا می داند کہ برائے خاندانِ من طرفہ داغ بدنامی ست
و لطف ایں کہ آں یک صد و دہ شعر از صفحۂ حک ساختن نمی توانم۔ چوں نواب مرشد آباد
نیز سید زادہ است (می خواہم کہ) ایں قصیدہ را بنامِ وے شہرت دہم۔۔۔۔۔۔ توقع
کہ تا زمانے کہ اشعار موضع اسم ممدوح را۔۔۔ (حک نہ کند)۔۔۔ آں قصیدہ را
بہ کس نہ نمایند"

(نامہ ہائے فارسی غالب ص ۲۹)

رائے چھجمل کے نام کے ایک خط سے جو ان کے "مہربانی نامہ تفقد رقم" موصولۂ پنجم ذی قعدہ
روز آدینہ" (یکم جون ۱۸۲۷ء) کے جواب میں لکھا گیا تھا، یہ اندازہ ہوتا ہے کہ غالب اس وقت تک آغا میر
تک رسائی کے لیے اپنی کوششوں کی طرف سے پُر اُمید تھے چنانچہ ان کو لکھتے ہیں کہ" انشاء اللہ العظیم
ہمدریں ہفتہ جوابے چنانکہ دل می خواہد از نوکِ خامہ بیروں تراوید نیست" (کلیات نثر ص ۱۵۶) لیکن نتیجہ ان
کی توقعات کے برخلاف نکلا اور وہ انتہائی مایوسی اور کبیدہ خاطری کے عالم میں لکھنؤ سے کان پور کی طرف چل
پڑے۔ کان پور پہنچنے کے بعد انھوں نے رائے صاحب موصوف کو جو خط لکھا ہے وہ امیدوں کے طلسم کی اس
شکست اور اس کے نتیجے میں ایک قسم کی جھلاہٹ اور مایوسی و آزردہ طبعی کے اثرات کی نشاندہی کرتا ہے۔
اس خط میں انھوں نے جہاں اپنے بعض مخلص و شفیق دوستوں کی گرم جوشی کا فراخ دلی کے ساتھ اعتراف
کیا ہے، وہیں آغا میر کے خلاف اپنے دل کا غبار نکالنے میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے:

"در زمانے کہ نمیقۂ سامی در ورود یافت، متردد بین السفر و الاقامت بودم و سر آں داشتم
کہ اگر نقشِ مدعا رسا نشیند در ہوسِ رنگِ ذوقِ گزیدہ بے تامل مکتوبے حاوی طلب
رقم کنم۔ اما ہنگامہ بازی ہائے خیال برہم خورد و بخت رمیدہ یاوری نہ کرد۔ مبادی مقدمہ
سراسر طراز دلبری داشت لیکن در اواسط کار بہنجار نہ بود۔ منت ایزد را کہ اواخر نادیدہ
ماند ورنہ چہا بایستے دید۔ خلاصۂ گفتگو ایں کہ اعیانِ سرکار لکھنؤ با من گرم جوشیدند، انچہ
در بابِ ملازمت قرار یافت، خلافِ آئینِ خویشتن داری و ننگ شیوۂ خاکساری بود،
تفصیل ایں اجمال و توضیح ایں ابہام جز بہ تقریر ادا نتواں کرد و از فورِ بے ربطی آں

را بدام تحریر نتواں آورد۔ کوتاہی سخن ہر چہ دراں بلاد از کرم پیشگی و فیض رسانی ایں گدا طبع، سلطان صورت یعنی معتمد الدولہ آغا میر شنیدہ می شد، بخدا کہ حال برعکس ست، در ابتلاے دولت ہر کرا آلتِ حصول مدعاے خود دید، بروے پیچید، لاجرم یک دو کس بہر رنگ متمتع گشتند و اکنوں کہ از استحکام اساس دولتِ خود خاطرش جمع است، در بندِ جمع زر افتادہ است۔ جملہ خاندان ہاے قدیم لکھنؤ از بیدادِ ایں بے رحم بسیلابِ فنا رسیدہ و ناز پروردگان ایں دیار آوارۂ جہاتِ گیتی گردیدہ و نوخود از تردستی و از اسرافِ خود پشیماں شدہ ازیں شیوہ برگشتہ تر گردیدہ۔ بالجملہ بازارِ بیداد گرم ست۔ مہاجنان و ساہوکاران و تاجران پنہاں زر و مال خود بجان پو می رسانند و ایمن نیند۔ ہر کہ بود گریخت و ہر کہ ہست در بند گریختن ست۔“

——— (کلیاتِ نثر غالب ص ۷۵ اور ۷۶)

آغا میر کی خدمت میں باریابی سے غالب کا مدعا درحقیقت کلکتہ کے سفر کے لیے زادِ راہ کی فراہمی کے سوا کچھ اور نہ تھا لیکن محض اس کوشش کی کامیابی کی امید پر تقریباً ایک سال تک پاؤں توڑ کر بیٹھا رہنا ان کی مزاجی کیفیت سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اس کے علاوہ آغا میر کی طرف سے مایوسی کے بعد انھوں نے جس شدید ردِ عمل کا اظہار کیا ہے، اس کے پیشِ نظر بھی عرضداشت کی مبینہ تاریخ تحریر (۲ محرم) سے ذی قعدہ تک ان کا ”مترددِ بین السفر والاقامت“ رہنا بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے یہ تسلیم کر لینا کہ انھوں نے مذکورہ عرضداشت ۲ محرم ۱۲۴۲ھ کو تحریر کی ہوگی، درست نہ ہوگا۔ اس کے برخلاف قوی امکان یہ ہے کہ یہ عرضداشت بیماری سے صحتیابی کے بعد اپریل یا مئی ۱۸۲۷ء میں لکھی گئی ہوگی۔

عرضداشت موسومہ آغا میر کو ۲ محرم کی تحریر مان لینے اور اس کے ذکر کو ایک دوسری عرضداشت کے حوالوں کے ساتھ مخلوط کر دینے کے نتیجے میں ایک عجیب قسم کا خلط مبحث پیدا ہو گیا ہے چنانچہ جناب کاظم علی خاں لکھتے ہیں کہ بیماری سے افاقہ ہونے پر غالب نے ۴ اگست ۱۸۲۶ء کے آس پاس راجا صاحب رام کے ذریعے کو مندرجہ ذیل تین چیزیں بھیجی تھیں:

(۱) وزیر اودھ آغا میر کے لیے ایک عرضداشت

(۲) شاہ اودھ نواب غازی الدین حیدر کے لیے ایک قصیدہ

(۳) سجان علی خاں کے لیے ایک خط۔ گمان غالب ہے کہ یہ خط بھی ۲۴ اگست ۱۸۳۶ء کے قریب لکھا گیا ہوگا۔

کاظم صاحب کا یہ خیال یکسر غلط فہمی پر مبنی ہے اور انھوں نے اس کے اظہار میں بے احتیاطی سے کام لے کر دوسروں کے لیے بھی اسی قسم کی غلط فہمی میں مبتلا ہونے کا سامان کر دیا ہے۔ موصوف نے غالب کے جس خط کے حوالے سے یہ تمام باتیں تحریر کی ہیں، اس میں نہ غازی الدین حیدر کا نام آیا ہے اور نہ آغا میر کا۔ منشی محمد حسن خاں کے نام کے اس خط کے بعض مفید مطلب حصے یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

"پیش ازیں نامۂ بنام خانِ والاشان، سجان علی خاں، وعرضداشتے بحضور والاے حضرت وزارت پناہی با یک قصیدۂ مدحیہ شاہ ہم آوردہ مجموع اوراق پیش وکیل راجہ صاحب اشفاق مناقب راجہ صاحب رام صاحب فرستادہ ام وآں خواستہ ام کہ آں نگارستان آرزوے محال بہ نظرِ خان صاحب عالی مناصب گذشتہ بحضرتِ دستورِ اعظم رسد۔ بو کہ ایں قصیدہ بہ بزمِ خسروی خواندہ شود و نامہ نگار از مائدۂ جودِ خسروی۔۔۔ زلہ بر بندد تا امروز کہ اربعین کامل گزشت، ہیچ گونہ ازاں نیرنگ وافسوں پدیدار نہ گشت۔۔۔ امروز کہ چارشنبہ بست دہم ماہِ ترسایان است وشبے کہ بقاعدۂ اہلِ تنجیم شبِ چارشنبہ وبہ لسانِ شرع شبِ پنجشنبہ نامیدہ شود، رسیدہ خارِ خیال در دلِ ایں آشوب انگیخت کہ بہ راجہ صاحب رام صاحب عرض کردہ شود کہ بہ لکھنؤ بہ وکیل خود را نویسند تا آں نامہ وآں عرضداشت کہ نورد آں قصیدہ آبستنی ست، بوالاخدمت شمار سانند، ذوقِ آرزو طلبی آں چناں بیتابم کرد کہ تا بامداد شکیبا نتوانستم بود، بہ شب نامہ نگاشتم وہم بہ شب خدمتِ راجہ صاحب فرستادم۔"

(کلیاتِ نثرِ غالب ص ۱۷۰)

یہاں اصل موضوع کی طرف آنے سے قبل یہ ذہن نشیں رکھنا ضروری ہے کہ سجان علی خاں غالب کے ان "دوستانِ جدید" میں سے تھے جو لکھنؤ میں ان کے ہم جلیس و ہم نشیں تھے اس لیے لکھنؤ میں موجودگی کے دوران انھیں یکے بعد دیگرے دو شخصوں کی وساطت سے مخاطب کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ جس وقت یہ خط لکھا گیا ہے، اس وقت غالب اور راجہ صاحب

رام دونوں دہلی میں موجود تھے۔ گویا یہ تمام خط و کتابت غالب کے قیامِ دہلی کے زمانے سے تعلق رکھتی ہے اور حقیقتاً دربارِ اودھ سے حصولِ مدعا کی ایک نئی کوشش سے متعلق ہے۔ غالب نے جو قصیدہ مع ایک عرضداشت اور خط کے سبحان علی خاں تک پہنچانے کے لیے راجہ صاحب رام کے وکیل کے پاس لکھنؤ روانہ کیا تھا اور جسے بعد میں منشی محمد حسن خاں کی معرفت "دستورِ اعظم" کی خدمت میں پیش کرنا مناسب سمجھا، وہ دراصل نصیر الدین حیدر اور ان کے وزیر روشن الدولہ کی مدح میں تھا۔ مرزا تفتہ کے نام دوشنبہ ۱۹ اگست ۱۸۶۱ء کے ایک خط میں انھوں نے اس سلسلے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"یہ قصیدہ منشی محمد حسن کی معرفت روشن الدولہ کے پاس اور روشن الدولہ کے توسط سے نصیر الدین حیدر کے پاس گزرا۔ اسی دن پانچ ہزار روپیہ بھیجنے کا حکم ہوا۔ متوسط یعنی منشی محمد حسن نے مجھ کو اطلاع نہ دی۔ مظفر الدولہ مرحوم لکھنؤ سے آئے، انھوں نے یہ راز مجھ پر ظاہر کیا۔ ۔ ۔ ۔ میں نے شیخ امام بخش ناسخ کو لکھا کہ تم دریافت کر کے لکھو کہ میرے قصیدہ پر کیا گزری۔ انھوں نے جواب لکھا کہ پانچ ہزار ملے، تین ہزار روشن الدولہ نے کھائے، دو ہزار منشی محمد حسن کو دیے اور فرمایا کہ اس میں سے جو مناسب جانو، غالب کو بھیج دو۔ کیا اس نے ہنوز تم کو کچھ نہ بھیجا؟ اگر نہ بھیجا ہو تو مجھ کو لکھو۔ میں نے لکھ بھیجا کہ مجھے پانچ روپے بھی نہیں پہنچے۔ اس کے جواب میں انھوں نے لکھا کہ اب تم مجھے خط لکھو، اس کا مضمون یہ ہو کہ میں نے بادشاہ کی تعریف میں قصیدہ بھیجا ہے اور مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ وہ قصیدہ حضور میں گزرا مگر میں نے نہیں جانا کہ اس کا صلہ کیا مرحمت ہوا۔ میں کہ تمنا ہوں، اپنے نام کا خط بادشاہ کو پڑھوا کر ان کا کہا یا ہزار روپیہ ان کے حلق سے نکال کر تم کو بھیج دوں گا۔ بھائی یہ خط میں نے ڈاک میں روانہ کیا، آج خط روانہ ہوا تیسرے دن شہر میں خبر اڑی کہ نصیر الدین حیدر مر گیا۔"

(خطوطِ غالب مرتبہ غلام رسول مہر مطبوعہ لاہور طبع ثالث ص ۴۹۰)

موجودہ معلومات کے مطابق آغا میر سے مایوس ہونے کے بعد دوبارہ دربارِ اودھ سے استمداد کے لیے غالب کی کوششوں کا آغاز پچیس اشعار کے اس تہنیتی قطعے سے ہوتا ہے جو "تاریخِ طوئی کتخدائی بادشاہِ اودھ" کے عنوان سے ان کے کلیاتِ نظمِ فارسی میں شامل ہے۔ ہجری و عیسوی مادہ ہائے تاریخ کے بموجب یہ قطعہ [illegible]ھ مطابق [illegible]ء میں کہا گیا تھا۔ اسی سال "روز تولد جناب امیر علیہ السلام" یعنی رجب کی

تیرہویں تاریخ کو نصیر الدین حیدر کی دوسری شادی ہوئی تھی۔ نامخ کے نام سہ شنبہ ۸ صفر ۱۲۵۱ھ مطابق ۲ جون ۱۸۳۵ء کو لکھے ہوئے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قطعے کو مناسب قدر دانی کی امید کے ساتھ حضور شاہ میں پیش کرنے کی غرض سے غالب نے سبحان علی خاں کی دوستی کا سہارا لیا تھا لیکن عرضداشت موسومہ آغا میر کی طرح ان کی یہ کوشش بھی جس ناکامی سے دوچار ہوئی، اس کا اندازہ اس خط کے ان مندرجات سے کیا جا سکتا ہے۔

"اینچہ در باب پاسخ مکتوب من بزبانِ گہرفشان سبحان علی خاں رقم پذیرفتہ است
نہ چنان است بلکہ حق آن ست کہ خان والاشان بہ گمنامان نپرداخت و التفات بہ خاکسارانِ
ننگ پایہ نخود شناخت ورنہ بشرطِ تامل پنہان نمی تواند ماند کہ مقصود من ہمہ آن بود کہ قطعہ
منظر بندگان خسروی بہ آستان گزر دو بخت از خاکساری و بے اعتباری من گفتہ شود وا اینہا
خود این قدر دشوار نبود۔"

(کلیات نثر غالب ص ۱۰۲، ۱۶۳)

گمان غالب یہ ہے کہ بے التفاتی کے اس مظاہرے اور زمانۂ لکھنؤ کے مایوس کن تجربے کا خیال آنے کے بعد ہی کسی وقت غالب نے شدت کے ساتھ یہ محسوس کیا ہوگا کہ انھوں نے دربارِ اودھ سے کار برآری کے لیے ایک بار پھر سبحان علی خاں کا سہارا لے کر غلطی کی ہے اور اسی کشمکش کے عالم میں انھوں نے بعجلت تمام منشی محمد حسن خاں کے نام وہ خط لکھا ہوگا جس کا اقتباس سطور بالا میں پیش کیا گیا ہے۔ ان حالات میں چہار شنبہ کے دن کسی انگریزی مہینے کی اٹھارہ تاریخ کو لکھا ہوا یہ خط ۱۶ جون ۱۸۳۵ء کے بعد کی تحریر قرار پاتا ہے۔ بعد کے اس زمانے میں نصیر الدین حیدر (متوفی ۲۷ ربیع الآخر ۱۲۵۳ھ مطابق ۷ جولائی ۱۸۳۷ء) کے باقی ماندہ دو سالہ دورِ حکمرانی میں صرف تین مہینے نومبر ۱۸۳۵ء، مئی ۱۸۳۶ء اور جنوری ۱۸۳۷ء ایسے آتے ہیں جن کی اٹھارہ تاریخ چہار شنبہ کے دن واقع ہوئی تھی۔ تقویم ہجری و عیسوی کے مطابق ۱۸ نومبر ۱۸۳۵ء کو رجب ۱۲۵۱ھ کی ستائیسویں، ۱۸ مئی ۱۸۳۶ء کو صفر ۱۲۵۲ھ کی پہلی اور ۱۸ جنوری ۱۸۳۷ء کو شوال ۱۲۵۲ھ کی دسویں تاریخ تھی۔ چونکہ مدحیہ قصاید سلاطین و نوابین کی خدمت میں عموماً عیدین یا اسی قسم کے خوشی کے دوسرے مواقع پر پیش کیے جاتے تھے، اس لیے عین ممکن ہے کہ یہ قصیدہ جشن عید الفطر کے موقعے پر حضورِ شاہ میں پیش کرنے کی غرض سے ماہ رمضان المبارک ۱۲۵۲ھ میں سبحان علی خاں کو بھیجا گیا ہو۔ ان تمام واقعات کا نصیر الدین حیدر کی وفات سے متصل زمانے میں پیش آنا بھی بظاہر اسی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اگر یہ قیاس صحیح ہے تو زیرِ بحث خط کی تاریخ تحریر ۱۸ جنوری ۱۸۳۷ء اور قصیدے کی روانگی کی تاریخ ۱۰ دسمبر ۱۸۳۶ء قرار پائے گی۔ خط کا آغاز غالب نے اس جملے سے کیا ہے "شباہنگام الست

ومن بادلے شرمندہ پیش چراغ کہ نورش از حجرہ بایواں نمی رسد، نگارش ایں ارادت نامہ پیش گرفتہ ام"۔ اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خط ایسے زمانے میں لکھا گیا ہے جب کہ سردی اپنے شباب پر تھی اور کہرے کی وجہ سے چراغ کی روشنی کا حجرے سے ایوان تک پہنچنا مشکل تھا۔ ان تمام شواہد کی روشنی میں یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ منشی محمد حسن خاں کے نام کے زیر بحث خط اور اس میں متذکرہ قصیدے اور عرضداشت کا غالب کے سفر کلکتہ کے زمانے سے کوئی تعلق نہیں۔

ہمیں معلوم ہے کہ ایک ہی قصیدے کو تھوڑے ترمیم و تغیر کے ساتھ مختلف ممدوحین سے منسوب کرنا غالب کے معمولات میں شامل رہا ہے اس لیے یہ بھی ممکن ہے کہ منشی محمد حسن خاں کی معرفت پیش کی جانے والی یہ عرضداشت بھی عرضداشت موسومہ آغا میر کی ترمیم یافتہ شکل ہو اور اس کے آخر میں "دوم محرم الحرام" کا اضافہ اسی نظر ثانی کے وقت کیا گیا ہو۔ اس صورت میں ہمیں اپنے پیش کردہ تمام قرائن اور قیاسات کو نظرانداز کر کے مکتوب موسومہ منشی محمد حسن خاں کی تاریخ تحریر ۱۸ جون ۱۸۳۴ء اور راجہ صاحب الور کے وکیل کی معرفت سبحان علی خاں کی خدمت میں قصیدے اور عرضداشت کی روانگی کی تاریخ ۱۰ مئی ۱۸۳۴ء قرار دینا ہوگی۔ آخر الذکر تاریخ از روئے تقویم یکم محرم ۱۲۵۰ھ سے مطابقت رکھتی ہے۔ رویت میں ایک دن کے فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسے "دوم محرم الحرام" کے مطابق تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ "پنج آہنگ" کے ایک قلمی نسخے (مخزونہ بنارس ہندو یونیورسٹی لائبریری) کے مطابق تاریخ کا یہ اضافہ بہر حال ۲۴ رجب المرجب ۱۲۵۷ھ (۲۲ اگست ۱۸۴۱ء) سے قبل عمل میں آچکا تھا۔[ع۶]

منشی محمد حسن خاں کے نام کے محولہ بالا خط کے سلسلے میں ایک اور غلطی کی نشان دہی بھی ضروری معلوم ہوتی ہے۔ جناب وزیر الحسن عابدی نے اس کی تاریخ تحریر چہارشنبہ ۳ ستمبر ۱۸۲۰ء متعین کی ہے اور اس سے چالیس روز قبل راجہ صاحب الور کے وکیل کے توسط سے بھیجی ہوئی عرضداشت کو عرضداشت موسومہ آغا میر مورخہ دوم محرم الحرام تصور کر کے جمعہ ۴ اگست ۱۸۲۰ء کی تحریر قرار دیا ہے،[ع۷] حالانکہ تقویم کی رو سے ۲ محرم ۱۲۴۴ھ ۶ اگست ۱۸۲۰ء کے مطابق ہے۔ راقم السطور نے "کلیاتِ نثر غالب" کے علاوہ "پنج آہنگ" کے دو قلمی نسخوں میں بھی اس جگہ واضح طور پر "سیزدہم" کی بجائے "ہژدہم" لکھا ہوا پایا ہے۔ چونکہ ۶ اگست سے ۸ ستمبر تک دنوں کی تعداد چونتیس ہو جاتی ہے۔ اس لیے اس خط اور عرضداشت موسومہ آغا میر کو ایک دوسرے سے منسلک قرار دینے اور چھ دن کا یہ فرق دور کرنے کے لیے عابدی صاحب "ہژدہم" کو "سیزدہم" کی تصحیف اور دوم محرم الحرام ۱۲۴۴ھ کو ۴ اگست ۱۸۲۰ء کے مطابق تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے۔ ہجری و عیسوی تاریخوں کی یہ تطبیق بھی اس اعتبار سے ناقص ہے کہ

۴ر اگست سے ۱۲ر ستمبر تک دنوں کی تعداد چالیس کی بجائے اکتالیس ہو جاتی ہے تحقیق میں اس قسم کے تصرفات اور غیر محتاط قیاس آرائیاں اکثر انتہائی گمراہ کن ثابت ہوتی ہیں چنانچہ عابدی صاحب کے ان غلط در غلط مفروضات نے جناب کاظم علی خاں کے لیے ایک نئی شکل پیدا کر دی۔ موصوف کا ارشاد ہے کہ:۔

''سبحان علی کے نام ۔ ۔ ۔ جمعہ ۴ر اگست ۱۸۲۶ء کے مکتوب کے آس پاس ہی غالب نے ۳ر اگست ۱۸۲۶ء مطابق ۲ر محرم ۱۲۴۲ھ کو لکھنؤ میں وزیر اودھ آغا میر کے لیے غیر منقوط فارسی نثر بھی تیار کی تھی۔ یہ مسئلہ تحقیق طلب ہے کہ یہ غیر منقوط نثر اور آغا میر کے لیے عرضی ایک ہی شے ہے یا یہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں''۔ ؎

اگر عابدی صاحب نے یہ وضاحت فرما دی ہوتی کہ انھوں نے تقویم ہجری و عیسوی سے اتفاق نہ کرتے ہوئے ۲ر محرم ۱۲۴۲ھ کو ۴ر اگست ۱۸۲۶ء کے مطابق قرار دیا ہے یا جناب کاظم علی خاں کا ذہن اتفاقاً اس طرف منتقل ہو جاتا تو نہ وہ اس مسئلے سے دوچار ہوتے اور نہ انھیں اس کی تحقیق طلبی کی ضرورت محسوس ہوتی۔

غالب کا سفرِ کلکتہ اور اس کے متعلقات پر تحقیقی یا نیم تحقیقی انداز سے کام کرنے والوں کی مشکلات میں جن تحریروں نے اضافہ کیا ہے ان میں محمد حسن خاں کے نام کا ایک اور خط بھی شامل ہے جو محولہ بالا خط کے معاً بعد لکھا گیا تھا۔ اس خط میں غالب نے اپنے اس مدعا کا اظہار کیا ہے کہ وہ شاہ و وزیر کی اس مدح سرائی کے صلے سے سفرِ کلکتہ کے لیے زادِ راہ فراہم کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ:۔

''فرستادنِ قصیدہ مدحیہ جامع مدح شاہ و وزیر بسیار گراں مایہ عزیمت ہا راشامل است، چہ بے سروسامانی مانع کام جوئی و مدعا طلبی افتادہ۔ راہے کہ در نظر است نے زادِ خواں بریدن۔ چہ دہ خواں پیمودہ بہ منزلِ خواں رسید۔ دست پیش ہر کس بہ گدیہ دراز و کارِ خود از خزینہ جز تو چوں خودے بساز نتواند کرد۔ لاجرم خواستہ ام کہ حلقہ در ایں دستور خسرو بجنبانم۔ بو کہ مرا بجائزہ بادخوانی و صلہ مدح گستری ایں مایہ سامان فراز آید کہ خود را گرد آوردہ بجستہ توانم بردکاہے توانم کرد وقت از دست می رود و ہنگام کار می گذرد۔ اگر دریں نزدیکی تقریبے اندیشیدہ قصیدہ گزاردہ شود، مرحمتے ست سترگ و بخشائشے ست عظیم۔ ۔ ۔'' (کلیاتِ نثرِ غالب ص ۷۰)

دوسرے تمام شواہد اور امکانات کو نظر انداز کر کے ایک تحریر کے کسی خاص حصے کی بنیاد پر فیصلہ کن

نتائج اخذ کرنے والوں کے لیے یہ خط غلط فہمی اور گمراہی کا اچھا خاصا سامان رکھتا ہے۔ چنانچہ بعض حضرات یہ سمجھنے سے قاصر رہے ہیں کہ جس قصیدے کا مقصد کلکتہ کے سفر کے لیے زادِ راہ کی فراہمی ہو، اسے غالب کے معلوم سفرِ کلکتہ سے کس طرح غیر متعلق قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب صرف ایک بار کلکتہ گئے تھے لیکن یہ یقین کرنے کے لیے کافی شواہد موجود ہیں کہ پنشن کے مقدمے میں ابتدائی طور پر ناکام رہنے کے باوجود وہ اس کی پیروی کی غرض سے ایک بار پھر کلکتہ جانا چاہتے تھے۔ جیسا کہ معلوم ہے کہ غالب کو اصل شکایت نواب احمد بخش خاں والیٔ فیروز پور جھرکہ سے تھی جنھوں نے ان کے خیال میں پنشن کی مجموعی رقم کو بطور خود گھٹا کر اور بعض لوگوں کو غلط طور پر مرزا نصراللہ بیگ کے وارثوں میں شامل کر کے انھیں ان کے حصے کی ایک بڑی رقم سے محروم کر رکھا تھا۔ لیکن چونکہ یہ تمام فیصلے لارڈ لیک کی منظوری سے ہوئے تھے، اس لیے ریزیڈنٹ سے گورنر جنرل تک کوئی بھی انگریز حاکم اس معاملے میں ان کا ساتھ نہ دے سکا۔ ۱۸۳۲ء میں جب ولیم فریزر دلی کے ریزیڈنٹ مقرر ہوئے تو انھیں مایوسی کے اندھیروں سے امید کی ایک کرن ابھرتی ہوئی محسوس ہوئی۔ فریزر نواب احمد بخش کے جانشین نواب شمس الدین احمد خاں کی بعض وعدہ خلافیوں کی بنا پر ان کے مقابلے میں ان کے چھوٹے بھائیوں اور احمد بخش کی جائز اولاد نواب امین الدین احمد خاں اور نواب ضیاء الدین احمد خاں سے ہمدردی رکھتے تھے۔ وراثت اور ترکے سے متعلق مابہ النزاع امور میں غالب بھی ان دونوں بھائیوں کے طرفدار تھے۔ عین ممکن ہے کہ وہ ان کی کامیابی کو اپنی کامیابی کی ضمانت یا پیش خیمہ سمجھتے ہوں۔ بہرحال جب فریزر کے حسب ایما ۱۹۳۴ء میں نواب امین الدین احمد خاں اپنا مقدمۂ عدالتِ عالیہ کے سامنے پیش کرنے کے لیے کلکتہ روانہ ہوئے تو غالب خواہش کے باوجود محض اپنی تنگ دستی اور بے بضاعتی کے باعث اس سفر میں ان کا ساتھ دینے سے معذور رہے۔ اپنی اس " واماندگی و بیچارگی " کا انھیں جتنا شدید احساس تھا، اس کا اندازہ مولوی سراج الدین کے نام اس خط کے بعض حصوں سے کیا جا سکتا ہے جو انھوں نے نواب امین الدین احمد کو بغرضِ تعارف لکھ کر دیا تھا۔ اس خط میں انھوں نے لکھا تھا کہ:

" برادر صاحب مشفق نواب امین الدین احمد خاں بہادر . . . . راہماں موج بلا کہ زورقم شکستہ بود، خانہ سیلاب نداداد۔ خونِ دو نایم بگردن کہ دریں سفر از ہمپایئش بازماندم . . . . واماندگی و بے چارگی من ازیں جا تواں سنجید کہ دنداں بر جگر نہم و امین الدین احمد خاں بہادر را در سفر تنہا گزارم . . . . ولطف اینست کہ ہر چند دریں

باب بہ گفتار آرایم و نہ ہنگامہ پوزش آرائم، شرمساری بیشتر گردد و خجلت افزاید۔"

(کلیاتِ نثرِ غالب ص ۱۳۵)

اس سے تقریباً تین سال پہلے وہ ۵ رجمادی الاولیٰ، ۱۲۴۷ھ مطابق ۱۲ راکتوبر ۱۸۳۱ء کو مقدمے میں ناکامی اور دادرسی کی غرض سے دوبارہ حکامِ صدر کی طرف رجوع کے ارادے کا ذکر کرتے ہوئے مولوی صاحب موصوف کو یہ لکھ چکے تھے:

"کارِ من بدادگاہ دہلی ..... تباہی گزید۔ حالیا برآں سرم کہ اگر مرگ اماں دہد بازہماں در رسم و دردِ دل بداں زمزمہ فرو ریزم کہ مرغان ہوا و ماہیانِ دریا را بر خود بگریانم۔"

(کلیاتِ نثرِ غالب ص ۱۴۴)

مولوی سراج الدین احمد کے موسومہ مکتوبات میں سے ایک اور خط سے بھی جو ۱۸۳۴ء میں ایک مشترک دوست مرزا احمد بیگ طپاں کی تعزیت کے سلسلے میں لکھا گیا تھا[۴۹] دوسری بار کلکتے کے سفر کے لیے ان کی اس آمادگی اور اشتیاق کا اظہار ہوتا ہے، لکھتے ہیں کہ

"ہنوز ہنگامِ مردنِ مرزا احمد نبود۔ چرا آں قدر صبر نہ کرد کہ بہ کلکتہ رسیدمے و روئے نظارہ فروزش دیگر بارہ دیدمے۔"

(کلیاتِ نثرِ غالب ص ۱۴۰)

نواب امین الدین احمد خاں جس خاندانی نزاع کے تصفیے کے لیے کلکتے گئے تھے، اس کا فیصلہ ان کے حق میں ہوا۔ چونکہ ان کی اس کامیابی میں ولیم فریزر کی حمایت کو بڑا دخل تھا، اس لیے نواب شمس الدین احمد خاں نے ان سے انتقام لینے کی ٹھان لی اور ایک سازش کے تحت ان کے مصاحبِ خاص اور داروغہ شکار کریم خاں نے ۲۲ مارچ ۱۸۳۵ء کو انھیں گولی مار کر قتل کر دیا۔[۵۰] غالب کے لیے جو اس عالم میں مغلوبیت میں فریزر کو اپنا "مربی" سمجھتے تھے، یہ حادثہ انتہائی پریشان کن ثابت ہوا۔ چنانچہ ناسخ کو ۶ ارجون ۱۸۳۵ء کے خط میں اس واقعے کے اثرات سے مطلع کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"یکے از ستم گرانِ خدا ناترس ..... ولیم فریزر صاحب بہادر را ..... در شب تاریک بضرب تفنگ کشت و مرا غمِ مرگِ پدر تازہ کرد۔ دل از جائے رفت و سرنگِ اندوہ سراپائے اندیشہ را فرو گرفت۔ خرمنِ آرمیدگی پاک بسوخت و نقشِ امید از صفحۂ ضمیر سراسر ستردہ شد۔"

(کلیاتِ نثرِ غالب ص ۱۶۱ و ۱۶۲)

فریزر کے قتل کے بعد اس واقعے کی تفتیش شروع ہوئی اور قتل اور ترغیب قتل کے جرائم کی پاداش میں ۲۶ اگست ۱۸۳۵ء کو کریم خاں کو اور ۸ اکتوبر ۱۸۳۵ء کو نواب شمس الدین احمد خاں کو پھانسی دے دی گئی اور ان کی جاگیر بحق سرکار ضبط کر لی گئی۔ اس صورتِ حال نے غالب کو ایک بار پھر امید افزا خواب دیکھنے کا موقع فراہم کر دیا چنانچہ ناسخ کو ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں کہ:

"جاگیر دارِ فیروز پور بجا تو (؟) کشتہ شد و جاگیر وے در جہ بجا آید پیوند داشت بسر کار ضبط گردید، اما ہنوز حکمے کہ حاوی جمیع مراتب و جامع ہمگی قواعد تواند بود، صدور نیافتہ... من کہ از میانہ آں جاگیر بحکم سرکار انگریزی زرے می یافتم، بجرم ایں فرماں دہاں بامن چہ می کنند۔ ہنوز از منتظرانِ آثار یاوری بختم، صاف ترک اینکہ انچہ جاگیر دارِ فیروز پور بمن می داد، از مقدار بایست کمتر بودہ و بداں قدر از۔ کار قانع نیستم۔"

(کلیاتِ نثرِ غالب ص)

نیشنل آرکائیوز آف انڈیا کے محافظ خانے میں غالب کے مقدمۂ پنشن کے جو کاغذات محفوظ ہیں، ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حالات کی اس تبدیلی کے بعد انھوں نے پنشن کی رقم میں اضافے اور کئی برسوں کے زرِ بقایا کی وصولی کے لیے اپنی کوششیں تیز کر دی تھیں۔ دسمبر ۱۸۳۶ء کو انھوں نے اپنی ایک درخواست میں گورنر جنرل کو لکھا تھا کہ ان کا مقدمہ یا تو باقاعدہ سماعت کی غرض سے صدر دیوانی عدالت کلکتہ کے سپرد کر دیا جائے یا اس کے تمام کاغذات آخری فیصلے کے لیے بادشاہ سلامت بہ اجلاسِ کونسل کے حضور میں ارسال کر دیے جائیں۔ اس پس منظر میں دوبارہ کلکتے کے سفر کے لیے غالب کی آمادگی میں کسی شبہے کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ منشی محمد حسن خاں کے نام کے دوسرے خط میں انھوں نے اسی متوقع سفرِ کلکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

لکھنؤ کے زمانۂ قیام کے واقعات و معاملات سے متعلق مختلف غلط بیانیوں اور غلط فہمیوں کی اس تصحیح و تردید کے بعد ہمیں غالب کے ساتھ کلکتے تک اپنا سفر جاری رکھنے کے لیے ایک بار پھر کان پور کی طرف لوٹنا ہوگا۔ رائے چھجمل کے نام کے خط کے حوالے سے یہ بات ہمارے علم میں آچکی ہے کہ غالب ۲۶ ذی قعدہ ۱۲۴۲ھ مطابق ۲۲ جون ۱۸۲۷ء کو لکھنؤ سے روانہ ہو کر ۲۹ ذی قعدہ مطابق ۲۵ جون کو کانپور پہنچے تھے۔ اسی خط میں انھوں نے رائے صاحب کو یہ اطلاع بھی دی تھی کہ:

ایں جا (کان پور) تو سہ مقام گزیدہ رہگراے باندامی شوم، دراں جا چند روز آرمیدہ اگر خدامی خواہد و مرگ اماں می دہد، بہ کلکتہ می رسم۔"

(کلیاتِ نثرِ غالب ص ۱۵۹)

کان پور میں دو تین روز قیام کے بعد باندہ کے لیے ارادۂ سفر سے متعلق اس بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ غالب جولائی ۱۸۲۶ء کے پہلے ہفتے میں وہاں پہنچ چکے ہوں گے۔ کان پور اور باندہ کا درمیانی فاصلہ نوے میل یا ایک سو چوالیس کلومیٹر یعنی لکھنو اور کانپور کی درمیانی مسافت (۴۵ میل یا ۷۲ کلومیٹر) سے دوگنا ہے۔ ان کی معلوم رفتار سفر کے پیش نظر اس فاصلے کے طے کرنے میں زیادہ سے زیادہ آٹھ روز صرف ہوئے ہوں گے۔ باندہ کی طرف سفر کے محرکات، وہاں قیام کی مدت اور آئندہ سفر پر روانگی کے متعلق محولہ سابق عرضی دعویٰ میں انہوں نے لکھا ہے کہ:

"میرے بزرگوں اور نواب ذوالفقار علی خاں بہادر کے باہمی پرانے تعلقات تھے۔ . . . یہاں میں تقریباً چھ مہینے تک نواب صاحب کے مکان پر رہا۔ خدا کے کرم اور نواب صاحب کی ہمدردی، تیمارداری اور توجہ سے مجھے اس خطرناک بیماری سے نجات ملی۔

اب بارشیں ختم ہو چکی تھیں اور نواب گورنر جنرل بہادر بھی کلکتے مراجعت فرما چکے تھے۔ میں فیروزپور سے تو دلی نہیں جا سکتا تھا، اب باندے سے کیسے اور کیونکر اس کی جرأت کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے خیال کیا کہ آخر دلی اور کلکتے دونوں جگہ قانون تو وہی ایک ہے۔ مجھے سارا معاملہ حکومت کے انصاف پر چھوڑ دینا چاہیے چونکہ کشتی سے سفر کرنے کی میری مقدرت نہیں تھی، مجبوراً مجھے خشکی کے راستے گھوڑے کی سواری سے کلکتے جانا پڑا۔"

غالب کے اس بیان کو اگر ان کے اس پچھلے بیان سے کہ "لکھنو کی آب و ہوا مجھے بالکل راس نہیں آئی۔" ملا کر دیکھا جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ باندے کے سفر کی اصل غرض و غایت آب و ہوا کی تبدیلی تھی اور کلکتے جانے کا خیال باندہ پہنچنے کے بعد پیدا ہوا۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ کلکتے کے سفر کا منصوبہ پہلے ہی بنایا جا چکا تھا اور باندے کے اس سفر کی زحمت محض زادِ راہ کی فراہمی کی غرض سے اٹھائی

گئی تھی چنانچہ محمد علی خاں (صدر امین باندہ) کے نام کلکتے سے لکھے ہوئے ایک خط میں بروز جمعہ، ۸ ذی الحجہ ۱۲۴۳ھ مطابق ۲۰ جون ۱۸۲۸ء کو تحریر کیا گیا تھا، انہوں نے واضح طور پر اس بات کا اقرار کیا ہے کہ :-

> چوں در باندا رسیدم ' دو ہزار روپیہ از نواب وام خواستم ...... و پارۂ از بایستنی ہائے زمستاں گرد آوردم و بادیہ فرسایان بہ کلکتہ رسیدم ۔[۴۴]

(نامہ ہائے فارسی غالب ص ۴۱)

غالب باندہ سے کلکتہ کے لیے بقول خود "بارشیں ختم ہونے کے بعد" روانہ ہوئے تھے۔ برسات کا موسم بالعموم ستمبر کے مہینے کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ گورنر جنرل یقیناً اس سے بھی پہلے کلکتے واپس پہنچ چکے ہوں گے کیونکہ ۲ جولائی ۱۸۲۷ء کو میرٹھ پہنچے اور وہاں چند روز قیام کرنے کے بعد ہی ان کا سفر مراجعت شروع ہو گیا تھا۔ بہر صورت جولائی ۱۸۲۷ء کے پہلے ہفتے سے ستمبر کے اواخر یا اکتوبر کے اوائل تک شمار کرنے کی صورت میں قیام باندہ کی مدت کسی طرح تین ماہ سے متجاوز نہیں ہو سکتی' اس لیے ان کا یہ بیان کہ وہ چھ مہینے تک باندہ میں مقیم رہے' یکسر خلافِ واقعہ ہے۔ ہماری تحقیق کے مطابق غالب نے کلکتے کا یہ سفر برسات کے موسم کے اختتام کی بجائے آغاز زمستاں یعنی نومبر کے مہینے میں شروع کیا تھا۔ بنارس سے روانگی کی تاریخ' وہاں قیام کی مدت اور باندہ سے بنارس تک مرحلہ وار قطع منازل سے متعلق خود ان کے بیانات کی روشنی میں ہمارا اندازہ یہ ہے کہ وہ نومبر ۱۸۲۷ء کے دوسرے ہفتے میں اس سفر پر روانہ ہوئے تھے اور تقریباً پچیس میل (چالیس کلومیٹر) کی مسافت طے کر کے پنجشنبہ ۱۵ نومبر کو موداہا پہنچے تھے۔[۴۵] موداہا میں انہوں نے یکشنبہ ۱۸ نومبر تک آرام کیا دوشنبہ ۱۹ نومبر کو وہاں سے روانہ ہو کر آئندہ شب ایک گاؤں میں بسر کی اور سہ شنبہ ۲۰ نومبر کو چلہ تارا پہنچے۔ ارادہ یہ تھا کہ چلہ تارا کی کارواں سرائے میں ایک رات گزار کر دوسرے دن فتحپور کے لیے روانہ ہو جائیں گے لیکن جس "ارھیا" (بیل گاڑی) میں موداہا سے چلہ تارا تک کا فاصلہ طے کیا تھا، وہ انتہائی سست رفتار تھی' اس لیے اسے چھوڑ کر ایک کشتی کرایے کی اور دریا کے راستے الٰہ آباد کی طرف روانہ ہو گئے۔ ملاحوں کی یقین دہانی کے مطابق یہ سفر تین دن میں طے ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن اس میں چھ دن سے زیادہ صرف ہوئے اور یہ کشتی ساتویں روز یعنی سہ شنبہ ۲۷ نومبر کو الٰہ آباد پہنچی۔ یہ شہر غالب کے لیے خلافِ توقع انتہائی دہشت خیز اور تکلیف دہ ثابت ہوا۔ یہاں نہ انہیں حسب ضرورت کوئی دوا دستیاب ہوئی اور نہ کوئی "متاعِ شائستہ" میسر آ سکی۔ نہ دمِ دمساز نہ آشرم و حیائے بیگانہ اور بہر جوئیں

محبت و مروت سے بے بہرہ نظر آئے ۔ حتیٰ کہ ان کے نزدیک اس "وادیِ ہولناک" کو شہر کہنا "ناانصافی" اور اس "دام گاہ غول" میں آدم زاد کا قیام کرنا "بے حیائی" قرار پایا ۔ چنانچہ انہوں نے اس "خرابہ" میں ایک شب بدرجۂ مجبوری اس طرح بسر کی جیسے کوئی قیدی قید خانے میں رات گزارتا ہے، اور دوسرے روز یعنی ۲۸ نومبر کو علی الصباح کشتی کے ذریعے بنارس کے لیے روانہ ہو گئے ۔ یہ سفر انہوں نے بقول خود اس سے بھی زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ طے کیا تھا جس رفتار سے ہوا سطح آب سے گزرتی ہے، اس لیے ہمارا اندازہ یہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ دسمبر ۱۹۲۷ کی پہلی تاریخ تک بہرحال بنارس پہنچ گئے ہوں گے ۔ بنارس کی فضا اور یہاں کی آب و ہوا ان کے لیے جنت نگاہ اور سرمایۂ نشاط ثابت ہوئی حتیٰ کہ بیماری کے اثرات یکسر زائل ہو گئے اور جسم و جاں میں توانائی اور فرحت کی ایک نئی رو دوڑتی ہوئی محسوس ہونے لگی ۔ یہاں کے مناظر میں دل فریبی کی وہ شان نظر آئی کہ رنج مسافرت اور غم غربت کی کاوشیں فراموش ہو گئیں اور اہتزاز و سرخوشی کے وفور نے وہ رنگ جمایا کہ وطن کی یاد اور دلی کا تصور طاق نسیاں کی زینت بن گیا ۔ یہاں تک کہ اگر ایک اہم مقدمہ درپیش اور شماتتِ اعدا سے دل ریش نہ ہوتا تو وہ بقول خود گنگا کے کنارے فقیروں کی طرح دھونی رما کر بیٹھ جاتے اور خود کو "گرد آلائش ہستی" سے پاک کر لیتے ۔ مولوی محمد علی خاں صدر امین باندہ کے نام جس خط میں غالب نے بنارس کے متعلق اپنے ان تاثرات کا اظہار کیا ہے، وہاں پہنچنے کے ایک ہفتے بعد لکھا گیا تھا ۔ اس درمیان میں وہ پانچ روز سرائے نیرنگ آباد معروف بہ نورنگ آباد (کذا ۔ اورنگ آباد) میں قیام کے بعد اسی محلے میں ایک کرایے کے مکان میں منتقل ہو چکے تھے ، اور اس "ہفتہ بہ غفلت بسر رفتہ" کو شامل کر کے یہاں مجموعی طور پر چار ہفتے قیام کا ارادہ رکھتے تھے تاکہ آگے سفر شروع کرنے سے پہلے ضروری دواؤں اور موسم سرما کی مناسبت سے مزید سامان آسایش کا بندوبست کر لیا جائے ۔ مکتوب الیہ موصوف کے نام اگلے خط میں جو اس خط کا جواب الجواب ہے ، اس میعادِ قیام و سفر میں کسی تبدیلی کی طرف اشارہ کیے بغیر لکھتے ہیں کہ :

> "امروز کہ آدینہ و بقول جمعے نہم ماہ و بہ اظہار گروہے دہم ست، در بند بر بستن رخت سفرم ۔ اگر شب بخیر گذشت و وجود معدوم راجع بہ عدمیت اصلی خود نگشت، فردا بروز شنبہ از بنارس می پویم ۔"
>
> (کلیات نثر غالب ص ۱۰۰)

بعد کی معلوم تاریخوں کو نظر میں رکھ کر تقویم کی جانب رجوع کرنے سے پتا چلتا ہے کہ اس خط میں متذکرہ نویں یا دسویں تاریخ ماہ جمادی الاخریٰ ۱۲۴۳ھ کے علاوہ کسی اور مہینے کی نہیں ہوسکتی۔ تقویم ہجری و عیسوی کے مطابق اس روز دسمبر ۱۸۲۷ء کی اٹھائیسویں تاریخ تھی۔ گویا غالب ۱۰ یا ۱۱ رجمادی الاخریٰ ۱۲۴۳ھ مطابق ۲۹ دسمبر ۱۸۲۷ء کو بنارس سے کلکتے کی طرف روانہ ہوئے تھے۔ عرضی دعویٰ پنشن کے مطابق چونکہ کشتی سے سفر کرنے کی مقدرت نہیں تھی، اس لیے بدرجۂ مجبوری یہ طویل مسافت خشکی کے لیے گھوڑے کی سواری سے کرنا پڑی۔ مولوی محمد علی خاں کے نام محولہ بالا خط میں اس ضمن میں رقم طراز ہیں کہ:

> "نہفتہ نماند کہ ناخدایان خدا ناشناس بنارس در باب کشتی مضایقہ کردند، چہ بہرکہ برخوردم، تا کلکتہ کم از صد روپیہ نطلبید و تا پٹنہ افزون از بست روپیہ نخواست۔ ناچار بہمان اسپ سوارہ تا بان لقعۂ صحرا خواہم پیمود و ہنوز ہوائے کشتی از سر بدر نرفتہ۔ در پٹنہ نیز جستجو خواہم نمود۔"
>
> (کلیاتِ نثرِ غالب ص ۱۶۵ و ۱۶۶)

چار سو چار سو میل کا یہ طویل سفر پورے ترپن دن میں طے کر کے مرزا صاحب شنبہ ۴ شعبان ۱۲۴۳ھ مطابق ۱۹ فروری ۱۸۲۸ء کو "شدتِ بردلیالی" سے "افسردہ و رنجور" اور "تالم گردشِ ایام" سے "تمر رسیدہ و نالاں" کلکتے پہنچے۔ اگرچہ ان کی کسی تحریر سے اس کا سراغ نہیں ملتا تاہم خیال یہ ہے کہ اس درمیان میں انھوں نے دم لے کر آگے بڑھنے کے لیے وقفۂ ماندگی کے طور پر کم از کم پٹنہ اور مرشد آباد میں ضرور قیام کیا ہوگا۔ کلکتے میں وہ جمعہ ۳ رصفر ۱۲۴۵ھ مطابق ۱۴ اگست ۱۸۲۹ء تک قیام پذیر رہے۔ کوئی ڈیڑھ برس کی اس مدت میں انھوں نے اپنے مقدمے کی پیروی کے پہلو بہ پہلو ادبی محاذ پر اپنی انفرادیت اور امتیاز کا لوہا منوانے میں بھی کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ اس سلسلے کے بیشتر واقعات اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ ہماری ادبی تاریخ میں محفوظ ہیں۔ "نامہ ہائے فارسی غالب" کی اشاعت کے ساتھ مقدمے کے سلسلے کی بعض گم شدہ کڑیاں بھی دریافت ہو چکی ہیں۔ کلکتے سے روانگی کے متعلق غالب نے ۸ اگست ۱۸۲۹ء کے ایک خط میں کہا ہے کہ میں کل بروز شنبہ ۱۵ اگست کو ورنہ یکشنبہ یا دوشنبہ کو بہرحال یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔ دہلی سے کلکتے تک کے سفر میں ایک گھوڑا، ایک سائیس، ایک جرکٹا، تین ذاتی خدمتگار اور ایک کہار مرزا صاحب کے ساتھ تھے۔ کلکتے پہنچنے کے بعد جب معاملات طول کھینچتے ہوئے نظر آئے

تو انہوں نے (۱۶ ربیع الثانی ۱۲۴۴ھ مطابق ۲۶ اکتوبر ۱۸۲۸ء سے قبل) گھوڑا ڈیڑھ سو روپے میں فروخت کر دیا اور سائیس اور چرکٹے کو چھٹی دے دی [۱] اس لیے واپسی کے سفر کا بڑا حصہ کشتی کے ذریعے طے ہوا۔ اگست کے وسط میں کلکتے سے روانہ ہو کر وہ جمعہ یکم جمادی الاول ۱۲۴۵ھ مطابق ۳۰ اکتوبر ۱۸۲۹ء کو باندہ پہنچے [۲] اور چند روز وہاں قیام کرنے کے بعد یکم جمادی الثانی مطابق ۲۹ نومبر کو یکشنبہ کے دن اس طرح دلی میں وارد ہوئے جیسے کوئی بچہ "دبستاں" میں اور قیدی "زنداں" میں پہنچتا ہے [۳]۔ اس کے بعد غالب کو شدید خواہش اور اشتیاق کے باوجود پھر کبھی کلکتے جانے کا موقع نہیں ملا لیکن اس شہر کے "سبزہ زار ہائے مطرّا" اور "بتانِ نازنین و خود آرا" کی یاد جس طرح انہیں تا عمر تڑپاتی رہی، اس کا اندازہ اس قطعے سے کیا جا سکتا ہے جو اس شعر سے شروع ہوتا ہے۔

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں !
اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

حواشی

[۱] بحوالہ "مقدمۂ پنشن کا عرضی دعویٰ" از مالک رام مشمولہ "فسانۂ غالب" ص ۱۰۱ تا ۱۰۳

[۲] "نامہ ہائے فارسی غالب" میں شامل مولوی محمد علی خاں صدر امین باندہ کے نام کے پہلے خط سے واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا فضل حق کے نام یہ خط سفر مشرق کے آغاز سے قبل "در مبادی بسیج سفر مشرق، قیام فیروز پور کے زمانے میں لکھا گیا تھا۔ (ص ۱۰) لیکن "کلیاتِ نثر غالب" میں اس خط کی یہ پس نوشت کہ "چوں سر رشتۂ سرکار بزبانے باز بستہ است، دراں کشایش از بند نتو نم بدر جست بیخودی گریبانم گرفت و بازم بہ دہلی آورد" (ص ۶۴) اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ یہ اس سے پہلے کے سفر کے زمانے سے متعلق ہے۔ خط کے مشتملات اور "نامہ ہائے فارسی غالب" میں شامل مکتوب موسومہ محمد علی خاں کی قدامت کے پیش نظر ہمیں ان مختلف فیہ بیانات میں سے پہلا بیان زیادہ قرینِ صحت معلوم ہوتا ہے

[۳] ابن حسن خاں کے نام کا یہ خط سہ ماہی "اردو ادب" علی گڑھ کے جولائی ۱۹۵۰ء کے شمارے میں شائع ہو چکا ہے۔ "فسانۂ غالب" حاشیہ ص ۱۰۲

۳ے تحقیق نوادر ص ۲۰۹

۴ے غالب کا قیام لکھنؤ — تحقیق کی روشنی میں، مشمولہ ہفتہ وار "ہماری زبان" مورخہ یکم مارچ ۲۰۰۵ء

۵ے نامہ ہائے فارسی غالب ص ۱۲

۶ے بحوالہ "غالبیات کے چند مباحث" از ڈاکٹر ابو محمد سحر ص ۲۰۵

۷ے غالب ص ۱۱۰ بحوالہ ہفتہ وار "ہماری زبان" شمارہ محولہ بالا ص ۲

۸ے ذکر غالب ص ۶۰ و ۶۱ بحوالہ ہفتہ وار "ہماری زبان" شمارہ محولہ بالا ص ۲

۹ے غالب کا قیام لکھنؤ "ہماری زبان" شمارہ محولہ بالا ص ۲

۱۰ے ایضاً مضمون محولہ صدر ص ۱

۱۱ے اس قطعہ تاریخ کے آخری چند اشعار یہ ہیں۔

اسد اللہ خاں کہ خوانندش ۔۔۔ در سخن غالب لطیف سگال
بہ ادائے گزارشِ تاریخ ۔۔۔ ریخت بر گوشہ بساط لآل
بہ ترتیب ایں ہمایوں جشن ۔۔۔ کہ بہ خسرو خجستہ باد بہ فال
زد رقم "بزم عشرتِ پرویز" ۔۔۔ ویں کہ گفتم بود ز روئے وصال
ور تو خواہی کہ آشکار شود ۔۔۔ نقشِ اندازۂ مسیحی سال

"سایۂ بختِ بادشاہ" نویس
واں گہش برفزائے "جشنِ کمال"

ڈاکٹر اکبر حیدری لکھتے ہیں کہ غالب نے یہ قطعہ تاریخ ۱۲۴۴ھ میں لکھا تھا۔ یہ سنہ انہوں نے "بزم عشرت پرویز" سے حاصل کیا ہے جو ان کے نزدیک اس جشن کا مادۂ تاریخ ہے۔ (تحقیق نوادر ص ۱۴۱) لیکن یہ خیال درست نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نصیر الدین حیدر کی دوسری شادی ۱۲۵۰ھ مطابق ۱۸۳۵ء میں ہوئی تھی اور اس قطعے کے دونوں مادہ ہائے تاریخ سے بھی یہی دونوں سنہ برآمد ہوتے ہیں۔ سنہ ہجری "بزم عشرت پرویز" میں "روئے وصال" یعنی واو کے چھ عدد شامل کرنے کے بعد اور سال مسیحی "سایہ بخت بادشاہ" کے اعداد (۱۳۹۱) میں "جشن کمال" کے چار سو چوالیس اعداد کے اضافے کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

۳۰؎ تواریخ اودھ از سید کمال الدین حیدر جلد اول ص ۳۳۰

۳۱؎ "پنج آہنگ" کا یہ قلمی نسخہ گنگا پرشاد نامی کاتب نے "بموجب فرمائش نواب صاحب والا مناقب انور الدولہ محمد شمس الدین (کذا) حسن خان بہادر" بمقام شاہجہان آباد چہارم ماہ رجب المرجب ۱۲۵۷ھ ۲۲ اگست ۱۸۴۱ء کو لکھ کر مکمل کیا تھا۔

۳۲؎ "پنج آہنگ" طبع لاہور ۱۹۶۹ء بحوالہ "ہماری زبان" شمارہ محولہ صدر ص ۷

۳۳؎ عبدالغفور نساخ کے مطابق مرزا احمد بیگ طپاں کی وفات ۱۸۳۴ء کا واقعہ ہے۔ سخن شعراء ص ۳۰۲

۳۴؎ اس سلسلہ کی تفصیلات کے لیے مالک رام صاحب کا مضمون "نواب شمس الدین احمد خاں" مشمولہ "فسانۂ غالب" (ص ۹۰ تا ۱۰۵) دیکھا جا سکتا ہے۔

۳۵؎ "مجموعۂ نثر غالب کا مقدمہ نثر" از خواجہ احمد فاروقی مشمولہ "چراغ رہ گذر" ص ۴۶

۳۶؎ یہاں سے اور اس سے آگے مختلف مقامات پر غالب کے ورود اور وہاں سے روانگی کی تاریخیں "نامہ ہائے فارسی غالب" میں شامل خطوط نمبر ۲ (ص ۱۶)، نمبر ۳ (ص ۱۷ و ۱۸) اور نمبر ۴ (ص ۲۰ و ۲۱) کی مدد سے متعین کی گئی ہیں۔ ان خطوں میں غالب نے صرف آمد، قیام اور روانگی کے دنوں کا ذکر کیا ہے۔ تاریخوں اور مہینوں کا تعین بنارس میں قیام کی مدت اور وہاں سے روانگی کے متعلق ان کے بیانات پر مبنی ہیں۔

۳۷؎ نامہ ہائے فارسی غالب ص ۲۶ یہ مجموعہ جس مخطوطے پر مبنی ہے، اس کے مطابق غالب نے اس خط میں ورود کلکتہ کی تاریخ "سہ شنبہ چہارم شعبان" تحریر کی تھی۔ مرتب مجموعہ جناب اکبر علی ترمذی نے تقویم ہجری و عیسوی سے عدم مطابقت کی بنا پر ان کے اس بیان کو رد کر کے متن کتاب میں "سہ شنبہ" کو "چہار شنبہ" بنا دیا ہے۔ اس حیرت انگیز ستم ظریفی (اور اس کا اعادہ انھوں نے بار بار کیا ہے) کے نتیجے میں غالب کے کلکتہ پہنچنے کی تاریخ ۲۰ فروری کی بجائے ۲۱ فروری ہو گئی ہے (مقدمہ بزبان انگریزی ص ۲۲ و توقیت سفر کلکتہ ص ۲) جو یقیناً غلط ہے۔ مالک رام صاحب نے اس سے ایک قدم اور آگے بڑھ کر ۴ شعبان مطابق ۱۹ فروری کا واقعہ قرار دیا ہے۔ (توقیت غالب مشمولہ فسانۂ غالب ص ۱۶)

۳۸؎ نامہ ہائے فارسی غالب ص ۱۷

۲۲ ایضاً ص ۴۴ و ۴۵

۲۳ ایضاً ص ۹۰ و ۹۱ بحوالہ مکتوب موسومہ علی اکبر خاں طباطبائی مرقومہ از باندہ بتاریخ ۸ جمادی الاول روز چہار شنبہ

۲۴ ایضاً ص ۹۲۔ غالب نے علی اکبر خاں طباطبائی کے نام کے اس خط میں اپنے ورود کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے کہ "یکم جمادی الثانی روز یکشنبہ کو دک بہ دبستاں و قیدی بہ زنداں و غالب مستہام بہ وطن رسید۔" اس کے برخلاف ایک دوسرے موقعے پر لکھتے ہیں کہ "یکشنبہ دوم جمادی الثانی سعی آوارگی در زاویۂ دلی پاے بدامن کشید۔" (کلیاتِ نثرِ غالب ص ۵۴) تاریخ کے اس فرق کو خواہ سہوِ قلم پر مبنی تصور کیا جائے، خواہ اختلافِ رویت پر، بہر دو صورت یکشنبہ کی قید برقرار رہنے کی بنیاد پر عیسوی تاریخ (۲۹ نومبر) سے اس کی مطابقت میں کوئی فرق واقع نہ ہوگا۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ

غالبؔ کا جذبۂ حبّ الوطنی اور سنہ ستّاون

مرزا غالبؔ سنہ ستاون کے ہنگامہ میں شروع سے آخر تک دہلی میں رہے۔ اس زمانے کے حالات ۱۱ مئی، ۱۸۵۷ء[1] سے ۳۱ جولائی ۱۸۵۸ء[2] تک انہوں نے اپنی فارسی کتاب دستنبو میں لکھے ہیں۔ ہنگامہ کے دنوں میں غالب پر جو گزری' اس کا ذکر دستنبو کے علاوہ ان کے خطوط میں بھی ملتا ہے جو نسبتاً زیادہ آزادی اور بے باکی سے لکھے گئے ہیں۔ غالب کی وطن دوستی یا انگریزوں کے تئیں ان کے سچے جذبات معلوم کرنے کے لیے صرف دستنبو کے بیانات پر نظر رکھنا کافی نہیں۔ بلکہ غالب کی شخصیت' ان کے مزاج اور ان کے مخصوص حالات کو جاننا بھی ضروری ہے نیز وہ خطوط اس بارے میں بے حد اہم ہیں جو انہوں نے اپنے خاص خاص دوستوں کو لکھے تھے اور جن میں ان کا پیمانۂ دل بے تابانہ چھلک گیا ہے۔

۲

مرزا غالبؔ ہنگامہ سنہ ستاون میں عیال سمیت اپنے گھر میں رہے[3]۔ ایک خط میں لکھتے ہیں "میں مع زن و فرزند ہر وقت اس شہر میں قلزم خوں کا شناور ہوں۔ دروازہ سے باہر قدم نہیں رکھا۔ نہ پکڑا گیا، نہ نکالا گیا، نہ قید ہوا، نہ مارا گیا[4]"۔ لیکن دہلی پر انگریزوں کا دوبارہ تصرف ہو جانے کے بعد غالبؔ پر پے در پے مصیبتیں نازل ہونا شروع ہوئیں۔ اس وقت وہ محلہ بلّی ماران میں حکیم محمد حسن خاں کے مکانات میں رہتے

تھے ۔ فتح شہر کے بعد پانی وغیرہ کا سلسلہ بھی بند ہو گیا اور دو دن بے آب و نان بسر کرنا پڑے۔ تیسرے روز حکیم محمود خاں کے خاندانی مکانوں کی حفاظت کرنے کیلئے مہاراجہ پٹیالہ کے بھیجے ہوئے سپاہی آ پہنچے اور ان کی وجہ سے مرزا کا گھر تو لوٹ سے بچ گیا۔ لیکن جو قیمتی سامان اور زیورات ان کی بیگم نے حفاظت کے خیال سے میاں کالے صاحب کے تہہ خانے میں رکھوائے تھے، انہیں فتح مند فوج نے لوٹ لیا۔ چند گورے غالب کے گھر میں بھی آ داخل ہوئے اور انہیں گرفتار کر کے کرنل برن کے سامنے پیش کیا جو قریب ہی حاجی قطب الدین سوداگر کے گھر میں مقیم تھے ۔ باز پرس ہوئی۔ زندگی باقی تھی کہ مرزا بچ گئے۔

ادھر ۲۱ ستمبر کے لگ بھگ کچھ فوجی ان کے بھائی مرزا یوسف کے گھر میں گھس گئے اور سب کچھ لے گئے ۔ مرزا یوسف تیس سال کی عمر سے دیوانے تھے ۔ ۱۹ اکتوبر کو مرزا یوسف کا بوڑھا ملازم خبر لایا کہ مرزا یوسف پانچ دن کے مسلسل بخار کے بعد رات کو گزر گیا۔ اس وقت نہ کفن کا کپڑا مل سکتا تھا، نہ غسال میسّر تھا اور نہ گور کن۔ غالب کے ہمسایوں نے ان کی بے کسی پر رحم کھایا اور پٹیالہ کے سپاہیوں میں سے ایک کو ساتھ لے جا کر مرزا یوسف کی تجہیز و تکفین کی۔

غدر کے دوران میں غالب کے دوستوں، عزیزوں اور شاگردوں میں سے کئی قتل ہوئے، کئی انگریزوں کے معتوب ٹھہرے، اور کئی خانماں برباد دلی سے نکل گئے۔ امام بخش صہبائی کو گولی مار دی گئی، محمد حسین آزاد کے والد محمد باقر بھی گولی کا نشانہ بنے ۔ مولوی فضلِ حق خیر آبادی کو کالے پانی کی سزا ہوئی ۔ شیفتہ کو حبس ہفت سالہ کا حکم سنایا گیا۔ صدر الدین آزردہ کی ملازمت موقوف اور جائداد ضبط ہو گئی ۔ نواب ضیاء الدین اور نواب امین الدین دلی پر انگریزوں کے غلبے کے بعد لوہارو کے لیے روانہ ہوئے، ابھی مہرولی تک ہی پہنچے تھے کہ لٹیروں نے لوٹ لیا۔ ادھر دلی میں ان کا گھر تاراج ہوا اور تقریباً بیس ہزار روپے کی مالیت کا کتب خانہ لٹ گیا۔ مرزا کا فارسی اور اردو کلام ان کے ہاں جمع ہوتا تھا وہ بھی ضائع ہو گیا۔ مظفر الدین حیدر خاں اور ذوالفقار الدین حیدر خاں (حسین مرزا) پر اس سے بھی بڑھ کر گذری ۔ نہ صرف ان کے گھروں پر جھاڑو پھر گئی بلکہ پردوں اور سائبانوں میں ایسی آگ لگی کہ گھر کا گھر پھنک گیا۔ یوسف مرزا کو خط لکھتے ہوئے ان مصیبتوں کا ذکر یوں کیا ہے :-

" میرا حال سوائے میرے خدا اور خداوند کے کوئی نہیں جانتا ۔ آدمی کثرتِ غم سے سودائی ہو جاتے ہیں۔ عقل جاتی رہتی ہے ۔ اگر اس ہجومِ غم میں میری قوت

تنفکرہ میں فرق آگیا ہو تو کیا عجب ہے بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے۔ پوچھو کہ غم کیا ہے، غمِ مرگ، غمِ فراق، غمِ رزق، غمِ عزت۔ غمِ مرگ میں قلعۂ نامبارک سے قطع نظر کر کے اہلِ شہر کو گنتا ہوں، مظفر الدولہ، میر ناصر الدین، مرزا عاشور بیگ میرا بھانجا، اس کا بیٹا احمد مرزا انیس برس کا بچہ، مصطفےٰ خاں ابن اعظم الدولہ، اس کے دو بیٹے ارتضیٰ خاں اور مرتضیٰ خاں، قاضی فیض اللہ، کیا میں ان کو اپنے عزیزوں کے برابر نہیں جانتا تھا۔ اے لو بھول گیا۔ حکیم رضی الدین خاں، میر احمد حسین میکش، اللہ اللہ! ان لوگوں کو کہاں سے لاؤں۔"[۱۵]

ایک اور خط میں لکھتے ہیں۔

"یہ کوئی نہ سمجھے کہ میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں۔ انگریز کی قوم میں سے جو ان روسیاہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے، اس میں کوئی میرا امیدگاہ تھا اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست، کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد۔ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز، کچھ دوست، کچھ شاگرد، کچھ معشوق، سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو اس کو زیست کیونکر نہ دشوار ہو۔ ہائے اتنے یار مرے کہ جو اب میں مروں گا تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہو گا۔"[۱۶]

دستنبو میں غالب لکھتے ہیں:

"دریں ماتم آورجا درد۔ . . . اگر جز گرستن بہ نگرستن سری داشتہ باشد، روزنِ دیدہ بخاک انباشتہ باد جز روز سیاہ ہیچ نیست کہ گویم دیدہ آن دید و برش دید ازیں پندار، روز سیاہ خود چیزی است کہ در تاریکی آں ہیچ نتواں دید۔ . . . ازیں درہائے دارو مگزین، و زخم ہائے مرہم مپذیر، آں می بایدم اندیشید، کہ من مردہ ام۔"[۱۷]

۲

شخصی صدموں اور چند دوسری وجہوں سے غالب غدر کو اچھے لفظوں میں یاد نہیں کرتے

تھے۔ دستنبو میں غالب نے غدر کی جی بھر کے مذمت کی ہے۔ انہوں نے غدر کی تاریخ "رستخیزِ بیجا" سے نکالی تھی[18] دستنبو میں انہوں نے انگریزوں کے خلاف لڑنے والے اپنے ہم وطنوں کو "نمک حرام" "خبیث و آوارہ" "بندہ ہائے بے خداوند" "سیاہ باطن" "بے رحم قاتل" "گمراہ باغی" "سیہ کار رہزن" اور "سیاہ رو جنگ جو" کے خطابات سے یاد کیا ہے[19] میرٹھ کی فوج کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"بخت برگشتہ و سرگشتہ چند از سپاہ کینہ خواہ میرت (میرٹھ) بشہر در آمدند، ہمہ بی آزرم و شور انگیز و بخدا وند کشی تشنۂ خونِ انگریز..." [20]

ایک اور جگہ لکھا ہے:

"... دلی کہ خون باد.... و دتی کہ برباد...." [21]

لیکن یہ تصویر کا صرف ایک رخ ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں کہ غالب نے دستنبو میں غدر کی مخالفت اور باغیوں کی جی بھر کے مذمت کی ہے بلکہ انگریزوں کی مدح و ستائش کا بھی کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ غالب نے انہیں "حاکمانِ عادل" "اخترِ تابندہ" "شیر دل فاتحین" "پیکرِ علم و حکمت" اور "خوش اخلاق و نیک نام حاکم" کہہ کر یاد کیا ہے[22] اس سلسلے میں دستنبو کے یہ اقتباسات ملاحظہ ہوں:

"ہندیان دامنِ دادگران از دست دادند و در شکنجۂ دامِ ہمدمی دوان افتادند۔" [23]

"داد آنست کہ آرامش جز در آئینِ انگریز آئین ہای دگر چشم داشتن کوری است" [24]

"ہر کہ گردن از فرماندہان بپیچد سرش در خود کفش است... جہانیان راسزد کہ با خداوندان بختِ خداداد، بہ خوشنودی سر فرود آرند و برون فرمانِ جہانداران را پذیرفتنِ فرمانِ جہان آفرین نگارند۔" [25]

غدر کے بعد دلی کے جو حالات تھے، جس طرح جگہ جگہ پھانسیاں لگی ہوئی تھیں اور جس طرح باشندگانِ دہلی کے قتل و خون کا بازار گرم تھا،[26] ان حالات میں غالب سے بغاوت کی موافقت یا انگریزوں کی مخالفت کی توقع تو نہیں کی جا سکتی۔ لیکن غالب نے جس طرح بڑھ چڑھ کر انگریزوں کی مدح و ستایش کی ہے وہ خاصی معنی خیز ہے۔ آخر ایسی کیا بات تھی کہ غالب اس درجہ تعریف پر مجبور تھے؟ اس سوال کے جواب میں مندرجہ ذیل حالات کا علم دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

۱۸۵۵ء میں غالب نے ملکہ وکٹوریہ کی تعریف میں ایک فارسی قصیدہ لکھ کر لارڈ کیننگ کی معرفت ولایت بھجوایا تھا۔ اس کے ساتھ ایک عرضداشت تھی کہ روم اور ایران کے بادشاہ شاعروں پر بڑی بڑی مہربانیاں کرتے ہیں، اور اگر برطانیہ کی ملکہ مجھے خطاب، خلعت اور پنشن سے سرفراز کرے تو بڑی عنایت ہوگی۔ غالب کو جنوری ۱۸۵۷ء میں لندن سے جواب ملا کہ درخواست پر تحقیق کے بعد حکم صادر ہوگا۔[۲۶] اس جواب کو پاکر مرزا "کوئین پوئٹ" ہونے کا خواب دیکھ رہے تھے کہ تین ماہ بعد غدر ہوگیا۔

غدر کے ایام میں ایک جاسوس گوری شنکر نے انگریزوں کو خفیہ اطلاع دی کہ ۱۸ر جولائی، ۱۸۵۷ء کو جب بہادر شاہ نے دربار کیا تو مرزا غالب نے سکہ کہہ کر گزرانا۔[۲۷] چنانچہ امن قائم ہونے کے بعد جب غالب نے پنشن اور دربار بحال کیے جانے کے لیے سلسلہ جنبانی کی تو انہیں صاف صاف کہا گیا کہ وہ غدر کے دنوں میں باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے اور اس بنا پر ان کی پنشن اور دربار موقوف رہا۔ عبدالغفور سرور کو لکھتے ہیں۔

"سکہ کا وار تو مجھ پر ایسا چلا جیسے کوئی چھرا یا کوئی گراب،
کس کو کہوں، کس کو گواہ لاؤں۔"[۲۸]

اس الزام میں جو سکہ غالب سے منسوب کیا جارہا تھا:

بزر زد سکۂ کشور ستانی
سراج الدین بہادر شاہ ثانی

اس کے بارے میں غالب کا خیال تھا کہ اسے ذوق نے ۱۸۳۷ء میں بہادر شاہ کی تخت نشینی کے موقع پر کہہ کے پیش کیا تھا۔[۲۹] اس لیے غالب دوستوں سے ۱۸۳۷ء کے اخبار اور خصوصاً "اردو اخبار" مانگتے تھے۔[۳۰] یہ اخبار محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر کا تھا، جن کے ذوق سے گہرے مراسم تھے اور ذوق کے کہے ہوئے سکے کا اس اخبار میں ملنا یقینی تھا۔ یوسف مرزا کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

وہ دلی اردو اخبار کا پرچہ اگر مل جائے تو بہت مفید مطلب ہے، ورنہ خیر کچھ محل خوف و خطر نہیں ہے۔ حکام صدر ایسی باتوں پر نظر نہ کریں گے۔ میں نے سکہ کہا نہیں؟ اگر کہا تو اپنی جان اور حرمت بچانے کو کہا۔ یہ گناہ نہیں اور اگر گناہ ہے بھی تو کیا ایسا سنگین ہے کہ ملکۂ معظمہ کا اشتہار بھی اس کو نہ مٹا سکے۔ سبحان اللہ! گولہ

انداز کا بارود بنانا اور توپیں لگانی اور بنک گھر اور میگزین کا لوٹنا معاف ہوجائے اور شاعر کے دو مصرعے معاف نہ ہوں۔[۳۲]

یہاں اصل بیان صرف اتنا نہیں کہ " میں نے سکہ کہا نہیں" جیسا کہ مالک رام کا خیال ہے[۳۳] ۔ بلکہ اس کا دوسرا حصہ یعنی "اگر کہا تو اپنی جان اور حرمت بچانے کو کہا" اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ پہلا حصہ۔ اور اس کے بعد کے تمام جملے اعتبار کا اندازہ رکھتے ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان جملوں سے غالب کے دل کا چور صاف ظاہر ہے اس امر کا قوی امکان ہے کہ غالب نے سکہ کہا تھا اور اسے بہادر شاہ کے حضور میں پیش بھی کیا تھا۔ ایک سکہ کا ذکر جیون لال نے اپنے روزنامچہ میں کیا ہے۔ اس روزنامچہ کا انگریزی ترجمہ مٹکاف نے کیا تھا اور خواجہ حسن نظامی نے اسے مع ایک اور روزنامچہ کے انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرکے "غدر کی صبح و شام" کے نام سے شایع کیا تھا۔ جیون لال نے ۱۹ مئی ۱۸۵۷ء کے دربار کا ذکر کرتے ہوئے جہاں دوسرے کئی شاعروں کے سکے نقل کیے ہیں، وہاں غالب کا سکہ درج کرتے ہوئے بجائے ان کا پورا نام لکھنے کے محض "مرزا نوشہ" لکھنے پر اکتفا کی تھی۔ مٹکاف غالباً اس نام سے واقف نہیں تھا اس کے انگریزی ترجمے میں یہ نام حذف ہوگیا۔ خواجہ حسن نظامی نے چونکہ انگریزی ترجمے سے ترجمہ کیا تھا۔ یہ نام ان کے ترجمے میں بھی موجود نہیں۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے جیون لال کا قلمی روزنامچہ لندن میں تلاش کیا۔ اس میں مرزا نوشہ یعنی غالب سے منسوب یہ سکہ شعر یوں ہے۔

بزرِ آفتاب و نقرۂ ماہ
سکہ زد در جہاں بہادر شاہ

البتہ گوری شنکر نے غالب سے جو سکہ منسوب کیا تھا:

بزر زد سکۂ کشور ستانی
سراج الدین بہادر شاہ ثانی

وہ غالب کا نہیں تھا۔ مالک رام نے صادق الاخبار کے حوالے سے حتمی طور پر ثابت کیا ہے کہ یہ سکہ حافظ غلام رسول ویران تلمیذ ذوق کا تھا۔

اگرچہ جو سکہ غالب سے منسوب کیا جا رہا تھا، وہ غالب کا نہ تھا، لیکن غالب اس الزام سے اپنی بریت ثابت نہ کرسکے۔ قلعہ کی تنخواہ تو گئی ہی تھی پنشن اور دربار کے معاملہ میں بھی زک اٹھانی پڑی

دستنبو میں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"دیرین پنشن سرکار انگریزی را سر رشتۂ بازیافت گم است، بفرد ختن آس
گستردنی و پوشیدنی جان و تن ہمی پرورم، گوئی دیگراں نان میخورند و من جامہ
ہمی خورم، ترسم کہ چون پوشیدنی ہمہ خوردہ باشم، در برہنگی از گرسنگی مُردہ باشم۔" [۲۲]

اس وقت غالب کی سب سے بڑی ضرورت پنشن کا اجرا تھا اور یہ انگریزوں کو اپنی وفاداری کا یقین دلائے بغیر ممکن نہ تھا۔ اس کے لیے فتح دہلی کے بعد غالب نے ملکۂ وکٹوریہ کی تعریف میں ایک فارسی قصیدہ لکھا جس میں انگریزوں کو فتح ہند کی مبارک دی گئی تھی۔ غالب نے اُسے حکام بالا کو بھجوایا۔ جواب ملا کہ چیف کمشنر کے ذریعہ بھجوایا جائے۔ غالب نے ایسا کیا۔ اس پر جواب ملا جس خط میں تہنیت کے سوا کچھ نہیں ہے، اس کے بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے۔ [۲۳] یہ جواب بڑا دل شکن تھا۔ ان حالات میں جو کام قصیدوں سے نہ ہو سکا، غالب نے اسے دستنبو سے لینا چاہا۔ ہرگوپال تفتہ کو جس کی نگرانی میں دستنبو چھپ رہی تھی۔ غالب ایک خط میں لکھتے ہیں:

اس تحریر (دستنبو) کو جب دیکھو گے تب جانو گے ..... ایک جلد نواب گورنر جنرل
بہادر کی نذر بھیجوں گا اور ایک جلد بذریعہ ان کے جناب ملکۂ معظمہ انگلستان کی نذر
کروں گا اب سمجھ لو کہ طرز تحریر کیا ہوگی۔ [۲۴]

اس بیان سے ظاہر ہے کہ دستنبو کی طباعت بعض مصلحتوں کے پیش نظر تھی۔ دلی پر باغیوں کا قبضہ کچھ اوپر چار ماہ رہا۔ غالب نے اس کا ذکر صرف پانچ چھ صفحوں میں کیا ہے۔ بیشتر محققین اس بات پر متفق ہیں کہ مرزا نے ان ایام کے حالات شروع میں تفصیل سے لکھے ہوں لیکن فتح دہلی کے بعد ان کی اشاعت مناسب نہ سمجھی ہو۔ دستنبو دراصل صاحبان انگلستان کو نذر کرنے کے لیے چھپوائی گئی تھی جس کا سبب بقول غالب یہ تھا: "سائل محکمۂ ولایت کو یاد دہی کرتا ہے اور گورنمنٹ سے تحسین طلب ہے۔" [۲۵]

دستنبو میں غالب نے ملکۂ وکٹوریہ والا فارسی قصیدہ (شمار یافت، روزگار یافت) بھی شامل کر دیا اور آخر میں اپنی خواہش کو صاف الفاظ میں یوں ظاہر کیا:

"کاش دربارۂ آن خوشہای سہ گانہ بہ نام مہر خوان، وسرا پای، و ماہانہ،

چناں کہ ہم دریں نگارش ازآں گزارش آگہی دادہ ام و اینک چشم نگراں بداں دوختہ
و دل پُر اُمید بداں نہادہ ام ....

دستنبو میں غالب نے بہادر شاہ ظفر کا جس کے وہ وظیفہ خوار تھے اور اُستاد بھی تھے سرے سے نام ہی نہیں لیا۔ شہزادوں کا ذکر کیا ہے، لیکن سرسری طور پر۔ اور تو اور فضل حق خیرآبادی اور صدرالدین آزردہ کا بھی (جنھوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کے فتویٰ پر دستخط کیے تھے اور جس کی پاداش میں فضل حق خیرآبادی کو کالے پانی کی سزا ہوئی تھی، اور آزردہ کی ملازمت موقوف اور جائداد ضبط کر لی گئی تھی) جو دونوں غالب کے گہرے دوست تھے، غالب نے ان کا ذکر نہیں کیا، اور اگر کیا تو صرف حکیم احسن اللہ خاں کا جو انگریزوں سے ملے ہوئے تھے اور جن کا نام غداروں کی فہرست میں سب سے اوپر تھا!

دستنبو کا یہ پہلو بھی دل چسپی سے خالی نہیں کہ غالب نے غدر کی ساری ذمہ داری "نمک حرام" سپاہیوں اور "خبیث و آوارہ" ہندوستانی فوجیوں پر ڈالی ہے اگرچہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ہندوستانیوں نے اپنی ضایع ہوتی ہوئی سلطنت کو بچانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی۔ غالب نے دہلی کے گرد و نواح کے سات حکمرانوں اور لکھنؤ، بریلی، مرادآباد، گوالیار، اور فرخ آباد کے مجاہدوں کی کوششوں کا ذکر خاصی تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ لیکن غدر کی ذمہ داری وہ حکمراں طبقے یا طبقۂ اشرافیہ پر ڈالنے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھے شاید اس لیے کہ خود اُن کا تعلق طبقۂ اشرافیہ سے تھا۔

۳

اس مقالہ کے باقی حصہ میں اب ہم اس سوال کو لیں گے کہ غدر کے بارے میں غالب کا اصل رویّہ کیا تھا؟ کیا واقعی وہ انگریزوں کی حکومت کو ہندوستان کے لیے نعمت سمجھتے تھے اور جس طرح اُن کے ہم وطنوں نے ملک اور قوم کی آزادی کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی، غالب اُسے اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے اور ان سے انھیں کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ اس سوال سے بحث کرتے ہوئے غالب کی سیرت کو بھی نظر میں رکھنا ضروری ہے۔ غالب سچے معنوں میں مغل تھے جو بقول محمد اکرام "ناسازگار حالات میں نیزہ بردار بن جاتا ہے، لیکن شہید ہونے سے گھبراتا ہے"۔ غالب کی طبیعت کا تمام رجحان خیال پرستی نہیں بلکہ واقعیت پرستی کی طرف تھا، یہ بات ان کی وراثت، ماحول، حالاتِ زندگی اور ادوار

فارسی کلام کو سامنے رکھنے سے بخوبی صاف ہو جاتی ہے۔ مرزا ترک نسل سے تھے اور ان کی رگوں میں وہی خون موجزن تھا جو مغل بادشاہوں کی رگوں میں تھا۔ چنانچہ جاہ و جلال اور ثروت و حشمت کی خواہش اُن کی گھٹی میں پڑی تھی۔ گو قدرت سے انہیں یہ چیزیں میسر نہ آئیں لیکن جہاں تک بن پڑا انہوں نے انہیں نبھانے کی کوشش کی۔ وہ شروع ہی سے وضعداری اور ذاتی وجاہت کے قائل تھے اس کے لیے انہوں نے سفر بھی کیے، دکھ بھی سہے اور مقدمے بھی لڑے۔ ان کا ظرف بڑا تھا اور بقدر حسرت بادہ پانے کی تمنا ساری عمر رہی۔ بقول خود وہ "شہد کی مکھی" بننے کے خلاف تھے "مصری کی مکھی" ہونے کی تلقین کیا کرتے تھے[45]

غالب کی نظر انگریزوں کے علم و آئین اور داد و دانش پر ضرور تھی، لیکن اس کے ساتھ ہی ان کی نظر مستقبل پر بھی تھی۔ مرزا کی جاگیر حکومت انگلشیہ کا عطیہ تھی۔ بہادر شاہ اور قلعے کی محفلوں کو وہ چراغ سحری سمجھتے تھے[46] اس سے انہیں کوئی گہری وابستگی نہ تھی۔ اس کے برعکس کئی انگریزوں مثلاً اسٹرلنگ، میجر جان کوب، سر جان میکلوڈ، مٹکاف اور ٹامس سے اُن کے مخلصانہ تعلقات تھے۔ وہ نہ صرف انگریزوں کے مداح تھے بلکہ انگریزی آئین کو بھی مغلیہ نظام پر ترجیح دیتے تھے چنانچہ جب سرسید نے آئین اکبری کی تصحیح کر کے مرزا کی رائے طلب کی تو انہوں نے جو مثنوی لکھی، اس میں بجائے تعریف کے تعریض کا پہلو نمایاں تھا۔ اس لیے سرسید نے اسے کتاب کے ساتھ شایع نہ کیا۔ نیز غدر سے دو سال پہلے جب فیصلہ ہوا کہ بہادر شاہ کے بعد شاہی سلسلہ ختم ہو جائے گا تو غالب نے بھی اپنے مستقبل کو انگریزوں سے وابستہ کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ چنانچہ ملکۂ وکٹوریہ کی تعریف میں لارڈ کیننگ کی معرفت ولایت بھجوایا گیا فارسی قصیدہ اسی کا نتیجہ تھا۔

غدر سے کچھ پہلے انگریزوں کی غاصبانہ کارروائیوں کے خلاف ملک میں نفرت اور بے چینی کی جو لہر اونچی اٹھ رہی تھی، غالب اس سے بے خبر نہ تھے اس سلسلے میں غالب کے ان خطوں کا ذکر ضروری ہے جو انہوں نے نواب یوسف علی خاں والی رامپور کو لکھے تھے اور بعد میں غالب کی ہدایت پر چاک کر دیے گئے تھے۔ مکاتیب غالب میں ۱۵ فروری ۱۸۵۷ء کا خط موجود ہے لیکن اس کے بعد غالب نے نواب رام پور کو ۸ مارچ ۱۸۵۷ء کو جو خط لکھا تھا اس کے بارے میں مرتب مکاتیب غالب کا بیان ہے خط میں صرف اس کا لفافہ شامل ہے اور اس کی پشت پر تحریر ہے۔ حسب الحکم چاک نمودہ شد[47]

عرشی صاحب نے مزید لکھا ہے: "میرزا صاحب نے یکم اپریل ۱۸۵۷ء کو ایک اور عریضہ ارسال کیا تھا.... مثل میں اس کا بھی صرف لفافہ شامل ہے اور اس کی پشت پر تحریر ہے: عرضی از دست مبارک چاک شدہ"..... حواشی مکاتیب غالب میں عرشی صاحب نے نواب رامپور کا ۲۳ مارچ ۱۸۵۷ء کا وہ خط بھی نقل کیا ہے جس میں انہوں نے غالب کو یقین دلایا تھا کہ ان کے لکھنے کے مطابق ان کا خط ضائع کر دیا گیا "صحیفۂ مسرت آگیں... شعر رسید رقیمۃ الوداد واینکہ صحائف شرائف عبارت اُردو بعد ملاحظہ چاک شدہ باشند..... وصول نشاط شمول گردیدہ..... مشفقا حسب الارقام سامی صحیفہ موصوفہ بعد استفادۂ مضمونش چاک نمودہ شد و آئندہ ہم دربارۂ ہمچو مکاتیب تعمیل ایمای سامی ملحوظ خواہد ماند"۔

ظاہر ہے کہ یہ خط و کتابت بصیغۂ راز تھی اور ایسے تمام خطوط غالب کے حسب ہدایت چاک کر دیے گئے۔ اس ہدایت کی کیا وجہ ہو سکتی تھی؟ عرشی صاحب کا خیال ہے "اس ہدایت کی وجہ بجز اس کے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتی کہ ان تحریروں کا مضمون سیاسیات سے متعلق تھا"۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے غلام رسول مہر کی کتاب پر حواشی لکھتے ہوئے ان خطوں کے بارے میں لکھا ہے کہ دلی میں غدر سے دو ماہ پہلے پولیٹیکل انقلاب اور فوجی بغاوت کے چرچے شروع ہو گئے تھے اور عجب نہیں کہ مرزا غالب نے ان امور کی طرف لکھا ہو اور اس لیے احتیاط متقاضی ہو کہ یہ خطوط چاک کر دیے جائیں۔

ابھی رامپور سے یہ خط و کتابت ہو رہی تھی کہ غدر کی آگ بھڑک اٹھی۔ غالب نے بہ تقاضائے ہوش مندی ہنگامہ کے دوران میں قلعہ والوں سے برابر بنائے رکھی۔ اُن کا یہ بیان کہ غدر کے دنوں میں انہوں نے آنا جانا موقوف کر دیا اور دروازے سے باہر قدم نہیں رکھا صحیح نہیں۔ جیون لال نے اپنے روزنامچے میں ۱۲ جولائی کے دربار کا ذکر کرتے ہوئے واضح طور پر لکھا ہے کہ مرزا نوشہ اور مکرم علی خاں نے آگرہ میں انگریزوں پر فتح پانے کی خوشی میں قصاید پڑھ کر سنائے۔ آگرہ کے اخبار عالمتاب کی سند بھی موجود ہے کہ غدر کے دوران میں غالب قلعہ میں قصیدے پڑھتے رہے۔ نیز اگرچہ جو سکہ غالب سے منسوب کیا جا رہا تھا وہ ان کا نہیں تھا، لیکن کم از کم جیون لال کی شہادت موجود ہے کہ غالب نے سکہ کہا تھا۔ اور وہ دربار آتے جاتے رہے تھے۔ غدر سے پہلے غالب کا

انگریزوں کا طرف دار رہنا، غدر کے دوران میں ان کا قلعہ والوں سے بنائے رکھنا اور فتح دہلی کے بعد فتح مند انگریزوں کا ساتھ دینا ایک اور صرف ایک بات کو ظاہر کرتا ہے وہ یہ کہ غالب انتہائی "واقعیت پسند" انسان تھے، اور بدلے ہوئے حالات کا رخ دیکھ کر اپنی منفعت کے لیے اقدام کرنا چاہتے تھے۔ یہ بات بھی نظر میں رہنی چاہیے کہ غدر سے چند ہی ماہ قبل غالب ریاست رامپور سے وابستہ ہوئے تھے۔ یہ ریاست غدر میں باغیوں کے خلاف انگریزوں کی حامی و مددگار رہی تھی۔ چنانچہ غالب کو مسلسل یہ خطرہ لگا ہوا تھا کہ اگر ان کے خلاف ذرا سا بھی شبہ ہو گیا تو رام پور سے تعلقات منقطع ہونے سے ان کے کام بند ہو جائیں گے۔ اسی لیے تو غدر کے بعد رام پور سے مراسلت کرتے ہوئے غالب نے سب سے زیادہ زور اسی بات پر دیا کہ غدر میں وہ گوشہ گیر رہے اور انگریزوں کے دل و جان سے خیر خواہ ہیں نیز غدر کے دوران اپنی مصلحتوں کے پیش نظر انہوں نے جو روش اختیار کی تھی، نواب رام پور کے نام ۱۴ر جنوری ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں اس کا اعتراف صاف الفاظ میں کیا ہے۔

غالب نے غدر کو برے لفظوں سے اسی لیے یاد کیا ہے کہ علاوہ دوسری مصیبتوں کے اس کی وجہ سے ان کے مستقبل کا نقشہ بگڑ گیا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اپنے ہم وطنوں کا یا ہندوستان کا درد ان کے دل میں نہیں تھا، دستنبو میں ایک جگہ اپنے خاص بالواسطہ اسلوب میں کہا ہے:

"دلست سنگ و آہن نیست چرا نسوزد چشم است رخنہ در روزن نیست
چون نگرید آری ہم بداغ مرگ فرماند ہاں باید سوخت، وہم بر ویرانی ہندستان باید گریست"

لیکن غدر اور انگریزوں سے متعلق ان کے اصل رویہ کے پیے دبے ہیں، ان کے خطوں سے رجوع کرنا چاہیے جو رازداری میں دوستوں کو لکھے گئے ہیں۔ ان میں کسی مصلحت کا دباؤ نہیں اور دل کی بات بڑی حد تک زبان پر آگئی ہے۔

غدر سے چند ماہ پہلے اودھ کے الحاق کے بارے میں ایک دوست کو خط لکھتے ہوئے کہتے ہیں۔ "اب ملاحظہ فرمائیں ہم اور آپ کس زمانہ میں پیدا ہوئے؟ .... تباہی ریاست اودھ نے باآنکہ بیگانۂ محض ہوں، مجھ کو اور بھی افسردہ کر دیا۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ سخت نا انصاف ہوں گے وہ اہل ہند جو افسردہ دل نہ ہوئے ہوں گے۔"

جب غالب کو معلوم ہوا کہ مہاراجہ الور کو پورے اختیارات کے ساتھ بحال کیا جا رہا ہے تو غالب جو جبر کے عقیدے میں یقین رکھتے تھے، ایک خط میں طنزیہ لکھتے ہیں:

"تمام عالم کا ایک سا عالم ہے۔ سنتے ہیں کہ نومبر میں مہاراجہ کو اختیار ملے گا، مگر وہ اختیار ایسا ہوگا جیسا خدا نے خلق کو دیا ہے۔ سب کچھ اپنے قبضۂ قدرت میں رکھا، آدمی کو بدنام کیا ہے۔"

غدر کے بعد انگریزوں نے ہندوستانیوں پر جو مظالم ڈھائے تھے، غالب کو اُن کا احساس تھا۔ اپنے ہم وطنوں کی پامالی اور شہر کی ویرانی کا جو تذکرہ غالب کے ہاں ملتا ہے بڑا ہی دردناک ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس سلسلے میں انہوں نے دلی کے بعض دوسرے شعراء کی طرح کوئی شہر آشوب یا طویل نظم نہیں کہی لیکن اُن کے خطوط میں دلی اور اہلِ دلی کی تباہی اور بربادی کی جو اہم تفصیل ملتی ہے، غدر کا کوئی بھی مورخ اُسے نظرانداز نہیں کر سکتا۔ پھر بھی مرزا کے خطوں میں انگریزوں کی زیادتیوں اور سختیوں کی طرف بڑے معنی خیز اشارے ملتے ہیں۔ اگرچہ انہوں نے یہ تمام حالات ڈر ڈر کے لکھے ہیں۔ پھر بھی ان خطوں میں بہت کچھ لکھ دیا ہے:

"یہاں کا حال سُن لیا کرتے ہو۔ اگر جیتے رہے اور ملنا نصیب ہوا تو کہا جائے گا، ورنہ قصہ مختصر، قصہ تمام ہوا۔ لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔"

۲۶ دسمبر ۱۸۵۷ء کے ایک خط میں حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں:

"انصاف کرو، لکھوں تو کیا لکھوں، کیا کچھ لکھ سکتا ہوں یا لکھنے کے قابل ہے... بس اتنا ہی ہے کہ اب تک تم ہم جیتے ہیں، زیادہ اس سے نہ تم لکھو گے، نہ میں لکھوں گا۔"

میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں:

"اگر زندگی ہے اور پھر مل بیٹھیں گے تو کہانی کہی جائے گی۔"

۹ جنوری ۱۸۵۸ء میں حکیم غلام نجف خاں کو پھر لکھتے ہیں:

"جو دم ہے غنیمت ہے، اس وقت تک مع عیال و اطفال جیتا ہوں۔ بعد گھڑی بھر کے کیا ہو، کچھ معلوم نہیں۔ قلم ہاتھ میں لیے پر جی بہت کچھ لکھنے کو چاہتا

ہے مگر کچھ لکھ نہیں سکتا۔ اگر مل بیٹھنا قسمت میں ہے تو کہہ لیں گے ورنہ انا للہ وانا الیہ راجعون"[۱۶]

ایک اور خط میں لکھا ہے :

"میں جس شہر میں ہوں اس کا نام بھی دلی اور اس محلہ کا نام بلی ماروں کا محلہ ہے لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا۔ مبالغہ نہ جاننا امیر غریب سب نکل گئے۔ جو رہ گئے تھے وہ نکالے گئے . . . گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں"[۱۷]

ایک خط میں ان مصیبتوں کو جو غدر میں اہل دہلی پر گذریں، ایک ایک کر کے گنایا ہے۔ ایک سطر انگریزوں کے مظالم میں بھی ہے لیکن دیکھئے کہ کتنی شدت اور بے باکی سے حقیقت کا اظہار کیا ہے:

"پانچ لشکر کا حملہ پے درپے اس شہر پر ہوا۔ پہلا باغیوں کا لشکر اس میں اہل شہر کا اعتبار لٹا، دوسرا لشکر خاکیوں کا، اس میں جان و مال و ناموس و مکان و مکین و آسمان و زمین و آثار ہستی سراسر لٹ گئے . . ."[۱۸]

فتح شہر کے بعد دہلی میں سرکار کے حکم سے جو مکانات ڈھائے گئے ان کے متعلق میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں :

"مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازہ تک بلا مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں وہ اگر اٹھ جائیں تو ہو کا مکان ہو جائے۔"

"قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا اور اب جو کنوئیں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہو گیا، تو صحرا صحرائے کربلا ہو جائے گا۔ اللہ اللہ دلی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہتے ہیں۔ واہ رے حسن اعتقاد، بندۂ خدا، اردو بازار نہ رہا۔ اردو کہاں، دلی کہاں! واللہ اب شہر نہیں، کیمپ ہے، چھاونی ہے۔ نہ قلعہ نہ شہر نہ بازار نہ نہر"[۱۹] ایک اور خط میں لکھتے ہیں :

"بھائی کیا پوچھتے ہو، کیا لکھوں۔ دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر ہے قلعہ، چاندنی چوک ہر روز مجمع جامع مسجد کا، ہر ہفتہ سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا، یہ پانچوں باتیں اب نہیں پھر کہو دلی کہاں ...... ہاں کوئی شہر قلمرو ہند

میں اس نام کا تھا۔[۲۵]

علاؤالدین احمد خاں کو لکھتے ہیں:

"اے میری جان یہ وہ دلی نہیں جس میں تم پیدا ہوئے ہو، وہ دلی نہیں ہے۔۔ جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے۔ وہ دلی نہیں ہے جس میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں ۔۔۔۔ ایک کیمپ ہے۔۔۔ معزول بادشاہ کے ذکور جو بقیۃ السیف ہیں وہ پانچ پانچ روپیہ مہینہ پاتے ہیں۔ اناث میں سے جو پیر زن ہیں وہ کٹنیاں اور جوانیں کسبیاں ہیں[۲۶]"

قدیم تمدن کے مٹنے اور ایک سلطنت کے معدوم ہو جانے کا نقش غالب کے دل پر گہرا تھا۔ تفتہ کی سنبلستان ابھی نہیں چھپی تھی۔ اُسے دیکھتے ہی بے اختیار کہہ اُٹھے:

"اس کاپی کی مثال جب تم پر کھلتی کہ تم یہاں ہوتے اور بیگمات قلعہ کو پھرتے چلتے دیکھتے۔ صورت ماہ دو ہفتہ کی سی اور کپڑے میلے، پائنچے لیرلیر، جوتی ٹوٹی۔[۲۷]"

مولوی عزیز الدین خاں کو ایک خط میں دلی کے اجڑنے کی داستان یوں بیان کی ہے:

"صاحب، دلی کو ویسا ہی آباد جانتے ہو جیسی آگے تھی۔ قاسم جان کی گلی ۔۔۔۔ بے چراغ ہے۔ ہاں آباد ہے تو یہ ہے کہ غلام حسین خاں کی حویلی ہسپتال ہے اور ضیاء الدین خاں کے کمرے میں ڈاکٹر صاحب رہتے ہیں اور کالے صاحب کے مکانوں میں ایک اور صاحب عالیشان انگلستان تشریف رکھتے ہیں ۔۔۔۔۔۔ لال کنوئیں کے محلہ میں خاک اڑتی ہے۔ آدمی کا نام نہیں۔[۲۸]"

عبدالغفور سرور کو لکھتے ہیں:

"بڑے بڑے نامی، خاص بازار اور اردو بازار اور خانم کا بازار کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبہ تھا، اب پتہ بھی نہیں کہ کہاں تھے۔ صاحب امکنہ اور دکانیں نہیں بتا سکتے کہ ہمارا مکان کہاں اور دکان کہاں تھی۔ برسات بھر مینہ نہیں برسا۔ اب تیشہ و کلند کی طغیانی سے مکانات گر گئے۔ غلہ گراں ہے، موت

ارزاں ہے، میوے کے مول اناج بکتا ہے۔"[۵۵]

انگریزوں نے بعض امرا کی حویلیوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ غالب نے اسے ایک جگہ "شیر زور اور پیل تن بندر کی زیادتی" سے تعبیر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"واہ رے بندر! یہ زیادتی اور شہر کے اندر۔"[۵۶]

یہاں انگریزوں کو بندر کہنا لطف سے خالی نہیں! یہ صحیح ہے کہ غالب کے ہاں وطن پرستی کا وہ تصور نہیں ہے جو بعد میں سیاسی اور تاریخی حالات کے تحت از مغرب کے اثر سے انیسویں صدی کے اواخر میں پیدا ہوا۔ وطنیت کا یہ تصور اس قدر نیا ہے کہ غالب سے اس کی توقع رکھنا عبث ہے۔ ہاں اگر اپنے تہذیب و تمدن سے محبت کرنا، اپنے ہم وطنوں سے ہمدردی رکھنا اور ان کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھنا وطن پرستی کہا جا سکتا ہے تو غالب بھی وطنیت کے اس جذبے سے عاری نہ تھے۔ اُن کے خطوط سے ان کے نہاں خانۂ دل کے جو راز ہم پر ظاہر ہوئے ہیں، اُن میں ایک یہ بھی ہے کہ دلی اور دلی والوں کی بربادی کا انہیں گہرا دکھ تھا۔ غدر کے بعد مسلمانوں پر جو شدت روا رکھی گئی تھی، اس کا انہیں دلی صدمہ تھا اور ایسی شکایتوں سے ان کے خط بھرے ہوئے ہیں۔[۵۷] جنوری ۱۸۵۹ء میں دلی میں ہندوؤں کے آباد ہونے کا حکم ہو گیا تھا لیکن مسلمانوں کو ایک مدت تک شہر میں رہنے کی اجازت نہ تھی۔ بعد میں حکم ہوا کہ جو مسلمان حاکم شہر کی مرضی کے مطابق جرمانہ ادا کرے اور ٹکٹ حاصل کرے، وہ شہر میں داخل ہو سکتا ہے۔ دیکھیے، انگریزوں کی اس غاصبانہ کارروائی پر مرزا کیسا گہرا طنز کرتے ہیں:

"جو مسلمان شہر میں اقامت چاہے، بقدر مقدور نذرانہ دے۔ اس کا اندازہ قرار دینا حاکم کی رائے پر ہے۔ روپیہ دے اور ٹکٹ لے۔ گھر برباد ہو جائے، آپ شہر میں آباد ہو جائیے۔"[۵۸]

غدر کے بعد مسلمانوں پر مصائب اور آلام کے جو پہاڑ ٹوٹے تھے۔ غالب نے وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا چنانچہ اس قطعے میں جو انہوں نے دلی کی تباہی سے متاثر ہو کر نواب علاؤالدین احمد خاں علائی کو ایک خط میں لکھا تھا، مسلمانوں کی زبوں حالی کا خاص طور پر ذکر کیا ہے:

بس کہ فعالِ ما یرید ہے آج — ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے — زہرہ ہوتا ہے آب، انساں کا

چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے — گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک — تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک — آدمی واں نہ جا سکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا — وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ — سوزش داغہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کیا کیے باہم — ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے یارب — کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا[۱۵]

غرض غدر سے متعلق غالب کا اصلی رویہ معلوم کرنے کے لیے دستنبو سے نہیں بلکہ ان کے خطوط سے رجوع کرنا چاہیے۔ دستنبو کو زیادہ سے زیادہ غالب کا پوری محنت سے تیار کیا ہوا "مرافعہ" کہا جا سکتا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ جس مقصد کے لیے اس مرافعے کو تیار کیا گیا' وہ اس سے پورا نہ ہوا یعنی پنشن تو نواب رام پور کی کوششوں سے مئی ۱۸۶۰ء میں جاری ہوگئی[۱۶] لیکن "پوئٹ لوریٹ" بننے کا غالب کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ یہ غالب کی شخصی اور ذاتی ضرورتیں تھیں جن کی وجہ سے وہ انگریزوں کی خوشامد پر مجبور تھے' نیز انگریزوں کے اثرات سے تہذیب کی جو نئی کرنیں پھوٹ رہی تھیں' غالب اُن کا خیر مقدم کرتے تھے کیونکہ ان ترقیوں کے مقابلے میں انہیں مغلیہ نظام انکار رفتہ اور بوسیدہ معلوم ہوتا تھا اور وہ اُن کی نظروں کے سامنے پارہ پارہ بھی ہو رہا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ملک و قوم کی بربادی اور اپنی سلطنت اور حکومت کے جاتے رہنے پر ان کا دل کڑھتا بھی تھا' اور اپنے ہم وطنوں کی تباہی اور بالخصوص شہر دہلی کی ویرانی و بربادی پر وہ اپنے خطوں میں خون کے آنسو بھی روئے ہیں۔ انگریزوں کی خوشامد کرنے اور ملک و قوم کی تباہی پر غمزدہ ہونے کی ان دونوں کیفیتوں میں تضاد ہے۔ غالب کے یہاں یہ تضاد غالباً ایک کشاکش میں ڈھل گیا ہے۔ وہ چونکہ حقیقت پسند تھے' اُن کی واقعیت انہیں مجبور کرتی تھی جہاں وہ انگریز کو انسانی ترقی کا استعارہ سمجھ کر قبول کریں وہاں اپنے ہم وطنوں کی تباہی و بربادی کا ماتم بھی کریں یعنی انھوں نے اپنے عہد کی ان دونوں متصادم صداقتوں میں کسی ایک سے بھی نظریں نہیں چرائیں بلکہ دونوں کو ان کی پوری کشاکش کے ساتھ قبول کیا اور برتا:

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

حواشی

۱۔ دستنبو ص ۶
۲۔ دستنبو ص ۷،
۳۔ دستنبو ص ۱۱، ۲۶، ۲۷، ۳۴،
۴۔ بنام عبدالغفور سرور، اردوے معلیٰ، ص ۱۰۴
۵۔ دستنبو ص ۳۳ ۔
۶۔ دستنبو ص ۳۳
۷۔ دستنبو ۳، ۴، ۷،
۸۔ کرنیل برن کا پورا نام تھا۔ یہ اس وقت دہلی کے ملٹری گورنر تھے۔
۹۔ دستنبو ص ۵۴

اس واقعہ کی تمام تفصیلات خود مرزا غالب نے اپنی نظم و نثر کے اس انتخاب میں لکھی ہیں جو انہوں نے سرجان میکلوڈ کے لیے مرتب کیا تھا۔ ان کا بیان ہے کہ جب گورے انہیں اپنے ساتھ لے چلے تو راہ میں ایک سارجنٹ بھی آملا۔ اس نے مرزا کی انوکھی وضع دیکھ کر کہا "ول تم مسلمان" مرزا نے کہا "آدھا مسلمان" سارجنٹ نے کہا۔ "ول آدھا مسلمان کیسے؟" غالب نے جواب دیا "شراب پیتا ہوں، (سور) نہیں کھاتا۔"

اس کے بعد جب انہیں کرنیل برن کے پاس لے جایا گیا تو انہوں نے کرنیل کو ملکۂ معظمہ سے اپنی خط و کتابت دکھائی اور اپنی وفاداری کا یقین دلایا تو کرنل نے پوچھا "تم دلی کی لڑائی کے وقت پہاڑی پر کیوں نہ آئے جہاں انگریزی فوجیں اور ان کے طرفدار جمع ہو رہے تھے۔" مرزا نے جواب دیا تلنگے دروازے سے باہر آدمی کو نکلنے نہیں دیتے تھے، میں کیوں کر آتا۔ اگر کچھ فریب کر کے کوئی بات

کرکے نکل جاتا، جب باولی کے قریب پہنچتا، تو پہرے والا گورا مجھے گولی مار دیتا۔ یہ بھی مانا کہ تنگئے باہر جانے دیتے، گورے گولی نہ مارتے، میری صورت دیکھیے اور میرا حال معلوم کیجیے۔ بوڑھا ہوں، پاؤں سے اپاہج اور کانوں سے بہرا، نہ لڑائی کے لائق نہ مشورت کے قابل، ہاں دعا کرتا سو یہاں بھی دعا کرتا رہا۔" (انشائے غالب تعمیمی ص ۷۵، ۷۶)

کرنل برن یہ سن کر ہنسے اور مرزا کو گھر جانے کی اجازت دی۔

۱۱ حالی نے بھی اس واقعہ کو اسی طرح لکھا ہے (یادگارِ غالب ص ۳۶) لیکن نواب غلام حسین کا بیان اس سے مختلف ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کسی دوست کی سفارش پر رہا ہوئے۔ نواب غلام حسین عارف کے والد اور مرزا کے ہم زلف تھے۔ غدر کے زمانہ میں انہوں نے جو فارسی روزنامچہ لکھا تھا، خواجہ حسن نظامی نے اسے "غدر کا نتیجہ" کے نام سے اردو میں ترجمہ کرکے شائع کیا تھا۔ اس میں غالب کے گرفتار ہونے کے واقعہ کا ذکر یوں ملتا ہے:

"غالب عرف مرزا نوشہ صاحب کے گھر میں چند گورے گھس کر ان کو گرفتار کرکے لے گئے اور کرنل برن کے سامنے لے جاکر پیش کیا۔ مرزا صاحب کی کچھ زندگی باقی تھی۔ ان کے ایک دوست اتفاق سے اس وقت وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ان کی سفارش کرکے رہائی دلوائی۔"

(نصرت نامۂ گورنمنٹ، ص ۷۵)

۱۲ دستنبو ص ۴۸، ۴۹۔

۱۳ دستنبو ص ۵۱۔

۱۴ اردوی معلی ص ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۹۳، ۲۴۳،

۱۴ دستنبو ص ۵۴۔

۱۵ اردوی معلی ص ۲۵۵۔

۱۶ بنام ہرگوپال تفتہ، اردوی معلی، ص ۹۱۔

۱۷ دستنبو ص ۴۶

۱۸ دستنبو ص ۹

۱۹ دستنبو ص ۱۳، ۲۷، ۱۴، ۱۲، ۳۰، ۱۵، ۵۸،

۲۰ دستنبو ص ۹

۲۱ دستنبو ص ۴۵

۲۲ دستنبو ص ۶۶، ۵۸، ۲۷، ۱۱

۲۳ دستنبو ص ۶

۲۴ دستنبو ص ۶

۲۵ دستنبو ص ۶۳

۲۶ "ایک عام اندازہ کے مطابق دہلی میں ۲۷،۰۰۰ آدمیوں کو گولی ماردی گئی یا پھانسی پر چڑھایا گیا" ڈاکٹر محمد اشرف حواشی ۴۔

۲۷ ذکر غالب ص ۹۲

۲۸ ذکر غالب ص ۸۰

۲۹ اردوی معلیٰ ص ۲۱۱

۳۰ اردوی معلیٰ ص ۱۰۲

۳۱ ذکر غالب ص ۸۱

۳۲ اردوی معلیٰ ص ۹۹، عود ہندی ص ۱۹

۳۳ اردوی معلیٰ ص ۲۴۹

۳۳الف "غالب سے منسوب دوسرا سکہ" مشمولہ 'فسانۂ غالب' ص ۱۲۶

۳۴ معارف "غالب کا سکہ شعر" ج ۸۲ نمبر ۵، نومبر ۱۹۵۸ء، ص ۳۸۸-۳۹۴

۳۵ معارف "غالب پر سکہ کا الزام اور اس کی حقیقت" ج ۸۳ نمبر ۲، فروری ۱۹۵۹ء ص ۱۴۱-۱۵۰

۳۶ دستنبو ص ۴۷

۳۷ دستنبو ص ۶۲

۳۸ اردوی معلیٰ ص ۴۱

ص۳۹ بنام منشی غلام غوث بےخبر، عود ہندی، ص ۱۱۴

ص۴۰ دستنبو ص ۶۷

ص۴۱ دستنبو ص ۵۵

ص۴۲ دستنبو ص ۲۱

ص۴۳ دستنبو ص ۵۳، ۴۴، ۵۸، ۲۳، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۲۲

ص۴۴ آثار غالب ص ۷۷، ۳

ص۴۵ خطوط غالب ج ۱ ص ۷۴، ۲

ص۴۶ "قلعہ میں شہزادگانِ تیموریہ جمع ہو کر غزل خوانی کرلیتے ہیں ... یہ صحبت خود چندروزہ ہے، اس کو دوام کہاں؟ کیا معلوم ہے، ابھی نہ ہو، اب کے ہو تو آئندہ نہ ہو"۔ بنام قاضی عبدالجمیل جنون، عود ہندی ص ۱۵۴

ص۴۷ مکاتیب غالب (متن) ص ۶

ص۴۸ ایضاً

ص۴۹ مکاتیب غالب (حواشی) ص ۱۲۱

ص۵۰ مکاتیب غالب (مقدمہ) ص ۸۰

(وسکانسن یونیورسٹی، ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں جہاں اس مضمون کے کچھ حصے لکھے گئے، مکاتیب غالب دستیاب نہیں تھی۔ میری فرمائش پر اس کے حوالے ڈاکٹر مختارالدین احمد آرزو نے علی گڑھ سے لکھ بھیجے، جس کے لیے ان کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے)

ص۵۱ خطوط غالب ج ۲ ص ۱۹۹، دستنبو ص ۴۶

ص۵۱ (الف) غالب اور ابوالکلام، ص ۱۵۴ - ۱۵۵۔

ص۵۲ معارف ج ۸۲ نمبر۵، ص ۳۸۸ - ۳۹۴

ص۵۳ مکاتیب غالب (مقدمہ) ص ۱ (متن) ص ۸

ص۵۳ (الف) مکاتیب غالب، ص ۸

ص۵۴ دستنبو ص ۱۴

ص۵۵ بنام غلام حسین قدر بلگرامی، اردوی معلیٰ ص ۴۰۳
ص۵۶ عود ہندی ص ۹۳
ص۵۷ "مفصل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں، ملازمان قلعہ پر شدت ہے اور باز پرس و دار و گیر میں مبتلا ہیں"۔ بنام تفتہ، اردوی معلیٰ ص ۵۸
ص۵۸ بنام شہاب الدین، اردوی معلیٰ ص ۲۱۷
ص۵۹ خطوط غالب ج ۲ ص ۶۷
ص۶۰ خطوط غالب ج ۱ ص ۲۹۶
ص۶۱ خطوط غالب ج ۲ ص ۶۸
ص۶۲ اردوی معلیٰ ص ۵۸
ص۶۳ بنام النور الدولہ سعد الدین شفق، اردوی معلیٰ ص ۲۲۶، عود ہندی ص ۵۲
ص۶۴ اردوی معلیٰ ص ۱۳۷، عود ہندی ص ۸۲
ص۶۵ بنام مجروح، اردوی معلیٰ ص ۱۳۶
ص۶۶ اردوی معلیٰ ص ۳۱۸
ص۶۷ اردوی معلیٰ ص ۵۱
ص۶۸ اردوی معلیٰ ص ۱۶۱، عود ہندی ص ۱۶۰
ص۶۹ اردوی معلیٰ ص ۱۰۳، عود ہندی ص ۲۷
ص۷۰ اردوی معلیٰ ص ۲۲۸
ص۷۱ اردوی معلیٰ ص ۵۸، ۶۱، ۱۳۶، ۱۴۴، دستنبو ۵۶، ۶۰
ص۷۲ بنام مجروح، اردوی معلیٰ ص ۱۴۵
ص۷۳ اردوی معلیٰ ص ۳۰۳
ص۷۴ ذکر غالب ص ۸۵

ماخذ

ص۱ اردوی معلیٰ: لاہور ۱۹۲۲ء

ص۲ عود ہندی، لاہور ۱۹۲۲ء

ص۳ مکاتیب غالب، مرتبہ امتیاز علی عرشی، رامپور (بار ششم) ۱۹۴۹ء

ص۴ خطوط غالب ج (۱) و (۲) مرتبہ غلام رسول مہر، لاہور ۱۹۴۹ء

ص۵ دستنبو، آگرہ (۱۸۵۸ء)

ص۶ انشائے غالب (قلمی) عکس مملوکہ مالک رام

ص۷ یادگار غالب، حالی، لاہور، ۱۹۱۹ء

ص۸ ذکر غالب، مالک رام، دہلی، ۱۹۵۰ء

ص۹ آثار غالب، محمد اکرام، لکھنؤ ۱۹۵۰ء

ص۱۰ غالب، غلام رسول مہر، لاہور ۱۹۳۶ء

ص۱۱ غدر کا نتیجہ (نصرت نامۂ گورنمنٹ) ترجمہ خواجہ حسن نظامی، دہلی ۱۹۳۰ء

ص۱۲ "غالب کا سکۂ شعر" ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، مشمولہ، معارف نومبر ۱۹۵۸ء، ص ۳۸۸ - ۳۹۴

ص۱۳ "غالب پر سکہ کا الزام اور اس کی حقیقت" مالک رام، مشمولہ معارف فروری ۱۹۵۹ء، ص ۱۴۱ - ۱۵۰

ص۱۴ "غالب اور غدر، ۱۸۵۷ء" (انگریزی) ڈاکٹر محمد اشرف مشمولہ REBELLION 1857 مرتبہ پی۔ سی۔ جوشی، دہلی، ۱۹۵۷ء، ص ۲۴۵ - ۲۵۶

ص۱۵ غالب اور ابوالکلام، عتیق صدیقی، دہلی ۱۹۶۹ء

ص۱۶ "غالب سے منسوب دوسرا سکہ" مشمولہ فسانۂ غالب از مالک رام، دہلی ۱۹۷۷ء

کاظم علی خاں

غالب کے گمشدہ مکاتیب

غالب کے اُردو خطوط کی داخلی شہادتیں غالب کے متعدد گم شدہ مکاتیب کی نشان دہی کرتی ہیں۔ ان گم شدہ مکاتیب میں بعض خطوط ایسے افراد کے نام تھے جن کے نام اب غالب کا کوئی اُردو خط موجود نہیں۔ گویا یہ گم شدہ خطوط اگر مل جائیں تو ان کی مدد سے غالب کے مکتوب الیہم کی فہرست میں چند ناموں کا اضافہ ہو سکتا ہے۔ سطورِ ذیل میں خطوطِ غالب اور دیگر ذرائع کی روشنی میں غالب کے ساڑھے تین درجن سے زائد گم شدہ مکاتیب کی نشان دہی کی جاتی ہے۔

۱

تفتہ کے نام ۲ رمئی ۱۸۵۳ء کے ایک خط میں غالب کا بیان ہے: "...... بابو صاحب کا خط تمہارے نام کا پہنچا۔ عجب تماشا ہے، وہ درنگ کے ہونے سے خجل ہوتے ہیں اور میں اُن کے عذر چاہنے سے مرا جاتا ہوں۔ ہائے اتفاق، آج میں نے اُن کو لکھا اور کل راجا کے مرنے کی خبر سنی۔"[1]

اس بیان سے جانی بانکے لال (جنھیں غالب اپنے خطوں[2] میں بابو صاحب لکھا کرتے تھے) کے نام غالب کے ایک ایسے خط کا پتا چلتا ہے جو اب ناپید ہے۔ جانی بانکے لال کے نام غالب کا یہ گم شدہ خط ۲ رمئی ۱۸۵۳ء سے قبل لکھا گیا تھا۔ غالب کے مطبوعہ اُردو مکاتیب میں جانی بانکے لال کے نام کوئی خط موجود نہیں۔ اگر غالب کا یہ گم شدہ خط اُردو میں تھا تو یہ غالب کے اُردو خطوط کے مکتوب الیہم کی فہرست میں جانی بانکے لال کے نام کا اضافہ کر سکتا ہے۔ جانی بانکے لال کے نام پنج آہنگ[3]

اور باغِ دودر؂ میں بھی غالب کا کوئی ایسا فارسی خط موجود نہیں جو ۲ رمئی ۱۸۵۳ء سے قبل لکھا گیا ہو۔ باغِ دودر میں جانی بانکے لال کے نام غالب کا جو واحد فارسی مکتوب شامل ہے اُس کا زمانۂ تحریر اواخر ستمبر ۱۸۵۳ء بتایا جاتا ہے (باغِ دودر (متن) ص ۱۶۷ نیز تحقیق نامہ ص ۸۱ تا ۸۲)۔ جانی بانکے لال شاعر تھے اور اُن کا تخلص رند تھا؂ رند کو غالب کی شاگردی کا شرف حاصل تھا۔ جانی بانکے لال رند کے مختصر حالات صرف چند کتابوں؂ میں موجود ہیں۔

۲

پنج شنبہ ۹ رجون ۱۸۵۳ء کے ایک خط میں غالب نے تفتہ کو لکھا ہے: "...... بابو صاحب کے جو خطوط ضروری اور کاغذ ضروری میرے پاس آئے ہوئے تھے وہ میں نے پنج شنبہ ۲۶ رمئی کو پارسل میں اُن کے پاس روانہ کر دیے اور اس میں لکھ بھیجا ہنڈوی اور میرے بھیجے ہوئے لفافے جلد بھیج دو؂......"

یہ بیان جانی بانکے لال رند کے نام غالب کے ایک ایسے خط کی نشان دہی کرتا ہے جو پنج شنبہ ۲۶ رمئی ۱۸۵۳ء کو لکھا گیا تھا مگر اب یہ ناپید خط غالب کے گم شدہ مکاتیب کی فہرست میں شامل ہو چکا ہے۔ غالب کے مطبوعہ فارسی اور اُردو خطوط میں جانی بانکے لال رند کے نام ۲۶ مئی ۱۸۵۳ء کا مذکورہ خط تلاش کے باوجود مجھے نہ مل سکا۔

تفتہ کے نام ایک خط میں غالب اطلاع دیتے ہیں: "......کل ایک رقعہ میرے پاس آیا کوئی صاحب ہیں عطاء اللہ خاں اور ناؔمی تخلص کرتے ہیں۔ خدا جانے کہاں ہیں اور کون ہیں۔ ایک دوست نے وہ رقعہ میرے پاس بھیجا۔ میں نے اُس کا جواب لکھ کر اُسی دوست کے پاس بھیج دیا...." (خطوطِ غالب (ط) مرتبہ مالک رام ص ۱۳)۔

۳

یہ بیان عطاء اللہ خاں ناؔمی اور غالب کے درمیان مکاتبت کے امکان کی نشان دہی کرتا ہے۔ افسوس کہ اب عطاء اللہ خاں ناؔمی کے نام غالب کے اُردو اور فارسی مکاتیب میں کوئی خط نہیں موجود ہے۔ پنج آہنگ میں جن ناؔمی کے نام غالب کے بعض فارسی خطوط ملتے ہیں اُن کا نام حسام الدین حیدر خاں ہے (کلیاتِ نثرِ غالب طبع ۱۸۶۸ء ص ۲۲۹ وبعد) اگر عطاء اللہ خاں ناؔمی کو غالب نے

کوئی خط لکھا تھا تو وہ اب ناپید ہے اور وہ خط غالبؔ کے مکتوب الیہم کی فہرست میں عطا اللہ خاں نامی کے نام کا اضافہ کرسکتا ہے۔ عطا اللہ خاں نامی کے نام غالبؔ کے خطوط تو موجود نہیں لیکن عطا اللہ خاں نامی کا نام غالبؔ کے کئی خطوط میں ضرور موجود ہے۔ ۸

۴

تفتہ کے نام ۵ مارچ ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں غالبؔ رقم طراز ہیں: "...... میں تم کو آگرہ میں سمجھ کر سکندر آباد خط نہ بھیج سکا۔ مولوی قمرالدین خاں کے خط میں تم کو سلام لکھا۔ کل اُن کا خط آیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ ابھی مرزا تفتہ یہاں نہیں آئے ......" (اُردوئے معلّیٰ (حصّہ اوّل): غالبؔ۔ اکمل المطابع، دہلی طبع مارچ ۱۸۶۹ء ص ۶۴)۔

یہ بیان مولوی قمرالدین خاں اور غالبؔ کے مابین مکاتبت کا انکشاف کرتا ہے۔ اب مولوی قمرالدین خاں کے نام فارسی یا اُردو میں غالبؔ کا کوئی خط موجود نہیں۔ یہ بیان غالبؔ کے مکتوب الیہم کی فہرست میں مولوی قمرالدین خاں کے نام کا اضافہ کرتا ہے۔ مولوی قمرالدین خاں کے نام غالبؔ کا کوئی خط موجود نہ ہونے کے باوجود اُن کا نام غالبؔ کے کئی خطوں میں موجود ہے۔ ۹

۵

مکتوبِ غالبؔ بہ نام تفتہ کا ایک تراشہ ملاحظہ ہو: "میر مکرم حسین صاحب کا خط پرسوں آیا۔ دو چار دن میں اُس کا جواب لکھوں گا......" (اُردوئے معلّیٰ (حصّہ اوّل) طبع مارچ ۱۸۶۹ء ص ۸۷)۔ یہ بیان غالبؔ اور میر مکرم حسین کے درمیان خط و کتابت کے امکان کی نشان دہی کرتا ہے۔ میر مکرم حسین کے نام اب تلاش کرنے پر مجھے غالبؔ کا اُردو یا فارسی میں کوئی خط نہیں ملتا۔ تفتہ کے نام غالبؔ کے ایک اور خط (مشمولہ اُردوئے معلّیٰ (حصّہ اوّل) طبع مارچ ۱۸۶۹ء ص ۵۳) سے بھی غالبؔ اور میر مکرم حسین کے مابین مکاتبت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مذکورہ شواہد غالبؔ کے اُردو خطوط کے مکتوب الیہم کی اس فہرست میں میر مکرم حسین کے نام کا اضافہ کرتے ہیں۔

۶

اُردوئے معلّیٰ (حصّہ اوّل) طبع ۱۸۶۹ء (ص ۲۷) میں شامل تفتہ کے نام ایک خط میں غالبؔ کا بیان ہے: "...... رائے امید سنگھ کے نام کا خط بہ احتیاط رہنے دو۔ جب وہ آئیں اُن کو دے

دو۔۔۔۔۔۔" گمانِ غالب ہے کہ اس بیان میں رائے امید سنگھ کے نام غالب ہی کے خط کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ خط اب غالب کے گم شدہ خطوط میں شامل ہو چکا ہے۔ غالب کے مطبوعہ فارسی و اُردو خطوط میں اب راقم السطور کو رائے امید سنگھ کے نام کوئی خط نہیں ملتا۔ غالب کے مکتوب الیہم کی فہرست کے لیے رائے امید سنگھ کا نام ایک اضافہ ثابت ہوتا ہے۔[۱]

۷

علائی کے نام مورخہ ۹ر فروری ۱۸۶۲ء (یک شنبہ) کے ایک خط (مشمولہ اُردوئے معلّیٰ (حصہ اول) طبع اول ص ۴۰) میں غالب بتاتے ہیں "صاحب! صبح جمعہ کو میں نے تم کو خط لکھا؛ اسی وقت بھیج دیا۔" یک شنبہ ۹ر فروری ۱۸۶۲ء کے خط میں غالب کے اس بیان سے پتا چلتا ہے کہ غالب نے علائی کے نام جمعہ ۷ر فروری ۱۸۶۲ء کو بھی ایک خط لکھا تھا۔ غالب کے دست یاب مطبوعہ فارسی و اُردو مکاتیب میں اب علائی کے نام جمعہ ۷ر فروری ۱۸۶۲ء کا کوئی خط نہیں موجود ہے۔ مکتوبِ غالب بنام علائی مکتوبہ جمعہ ۷ر فروری ۱۸۶۲ء کو غالب کے گم شدہ خطوط میں شامل کیا جائے گا۔

۸

قدر بلگرامی کو ایک خط میں غالب نے لکھا ہے: "۔۔۔۔۔جناب نوروز علی صاحب کی خدمت میں میرا سلام کہیے اور یہ کہیے کہ اگر ۔۔۔۔۔ کیجیے گا اور یہ کہیے گا کہ بیرنگ خط کا ایک آنہ دینا پڑے گا۔ ہر مہینے میں آٹھ خط تک بلکہ سو خط تک میں نہ گھبراؤں گا۔ بھیجیے۔۔۔۔۔۔" (خطوطِ غالب (ط) : مرتبہ مالک رام ص ۲۷۸)۔ نوروز علی اور غالب کے درمیان مکاتبت کا سلسلہ قائم ہو سکا یا نہیں اس پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ اگر نوروز علی کے نام غالب نے خطوط لکھے تھے تو وہ اب ناپید ہیں۔ غالب کے مکتوب الیہم کی فہرست کے لیے نوروز علی کا نام ایک نیا نام ہوگا۔

۹

دو شنبہ ۵ر مئی ۱۸۶۲ء کے خط میں غالب قدر بلگرامی سے مخاطب ہیں: "آپ کا خط آیا اور میں نے اس کا جواب بھجوایا۔۔۔۔۔" (خطوطِ غالب (ط) : مرتبہ مالک رام ص ۲۶۷)۔ یہ اطلاع ۵ر مئی ۱۸۶۲ء کو دی گئی ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے قدر بلگرامی کو ۱۸۶۲ء میں ۵ر مئی سے قبل بھی ایک خط لکھا تھا۔ مجھے قدر بلگرامی کے نام ۱۸۶۲ء میں ۵ر مئی سے قبل کا غالب کا کوئی خط نہیں ملتا

یہاں غالب نے اپنے جس خط کی اطلاع دی وہ اب ناپید ہے۔

۱۰

مرزا یوسف علی خاں عزیز کے نام اپنے خط میں غالب نے اطلاع دی ہے: "........کل زین العابدین فوق کا خط...... بہ سبیل ڈاک بھجوا دیا ہے......" (عودِ ہندی: غالب۔ مطبع مجتبائی میرٹھ (طبع اوّل) مطبوعہ ۱۰ رجب ۱۲۸۵ھ (مطابق اکتوبر ۱۸۶۸ء) ص ۶۵) - اس سے زین العابدین فوق اور غالب کے درمیان خط و کتابت کا انکشاف ہوتا ہے۔ زین العابدین فوق کے نام اب غالب کا کوئی اُردو خط موجود نہیں۔ غالب کے مکتوب الیہم کی فہرست زین العابدین فوق کے نام سے خالی ہے مگر غالب کا مذکورہ بیان فوق کو اس فہرست میں شامل کر رہا ہے۔

۱۱

آرام کے نام غالب کے ایک خط کا تراشہ ملاحظہ ہو: "...... اپنے شفیق دلی ماسٹر رام چندر صاحب کو تمھارے آنے کی اطلاع دی۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ جو رقعہ انھوں نے میرے رقعے کے جواب میں لکھا ہے وہ تم کو بھیجتا ہوں۔ پڑھ لینا......" (اُردوے معلیٰ (حصہ اوّل) طبع ۱۸۶۹ء ص ۳۷۴) - یہ بیان ماسٹر رام چندر اور غالب کے درمیان مکاتبت کے جس سلسلے کا انکشاف کرتا ہے اُس کے بارے میں ادبی حلقے بے خبر نظر آتے ہیں۔ صدیق الرحمٰن قدوائی کی کتاب ماسٹر رام چندر غالب اور ماسٹر رام چندر کی مکتوب نگاری کی خصوصیات پر تو روشنی ڈالتی ہے[11] لیکن غالب اور رام چندر کے درمیان خط و کتابت کے محولۂ بالا سلسلے کے متعلق خاموش نظر آتی ہے۔ ماسٹر رام چندر کے نام اب غالب کا فارسی یا اُردو میں کوئی خط نہیں ملتا۔ غالب کے مکتوب الیہم کی فہرست میں محولۂ بالا بیان ماسٹر رام چندر کے نام کا اضافہ کرتا ہے۔ ماسٹر رام چندر کے نام یہاں غالب نے اپنے جس خط کا ذکر کیا ہے وہ اب غالب کے گم شدہ خطوط میں شامل ہو چکا ہے اور یہ ۲۳ جولائی ۱۸۵۹ء سے کچھ عرصہ قبل تحریر ہوا ہوگا۔

۱۲

تفتہ کے نام اپنے مکتوب مورخہ ۲۳ اگست ۱۸۵۸ء میں غالب کا بیان ہے "آج تمھیں دو خط بھیجے ہیں۔ ایک تو صبح کو پوسٹ پیڈ اور ایک اب بارہ پر تین بجے بیرنگ....."[12] اب تفتہ

کے نام ۲۲ اگست ۱۸۵۸ء کا ایک ہی خط ملتا ہے دوسرا خط ناپید ہے۔

۱۳

نواب غلام بابا خاں کے نام اپنے خط مورخہ ۹ اگست ۱۸۶۶ء میں غالب نے لکھا ہے :
"کیوں حضرت، صاحب زادے کا اسم تاریخی پسند آگیا یا نہیں ؟ نام تاریخی اور پھر سید بھی اور خان بھی سید مہابت علی خاں، عجب ہے اگر پسند نہ آئے اور بہت عجب ہے کہ اس امر کی نہ آپ کے خط میں توضیح نہ میاں داد خاں کے خط میں خبر ...... "۳۳

مجھے تلاش کے باوجود غلام بابا خاں یا میاں داد خاں سیاح کے نام غالب کا کوئی ایسا خط نہیں ملتا جو ۹ اگست ۱۸۶۶ء سے قبل کسی قریبی زمانے میں لکھا گیا ہو اور اُس میں غالب نے غلام بابا خاں کے فرزند کا تاریخی نام تجویز کیا ہو۔ غالب کا بیان بتاتا ہے کہ غالب نے اِن مضامین پر مشتمل ایک خط ۹ اگست ۱۸۶۶ء سے قبل ضرور لکھا تھا مگر اب وہ خط غالب کے گم شدہ مکاتیب میں جگہ پا چکا ہے۔

۱۴، ۱۵

قدر بلگرامی کے نام اپنے ایک خط میں غالب کا بیان ہے : "اِس وقت آپ کی وحشت انگیز تحریر پہنچی۔ اِدھر اُس کو پڑھا اور اُدھر یہ خط تمھیں اور ایک خط مرزا عباس کو اور ایک خط تہنیت کا منشی صاحب (منشی صاحب سے مراد ہیں منشی نول کشور جنھیں غالب اپنے خطوط بہ نام قدر بلگرامی میں منشی صاحب ہی لکھا کرتے تھے) کو لکھا"۳۴

تقویم کی رُو سے اِس خط کی تاریخ تحریر چہارشنبہ ۴ جون ۱۸۶۲ء ملتی ہے۔ مجھے تلاش کے باوجود مرزا عباس اور منشی نول کشور کے نام ۴ جون ۱۸۶۲ء کا مکتوبہ غالب کا کوئی اُردو خط نہیں مل سکا ہے۔ مرزا عباس بیگ کے نام غالب کا اب محض ایک اُردو خط مورخہ ۱۲ مئی ۱۸۶۳ء موجود ہے (خطوط غالب: مرتبہ مولانا غلام رسول مہر۔ لاہور طبع ۱۹۶۸ء ص ص ۵۴۲ تا ۵۴۳)۔ منشی نول کشور کے نام اب اُردو میں غالب کا محض اوائل مارچ ۱۸۶۳ء کا ایک خط ملتا ہے (اُردوئے معلیٰ (صدی ایڈیشن) حصہ دوم، سوم مرتبہ مولانا فاضل لکھنوی ص ص ۱۱۰۶ تا ۱۱۰۷)۔ منشی نول کشور کے نام غالب کا خط مورخہ ۴ جون ۱۸۶۲ء اب ناپید ہے۔ پنج آہنگ بھی منشی نول کشور کے نام غالب کے ۴ جون ۱۸۶۲ء کے مکتوبہ فارسی خط سے خالی ہے۔ پنج آہنگ میں منشی نول کشور کے نام غالب کا جو واحد فارسی خط شامل ہے اُس کی تاریخ تحریر

چہارشنبہ ۱۸ جولائی ۱۸۶۰ء ہے۔ اِن حالات میں میرے نزدیک منشی نول کشور اور مرزا عباس بیگ کے نام ۴ جون ۱۸۶۲ء کو تحریر ہونے والے متذکرۂ بالا خطوط اب غالب کے گم شدہ مکاتیب کی فہرست میں شامل ہو چکے ہیں۔

۱۶

قدر بلگرامی کے نام ایک خط میں غالب اطلاع دیتے ہیں: "برخوردار مرزا عباس کو دوبارہ تحریر کی حاجت نہیں۔ اگر وہ سعادت مند ہیں تو وہی ایک خط کافی ہے" (اردوئے معلی (صدی ایڈیشن) حصہ دوم و سوم: مرتبہ فاضل لکھنوی ص ص ۱۰۵۰ تا ۱۰۵۱)۔ غالب کی یہ عبارت جنوری ۱۸۶۰ کے مکتوب سے ماخوذ ہے لہٰذا اِس بیان میں مرزا عباس بیگ کے نام غالب نے اپنے جس خط کا ذکر کیا ہے وہ جنوری ۱۸۶۰ء یا اس سے قبل لکھا گیا ہوگا اور اب وہ ناپید ہے۔ مرزا عباس بیگ کے نام اب غالب کا جو واحد اردو خط موجود ہے اُس کی تاریخِ تحریر ۱۲ مئی ۱۸۶۲ء ہے (خطوطِ غالب: مرتبہ مولانا غلام رسول مہر ص ص ۵۴۲ تا ۵۴۳)۔ مرزا عباس بیگ کے نام جنوری ۱۸۶۰ء یا اُس سے قبل کا خط اب شاید غالب کے گم شدہ مکاتیب میں شامل ہو چکا ہے۔

۱۷

حکیم غلام نجف خاں کے نام ایک خط میں غالب رقم طراز ہیں: "بھائی ہوش میں آؤ میں نے تم کو خط کب بھیجا اور رقعے میں کب لکھا کہ میں شیر زماں کا خط تمھارے پاس بھیجتا ہوں۔ میں نے تو ایک لطیفہ لکھا تھا کہ شیر زماں خاں نے میرے خط میں تم کو بندگی لکھی تھی اور میں وہ بندگی اِس رقعے میں لپیٹ کر تم کو بھیجتا ہوں۔ بس بات اتنی ہی تھی۔۔۔۔" (اردوئے معلی (حصہ اول) طبع ۱۸۶۹ء ص ۲۲۱)۔ مجھے تلاش کے باوجود حکیم غلام نجف خاں کے نام غالب کا ایسا کوئی فارسی یا اردو خط نہیں ملتا جس میں غالب نے شیر زماں خاں کی بندگی حکیم غلام نجف کو رقعے میں لپیٹ کر بھیجنے کا ذکر کیا ہو۔

۱۸، ۱۹

مکتوبِ غالب بنام حکیم غلام نجف خاں مورخہ ۲۶ دسمبر ۱۸۵۷ء (مشمولہ خطوطِ غالب: مرتبہ غلام رسول مہر ص ۲۱۵) میں غالب کے مندرجہ ذیل بیانات غالب کے دو گم شدہ مکاتیب کی نشان دہی کرتے ہیں: "میاں تمھارا خط پہنچا۔ آج میں نے اس کو اپنے خط میں ملفوف کر کے آگرہ کو روانہ کیا۔۔۔۔

یہ رقعہ حیدر حسن خاں (کے) نام کا ہے، اُن کو حوالے کر دینا۔" اس بیان میں غالب نے اپنے جن دو خطوط کے متعلق اطلاع دی ہے وہ اب ناپید ہیں۔ ان دو گم شدہ مکاتیب میں سے پہلا خط جو آگرے بھیجا گیا تھا وہ مکتوبِ غالب بہ نام غلام نجف خاں مورخہ ۲۱/دسمبر ۱۸۵۷ء (مشمولہ خطوطِ غالب: مرتبہ غلام رسول مہر ص ۳۱۵) کی روشنی میں شیر زماں کے نام معلوم ہوتا ہے۔ ملحوظ رہے کہ شیر زماں خاں اور غالب کے درمیان خط و کتابت کے ثبوت موجود ہیں (در رک خطوطِ غالب (حصہ اوّل): مرتبہ مالک رام خط نمبر ۲۳۰ نیز خط نمبر ۲۳۳)۔ غالب کے مکتوب الیہم کی فہرست کے لیے شیر زماں خاں ایک نیا نام ہے۔ غالب کا دوسرا ناپید خط حیدر حسن خاں کے نام تھا جو غالب کے مکتوب الیہم کی فہرست میں حیدر حسن خاں کے نام کا اضافہ کرتا ہے۔ حیدر حسن خاں کے نام اب اُردو یا فارسی میں غالب کا کوئی خط موجود نہیں۔

۲۰

حکیم غلام نجف خاں کو ایک خط میں غالب یہ تاکید کرتے ہیں: "میاں، پہلے ظہیر الدین کا حال لکھو...... پھر تم خط لکھو میاں نظام الدین کو اور اُس میں لکھو کہ تم نے غالب کے خط کا جواب نہیں لکھا۔ وہ کہتا ہے کہ میں حیران ہوں کہ میاں نظام الدین اور میرے خط کا جواب نہ لکھیں......" (اردوئے معلیٰ (حصہ اوّل) طبع ۱۹۶۹ء ص ۲۲۲)۔ اس بیان سے غالب اور میاں نظام الدین کے مابین مکاتبت ثابت ہے۔ اب نظام الدین کے نام اُردو یا فارسی میں غالب کا کوئی خط موجود نہیں۔ غالب کے مکتوب الیہم کی فہرست کے لئے "میاں نظام الدین" ایک نئے شخص ثابت ہوتے ہیں۔ اس بیان میں غالب نے نظام الدین کے نام اپنے جس خط کا ذکر کیا ہے وہ غالب کے گم شدہ خطوط کی فہرست میں شامل کیا جائے گا۔

۲۱

میاں نظام الدین کے علاوہ اُن ہی کے ہم نام ایک اور شخص نواب حافظ نظام الدین سے بھی غالب کی مکاتبت کے ثبوت دست یاب ہوتے ہیں۔ نواب سعد الدین خاں شفق کے نام ایک فارسی خط میں غالب کے بیان کا اُردو مفہوم ملاحظہ ہو: "......... نواب حافظ نظام الدین کے خط سے ان اوراق کے نظرِ ہمایونی سے گزرنے کا حال معلوم ہوا......" (پنج آہنگ: ترجمہ محمد عمر مہاجر۔ کراچی طبع ۱۹۶۹ء ص ص ۴۹ تا ۱۵۰)۔ خواجہ ظہیر الدین کے نام ایک فارسی خط میں غالب کے بیان کا اردو مفہوم پیش ہے: "...... بارے اب حافظ نظام الدین کے خط سے گردِ ملال دُھل گئی......" (پنج آہنگ مترجمہ

مہاجر ص ۱۵۶) ۔ یہ بیانات غالب اور نواب حافظ نظام الدین کے درمیان مکاتبت کا ثبوت ہیں مگر اب نواب حافظ نظام الدین کے نام اردو یا فارسی میں غالب کا کوئی خط دست یاب نہیں ہوتا۔ غالب کے مکتوب الیہم کی فہرست کے لیے نواب حافظ نظام الدین کا نام اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

۲۲

نواب سعدالدین خاں شفق کے نام ایک خط میں غالب کا بیان ہے: ”مولانا قلق کے نام کی عرضی اُن کو پہنچا دیجیے گا ۔۔۔۔۔۔“ (عودِ ہندی طبع رجب ۱۲۸۵ھ ص ۶۵)۔ مکاتیبِ غالب بہ نام شفق کے بافہم مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہاں عرضی سے مراد قلق کے نام غالب کا خط ہے۔ قلق کے نام غالب کا یہ خط دراصل غالب کے نام قلق کے اُس خط کا جواب ہے جس کا ذکر شفق کے نام غالب کے مندرجہ ذیل مکاتیب میں موجود ہے:

”حضرت نے خوب وکالت کی! مولانا قلق سے تقصیر میری معاف نہ کروائی۔ کہہ دوگے کہ گناہ معاف ہوگیا۔ میں بغیر سارٹی فکٹ کے کب مانوں گا۔“ (خطوطِ غالب (رٹ): مرتبہ مالک رام ص ۲۰۶ (خط نمبر ۲۴۴))

”قبلہ و کعبہ، کرا جنابِ مولانا قلق میں، حضرت شفق ۔ و غالب کی شفاعت کی تھی وہ مقبول نہ ہوئی؟ اب جنابِ ’ہاشمی‘ کو اپنا ہم زبان اور مددگار بناکر پھر کہتے ہیں۔ آپ کی بات اِس باب میں کبھی نہ مانوں گا، جب تک سیّد صاحب (سید صاحب سے مراد ہیں میر امجد علی قلق) کا خوش نودی نامہ نہ بھجوایئے گا۔ اس سارٹی فکٹ کے حصول میں رشوت دینے کو بھی موجود ہوں ۔۔۔۔۔۔“ (خطوطِ غالب (رٹ): مرتبہ مالک رام ص ۲۰۷ (خط نمبر ۲۴۵))

”پیر و مرشد ۔۔۔۔۔۔ پرسوں آپ کا خط مع سارٹی فکٹ کے پہنچا۔ آپ کو مبدٔ فیاض سے اشرف الوکلاء کا خطاب ملا، مخنہ انہ مجتبانہ ۔۔۔۔۔۔ مولانا قلق کے نام کی عرضی اُن کو پہنچا دیجئے گا ۔۔۔۔۔۔“ (خطوطِ غالب (رٹ): مرتبہ مالک رام ص ص ۲۰۷ تا ۲۰۸ (خط نمبر ۲۴۶) نیز دیکھیے عودِ ہندی طبع ۱۲۸۵ھ ص ص ۶۴ تا ۶۵)

غالب کے یہ تینوں بیانات قلق اور غالب کے درمیان مکاتبت کے مظہر ہیں۔ لیکن اب میر امجد علی

تلق کے نام فارسی یا اردو میں غالب کا کوئی خط دست یاب نہیں ہوتا۔

غالب کے غیر معروف مکتوب الیہ میر امجد علی تلق لکھنؤ کے باشندے، میر محمد علی کے فرزند، افضل الدولہ نواب احمد بخش خاں بیتاب کے شاگرد اور نواب انور الدولہ سعد الدین خاں بہادر شفق کے استاد تھے۔ شفق پہلے تلق کے شاگرد تھے پھر غالب سے اصلاح لینے لگے۔ تلق لکھنؤ کے رہنے والے تھے لیکن بعد کو کدورہ (کالپی) میں جا بسے تھے۔ غالب میر امجد علی تلق کی شاعری کے مداح تھے۔ چنانچہ شفق کے نام ایک خط میں غالب نے لکھا ہے: "مولانا تلق نے متقدمین، یعنی امیر خسرو و سعدی و جامی کی روش کو سر حدِ کمال کو پہنچایا ہے ...." [خطوطِ غالب (ط): مرتبہ مالک رام ص ۲۱۴ (خط نمبر ۲۵۲)]۔

میر امجد علی تلق کے حالات متعدد مصادر[۱] میں موجود ہیں۔

۲۳

بابو ہر گوبند سہائے (نشاط) کے نام اپنے ایک خط میں غالب کا بیان ہے "برخوردار بہت دن ہوئے کہ میں نے تم کو خط لکھا ہے۔ اب اس خط کا جواب ضرور لکھو اور جلد لکھو........" (اردوئے معلیٰ حصہ اوّل) طبع اول ص ۳۸۶)۔ یہ بیان ۲۹ ردسمبر ۱۸۵۸ء کے خط سے ماخوذ ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بابو ہر گوبند سہائے کے نام غالب نے ۲۹ ردسمبر ۱۸۵۸ء سے قبل بھی ایک خط لکھا تھا۔ تلاش کے باوجود مجھے ہر گوبند سہائے کے نام اردو یا فارسی میں غالب کا ایسا کوئی خط نہیں ملتا جو ۲۹ ردسمبر ۱۸۵۸ء سے قبل لکھا گیا ہو۔ ۲۹ ردسمبر ۱۸۵۸ء سے قبل کا یہ محولہ خط اب غالب کے گم شدہ مکاتیب میں شامل ہو گا۔

۲۴

حسین مرزا کے نام ایک خط (مشمولہ اردوئے معلیٰ (حصہ اوّل) طبع ۱۸۶۹ء ص ص ۲۲۴ تا ۲۳۱) میں غالب اطلاع دیتے ہیں: "نواب صاحب آج تیسرا دن ہے کہ تم کو حال لکھ چکا ہوں......" یہ بیان حسین مرزا کے نام غالب کے اُس خط سے ماخوذ ہے جو ۱۵ ردسمبر ۱۸۵۹ء کو لکھا گیا تھا اور شاید ۱۶ ردسمبر ۱۸۵۹ء کو پوسٹ کیا گیا تھا[۲]۔ گویا یہاں حسین مرزا کے نام غالب نے اپنے ایک ایسے خط کا ذکر کیا ہے جو ۱۵ ردسمبر ۱۸۵۹ء سے تین روز قبل لکھا گیا ہو گا۔ حسین مرزا کے نام غالب کے دست یاب مکاتیب میں مجھے ایسا کوئی خط نہیں ملا جو ۱۵ ردسمبر ۱۸۵۹ء سے تین یوم قبل لکھا گیا ہو۔ یہ خط اب ناپید ہے اور

اسے غالب کے گم شدہ خطوط میں جگہ دی جائے گی۔

۲۵ ، ۲۶

میر ابراہیم علی خاں وفا کو ایک خط میں غالب مطلع کرتے ہیں : " دو تین دن ہوئے کہ قبلہ و کعبہ میر عالم علی خاں کا خط آیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ آزردہ تخلص کی دو غزلیں اصلاحی پہنچیں۔ دیکھئے اس سہو کو کہ کس کی غزلیں کس کو بھیجیں ...... " (اردوئے معلیٰ (حصہ اول) طبع اول ص ۲۲۵)۔ اس بیان کی روشنی میں میر عالم علی خاں اور آزردہ (نام نامعلوم) سے غالب کی مکاتبت ثابت ہے مگر میر عالم علی خاں اور آزردہ کے نام اب غالب کے خطوط ناپید ہیں۔ یہ بیان غالب کے مکتوب الیہم کی فہرست میں میر عالم علی خاں (مائل) اور آزردہ نام کے دو افراد کا اضافہ کرتا ہے۔ آزردہ کے متعلق غالب کا بیان ہے : " ...... اب یہ بھی یاد نہیں آتا کہ آزردہ کا نام کیا ہے " (اردوئے معلیٰ (ط) ص ۲۲۵)۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ آزردہ کوئی غیر معروف شاعر تھے جو اپنی غزلوں پر غالب سے اصلاح لیا کرتے تھے ۔ تلامذۂ غالب طبع اول از مالک رام) آزردہ کے ترجمے سے خالی ہے۔ میر عالم علی خاں مائل کا ترجمہ تلامذۂ غالب (ص ۲۵۲) میں موجود ہے۔

۲۷

احمد حسین مینا (یا تمنا) مرزا پوری کے نام ایک خط میں غالب نے لکھا ہے : " کل دوپہر کو آپ کے عنایت نامے کے ساتھ ہی جناب اخگر کا مہربانی نامہ مع غزل پہنچا۔ آج جواب آپ کو لکھتا ہوں... " یہ بیان مولوی فرزند علی اخگر اور غالب کے درمیان مکاتبت کا مظہر ہے۔ اگر اخگر کو غالب نے خطوط لکھے تھے تو وہ اب ناپید ہیں۔ اب نہ تو اخگر کے نام غالب کا کوئی اردو خط موجود ہے اور نہ غالب کے مکتوب الیہم کی فہرست میں فرزند علی اخگر کا نام شامل ہے۔ میرے نزدیک غالب کے مکتوب الیہم کی فہرست میں اخگر کا اضافہ کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ سخن شعرا، تلامذۂ غالب اور بزمِ غالب سے میں فرزند علی اخگر عظیم آبادی کے حالات کے ماتحت اخگر کی جس غزل کا محض ایک شعر نقل ہوتا آیا ہے مجھے اخگر کی اُسی غزل کے چار ایسے اشعار دست یاب ہوئے ہیں جو مذکورہ بالا تینوں کتابوں پر اضافہ ثابت ہوتے ہیں۔ سخنِ شعرا، تلامذۂ غالب اور بزمِ غالب میں فرزند علی اخگر کا محض یہ ایک شعر درج ملتا ہے :-

خود نما تھا سب حسینانِ زمن میں آئنہ　　　ہے مگر حیران تیری انجمن میں آئنہ

فرزند علی انجؔم کی اسی غزل کے راقم الحروف کے تلاش کردہ چار اشعار سطور ذیل میں ملاحظہ ہوں :-

گرمیِ آہِ شرر بارِ دلِ مغموم سے — شعلہ جوّالہ ہے بیت الحزن ہیں آئنہ

عکسِ عارض جلوہ افزا ہے جو طشتِ آب میں — صاف یہ آیا تصور ہے لگن میں آئنہ

لاکھوں وعدے لے خود آراؔہ عاشق سے گئے — پر کسی دن بھی تو اُس کی انجمن میں آئی نہ

رُخ کی شاگردی جو اے انجؔم ہوئی مدِ نظر — ہوگیا استادِ مجبوری کے فن میں آئنہ[۲۱]

۲۸

چودھری عبدالغفور سرورؔ کو ایک خط (مشمولہ عودِ ہندی طبع ۱۲۸۵ھ ص ۱۶) میں غالبؔ اطلاع دیتے ہیں : "...... آپ کو معلوم رہے کہ آپ کے چچا صاحب کے خط کا جواب اس سے آگے بھیج چکا ہوں ......" چودھری سرورؔ کے چچا کا نام چودھری غلام رسول تھا[۲۲]۔ یہ بیان غالبؔ اور چودھری غلام رسول کے درمیان مکاتبت کا ثبوت فراہم کرتا ہے اور غالبؔ کے مکتوب الیہم کی فہرست میں چودھری غلام رسول کے نام کا اضافہ کرتا ہے۔ اب چودھری غلام رسول کے نام اُردو یا فارسی میں غالبؔ کا کوئی خط دستیاب نہیں ہوتا۔

۲۹

منشی شیونرائن آرامؔ کے نام ایک خط میں غالبؔ کا بیان ہے : "آج اسی وقت میں نے تم کو یہ خط لکھا اور اسی وقت بھائی مصطفیٰ خاں کو ایک خط بھیجا ہے اور اُن کو لکھا ہے اگر چھاپا شروع نہ ہوا ہو تو نہ چھاپا جائے اور دیوان جلد میرے پاس بھیجا جائے۔" (خطوطِ غالبؔ : مرتبہ غلام رسول مہرؔ ص ۲۱۹) نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ کے نام ان مطالب پر مشتمل اردو یا فارسی میں اب غالبؔ کا کوئی خط موجود نہیں۔ یہ خط غالبؔ کے گم شدہ مکاتیب میں شامل ہونا چاہیے۔

۳۰

مولانا عرشیؔ کا بیان ہے کہ غالبؔ نے ۸/مارچ ۱۸۵۷ء کو والی رام پور نواب یوسف علی خاں ناظمؔ کے نام جو خط ارسال کیا تھا وہ ۱۱/مارچ ۱۸۵۷ء کو رام پور پہنچا تھا۔ اب مثل میں اس خط کا لفافہ اس تحریر کے ساتھ موجود ہے : "عرضی حسب الحکم چاک نمودہ شد۔ ۱۶/رجب ۱۲۷۳ھ" غالبؔ کے اس خط کا جو جواب ناظمؔ نے ۲۵/رجب ۱۲۷۳ھ کو دیا اُس سے مولانا عرشیؔ نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ غالبؔ کی یہ

مکاتبت بہ صیغۂ راز تھی ؎۔ ظاہر ہے کہ غالب کا یہ چاک شدہ مکتوب بھی اب ناپید ہے۔

۳۱

مکاتیبِ غالب (متن ص ص ۶ تا ۷) میں مولانا عرشی کا بیان ہے کہ مکتوبِ غالب بہ نام ناظم مورخہ یکم اپریل ۱۸۵۷ء بھی چاک کر دیا گیا تھا۔ یہ اطلاع اِس خط کے لفافے پر درج ہے۔ مثل میں خط ناپید ہے صرف لفافہ موجود ہے۔

۳۲

نواب یوسف علی خاں ناظم کے نام اپنے خط مورخہ ۷ اپریل ۱۸۵۹ء میں غالب نے لکھا ہے: ''ایک خط مشتمل اپنے حال پر...... روانہ کر چکا ہوں'' (مکاتیبِ غالب (متن) ص ۱۳ (مع حاشیہ ۱)) اس بیان میں جس خط کا ذکر ہے اُس کے متعلق مولانا عرشی نے حاشیے میں لکھا ہے کہ وہ خط غالب نے ۱۶ فروری ۱۸۵۹ء سے قبل ارسال کیا ہوگا کیوں کہ ناظم نے اُس کا جواب ۱۶ فروری ۱۸۵۹ء کو تحریر کیا تھا۔ ناظم کے نام ۱۶ فروری ۱۸۵۹ء سے قبل کی کسی قریبی تاریخ کا خط مکاتیبِ غالب میں نہیں ملتا۔ شاید یہ خط بھی تلف ہو چکا ہے۔

۳۳

ناظم کے نام اپنے ایک خط میں غالب کا بیان ہے: ''پرسوں ایک نیاز نامہ بھیجا ہے....'' (مکاتیبِ غالب (متن) ص ۱۵)۔ یہ بیان ۵ نومبر ۱۸۵۹ء کے خط سے ماخوذ ہے۔ بیان میں غالب نے اپنے جس خط کو ''پرسوں'' بھیجنے کا ذکر کیا ہے وہ ۳ نومبر ۱۸۵۹ء کو ارسال کیا گیا ہوگا۔ مکاتیبِ غالب طبع چہارم میں ۳ نومبر ۱۸۵۹ء کا خط موجود نہیں۔ غالباً یہ خط بھی غالب کے گم شدہ مکاتیب کی فہرست میں شامل ہو چکا ہے۔

۳۴، ۳۵

ناظم کے نام غالب کے ایک خط (مشمولہ مکاتیبِ غالب (متن) ص ۲۱ مع حاشیہ ۴ نیز ص ۲۲) کا تراشہ ملاحظہ ہو: ''بھائی حسن علی خاں ؎ کے بیٹوں کے باب میں جو علی بخش خاں صاحب کو لکھا، اُس کو میں سپارش نہ سمجھا تھا...... میر سرفراز حسین اور میرن صاحب کو، واللہ باللہ، اگر میں نے بھیجا ہو۔ نوکری کی جستجو کو نکلے تھے۔ میر سرفراز حسین نوکری پیشہ، اور میرن صاحب مرثیہ خوان، وہ یہاں کے

مرثیہ خوانوں میں ممتاز۔ خانساماں صاحب کو جو میں نے یہ لکھا کہ یہ ایسے ہیں، غرض اس سے یہ تھی کہ محرم میں جہاں دس پانچ مرثیہ خوان اور مقرر ہوتے ہیں، میرن صاحب بھی مقرر ہو جائیں ۔۔۔۔۔۔"

اس سے پتا چلتا ہے کہ حسن علی خاں کے بیٹوں کے سلسلے میں غالب نے ریاستِ رام پور کے خانساماں علی بخش خاں کو خط لکھا تھا جو اب ناپید ہے۔ اس بیان سے یہ بھی علم ہوتا ہے کہ غالب نے میر سرفراز حسین اور میرن صاحب کے لیے بھی علی بخش خاں کے نام کوئی تعارفی خط لکھا تھا اور یہ خط بھی دست یاب نہیں ہوتا۔ غالب کے مطبوعہ فارسی واُردو مکاتیب میں اب علی بخش خاں کے نام کوئی خط موجود نہیں۔ غالب کے مکتوب الیہم کی فہرست کے لیے علی بخش خاں ایک نیا نام ہے علی بخش خاں اور غالب کے دوستانہ تعلقات پر اپنے جس مضمون میں[۲۵] ڈاکٹر حنیف نقوی نے معلومات پیش کی ہے وہ غالب اور علی بخش خاں کے مابین خط وکتابت کے بارے میں خاموش ملتا ہے۔

غالب کے غیر معروف مکتوب الیہ شیخ علی بخش خاں بہادر، متولد ۴ر شوال ۱۲۲۶ھ مطابق ۱۰ر اکتوبر ۱۸۱۱ء نجیب آباد کے متوطن، شیخ محبوب بخش (خلف شیخ امان اللہ) کے فرزند، رام پور کے ساکن، ریاست رام پور کے ملازم اور جنگ آزادیِ ہند کے مشہور رہنما مولانا محمد علی جوہر کے دادا تھے۔ شیخ علی بخش خاں بہادر ۲ر محرم ۱۲۸۳ھ (از روے تقویم مطابق ۷ر مئی ۱۸۶۶ء) کو فوت ہوئے تھے (رک: (۱) مکاتیبِ غالب (متن ص ۲۱) حاشیہ ۴ (۲) بزمِ غالب ص ص ۲۸۹ تا ۲۹۰ (۳) نگار، نئی دہلی ماہ اپریل ۱۹۸۰ ص ۱۷)۔

۳۶

مکاتیبِ غالب (متن ص ۳۶ ۔ حاشیہ ۱) سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے نواب کلب علی خاں کو اُن کے والد نواب یوسف علی خاں ناظم کی وفات کے موقعے پر ۲۷ر اپریل ۱۸۶۵ء کو ایک خط لکھا تھا جس میں باپ کی وفات پر بیٹے کو تعزیت اور جانشینی پر تہنیت پیش کی گئی تھی۔ اب نواب کلب علی خاں کے نام غالب کا یہ خط بھی ناپید ہے اور مثل میں محض اِس مکتوب کا لفافہ موجود ہے۔ غالب کے اِس گم شدہ مکتوب مورخہ ۲۷ر اپریل ۱۸۶۵ء کا جواب والیِ رام پور نواب کلب علی خاں کی جانب سے یکم مئی ۱۸۶۵ء کو بھیجا گیا تھا۔ چنانچہ ۴ر مئی ۱۸۶۵ء کے ایک خط میں غالب نے ان باتوں کا ذکر یوں کیا ہے: "رام پور سے ۔۔۔ ۔۔۔ تعزیت وتہنیت کے خط کا جواب آگیا" (خطوطِ غالب: مرتبہ غلام رسول مہر ص ۴۷۱)۔

۳۷

مکاتیبِ غالب (متن ص ۵۹) سے پتا چلتا ہے کہ غالب نے ۱۹ر ستمبر ۱۸۶۶ء کو نواب کلب علی خاں کے نام ایک خط بھیجا تھا۔ مثل میں اب اِس خط کا صرف لفافہ ملتا ہے۔ غالب کا یہ ناپید خط اردو میں تھا یا فارسی میں اس کے متعلق کچھ عرض کرنا دشوار ہے (بہ حوالہ مولانا عرشی)۔

۳۸

خط نمبر ۱۱۵/۱ (مشمولہ مکاتیبِ غالب متن ص ۸۳) بہ نام کلب علی خاں میں غالب نے اپنے جس مکتوب "مشعر رسید تنخواہ نومبر ۱۸۶۸ء" کے بھیجنے کا ذکر کیا ہے وہ بھی اب ناپید ہے۔ غالب کا یہ گم شدہ خط نواب کلب علی خاں کے نام تھا۔

۳۹

خم خانۂ جاوید سے پتا چلتا ہے کہ میجر نلر نے ایک بار ماسٹر پیارے لال آشوب سے مسجع اور مقفی عبارت میں فرق دریافت کیا۔ آشوب نے یہ سوال غالب کو ارسال کر دیا۔ غالب نے "۔۔۔۔۔ اس کا جواب مع امثال نظم میں لکھ کر دیا جس کا اخیر شعر یہ تھا: ؎

تحریر ہے یہ غالبِ یزداں پرست کی
تاریخ اس کی آج نویں ہے اگست کی" ۲۷

ماسٹر پیارے لال آشوب کے نام اب غالب کا کوئی ایسا منظوم خط نہیں ملتا۔ شاید یہ منظوم مکتوب بھی غالب کے گم شدہ خطوط میں شامل ہو چکا ہے۔

۴۰

غالب کے نام اپنے ایک خط میں خواجہ غلام غوث بے خبر کا بیان ہے: "جناب عالی! کل میں اپڈ میں تھا۔ مرزا حاتم علی مہر ۔۔۔۔۔ میرے پاس بیٹھے تھے کہ ہرکارہ ڈاک کا آپ کا خط لایا۔ میں نے پڑھا، انھوں نے سنا، دونوں نے لطف اٹھایا۔ پہلا مجموعہ (یعنی خطوطِ غالب کا مجموعہ عودِ ہندی طبع اکتوبر ۱۸۶۸ء) اگر ایسا مہمل چھپا تو دوسرے کا چھپنا بہت مناسب ہوا۔ مگر گستاخی معاف: یہ نام اردوے معلیٰ نہایت بھونڈا رکھا گیا ہے"

(فغانِ بے خبر ص ۱۲۹۔ بہ حوالہ عودِ ہندی؛ مرتبہ مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور طبع جون ۱۹۶۷ء پیش لفظ ص ۰۷ تا ۱۷) بے خبر کا یہ بیان بتاتا ہے کہ عودِ ہندی کی طباعت (۱۰ر رجب ۱۲۸۵ھ مطابق ۲۷ر اکتوبر ۱۸۶۸ء) کے بعد بھی غالب نے بے خبر کو ایک خط لکھا تھا۔ اب تلاش کے باوجود مجھے

بے خبر کے نام غالب کا کوئی ایسا خط نہیں ملتا جو ۲۷ ؍ اکتوبر ۱۸۶۶ء کے بعد لکھا گیا ہو۔ یہ خط غالب کے گم شدہ مکاتیب میں شامل کیا جائے گا۔

۴۱ تا ۴۴

مجھے والیِ رام پور نواب کلب علی خاں کے نام غالب کے چند ایسے خطوط ملتے ہیں جن میں خود غالب کے بیانات سے منکشف ہوتا ہے کہ غالب اور نواب مرزا خاں داغ کے درمیان بھی خط و کتابت کا سلسلہ قائم تھا اور غالب نے نواب مرزا خاں داغ کو کم از کم چار خطوط ضرور لکھے تھے۔ داغ دربارِ رام پور میں برسوں مصاحبت اور ملازمت کر چکے ہیں۔ نواب مرزا خاں داغ کے ذکر پر مشتمل خطوطِ غالب (بہ نام نواب کلب علی خاں) کے تراشے سطورِ ذیل میں ملاحظہ ہوں:

(۱) "......... برخوردار نواب مرزا خاں کے خط میں یہ حال مفصل لکھا ہے وہ عرض کرے گا۔"[۲۹]

(۲) "بہت دن ہوئے کہ برخوردار نواب مرزا خاں نے مجھ کو مبارک باد لکھی تھی کہ حضور نے تیرے قرض کے ادا کرنے کی نوید دی ہے اور مقدارِ قرض پوچھی ہے۔ سو میں نے اُن کو لکھ بھیجا تھا کہ آٹھ سو روپے میں میرا قرض تمام ادا ہو جائے گا۔"[۳۰]

(۳) "ایک عبارت کا ایک جزو بہ طریقِ خط ایک انصاف دشمن کو لکھ کر چھپوا دیا ہے۔ پارسل اُس کا نواب مرزا کو ارسال کیا ہے۔ پانچ رسالے وہ میری طرف سے نذر گزرانیں گے ......"[۳۱]
یہاں غالب نے نامۂ غالب بھیجنے کا ذکر کیا ہے جو نواب رام پور کو بہ توسط نواب مرزا خاں داغ بھیجا گیا تھا۔

(۴) "میں نے کل ایک خط نواب مرزا خاں کو لکھا ہے ...."[۳۲]

غالب کے یہ بیانات نواب مرزا خاں داغ کے نام جن چار خطوط کی نشان دہی کرتے ہیں وہ اب غالب کے گم شدہ مکاتیب میں شامل ہو چکے ہیں۔ غالب کے مکتوب الیہم کی فہرست کے لیے نواب مرزا خاں داغ کا نام ایک اہم اضافہ ہے۔ ڈاکٹر سید محمد علی زیدی کا پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ مطالعۂ داغ اس سلسلے میں خاموش ملتا ہے۔ اس کے علاوہ نور اللہ محمد نوری کی کتاب داغ دہلوی بھی[۳۳] داغ و غالب کے درمیان خط و کتابت کے بارے میں کچھ بتانے سے قاصر نظر آتی ہے۔ افسوس کہ اب نہ تو داغ دہلوی کے مجموعۂ مکاتیب[۳۴] میں غالب کے نام کوئی خط ملتا ہے اور نہ رقعاتِ غالب کے فارسی و اردو مطبوعہ نسخے

میں داغ دہلوی کے نام کوئی مکتوب موجود ہے۔

پیشِ نظر مضمون غالب کے مکتوب الیہم کی فہرست میں بہ تفصیلِ ذیل ڈیڑھ درجن سے زائد افراد کا اضافہ کرتا ہے:

۱۔ آزردہ (نام نامعلوم)
۲۔ مولوی فرزند علی اختر
۳۔ چودھری غلام رسول
۴۔ حیدر حسن خاں
۵۔ نواب مرزا خاں داغ
۶۔ جانی بانکے لال رند
۷۔ رائے امید سنگھ
۸۔ شیخ علی بخش خاں
۹۔ شیر زماں خاں
۱۰۔ زین العابدین فوق
۱۱۔ میرا مجد علی قلق
۱۲۔ قمر الدین خاں
۱۳۔ ماسٹر رام چندر
۱۴۔ میر عالم علی خاں مائل
۱۵۔ میر کرم حسین
۱۶۔ عطاء اللہ خاں نامی
۱۷۔ نظام الدین
۱۸۔ نواب حافظ نظام الدین
۱۹۔ نوروز علی

حواشی

۱ے خطوطِ غالب (حصہ اول): مرتبہ مالک رام۔ انجمن ترقی اردو (ہند)، علی گڑھ طبع ۱۹۶۲ء ص ۲۲

۲ے رک خطوطِ غالب: مرتبہ غلام رسول مہر۔ علمی پرنٹنگ پریس، لاہور طبع ۱۹۶۸ء ص ۱۰۵ مع حاشیہ ۲ نیز ص ۵۳۱ مع حاشیہ ۱

۳ے پنج آہنگ مشمولہ کلیاتِ نثرِ غالب: مطبع منشی نول کشور، کان پور طبع اپریل ۱۸۸۸ء

۴ے باغِ دودر: غالب۔ مرتبہ وزیر الحسن عابدی۔ پنجابی ادبی اکیڈمی پریس، لاہور طبع ۱۹۷۰ء

۵ے بزمِ غالب: عبدالرؤف عروج۔ ادارۂ یادگارِ غالب، کراچی طبع مارچ ۱۹۶۹ء ص ص ۷۶ تا ۷۸

۶ے رک: (۱) بزمِ غالب ص ۷۶ (۲) خطوطِ غالب: مرتبہ غلام رسول مہر ص ۱۰۵ (حاشیہ ۲) (۳) تلامذۂ غالب: مالک رام۔ مرکزِ تصنیف و تالیف نکودر (طبع اول) ص ۱۳۶ (۴) نادراتِ غالب، مرتبہ آفاق حسین آفاق مشہور پریس، کراچی طبع ۱۹۴۹ء (حصہ دوم) ص ۱۰۱ (۵) اردوئے معلیٰ (صدی ایڈیشن) حصہ اول جلد اول: مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی۔ مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور طبع ۱۹۶۹ء ص ۷۰ (حاشیہ ۳)

٧ے اردوئے معلی (حصہ اوّل): غالب۔ اکمل المطابع، دہلی (طبع اوّل، مطبوعہ مارچ ١٨٦٩ء) ص ٢٨

٨ے رک: (١) نادراتِ غالب (حصہ دوم) ص ٢٧ (٢) خطوطِ غالب (حصہ اول): مرتبہ مالک رام ص ٥٠

٩ے رک: (١) عودِ ہندی: غالب۔ مطبع مجتبائی، میرٹھ (طبع اوّل، مطبوعہ ١٠ رجب ١٢٨٥ھ مطابق ٢٧ اکتوبر ١٨٦٨ء) ص ١٠٩ (٢) اردوئے معلی (حصہ اول، طبع مارچ ١٨٦٩ء) ص ص ٣٨، ٤٩، ٣٧ نیز ٧٠۔

١٠ے رائے امید سنگھ اور غالب کے درمیان مکاتبت کے مزید ثبوت کے لئے ملاحظہ ہو خطوطِ غالب (حصہ اول): مرتبہ مالک رام ص ٣٣ (خط نمبر ٣٣ بنام تفتہ)

١١ے ماسٹر رام چندر: صدیق الرحمٰن قدوائی۔ شائع کردہ شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی، دہلی طبع اگست ١٩٦١ء (متن) ص ص ٣٠ تا ٣٣

١٢ے اردوئے معلی (صدی ایڈیشن) حصہ اول جلد اول: مرتبہ فاضل لکھنوی ص ٣٠٢

١٣ے خطوطِ غالب: مرتبہ غلام رسول مہر ص ص ٥٢ تا ٥٣۔

١٤ے اردوئے معلی (صدی ایڈیشن) حصہ دوم و سوم: مرتبہ فاضل لکھنوی۔ مجلس ترقی ادب، لاہور طبع اپریل ١٩٧٠ء ص ١٠٥٧۔ اس خط کی تاریخ تحریر ماخذ میں خلافِ تقویم چہارشنبہ ٥ رجون ١٨٦٢ء درج کی گئی ہے۔ میں اسے تقویم کی رو سے چہارشنبہ ٤ رجون ١٨٦٢ء کا خط قرار دیتا ہوں۔

١٥ے رک: (١) پنج آہنگ مشمولہ کلیاتِ نثرِ غالب طبع ١٨٦٨ء ص ص ٢٥٣ تا ٢٥٤ (٢) پنج آہنگ: غالب۔ مرتبہ وزیر الحسن عابدی۔ مطبع عالیہ، لاہور طبع ١٩٦٩ء ص ص ٦٠٥ تا ٦٠٦ (اس کتاب کے لئے جناب ڈاکٹر نیر مسعود صاحب کا ممنون ہوں) (٣) پنج آہنگ: مترجمہ محمد عمر مہاجر۔ ادارۂ یادگارِ غالب، کراچی طبع مارچ ١٩٦٩ء ص ص ١٨٦ تا ١٨٧ (اس کتاب کے لئے میں جناب قاضی عبدالودود صاحب کا متشکر ہوں)

١٦ے میاں نظام الدین نظر بظاہر غالب کے مربی نواب نصیر الدین عرف میاں کالے کے فرزند تھے۔ میاں نظام الدین انقلاب ١٨٥٧ء کے بعد کافی پریشان رہے۔ ان کی تاریخ وفات ٢١ رشوال ١٢٩٦ھ بتائی جاتی ہے (ذکرِ غالب ص ص ٢٨٩ تا ٢٩٠)۔

١٧ے رک: (١) سخنِ شعرا: نساخ۔ مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ طبع اکتوبر ١٨٧٤ء ص ٢٤٩ نیز ص ٣٨٧ (٢) بزمِ سخن: سید علی حسن خاں سلیم۔ مطبع مفید عام، آگرہ طبع ١٨٨١ء/ ١٢٩٨ھ ص ٣١٩ (٣) تذکرۂ طورِ کلیم: سید نور الحسن خاں کلیم۔ مطبع مفید عام، آگرہ طبع ١٢٩٨ھ ص ٨١ (٤) گلستانِ سخن: قادر بخش صابر —

مطبع مرتضوی، دہلی طبع ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۵ء) (۵) سراپا سخن: محسن علی محسن - منشی نول کشور لکھنؤ طبع ۱۸۶۱ء (۶) تذکرۂ نادر: مرتبہ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب۔ کتاب نگر، لکھنؤ طبع ۱۹۵۷ء ص ۴۳ (۷) تلامذۂ غالب: مالک رام ص ۱۰۷ (حاشیہ) (۸) بزمِ غالب ص ص ۲۲۹ تا ۲۳۰

۱۸ــ متنِ مکتوب میں غالب کا بیان ہے: "آج ۱۵ دسمبر کی ہے۔" خط کے خاتمے پر ۱۶ دسمبر ۱۸۵۹ء درج ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خط ۱۵ دسمبر کو لکھا گیا اور ۱۶ دسمبر ۱۸۵۹ء کو پوسٹ کیا گیا ہوگا۔

۱۹ــ مرقعِ ادب (حصہ اول): صفدر مرزا پوری۔ مجتبائی پریس، لکھنؤ (سنِ اشاعت ندارد) ص ۳۰

۲۰ــ رک: (۱) سخن شعرا ص ۱۹ (۲) تلامذۂ غالب ص ۲۹ (۳) بزمِ غالب ص ۲۰

۲۱ــ تذکرۂ نادر ص ۲۲

۲۲ــ چودھری عبدالغفور سرور کے نام ایک خط میں غالب کا بیان ہے: "...... اپنے عمِ والا قدر جناب چودھری غلام رسول صاحب کو فقیر کا سلام نیاز پہنچا دیجیے ....." (عودِ ہندی: غالب طبع ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۸ء) ص ۱۴)۔ غالب کے اس بیان سے چودھری غلام رسول، چودھری سرور کے چچا ثابت ہوتے ہیں۔

۲۳ــ مکاتیبِ غالب: مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی ناظم پریس، رام پور طبع ۱۹۴۶ء (متن) ص ۶ (مع حاشیہ ۵)

۲۴ــ حسن علی خاں کے متعلق مولانا عرشی نے حاشیے میں لکھا ہے: "حسن علی خاں کے متعلق معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کون صاحب تھے" (مکاتیبِ غالب (متن) ص ۲۱ حاشیہ نمبر ۳ (بر صفحہ ۱۳۹)۔ میرے نزدیک نظر بہ ظاہر یہ وہی حسن علی خاں ہیں جن کے ذکر پر مشتمل خطوطِ غالب کے تراشے سطورِ ذیل میں پیش ہیں:

(۱) "..... یہاں کا حال یہ ہے کہ مسلمان امیروں میں تین آدمی نواب حسن علی خاں، نواب حامد علی خاں، حکیم احسن اللہ خاں۔ سو اُن کا حال یہ ہے کہ روٹی ہے تو کپڑا نہیں ......" (اردوئے معلیٰ حصہ اول طبع ۱۸۶۹ء ص ۲۷۲) (۲) "..... نواب فیض محمد خاں کے بھائی، حسن علی خاں مر گئے ......" (عودِ ہندی طبع ۱۲۸۵ھ ص ۹۰) (۳) "......... حسن علی خاں بہت بڑے باپ کا بیٹا سو روپے روز کا پنشن دار، سو روپے مہینے کا روزینہ دار بن کر نامرادانہ مر گیا ....." (اردوئے معلیٰ حصہ اول طبع ۱۸۶۹ء ص ۱۳۴)۔ نواب حسن علی خاں میری اطلاع کے بموجب نجابت علی خاں والیِ ریاست جھجر کے فرزند تھے۔ والد کی وفات پر ریاست حسن علی خاں کے بھائی نواب فیض محمد خاں کے حصے میں آئی

اور حسن علی خاں نے تین ہزار روپے ماہ وار کی پنشن پائی۔ پنشن ہوئی تو نواب حسن علی خاں دہلی میں جا بسے۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد حسن علی خاں کی ماہانہ پنشن تین ہزار روپے سے گھٹ کر سو روپے ماہ وار رہ گئی۔ حسن علی خاں نے عسرت کی حالت میں ۱۶ر فروری ۱۸۶۳ء سے کچھ عرصہ قبل وفات پائی۔ بنظر بہ ظاہر غالب نے انھیں حسن علی خاں کے بیٹوں کے لیے رام پور میں سفارش کی تھی۔ (بزم غالب ص ۱۴۰)

۲۵ے مشمولہ نگار، نئی دہلی ماہ اپریل ۱۹۸۰ء (جلد ۵۸۔ شمارہ $\frac{۱۰}{۱۱}$) ص ص ۶۹ تا ۷۱

۲۶ے تقویم یک صد و دو سالہ۔ مطبع منشی نول کشور لکھنؤ طبع ۱۸۶۵ء مملوکہ رضا لائبریری رام پور میں ایک ماہر تقویم کے ذریعے اضافہ شدہ اندراجات (بابت ۱۸۶۷ء) ملاحظہ ہوں۔

۲۷ے خم خانۂ جاوید (جلد اول): لالہ سری رام۔ مطبع منشی نول کشور، لاہور طبع ۱۹۰۸ء ص ۹۲

۲۸ے رک: (۱) انتخاب یادگار: امیر مینائی۔ تاج المطابع، رام پور مطبوعہ ۴ر ذی الحجہ ۱۲۹۷ھ (طبقہ دوم)
(۲) مطالعۂ داغ: ڈاکٹر سید محمد علی زیدی۔ کتاب نگر لکھنؤ طبع ۱۹۷۴ء ص ۸۷

۲۹ے مکاتیب غالب (متن) ص ۸۳

۳۰ے ایضاً ص ۸۴

۳۱ے ایضاً ص ۴۱

۳۲ے غالب کی نادر تحریریں: مرتبہ خلیق انجم۔ مکتبہ شاہراہ، دہلی طبع فروری ۱۹۶۱ء ص ۹۸

۳۳ے داغ دہلوی: نور اللہ محمد نوری۔ اعظم اسٹیم پریس، حیدرآباد دکن طبع ۱۳۵۵ھ

۳۴ے زبانِ داغ: مرتبہ سید رفیق مارہروی۔ نسیم بک ڈپو لکھنؤ (سنہ اشاعت ندارد) میں تلاش کے باوجود مجھے غالب کے نام داغ دہلوی کا کوئی خط نہیں مل سکا۔

۳۵ے رقعاتِ غالب کے مندرجہ ذیل (فارسی و اردو) مجموعے مجھے خطوطِ غالب بہ نام داغ دہلوی سے خالی ملتے ہیں:
(۱) پنج آہنگ مشمولہ کلیاتِ نثرِ غالب طبع اپریل ۱۸۶۸ء (۲) باغ دو در: غالب۔ مرتبہ وزیر الحسن عابدی (۳) متفرقاتِ غالب: مرتبہ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب۔ کتاب نگر لکھنؤ طبع ۱۹۶۹ء (۴) آثارِ غالب: مرتبہ قاضی عبد الودود۔ مشمولہ علی گڑھ میگزین (غالب نمبر ۴۹-۱۹۴۸ء) (۵) عودِ ہندی طبع ۱۰ر رجب ۱۲۸۵ھ (۶) اردوئے معلیٰ حصہ اول طبع مارچ ۱۸۶۹ء (۷) اردوئے معلیٰ (صدی ایڈیشن، حصہ اول و دوم و سوم: مرتبہ مرتضیٰ حسین فاضل۔ مجلس ترقیِ ادب، لاہور (۸) خطوطِ غالب: مرتبہ مولانا غلام رسول مہر

طبع ۱۹۶۸ء (۹) خطوطِ غالب (حصہ اول)؛ مرتبہ مالک رام (۱۰) نادراتِ غالب: مرتبہ آفاق حسین آفاق (۱۱) مکاتیب غالب: مرتبہ مولانا عرشی طبع چہارم ۱۹۴۶ء (۱۲) غالب کی نادر تحریریں: مرتبہ خلیق انجم

استدراک

(۱) جناب مولانا امتیاز علی خاں کی تحقیق ہے کہ نواب یوسف علی خاں ناظم اور نواب کلب علی خاں کے فرامین کے مسودوں نیز غالب کے خطوط مشمولہ مکاتیبِ غالب میں تقریباً ۲۵ ایسے خطوط کے حوالے ملتے ہیں جو شاید اب موجود نہیں ہیں (مکاتیبِ غالب (دیباچہ) ص ۴۵-۴۴)۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ والیان رام پور کے نام غالب کے خطوط ایک بڑی تعداد میں تلف ہو چکے ہیں۔

(۲) باغِ دودر (متن) ص ۷۱ نیز (تحقیق نامہ) ص ۱۰ میں غالب کے بیان سے انکشاف ہوتا ہے کہ غالب اور مرزا زین العابدین خاں عارف کے درمیان بھی مکاتبت ہوتی تھی۔ عارف کے نام غالب کے خطوط بھی مجھے دست یاب نہیں ہوئے ہیں۔

(۳) شاہ باقر علی باقر آروی اور غالب کے درمیان بھی مکاتبت کا پتا چلتا ہے مگر خطوطِ غالب بنام باقر اب دست یاب نہیں ہوتے (بحوالہ دُودِ چراغ محفل، سید حسام الدین راشدی۔ ادارہ یادگار غالب کراچی طبع مارچ ۱۹۶۹ (ص ۱۴۸ و بعد)

(۴) غالب نے مرزا رجب علی بیگ سرور لکھنوی کے نام بھی متعدد خطوط لکھے تھے جو اب نایاب ہیں (تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو میرا مضمون "غالب اور مرزا رجب علی بیگ سرور")

پروفیسر مختار الدین احمد

مفتی صدر الدین آزردہ کی کچھ نایاب و کمیاب تحریریں

مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی (متوفی ۱۲۸۵ھ) علوم عقلی و نقلی دونوں کے ماہر تھے اور اپنے عہد کے متبحر عالم۔ انیسویں صدی میں دہلی اور اس کے اطراف میں ان جیسے صاحب علم و فضل دو چار ہی ملیں گے اور ان دو چار میں بھی مفتی صاحب بہت ممتاز نظر آئیں گے۔ بایں ہمہ ان کی تصانیف جو ہم تک پہنچی ہیں ان کی تعداد ہاتھ کی انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے، ان کی ذات میں علم و فضل، ذکاوت، جودت طبع، تبحر علمی اور دوسری خصوصیات اس طرح سے جمع ہو گئی تھیں کہ وہ صاحب تصانیف کثیرہ ہوتے، لیکن دوسرے مشاغل نے تصنیفی کاموں کی طرف انھیں توجہ کرنے کا زیادہ موقع نہیں دیا۔ ان مشاغل میں درس و تدریس قلعۂ معلی کی حاضری، فتویٰ نویسی اور پھر دیوان خانے کی صحبتیں سب کچھ شامل ہیں۔ پھر جب وہ ۱۸۴۴ء میں انگریزوں کے عہد میں صدر الصدور مقرر ہوئے تو تالیف و تصنیف کے وقت کا اور نقدان ہو گیا۔ ان مصروفیات نے انھیں جم کر علمی کام کرنے کا موقع نہیں دیا ورنہ وہ ہندوستان کے انیسویں صدی کے بہت اہم اور نامور مصنفین میں شمار ہوتے۔

ان موانع کے باوجود جن کا ذکر اوپر ہوا پھر بھی انھوں نے کچھ تحریریں ایسی یادگار چھوڑی

ہیں جو اہلِ نظر کے لیے سرمۂ چشمِ بصیرت ہیں۔

مفتی صاحب کی تصانیف دو حصوں میں تقسیم کی جا سکتی ہیں، ایک وہ جن کا ذکر صرف کتابوں میں ملتا ہے، اور وہ ظاہرا حوادث کی نظر ہو گئیں[۱]، اور دوسری وہ تصانیف جن کے وجود کی اطلاع ہے اور جو دستبرد زمانہ سے کسی طرح محفوظ بھی رہ گئیں۔

پہلے حصے میں حسب ذیل تصانیف کا ذکر کیا جا سکتا ہے:

۱۔ حاشیۂ قاضی مبارک، معقولات کی مشہور کتاب کی شرح۔ اس کا ذکر مولوی کریم الدین پانی پتی نے تذکرۂ فرائد الدہر میں کیا ہے۔

۲۔ حاشیۂ میر زاہد، یہ بھی مشہور کتاب ہے جو پہلی کتاب قاضی مبارک کی طرح درسِ نظامیہ میں ہمیشہ شریک رہی۔ مفتی صاحب نے اس پر حاشیہ لکھا تھا اور ان کے شاگرد مولانا نور الحسن کاندھلوی (متوفی ۱۱ر محرم الحرام ۱۲۸۵ھ) نے حسب روایت مولانا احتشام الحسن کاندھلوی اس کی نقل تیار کر لی تھی۔ دیکھیے ان کی تصنیف "مشائخ کاندھلہ"۔

۳۔ کتاب در صنائع و بدائع، صاحب فرائد الدہر نے اس کا ذکر کیا ہے۔

۴۔ شرح دیوان متنبی، مولانا ابوالکلام آزاد کے والد ماجد مولانا خیر الدین کی روایت ہے کہ مفتی صاحب نے عربی کے مشہور شاعر متنبی کے دیوان کی شرح بھی لکھی تھی[۲]۔

۵۔ درّ المنضود فی حکم امرأۃ المفقود، یہ دراصل کسی استفتا کا تفصیلی جواب معلوم ہوتا ہے جو رسالے کی شکل میں مرتب ہوا۔ اس کا ذکر اتحاف النبلاء[۳] اور حدائق الحنفیہ[۴] میں ملتا ہے۔ متاخرین میں مولانا ابوالکلام آزاد کی نظر سے یہ کتاب گزری تھی[۵] لیکن ان کے ذخیرۂ کتب میں اب یہ کتاب نہیں ملتی۔

۶۔ تحریر در مسئلہ امتناع نظیر خاتم النبیین:

مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے مفتی صاحب کی اس تحریر کا ذکر کیا ہے۔ مولانا آزاد نے لکھا ہے[۶]: مفتی صدر الدین کی یہ تحریر ایضاح الحق الصریح

کے حاشیے پر مولانا اسماعیل شہید کے رسالہ "یک روزی" کے ساتھ چھپ گئی ہے
جو مولانا فضل حق خیر آبادی کے رسالے کی رد میں ہے۔ تلاش کے باوجود یہ رسالہ
راقم الحروف کو نہ مل سکا۔

اب ان کتابوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو دست برد زمانہ سے کسی طرح محفوظ رہ گئیں:

۱۔ ان میں سب سے اہم "منتہی المقال فی شرح حدیث لا تشد الرحال" ہے۔ یہ رسالہ
فارسی میں ہے، عربی میں نہیں جیسا کہ نام سے ظاہر ہوتا ہے، یہ اس زمانے کی روش
تھی۔ اردو اور فارسی زبان میں لکھی جانے والی کتابوں کے نام بھی عربی میں
رکھے جاتے تھے۔

زیارت قبور کا مسئلہ فقہا کے درمیان عرصے سے وجہ نزاع رہا ہے۔ حدیث ہے:
لا تشد الرحال الا الی ثلاثة مساجد، المسجد الحرام ومسجدی هذا، والمسجد
الاقصیٰ۔ یعنی مسجد الحرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ کے سوا سفر کا اہتمام نہ کیا جائے۔ یہ حدیث
متفق علیہ ہے اور الجامع الصحیح للبخاری اور دوسرے احادیث کے مجموعوں میں ملتی ہے۔

ایک خاص مدرسۂ فکر کے علماء اس حدیث سے استناد کرتے ہوئے قبور انبیاء اور
مزاراتِ اولیاء کی زیارت کے لیے خاص طور بہ شد رحال کر کے جانے کو حرام قرار دیتے ہیں،
اور اس ممانعت میں مرقدِ نبوی کو بھی مستثنیٰ نہیں کرتے۔

لیکن متعدد علماء اور محدثین مثلاً ابن حجر العسقلانی (متوفی ۸۵۲ھ) ابن حجر المکی، علامہ
قسطلانی اور دوسرے علماء نے اس خیال کی تردید کی ہے۔ علامہ تقی الدین السبکی الشافعی نے
"شفاء الاسقام فی زیارۃ خیر الانام" لکھ کر ایک طرح سے اس مسئلے کا فیصلہ کر دیا ہے۔ لیکن
پھر بھی ہر زمانے میں اس مسئلے میں اختلافات رہے۔ مغلوں کے آخری دور میں ولی اللّٰہی خانوادے
میں بھی علماء کی دو جماعتیں ہو گئی تھیں، ایک شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے
متبعین کی اور دوسری جماعت شاہ اسماعیل شہید کی جو اجتہاد اور عدم تقلید کی طرف مائل
تھی، اور سختی سے اس کی حرمت کی قائل تھی۔ اس زمانے میں علماء میں مناظرے تک کی
نوبت آئی، اور دونوں فریقوں کی طرف سے رسالے لکھے گئے۔ ایک نے دوسرے مدرسۂ فکر

کے لوگوں کے جواب لکھے، پھر جواب الجواب مرتب ہوئے اور بعض لوگوں نے اس کے بھی جواب لکھے۔ مفتی صدرالدین صاحب اسی پہلے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو زیارتِ قبور کے جواز کے قائل ہیں۔

منتہی المقال کے دو ایڈیشن راقم کی نگاہ سے گزرے ہیں۔ ایک ایڈیشن مطبع شرف المطالع دہلی کا ۱۲۶۵ھ کا چھپا ہوا ہے جو خواجہ حسن علی کے اہتمام سے شائع ہوا۔ تعداد صفحات ۴۶۔ دوسرا نسخہ مطبوعہ مطبع علوی ۱۲۶۴ھ کا چھپا ہوا ہے۔ ان نسخوں کے آخر میں علامہ فضل حق خیرآبادی کی تقریظ عربی نثر میں ہے اور مفتی سعد اللہ کی عربی نثر و نظم دونوں میں ہے۔ اس کتاب کے مطبوعہ نسخے کتب خانہ ندوۃ العلماء لکھنو، کتب خانہ مدرسۂ دیوبند اور کتب خانہ رضا رام پور میں محفوظ ہیں۔ اس کی ایک نقل اس وقت راقم الحروف کے پیشِ نظر ہے جسے اشاعت کے لیے مرتب کیا جا رہا ہے۔

۸۔ واقعتہ الفتویٰ۔ یہ دراصل ایک استفسار کا جواب ہے جس نے طوالت کی وجہ سے ایک مستقل رسالے کی شکل اختیار کرلی ہے، سائل نے سوال کیا تھا کہ جامع مسجد شاہجہاں بادشاہ دہلی میں نماز جمعہ ادا کرنے کے متعلق آپ کا فتویٰ کیا ہے، جبکہ وہاں تعزیہ، قدم شریف اور دوسری اشیاء موجود ہیں۔ مستفسر نے یہ بھی استفسار کیا تھا کہ نماز جمعہ، مسجد شاہ جہانی میں پڑھی جائے یا جامع مسجد ترک کر کے محلے کی مسجد میں نماز جمعہ ادا کرلی جائے۔

مفتی صاحب نے بہت تفصیلی بحث اس مسئلے پر کی اور مخالفین کے سارے شبہات کا انھوں نے ازالہ کیا۔ وہ شاہجہانی جامع مسجد کو چھوڑکر کسی محلے کی مسجد میں جمعہ کی اقامت کو مسترد کرتے ہوئے ادلۂ واضحہ سے ثابت کرتے ہوئے لکھتے ہیں[9]:

"دمع ہذا اجتماع جمِ غفیر و انبوہِ کثیر از خواص و عوام مسلمین ایں بلدہ در روز جمعہ برائے ادائے نماز در جامع مسجد ایں شہر کہ دریں زمان از شعائر اسلام ہمیں اقامت جمعہ و اعیاد باقی ماندہ است موجبِ تکثیر سواد اسلام و اقامتِ جمعہ علی اکمل وجہ الاشتہار و الاعلان بین الانام است کہ نظارگیانِ حج ج ر یاد از مسجد حرم میدہد، و ایں شوکت اسلام در روز جمعہ

چنانچہ دریں شہر ست امروز در تمامی بلاد ہندوستان مثل آن نشان نمی دہد، و زیارت و کثرت ثواب نماز در جامعے کہ جمعہ گزاردہ شود دران نسبت بمساجد محلات باین جماعت کثیر از اہلِ اسلام باظہار و اعلان تمام کہ ندائے حیّ علی الصلوٰۃ موذنان بگوشِ افلاکیان می رسد مستغنی از بیان است الی صل فضیلتے کہ این جامع جامع الصفات را دریں امور است مساجد دیگر را حاصل نیست۔"

مستفسر نے یہ بھی پوچھا تھا کہ مسجد شاہجہانی میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو حاضر و ناظر جان کر یا رسول اللہ کہہ کر پکارتے ہیں، صلوٰۃ و سلام پڑھتے ہیں اور اپنی حاجتیں پیش کرتے ہیں۔

مفتی صاحب اس شبہے کا ازالہ اس طرح کرتے ہیں[۱۰]:

"وحال ندا انیست کہ ندائے نامشروع ہم موجبِ حرمتِ نماز نمی گردد، چہ جائیکہ ندائے الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ کہ موجب مزید حصول برکات دران مکان است کہ این ندا دہ آنجا کنند، جمہور علماء متاخرین آنرا مستحسن داشتہ اند و تعامل اہلِ حرمین از صدہا سال بر آن است۔"

ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ جامع مسجد میں کچھ تبرکات رکھے ہیں جن کی کوئی سند نہیں، خادمان مسجد صلوٰۃ و سلام پڑھتے ہیں۔ مجر (یعنی قدم شریف) کو بصورت تعزیہ معبد بنا رکھا ہے۔ اس کے گرد طواف کرتے ہیں اور نذر و نیاز پیش کرتے ہیں۔ اس پر پھول رکھتے ہیں، جس طرح بت خانوں کا دستور ہے۔ اس صورتِ حال میں اندرونِ مسجد ہذا نماز جمعہ ادا کرنا مکروہ تحریمی ہے۔

مفتی صاحب فرماتے ہیں[۱۱]:

"وقید "بے سند" در تبرکات کہ مندرج سوال ست لغو است، اگر تبرکاے را سند ہم باشد، آنکہ نیز لائق پرستش و عبادت نیست،

و اگر تبرکات حضرت سیدِ کائنات علیہ افضل الصلوٰۃ و اکمل التحیات
باسناد صحیحہ ثابت باشد یا بغلبۂ ظن صحت آں معلوم است ۔ لائق تلقی
بالقبول و الاکرام و الاحترام است و افعالِ عوام از پرستش و مثل آں
درصورت واقعیت ہم نسبت بہ تبرکات در تبریک آں نقصانے پیدا
نمی کنند ، و نہ محل آں را بت خانہ می سازد و نہ موجب حرمت نماز در مسجد
می گردد ، اگر خود مسجد را عوام طواف کنند و احجار آنرا بوسند قصورِ مسجد
چیست کہ نماز در آں روا نبود"

راقم کے پاس اس رسالے کی ایک نقل محفوظ ہے جو ۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ
رسالہ مطبع احمدی (دہلی) میں باہتمام شیخ ظفر علی چھپا تھا، لیکن اب اس قدر کمیاب ہے
کہ ایک نسخے کے علاوہ راقم کو کسی اور نسخے کی اطلاع نہیں ہے۔

۹۔ کتب خانہ ندوۃ العلماء میں معقولات کے چند مختصر رسالوں کا ایک مجموعہ
محفوظ ہے[۱۲]۔ اس میں رسالۂ ضابطۂ اشکال اربعہ از بحر العلوم مولانا عبد العلی
مکتوبہ ۱۲۵۲ھ کے ساتھ شرح ضابطۃ التہذیب "من تصنیفات المولوی الاعظم
المفتی الاکرم محمد صدر الدین سلمہ" کا ایک قلمی نسخہ بھی ہے جس کی کتابت
جمعہ ۲ ربیع الثانی ۱۲۶۳ھ کو ہوئی ہے۔

۱۰۔ رضا لائبریری رام پور میں ایک مختصر فارسی تحریر[۱۳] شبہہ لزوم لزومیات اعتباریہ
فی العقول المجردہ مصنفہ علامہ فضل حق بن مولانا فضل امام الخیرآبادی المتوفی
۱۲۷۸ھ ہے۔ پہلے شبہہ کا متن فارسی درج ہے۔ اس کے بعد شبہۂ مذکور کا
جواب از مفتی صدر الدین دہلوی مندرج ہے۔

۱۱ رسالہ در تحقیق جواب سوال دعاء بین الخطبتین :
کسی نے مفتی صاحب سے مسئلہ پوچھا تھا کہ دونوں خطبوں کے درمیان
دعا کرنے کا جو طریقہ رائج ہے اس کا شرعی حکم کیا ہے، مفتی صاحب کا جواب
فارسی میں ہے۔ اس کا قلمی نسخہ مولانا عبدالحی فرنگی محلی کے ذخیرۂ کتب میں

تھا جو اب مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ منتقل ہو گیا ہے[۱۴]۔ اس نسخے کے اوراق کی تعداد ۹ ہے۔ اس فتوے کی نقل "خادم الطلبہ خادم حسن عفی اللہ عنہٗ" نے مولانا حافظ عبدالحلیم کے لیے رام پور میں "بمکان مولانا و استاذنا سند الوقت فی الآفاق مولوی محمد جلال الدین خاں افاض اللہ تعالیٰ علینا ببرکاتہ نفعنا بہ و سائر المومنین" تیار کی تھی۔

۱۲۔ رسالۂ منطق: مفتی صاحب کا یہ مختصر رسالہ ۸ صفحات پر مشتمل ہے، منطق کی ایک قلمی کتاب قطبیہ کے ساتھ یہ رسالہ مجلّد ہے اس کے ایک ہی نسخے کا اب تک پتا چلا ہے، اور وہ کتب خانہ رضا رام پور میں محفوظ ہے[۱۵]۔

۱۳۔ تذکرہ در حال ریختہ گویانِ ہند:

آزردہ کے تذکرۂ شعراء کا ذکر سب سے پہلے نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کی "گلشن بیخار" میں ملتا ہے۔ وہ مرزا محمد رفیع سودا کے ترجمے میں استطراداً لکھتے ہیں:

"اشعار منتخب ایشان باید نگریست کہ درچہ رتبتِ عالی و مکانتِ ضخیم جلوۂ ظہور گرفتہ۔ ویدل علی ذلک ما قال شرف الافاضل، فخر الاماثل، قدوۃ المحققین مولانا محمد صدرالدین المتخلص بہ آزردہ در تذکرۂ خود کہ بایجاز و اختصار تمام در حالِ ارباب نظم ریختہ نوشتہ است، تحت ترجمۂ میر تقی المتخلص بہ میر در شرح کلام وے: حیث قال پستش اگرچہ اندک پست است، اما بلندش بسیار بلند۔"

نواب نورالحسن خاں نے طور کلیم اور لالا سری رام نے خم خانۂ جاوید میں جو اس تذکرے کا ذکر کیا ہے قریب بہ یقین ہے کہ ان دونوں کا ماخذ شیفتہ ہی کا بیان ہے، اس کے کسی مکمل نسخے کے وجود کی اب تک اطلاع نہیں ملی ہے۔ حسنِ اتفاق سے کیمبرج یونیورسٹی کے ایک کالج کے کتاب خانے میں اس تذکرے کا ایک نسخہ کسی طرح پہنچ کر دستبردِ زمانہ سے محفوظ رہ گیا۔ اس کا مختصر سا ذکر پروفیسر ایڈورڈ براؤن کی فہرست مخطوطات میں درج ہے۔

لیکن موئف کا نام صرف محمد صدرالدین مختصر سا لکھا ہے۔ انھیں علم نہ ہوسکا کہ یہ آزردہ دہلوی ہیں۔ میرے یورپ کی روانگی کے وقت قاضی عبدالودود صاحب نے اس تذکرے کے مطالعہ کا شوق دلایا تھا، ۱۹۵۴ء میں جب میں کیمبرج گیا تو اس کے مطالعے سے مجھے یقین ہوگیا کہ یہ محمد صدرالدین ، محمد صدرالدین خاں آزردہ دہلوی ہیں اور یہ کہ یہ تذکرہ ان کے عہدِ شباب کی یادگار ہے، افسوس ہے کہ یہ نسخہ ناقص الآخر نکلا، صرف ابتدائی ۴۴ صفحات مجھے ملے جن کا عکس میں اپنے ساتھ لے آیا تھا، خیال تھا کہ تلاش سے اس کا کوئی مکمل نسخہ مل جائے تو اسے شائع کر دیا جائے۔ ایسا نہیں ہے کہ مفتی صاحب اس تذکرے کو مکمل نہ کر سکے ہوں اس لیے کہ شیفتہ کی نگاہ سے مکمل نسخہ گزرا تھا۔ ورنہ وہ میر کے ترجمے کا ذکر نہ کرتے۔ تلاش سے کوئی دوسرا نسخہ نہ ملا تو ناچار نسخہ کیمبرج سے متن مرتب کرکے حواشی و تعلیقات کے ساتھ میں نے جناب مالک رام صاحب کے حکم کی تعمیل کر دی اور انھوں نے اسے علمی مجلس دہلی کے تماہی رسالہ تحریر میں شائع کر دیا۔ رسالۂ تحریر سے انجمن ترقی اردو پاکستان نے ۱۹۷۴ء میں اسے کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے۔

میرا خیال ہے کہ یہ تذکرہ ۱۲۲۹ اور ۱۲۳۲ھ کے درمیانی زمانے میں مرتب ہوا جب آزردہ کی عمر ۲۵ ۔ ۳۰ سال سے زیادہ نہ تھی۔ اس تذکرے سے کسی جگہ بھی ہمارے علم میں کچھ اضافہ نہیں ہوتا۔ موئف نے اس کی ترتیب و تالیف میں مصحفی کے تذکرۂ ہندی اور قائم کے مجموعۂ نغز پر انحصار کیا ہے، اور ستم یہ کیا ہے کہ جہاں ان دونوں تذکروں میں مفید معلومات درج تھیں انھیں نظر انداز کر دیا ہے۔

تذکرے کے مطالعے سے آزردہ کے کسی خاص تنقیدی شعور کا بھی پتا نہیں چلتا۔ بیشتر شعرا کے لیے مروّج ترکیبیں استعمال کی گئی ہیں۔ احسان: اشعار ریختہ، بامزہ و خوش ادا (تذکرۂ آزردہ ص ۲۲) اسد: طبیعتے ہموار (تذکرہ ص ۲۳) آشفتہ: نہایت بامزہ حرف می زند (ص ۲۲) اوباش: طبعش خالی از لطافت نیست (ص ۲۵) برکت: فکرش بلیغ و نظمش فصیح (ص ۲۵) بقا: شیریں مقال، اشعار بلند مرتبہ شاعرانہ دارد (ص ۲۶) بیان: اشعار خوب و دلفریب (ص ۲۷) وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ اس سے نہ خود موئف کا کوئی معیارِ تنقید

قائم ہوتا ہے، نہ شاعر کے کلام ہی کی کسی خصوصیت کا اظہار ہوتا ہے۔ دیکھا جائے تو یہ رسمی تنقید و تعریف صرف ہمارے مشرقی تہذیب و تمدن کی وضعداری کا مظاہرہ ہے اور بس۔

دو مقامات پر البتہ ایسے فقرے اس تذکرے میں ملتے ہیں، جن سے آزردہ کی آزادہ روی کا کچھ نقش ابھرتا ہے۔ میر محمدی بیدار کے حالات میں لکھتے ہیں[۱]: "گاہ گاہ اشعار خوب ہم از وے سرزدہ" — سراج الدین ظفر (جو ابھی سریر آرائے تاج و تخت مغلیہ نہیں ہوئے تھے) کے تذکرے میں ایک فقرہ ملتا ہے[۲]: "اشعار بسیار دارد، گاہے ابیات درست ہم از طبعش سر می زند۔" یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس دوسرے اقتباس میں لفظ "درست" ٹھیک ہے یا نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ غلط نویس کاتب نے کسی اور لفظ کی جگہ اسے لکھ دیا ہو۔ ان دو رایوں پر اس رائے کا بھی اضافہ کر لیجیے جو شیفتہ نے گلشن بیخار میں میر کے متعلق آزردہ کے تذکرے سے نقل کی ہے: "پستش اگرچہ اندک پست است، اما بلندش بسیار بلند۔"

۱۴۔ اشعار آزردہ:

مفتی صدر الدین آزردہ نے طبع رسا پائی تھی۔ وہ ایک نغز گو، خوش گفتار شاعر تھے۔ ان کے کلام میں شگفتگی بھی ہے اور سادگی و پُرکاری بھی اور ان کے یہاں زبان سے گزر کر دل کی بات کہنے کی کوشش بھی پائی جاتی ہے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ وہ شاعر سے زیادہ اچھے نقاد تھے۔ انھیں اچھے شعروں کی پرکھ تھی، اور اشعار کے حسن و قبح پر دو بے لاگ رائے دینے کی صلاحیت و جرأت رکھتے تھے۔ آج غالب کے اردو دیوان کی شاید وہ اہمیت نہ ہوتی اگر مرزا غالب، شیفتہ اور آزردہ کے مشوروں کو قبول نہ کرتے، اور ان کی نکتہ چینیوں اور خردہ گیریوں کا برا مانتے اور دیوان مرتب کرتے وقت بیدردی سے اپنا کلام مسترد نہ کر دیتے۔

آزردہ نے عربی میں بھی شعر کہے ہیں، عربی شعر واجبی سے ہیں، گو وہ عربی نثر لکھنے پر بڑی قدرت رکھتے تھے۔ انھوں نے فارسی میں بھی طبع آزمائی کی ہے، اور بعض اچھے شعر نکالے ہیں۔ اردو اشعار بہت زیادہ نہیں کہے۔ پھر بھی تعداد میں کئی سو ہوں گے۔ راقم

نے ان کا دیوانِ شعر مرتب کیا ہے جو عربی، فارسی اور اردو اشعار پر مشتمل ہے۔ ویسے ان کے اردو اشعار تذکروں اور دوسرے کاغذوں سے تلاش کر کے ڈاکٹر خلیق انجم نے اُردو نامہ کراچی میں چھپوا دیے ہیں اور جناب پرواز اصلاحی نے بھی اپنی کتاب کے آخر میں ان کی متعدد غزلیں درج کر دی ہیں۔

مفتی صاحب کا دیوان کبھی مرتب نہیں ہوا، انھوں نے زیادہ تعداد میں شعر ہی نہیں کہے، کبھی کسی مشاعرے کے لیے کچھ لکھ لیا۔ کبھی طبیعت حاضر ہوئی تو کچھ شعر موزوں ہو گئے، گرفتار ہوئے اور ایک شہر آشوب لکھ دیا۔ لیکن اس مختصر شعری سرمائے میں بھی متعدد شعر ایسے ملتے ہیں جن سے ان کی اعلا شعری صلاحیت اور نغز گوئی کا ثبوت ملتا ہے۔

مختصر حال چشم و دل یہ ہے
اِس کو آرام اُس کو خواب نہیں

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اِک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

دامن اس کا تو بھلا دُور ہے ہاں دست جنوں
کیوں ہے بیکار، گریباں تو مرا دور نہیں

محتسب کو کیا بیکار تری آنکھوں نے
ایک مے خانہ بھی اس دور میں معمور نہیں

فلک نے بھی سیکھے ہیں تیرے سے طور
کہ اپنے کیے سے پشیماں نہیں

اسی کی سی کہنے لگے اہل حشر
کہیں پرسشِ داد خواہاں نہیں

نہ اٹھی بیٹھ کے خاک اپنی ترے کوچے میں
ہم نہ یاں دوشِ ہوا کے بھی کبھی بار ہوئے

امیدِ بُو میں اس کی ملے یوں صبا سے ہم
جس طرح بے خبر سے کوئی بے خبر ملے

آزردہ مر کے کوچۂ جاناں میں رہ گیا
دی تھی دعا کسی نے کہ جنت میں گھر ملے

کامل اس فرقۂ زہاد سے اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

وہ اور وعدہ وصل کا، قاصد نہیں نہیں
سچ سچ بتا یہ لفظ انھی کی زباں کے ہیں

اچھا ہوا نکل گئی۔ آہ حزیں کے ساتھ
اک قہر تھی، بلا تھی، قیامت تھی، جاں نہیں

آزردہ ہونٹ تک نہ ہلے اس کے رُو برو
مانا کہ آپ سا کوئی جادو بیاں نہیں

کچھ نثری تحریریں:

آزردہ عربی نثر لکھنے پر بھرپور قدرت رکھتے تھے اور ان کی فارسی نثر میں ایک خاص قسم کا حسن ہے جو انھیں اپنے بعض معاصرین سے ممتاز کرتا ہے۔ عربی نثر کا وہ نمونہ قابلِ ذکر ہے جو ایک استفسار کے جواب میں انھوں نے سپردِ قلم کیا ہے، یہ استفسار منع صرف اور بعض دوسرے نحوی و لغوی مسائل کے متعلق تھا۔ مفتی صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا عربی جواب پروفیسر محمد شفیع صدر شعبۂ عربی پنجاب یونیورسٹی کو مل گیا تھا، جسے انھوں نے اورینٹل کالج میگزین (شمارہ اگست ۱۹۶۲ء) میں اپنے نوٹ کے ساتھ شائع کر دیا تھا۔ مفتی صاحب کی تحریر کا عکس بھی انھوں نے شائع کر دیا تھا۔ جس کے آخر میں انھوں نے اپنا نام اس طرح لکھا ہے:

محمد صدر الدین الملقب بصدر الصدور، واللہ علیم بذات الصدور، اس پر ان کی مہر ثبت ہے جس میں ۱۲۴۱ھ کے اعداد منقوش ہیں۔ اس پر مولانا مملوک العلی کے دستخط بھی ہیں۔ مفتی صاحب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی عربی کی یہی ایک تحریر ہمارے سامنے ہے۔

ان کی فارسی تحریریں، اس عہد کے دوسرے ادیبوں اور شاعروں کی طرح ابوالفضل اور ظہوری کے رنگ کی ہیں اور انھی کی اتباع میں لکھی گئی ہیں۔ ان کی فارسی نثر کے نمونے تذکرہ "ریاض الفردوس" مرتبہ محمد حسین شاہجہاں پوری اور "آثار الصنادید" مؤلفہ سرسید احمد خاں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

اب کچھ ان کی اردو نثری تحریروں کے متعلق لکھا جاتا ہے۔

مفتی صدر الدین آزردہ نے طویل عمر پائی۔ ان کے احباب، تلامذہ اور عقیدت مندوں کی خاصی تعداد تھی۔ انھوں نے زندگی میں اردو میں کتنے فتوے اور مختلف قسم کی علمی و ادبی تحریریں لکھی ہوں گی۔ کتنے خطوط ان لوگوں کو اور دوسروں کو انھوں نے تحریر کیے ہوں گے افسوس ہے ان کا پتا نہیں چلتا۔ عربی و فارسی کے چند خطوط بعض معاصر مصنفین نے محفوظ دیے ہیں، ان کے چند خطوط جو مولانا نور الحسن کاندھلوی کو لکھے گئے ہیں اور غالباً فارسی زبان میں ہیں، مولانا محمد سلیمان کاندھلوی (متوفی ۱۹۰۸ء) نے کتابی شکل میں جمع کر دیے تھے۔ اس مجموعے میں مولانا فضل حق خیر آبادی، مولانا فضل عظیم خیر آبادی اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی

کے بھی خطوط ہیں[۱۹]۔ اردو میں انھوں نے کتنے خطوط لکھے اس کا اندازہ کرنا آسان نہیں۔ لیکن ان کے وہ خطوط جو انھوں نے ریاست رامپور کے فرماں رواؤں کو لکھے تھے، رامپور کے دارالانشا نے محفوظ کر دیے تھے۔ اور اب بھی کتب خانۂ رضا رام پور میں موجود ہیں۔ ان کی تعداد ۵۳ ہے۔ فارسی خطوط ۴۴ ہیں، اور اردو خطوط کی تعداد ۹ ہے۔ سات خطوط مفتی صاحب کے اعزاء کے ہیں۔ اس طرح مفتی صاحب اور ان کے اعزاء کے ۶۰ خطوط رامپور میں محفوظ ہیں۔

مختصر طور پر بعض خطوط کے مطالب یہاں لکھے جاتے ہیں:

۱۔ آزردہ کا پہلا خط فارسی زبان میں ہے جو ۲۰ رجب ۱۲۷۱ھ کا تحریر کردہ ہے۔ یہ نواب سید محمد سعید خاں بہادر جنت آرام گاہ کی وفات حسرت آیات پر بہ طور تعزیت انھوں نے نواب یوسف علی خاں کو لکھا ہے۔ اس میں تعزیت کم ہے نواب یوسف علی خاں کے مسند ریاست پر متمکن ہونے پر مسرت کا اظہار زیادہ ہے۔ آخر میں کچھ نصائح اور مشورے ہیں: رفاہ و پرورش رعایا و حسنِ سلوک با ملازمان دستوسلان قدیم، و قدر افزائی اہلِ فضل و کمال، خصوصاً آنانکہ نظیر و عدیلِ خود در ہندوستان بلکہ در اقالیم دیگر ہم ندارند" پر زور دیا ہے۔ آخر میں وقت کے لحاظ سے مشورہ دیا ہے: "رضامندی و خوشنودی اہالیانِ دولت انگلشیہ خصوصاً صاحبِ مدار المہام مطمح نظر والا خواہد ماند"

۲۔ دوسرا خط فارسی میں ۲۶ شوال ۱۲۷۱ھ کا تحریر کردہ ہے۔ نواب صاحب نے دو بہنگی قلمی آموں کی جن میں تین سو دانے تھے بھجوائے تھے۔ یہ خط ان کے رسید و شکریے پر مشتمل ہے۔

۳۔ مکتوب فارسی مورخہ ۲ ربیع الثانی ۱۲۷۲ھ شیرینی مطابق فہرست ملفوفہ کی رسید، شکریہ اور صحت و استقامتِ مزاج اشرف کی نوید بشاشت پر حمد الٰہی۔

۴۔ مکتوب فارسی مکتوبہ غرۂ رمضان ۱۲۷۲ھ عنایت نامے کا شکریہ" نوید بشاشت بادویہ صحت و اعتدال مزاج اشرف" پر خدا کا شکر اور کم فرصتی کی وجہ سے عریضہ

حاضر نہ کرنے پر اظہار ندامت۔

۵۔ مکتوب فارسی مورخہ ۱۳ر شوال ۱۲۷۲ھ "یک ہنگی یک صد انبہ ولایتی شرف ورود آوردہ، کام و زبان را شیریں گوار و ارکان و زبان را عذب البیان، سپاس گزار یادفرمائیہا وعنایت ہاے بیشمار گردانید"۔

۶۔ مکتوب مورخہ ۲۰ جمادی الآخری ۱۲۷۳ھ شیرینی کی ٹوکری ملنے پر شکریہ ادا کیا ہے، پھر لکھا ہے: یک صد و بست و پنج انگترہ کہ از خصائص ایں دیار است از بہترین اثمار باغات اینجا ارسال خدمت نمودہ، ہر چند ایں ارمغانِ محقر لائق اتحاف نبود، لیکن از کرم عمیم وعنایات قدیم کہ مبذول حال ترقی خواہ صمیم است، امید پذیرائی آں است۔

۷۔ اس کے بعد چند مکتوبات کے بعد ۱۳ صفر المظفر ۱۲۸۱ھ کا ایک مکتوب ملتا ہے، خلاصہ یہ ہے:

"چھ ماہ سے عارضۂ فالج میں مبتلا ہوں، الحمد للہ کہ اب مرض میں تخفیف ہے۔ اس مدت میں اعزہ و احباب استخبار و استفسار حال میں کثرت سے خطوط بمبئی، مدراس، حیدرآباد، پنجاب وغیرہ سے آئے جن کی نقول آپ کو بھیجنی ایک زائد بات ہے لیکن بعض جلیل القدر انگریزوں کے خطوط کی نقلیں آپ کی خدمت میں روانہ کر رہا ہوں۔

صاحب کمشنر بہادر دہلی اور ڈپٹی کمشنر برائے عیادت تشریف لائے تھے سرجان لارنس بہادر گورنر جنرل ہندوستان سے زیادہ عزت و مرتبہ کسی کو حاصل نہیں، مقام غور ہے کہ وہ کیا تحریر فرماتے ہیں۔

مفتی صاحب کا مقصد ظاہر ہے کہ ایسے ایسے جلیل القدر اصحاب نے توجہ وعنایت فرما کر پرسشِ احوال کی اور آپ کی طرف سے ایک خط بھی خیریت جوئی کا نہ آیا۔ یہ خیال رہے کہ نواب یوسف علی خاں مفتی صاحب کے شاگرد بھی تھے۔

مولانا امتیاز علی عرشی صاحب لکھتے ہیں:

"نواب سید محمد یوسف علی خاں بہادر فردوس مکاں نے سنِ شعور

میں قدم رکھ کر اپنی خاندانی روایات کے تحت طلب علم کی راہ پر گامزنی کی، تو دلی کے اساتذہ میں صدرالدین خاں آزردہ اور مولوی فضل حق خیرآبادی عربی میں اور مرزا (غالب) فارسی میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے، ان سب سے خاندان رام پور کی دوستی تھی۔ نواب فردوس مکاں کی تعلیم انھی حضرات کے سپرد کی گئی"

(دیباچہ مکاتیب غالب ص۳، طبع رامپور، ۱۹۴۴ء)

اس مکتوب میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

از مکتب خانہ برخاستہ نوکری سرکار کردم تا روز غدر۔ وعہدۂ صدرالصدوری از نیازمند شروع شدہ و با بندہ منتہی شدہ، التجا پیش کسے نبردم۔

یک منعم و یک نعمت و یک منت و یک شکر
صد شکر کہ تقدیر چنیں راند قلم را

مگر البتہ یک گونہ افسوس می آید از نارسائی حالِ شکستۂ عاجز کہ از بدوِ ریاست تا روزِ غدر متصل و برابر خطوط جاری ماندند، و دراں زمانہ باکسے ایں سررشتہ جاری نبود، و حالا یک قلم موقوف فرمودند"

مفتی صاحب کے اس مکتوب کے ساتھ بعض انگریزوں کے خطوط کی نقلیں ہیں:
ڈائینشل ممبر سپریم کورٹ اپنے خط مکتوبہ اپریل ۱۸۶۳ء میں لکھتے ہیں:

محب قدیم من سلامت!

میں نہایت خوش ہوا، آپ کی مہربانی سے جو عنایت نامہ پہنچا اس لیے کہ وہ آپ کی تندرستی کی خبر لایا۔

اگر مجھے، جب دو دن دہلی میں ٹھہرا تھا، یہ معلوم ہوتا کہ آپ ایسے بیمار ہیں تو ضرور آپ کے گھر آتا اور ملاقات کرتا۔

میں اس بات سے نہایت خوش اور مسرور ہوں کہ آپ مجھے بھولے نہیں، اور میری یاد چلی جاتی ہے اور ہر وقت میرا خیال ہے. میں یقین کرتا ہوں کہ پھل اس کا اچھا ہوگا۔

آپ کا صادق دوست

مولوی صدرالدین خاں صاحب
صدرالصدور سابق دہلی
کی خدمت میں پہنچے۔ (اپریل)

مسٹر جی۔ ڈبلیو۔ ہملٹن صاحب بہادر کمشنر دہلی:

کرم فرمائے من!

البتہ آپ کو بہت بیمار سن کہ مجھے غم ہوا تھا، لیکن اب امید واثق ہے کہ آپ کو بہت جلد شفائے کامل حاصل ہو جاوے، جس دن سے میں دورہ پر سے واپس آیا ہوں اس دن سے مجھے نہایت کام تھا، ورنہ میں آپ آتا اور اپنی آنکھ سے دیکھتا، اور آؤں اگر آپ کو تکلیف نہ ہو۔ میں بہت عجز سے آپ کی شفا کی دعا مانگتا ہوں۔ فقط

آپ کا صادق دوست
جی، ڈبلیو، ہملٹن

المرقوم ۴ر جنوری ۱۸۶۳ء

مسٹر طامسن ہنری تھارنٹن صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر دہلی

مولوی صاحب مشفق مہربان سلمہ اللہ تعالیٰ

راقم کو دریافت کرنا اس امر کا ضرور ہے کہ جس وقت نواب اعتمادالدولہ افضل علی خاں نے روپیہ واسطے امداد خرچ دہلی کالج داخلہ کیا تھا، کچھ شرائط

بھی بابت اس کے ہوئی تھیں یا بلاشرط دیا گیا تھا۔ اگر کچھ شرطیں ہوئیں تو کیا؛
اور کوئی نوشت بھی ایسی شرائط کی ہوگئی تھیں یا نہیں اور اب وہ تحریر
کسی طرح پر مل سکتی ہے یا نہیں، چونکہ آپ ممبر کمیٹی کالج دہلی تھے، پس
میں یقین کرتا ہوں کہ حال آپ کو معلوم ہوگا۔ لہذا مستکلف کہ جو حال معلوم
ہووے، اس سے آگہی دیجیے۔ زیادہ چہ نگاشتہ آید۔ فقط

راقم طامس ہنری تھارنٹن

مرقومہ ۵ رجولائی ۱۸۶۴ء

طامس ہنری تھارنٹن صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر دہلی

مولوی صاحب مشفق مہربان

سلمہ اللہ تعالیٰ

چھٹیات صاحب کمشنر بہادر قسمت دہلی و چھٹی نواب معلی الالقاب
جان لارنس صاحب گورنر جنرل بہادر کشور ہند مصحوب ملازم آں مہربان
پہنچی، چنانچہ ان کو بعد دیکھنے کے واپس بھیجتا ہوں۔ میں نے پہلے بھی حال
آپ کی علالتِ مزاج کا سنا تھا۔ اور مجھ کو بہ سماعت اس حال کے بہت افسوس
تھا۔ اب کہ معلوم ہوا کہ عارضۂ لاحقۂ آں مشفق میں بہت صحت ہے اور
صرف تدرے قلیل عارضہ باقی ہے۔ امید ہے کہ یہ بھی جلد جاتا رہے۔ میں
دعا کرتا ہوں خدا تعالیٰ آپ کو شفا بخشے اور امید رکھتا ہوں آپ جلد شفا
پاکر نگرانی اہتمام مدارس سرکاری میں بدل مثل سابق توجہ فرمائیں۔

زیادہ شوق

محررہ ۱۶ راپریل ۱۸۶۴ء

اب تک مفتی صاحب نے خطوط فارسی میں لکھے تھے۔ اب ان کا پہلا خط اردو زبان
میں لکھا ہوا جو رام پور کے دفتر انشا میں محفوظ ہے وہ یکم ذیقعدہ ۱۲۸۱ھ کا ہے، جس میں

"تریاق فاروق" اصلی "دواخانۂ سرکار" سے منگوائی گئی ہے۔ نواب یوسف علی خاں کے نام مفتی صاحب کا یہ آخری خط ہے۔

دسواں خط ۱۲ر ذی الحجہ ۱۲۸۱ھ کا لکھا ہوا ہے، یہ بھی اردو میں ہے، اور قدرے طویل ہے، مکتوب الیہ نواب کلب علی خاں ہیں۔ یہ خط نواب یوسف علی خاں کی وفات پر تعزیت میں اور نواب کلب علی خاں کی مسند آرائی ریاست کی تہنیت میں لکھا گیا ہے۔ آخر میں لکھا ہے:

"جب نواب مرحوم مغفور مسند آرائے ریاست ہوئے تھے تو ان دنوں اس عقیدت کیش نے ایک تحریر ان کی خدمت میں بھیجی تھی کہ اس طرح پر عمل کرنا چاہیے، یقین ہے کہ وہ تحریر دفتر میں موجود ہوگی۔ آپ اس کو ملاحظہ فرمائیے"

اب مفتی صدرالدین آزردہ کا ایک مکمل خط پیش کیا جاتا ہے، جو انھوں نے نواب کلب علی خاں کو، ار جنوری ۱۸۶۶ء کو لکھا تھا، یہ اردو میں ہے اور بعض حیثیتوں سے اہم ہے:

نواب مستطاب معلی القاب والا مناقب جلیل المناصب معدنِ تفقد و نوازش بے پایاں، استظہارِ نیازمنداں ملاذ عقیدت کیشاں دامت عنایتکم۔

بعد گزارش مراسم نیازمندی ہا ملتمس آنکہ پیشتر ازیں درجواب صحائف عالی قطعہ عرضہ روانہ کیا گیا ہے۔ یقین ہے کہ بشرفِ ملاحظہ گذرا ہوگا اور وہ جو زبانی پرسش حال اس ترقیخواہ[۱۲] کا از راہِ سرداری نواب عالی مقام نے فرمائے وہ سب زبانی شفیق مرزا اسداللہ صاحب غالب و نیز از خطوط نواب صاحب کرم گستر نواب محمد مصطفےٰ خاں صاحب دریافت ہوا کمال مرہون اور سپاس گزار یاد فرمائیہا فرمایا۔

عالیجاہا اب فی الحال مختصر حال اپنا التماس کرتا ہوں کہ اب عمر اس خاکسار کی قریب ہشتاد سال پہنچی ہے. ابتدائے جوانی سے تا ایام پیری کبھی خالی مشغلۂ درس وتدریس سے نہیں رہا اور اس عرصہ میں صدہا طلبۂ علوم ہر دیار و رئیس زادگان والاتبار کو استفادہ حاصل[22] ہوا. اب تک بھی باوجود پیری و بیماری کے طالب علم جو مکان پر سکونت پذیر ہیں و بعض اطراف وجوانب سے آتے ہیں، بطور تحقیقات استفادہ حاصل کرتے ہیں اور مجھ کو بھی ایک دم بدون اس شغل کے کہ قدیم سے خوگر اس کا ہوں چین نہیں آتا. اور اخراجات ضروری ولابدی طلبۂ مذکورین میرے ذمہ ہے علاوہ اس کے عزیز واقارب بھی میرے ہیں کہ اون[23] کے مایحتاج ضروری کا بھی میں کفیل ہوں اگرچہ اب تک مجکو خاص اپنی ذات کے واسطے کسی امر کی حاجت چنداں نہیں تھی الا بسبب خانہ نشینی وزیر باری و بیکاری سالہا سال کہ محض بہ اتفاق لیل ونہار پیش آتی ہے. فی الحال اس اخراجات کا انصرام مجھ سے محض دشوار ہے اور تکلیف طلبہ و عزیزاں دیکھی نہیں جاتی. خواہی نخواہی باعث گزارش حال ہے :

من کجا و ذوق گل چیدن کجا اے باغباں
نالۂ بلبل بزور اینجا مرا آوردہ است

اگر خدام والا مقام از راہ سرداری وقدرشناسی ارباب کمال کچھ وظیفہ مقررہ برائے چندے کہ جسے گذر اوقات طلبۂ علوم و عزیزاں ہووے، تعین فرمادیں تو باعث نیک نامی کا دنیا میں موجب اجر عظیم کا آخرت میں ہوگا:

با کریماں کارہا دشوار نیست

اور نیز یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ خاکسار آفتاب لب بام ہے. غایت سے غایت اجرا اس وظیفے کا چھ مہینے سے زیادہ نہ کھنچے گا. یقین ہے کہ آپ

.جیسے سردار باہمت سے واسطے مجھ جیسے ترقیخواہ قدیم کے اور پھر ایسے امر خیر میں کہ وہ بھی برائے چند روز ہے توجہ دریغ نہ ہوگی.

اور یہ بھی واضح ہووے کہ باوجودیکہ نواب غفران مآب نواب محمد یوسف علی خاں بہادر مرحوم کو قدیم الایام سے ایک اخلاص اور اعتقاد خاکسار سے تھا، بارہا چاہا کہ کچھ وظیفہ مقرر کر دیا جاوے، شاید مولوی مفتی سعد اللہ صاحب بھی اس سے واقف ہوں، الا تکلیف دہ اون کا نہ ہوا. اب توقع ہے کہ اس مصرع پر عمل ہووے۔

اگر پدر نتواند پسر تمام کند

امید ہے جواب باصواب سے بزرگی معزز فرمائیے اور اس ترقیخواہ کو مدام ترقیخواہ قدیم اپنا جان کر ہمیشہ بارسال مژدہ مزاج مبارک مسرور و خوش وقت فرماتے رہیئے۔ ایام دولت و حشمت مدام رہے۔

راقم آثم [مہر] صدر الصدور سابق دہلی

مرقوم ۱۷ ماہ جنوری ۱۸۶۶ء

مطابق ۲۹ ماہ شعبان ۱۲۸۲ ہجری مقدسہ

لفافے پر پتا اس طرح درج ہے:

انشاء اللہ تعالیٰ در مراد آباد و از آنجا رامپور

بشرف ملاحظۂ مباہجہ نواب صاحب مستطاب معلی القاب والامناقب جلیل المناصب معدن تفقد و نوازش بے پایاں استظہار نیازمندان ملاذ عقیدت کیشاں نواب کلب علی خاں بہادر والی رام پور دامت عنایتکم مشرف باد۔

ضروری ہے از راہ سرداری حرف بحرف ملاحظہ فرمائیے گا۔

الراقم آثم محمد صدر الدین خاں صدر الصدور سابق دہلی

ٹکٹ چسپانیدہ شد

برادر گرامی مولانا امتیاز علی عرشی نے اس خط کا مقابلہ اصل سے کیا تھا اور میرے استفادے کے لیے حسب ذیل سطور لکھ دی تھیں :

عرشی عرض کرتا ہے کہ اس کے جواب میں نواب کلب علی خاں بہادر نے ۶ ر رمضان ۱۲۸۲ھ مطابق ۱۴ ر جنوری ۱۸۶۶ء کو لکھا :

"حسب ترقیم آں کرم فرما مبلغ دوصد روپیہ برای مصارف طلبہ و عزیزان آں مکرم از ماہ جنوری سنہ حال مقرر نمودہ شد. اگر خواستہ خداست ماہانہ ہنڈوی آں بذریعہ رقیمۃ الاخلاص خواہد رسید۔"

مفتی صدرالدین آزردہ نواب صاحب کے نام اپنے آخری خط میں لکھتے ہیں :

" مجھ کو زندگی سے یاس ہے، ایک میری زوجہ ضعیفہ اور دوسرا خواہرزادہ محمد احسان الرحمٰن خاں جس کو میں نے فرزندانہ پرورش کیا ہے. اور نہایت لئیق اور سعادت مند اور نیک چلن ہے. ان دونوں کو آپ کے سپرد کیے جاتا ہوں. اگر ناگوار خاطر عاطر نہو تو میرے بعد ان کی خبر گیری کسی قدر فرماتے رہیں کہ یہ ایک نوع کا حسنِ سلوک میرے بعد بھی ہوگا.

سپردم بتو مایۂ خویش را
تو دانی حسابِ کم و بیش را

اس مکتوب میں آزردہ کا یہ فقرہ بھی ملتا ہے : "شاید یہ میرا آخری خط ہے." اور یہ واقعی ان کا آخری خط ثابت ہوا. ۲۳ ربیع الاول کو انھوں نے یہ خط تحریر کیا تھا اور ابھی یہ شاید رام پور پہنچا بھی نہ ہوگا کہ مکتوب نگار کو پیغامِ اجل آپہنچا اور دوسرے ہی دن ۲۴ ر ربیع الاول کی شام کو وہ اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

اس طرح مفتی صدرالدین آزردہ اور نوابانِ رام پور کی خط و کتابت کا یہ باب ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا. لیکن تاریخ نے نہ وہ باب بند کیا ہے اور نہ اسے فراموش کیا ہے، جو مفتی

صاحب کے انتقال کے بعد ان کے اعزہ وپس ماندگان اور " نواب مستطاب معلی القاب جم قدم، کیواں علم، مخزن اسرار فضل وکمال، مطلع انوار جاہ وجلال، ملجاے عجائز و ماداے ارامل " جناب نواب کلب علی خاں صاحب بہادر والی رام پور کے درمیان تعلقات ومعاملات کا کھلا۔

نواب صاحب کے نام عریضوں میں مفتی صاحب کی نادار بیوہ، لاڈوں کی پلی لاڈو بیگم کبھی اپنے کو "عاجزہ" کبھی "نحیفہ" کبھی "گنہگار" اور کبھی "ضعیفہ" لکھ لکھ کر مالی امداد طلب کرتی رہیں، ان کا خواہر زادہ (محمد احسان الرحمٰن خاں) لکھتا رہا کہ ہم لوگوں کی ماہانہ آمدنی صرف تیرہ روپے ماہوار ہے، اس میں کسی طرح گذر اوقات ممکن نہیں، مدد فرمایئے۔ یہ سب عرائض نواب صاحب کی خدمت بابرکت میں پیش کیے جاتے رہے۔ لیکن منشی سیل چند میر منشی ان عریضوں پر کبھی " پیش نمودہ، حکمے صادر نہ گردید" اور کسی پر " پیش نمودہ شد داخل دفتر گردید" لکھ کر ساری عرضیوں کو داخل دفتر کرتے رہے۔

بھلا ہے:

ایں دفتر بے معنی غرق مے ناب اولیٰ

حواشی

۱۔ مفتی صاحب نے زندگی میں کثرت سے فتاویٰ لکھے ہوں گے، وہ عرصے تک صدر الصدور رہے، جہاں مقدمات کے فیصلے لکھنا ان کے فرائض میں داخل تھا۔ فقیر محمد جہلمی لاہوری حدائق الحنفیہ میں لکھتے ہیں: " اجوبۂ کثیرہ، استفتاآت آپ کے یادگار ہیں۔" (صہ ۴۸۲) اس کتاب کا سال تکمیل ۱۲۹۷ھ ہے، گویا اس وقت بھی بیشتر تحریرات استفتا، مفتی صاحب کی موجود تھیں۔ لیکن اب صرف چند تحریرات اور فتاوے باقی رہ گئے ہیں۔ باقی سب ضائع ہوگئے۔

۲۔ غلام رسول مہر: غالب صہ ۲۸۲، طبع چہارم لاہور، دسمبر ۱۹۴۶ء۔

۳۔ نواب صدیق حسن خاں : اتحاف النبلاء

۴۔ فقیر محمد جہلمی : حدائق الحنفیہ : ۴۸۲ - ۴۸۳

۵۔ غلام رسول مہر : نقش آزاد : ۳۱۳

۶۔ غلام رسول مہر : غالب صہ ۲۷۸، حاشیہ (۱) نیز دیکھئے یہی کتاب صہ ۲۸۲

۷۔ یہ کتاب مولانا ابوالکلام کی نظر سے بھی گزری تھی۔ (غالب صہ ۲۸۲) معلوم نہیں یہ کون سا ایڈیشن تھا۔

۸۔ قاضی مفتی محمد سعد اللہ مراد آبادی کا سال ولادت ۱۲۱۹ھ، ابتدائی تعلیم مولوی عبدالرحمٰن تلمیذ بحرالعلوم ملا عبدالعلی لکھنوی سے حاصل کی۔ ۱۲۳۹ھ میں شاہ عبدالعزیز دہلوی کی مجالس وعظ میں شریک ہوئے۔ درسیات کی مروجہ کتب مولوی محمد حیات لاہوری، اخوند شیر محمد خاں فاضل اور مفتی صدرالدین خاں دہلوی سے پڑھیں۔ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ ۱۲۷۰ھ کے بعد وہ رام پور میں آکر مقیم ہو گئے۔ انھوں نے رامپور میں ۱۲۹۴ھ میں وفات پائی۔ حدائق الحنفیہ ص ۴۸۹۔

۹۔ واقعۃ الفتویٰ صہ نسخہ مملوکہ راقم الحروف

۱۰۔ حوالۂ سابق۔

۱۱۔ واقعۃ الفتویٰ صہ ۱۴ - ۱۵

۱۲۔ کتب خانہ ندوۃ العلما، نمبر کتاب ۲۰۵، نمبر جلد ۱۶۵

۱۳۔ کتب خانۂ رام پور رقم : ۱۱۵۲

۱۴۔ کتب خانہ مولانا آزاد، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نمبر ۹۶/۷۹۴

۱۵۔ کتب خانہ رام پور، رقم : ۲۶۹۴

۱۶۔ تذکرۂ آزردہ صہ ۲۷

۱۷۔ حوالۂ سابق صہ ۵۶

۱۸۔ مولانا آزاد نے یہ مصرع اس طرح لکھا ہے:

دامن اس کا تو بہت دور ہے اے دست جنوں (غالب صہ ۲۸۲)

۱۹۔ جناب نورالحسن راشد کا مضمون "حیات سرسید کا ایک گم شدہ ورق" مطبوعہ رسالہ آج کل نئی دہلی (مئی ۱۹۷۵ء)
۲۰۔ اکثر مقامات پر مفتی صاحب کا املا بدستور رہنے دیا گیا ہے۔
۲۱۔ وہ "ترقیخواہ" اسی طرح ملا کر لکھتے تھے۔
۲۲۔ مفتی صاحب نے "استفادہ حاصل ہونا" اور "استفادہ حاصل کرنا" لکھا ہے، ظاہرا وہ اسے درست سمجھتے تھے۔
۲۳ مفتی صاحب کا بھی اس زمانے کے دستور کے مطابق یہی املا تھا، یعنی اُن، اُس کو 'اون'، 'اوس'، لکھتے تھے۔
۲۴۔ نقل نویس نے "نہ کیجئے گا" لکھا تھا۔ عرشی صاحب نے اصل کے مطابق اپنے قلم سے "نہ کیجے گا" کر دیا ہے۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی

غالب کی دلّی

غالب کی شخصیت اور افکار کی طرح، دلّی کی تاریخ کے بھی دو واضح لیکن مختلف اور متضاد دور تھے۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے، اور ۱۸۵۷ء کے بعد۔ اپنی آٹھ سو سالہ تاریخ میں دلّی نے سیری، کیلوکھڑی، تغلق آباد، فیروز آباد اور شاہ جہاں آباد کے کتنے ہی مختلف النوع پیکر بدلے تھے لیکن اُن سب تبدیلیوں میں ایک تاریخی تسلسل تھا، اور آنے والے ہر دور کی ہر کڑی گزرے ہوتے زمانے کی کڑی سے کچھ اس طرح مربوط تھی کہ ہر تبدیلی میں ارتقا کی دلآویز شان نظر آتی تھی۔ ۱۸۵۷ء میں یہ تاریخی تسلسل ٹوٹ گیا، اور جس دلّی نے سلاطین مغلیہ کے آغوش امن و عافیت میں پرورش پائی تھی، اس وقت ایک ایسے انسان کی طرح جو اپنا حافظہ کھو بیٹھا ہو، ہر طرف حسرت اور مایوسی سے دیکھتی تھی اور خود اپنے وجود سے بیگانہ نظر آتی تھی۔ ایک انگریز شاعر نے اس نوع کی کیفیت کا اظہار اس طرح کیا ہے:

Wandering between two worlds, one dead
The other powerless to be born.

یہی حال غالب کا ۱۸۵۷ء کے بعد دلی میں تھا۔ ایک دلّی دم توڑ چکی تھی، دوسری نے ابھی جنم نہیں لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۸۵۷ء سے پہلے کا غالب، اُس غالب سے

بالکل متناقض ہے جن سے ہماری ملاقات اس ہنگامے کے بعد ہوتی ہے جب اُس کا ذہن حال اور ماضی کے ربط کو سمجھنے سے قاصر، اپنے زخم دل اس طرح دوستوں کو دکھاتا ہے :

"صاحب ! تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا ؟ وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات مہر و محبت پیش آئے، شعر کہے، دیوان جمع کیے ..... ناگاہ، نہ وہ زمانہ رہا، نہ وہ اشخاص، نہ وہ معاملات، نہ وہ اختلاط، نہ وہ انبساط۔ بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہٖ مثل پہلے جنم کے ہے یعنی جس شہر میں ہوں اس کا نام بھی دلّی اور اس محلّے کا نام بھی بلّی ماروں کا محلہ ہے لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا۔"[1]

جو شخص اس طرح دو جنم کی بات کرتا ہو، جو عالم تصور میں اپنے بالا خانے کی سیڑھیوں پر کبھی میر مہدی کو چڑھتے دیکھتا ہو، کبھی یوسف مرزا کی آواز اس کے کانوں میں گونجتی ہو[2] اس کی نفسیاتی کیفیت میں ایسے سماجی طوفان کا بے چین احساس پوشیدہ ہے جس نے زندگی کے مرکز و محور کو بالکل بدل کر رکھ دیا تھا۔ یہ صرف فریب آرزو کی سہل انگاری نہ تھی، اس کے پیچھے بے رحم حالات کے وہ نشتر تھے جنھوں نے غالب کی زندگی کو ایک مجسم مرثیہ بنا دیا تھا۔

---

[1] خط بنام تفتہ، ۵ دسمبر ۱۸۵۷ء

[2] "وہی بالاخانہ ہے اور وہی میں ہوں، سیڑھیوں پر نظر کہ وہ میر مہدی آئے، وہ یوسف مرزا آئے، وہ میرن آئے، وہ یوسف علی خاں آئے.... کیا مجمع برہم ہوا ہے۔ مجھ کو کیا غم ہوا ہے۔" خط بنام میر سرفراز حسین ۱۸۵۸ء

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید
نااُمیدی اس کی دیکھا چاہیے

یا

ہو چکیں غالبؔ! بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

صرف وہی شخص کہہ سکتا تھا جس کے رگ وپے میں زہرِ غم اتر چکا ہو۔

دلّی کی تباہی صرف ایک سیاسی نظام کی تباہی نہ تھی، بلکہ ایک ایسی تہذیب کا زوال تھا جس کے لیے میں تقریباً تین سو سال تک ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک مشترکہ تہذیب کے گیسو سنوارے تھے۔ اس حادثے کے پیچھے ایک پورے اخلاقی نظام کا انتشار تھا۔ کبھی شاعروں نے دلّی کے "شہر آشوب" لکھے تھے، اب اس کے مرثیے لکھنے کا وقت آگیا تھا۔ خسروؔ نے جس "حضرتِ دہلی" کو "کنفِ دین و داد" کہا تھا، وہ اب دلّیِ مرحوم بن چکی تھی۔ ایسے ہوش ربا دور میں سانس لینے والا شاعر، حالات کا مرکب بننے پر مجبور تھا لیکن اس کی صلاحیتیں راکب بننے کا تقاضا کرتی تھیں۔ اس نے حالات کے آگے تو نامرادانہ سپر ڈال دی، لیکن اپنے دل کی دنیا کچھ اس طرح سجائی کہ زندگی کی حقیقتوں میں جو کھویا تھا، وہ انکار کی دنیا میں اُس نے پالیا۔

غدر سے پہلے کی دلّی غالبؔ کی شخصیت کا جز تھی، بعد کی دلّی اس کی اُمیدوں کا قبرستان۔ مغلیہ سلطنت سے اُن کا تعلق ہزار ہا ہزار پیچیدگیوں کے باوجود، ان کے قلب کی انتہائی گہرائیوں میں اترا ہوا تھا۔ مغلیہ سلطنت کا آخری تاجدار یقیناً بے بس اور مجبور تھا، لیکن عوام کی نظر میں قلعے کی حیثیت ایک ایسی نشانی کی تھی جس کے گرد اُن کی تہذیب اور ان کے جذبات دونوں کی پرورش ہوئی تھی۔ حد یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء میں اُن طاقتوں نے بھی جو ایک عرصے سے سلطنت مغلیہ سے برسرِ پیکار تھیں، بہادر شاہ کو اپنا رہبر تسلیم کرلیا اور اس کے جھنڈے کے نیچے

جمع ہوگئیں۔ قلعے کے سیاسی اقتدار کے سوتے خشک ہو چکے تھے، لیکن یہاں کے کارگہِ فکر میں اب بھی تہذیبی قدریں، علمی روایات اور سماجی نظریات ڈھلتے تھے۔ شاہ جہاں کی فیاضیاں، اس کے جشن ماہتابی اور نوروز کی محفلیں اب ماضی کی داستانیں بن چکی تھیں، لیکن قلعۂ معلا میں اب بھی دلّی کی تہذیب کا دل دھڑکتا تھا۔ یہاں جس رسم و رواج پر، جس ادبی رجحان پر، جس تمدنی روش پر قلعے کی مہر لگ جاتی تھی، وہ ہر جگہ مقبول اور معتبر ہو جاتا تھا۔ شاہی خزانے خالی تھے، سلاطین چھتوں پر چڑھ چڑھ کر" بھوکے مرتے ہیں، بھوکے مرتے ہیں" کی آوازیں بلند کرتے تھے[۱] مسکینِ دربار اپنی تنخواہوں کے انتظار میں بے چین رہتے تھے، لیکن غربت اور تنگ دستی میں بھی اپنی روایات کی پاسداری کرتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد وہی غالب جس نے کتنی ہی تنگی سے سہی، لیکن عزت اور ایک گونہ اطمینان کے ساتھ دلّی میں دن گزارے تھے، کاسۂ گدائی لے کر نوابوں کے دربار میں دستک دیتا اور انگریز افسروں کی خوشامد کرتا نظر آتا ہے۔ بقول مولانا ابوالکلام آزاد زمانے کی ستم ظریفی دیکھنی چاہیے کہ غالب جیسے مغرورِ فن و کمال کو ایک خام کار مسند نشیں کے آگے کس کس طرح جھکا کر چھوڑا[۲]۔ ۱۸۳۵ء میں غالب پر چالیس پچاس ہزار روپیہ قرض تھا، لیکن یہ قرضہ امارت کی نشانی تھا اور اس وقت ان کی خود اعتمادی کا یہ عالم تھا کہ ناسخ نے جب حیدر آباد جانے کا مشورہ دیا تو تیار نہ ہوئے، لیکن آخری زمانے میں صرف ۸۰۰ روپیے کے قرض نے صبر و استقلال کا دامن ہاتھ سے چھڑا دیا۔ اور وہ نواب رام پور کے سامنے عاجزانہ عرضِ حال کرتے کرتے تھک گئے۔ وہ غالب جو بہادر شاہ کی بھی ملازمت قبول کرنا اپنے لیے دونِ مرتبت سمجھتا تھا:

---

۱ سیرت فریدیہ، سرسید احمد خاں ص ۲۳ - ۲۴۔

۲ غالب اور ابوالکلام، عتیق صدیقی ص ۲۰۲۔

وہ دن گئے جو کہتے تھے "نوکر نہیں ہوں میں"

کلبِ علی خاں کے سامنے کس عجز اور بے بسی سے کہتا ہے ع

خیرات خوارِ محض ہوں نوکر نہیں ہوں میں [1]

کیا زمانے کی اس بے رحمی سے غالب جیسا حساس انسان اس طرح گزر گیا کہ اس کے قلب کی بے چین دھڑکنیں اس کے اشعار تک نہ پہنچ سکیں ؟ جب اس نے نمناک آنکھوں اور گلوگیر آواز میں کہا تھا:

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار ! اگر تمھیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو، جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

تو حالاتِ گرد و پیش کی بے رحمی کے متعلق سب کچھ کہہ دیا تھا جو ایک خود دار شخص کہہ سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب کی شخصیت اور افکار کے سارے مطالعے اس وقت تک نامکمل رہیں گے جب تک حالاتِ گرد و پیش کے آئینے میں ان نفسیاتی عوامل اور محرکات کا تجزیہ نہ کیا جائے جنھوں نے اس کی شعری فکر کا رُخ متعین کیا تھا۔

سلطنتِ مغلیہ کا زوال گو اٹھارویں صدی میں شروع ہو گیا تھا، اور انیسویں صدی میں تو اس پر نزع کی کیفیت طاری تھی، لیکن یہ خیال صحیح نہیں کہ اس زمانے میں ادبی اور علمی فکر کے سوتے بھی خشک ہو گئے تھے۔ سیاسی نظام نے یقیناً دم توڑ دیا تھا لیکن ذہنی زندگی میں ایک ارتفاعی کیفیت متحرک تھی۔ بظاہر یہ حالات کا تضاد محسوس ہوتا ہے، لیکن اس میں فکرِ انسانی کے نشو و نما کا ایک بنیادی راز پنہاں ہے۔ Compton Ricket نے انگلستان کی علمی اور ادبی تحریکوں کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے:

---

[1] دو شعر ملاحظہ ہوں:

در پر امیر کلبِ علی خاں کے ہوں مقیم — شائستۂ گدائیِ ہر در نہیں ہوں میں
بوڑھا ہوا ہوں، قابلِ خدمت نہیں اسدؔ — خیرات خوارِ محض ہوں نوکر نہیں ہوں میں

"The great flowering of the English Renaissance was not the moment when Drake and Hawkins were defying Philip of Spain. After the defeat of the Armada came the triumphs of Shakespeare"
(A History of English Literature, P. 680)

اگر یہ صحیح ہے کہ آرمیڈا کی شکست نے شیکسپیر کی فکر کو بالیدگی اور اس کی صلاحیتوں کو آب و رنگ بخشا تھا، تو اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندی مسلمانوں کی تاریخ کی عظیم المرتبت شخصیتوں نے اس وقت آنکھ کھولی تھی، جب سلطنتِ مغلیہ کا آفتاب لبِ بام آچکا تھا۔ شاہ ولی اللہؒ، غالب، اور سرسید دورِ انحطاط کی پیداوار تھے، لیکن جس سماج نے اُن کو جنم دیا تھا اس کی علمی، اخلاقی اور فکری صلاحیتوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جس وقت بنگال میں جنگِ پلاسی لڑی جا رہی تھی (۱۷۵۷ء) دلی میں شاہ ولی اللہؒ کا مدرسۂ رحیمیہ علم و عرفان کا مرکز بنا ہوا تھا، اور شاہ صاحبؒ کی نواسنجیوں کے آگے، بقولِ مولانا شبلی غزالیؒ، رازیؒ اور ابنِ رشد کے کارنامے بھی ماند پڑ گئے تھے۔[1] اگر ہندوستان میں علوم اسلامی کی ۹۰۰ سالہ تاریخ کا جائزہ لیا جائے، تو کوئی بھی عالم شاہ ولی اللہؒ کی علمی سرفرازی اور بلندی کا مدمقابل نظر نہیں آئے گا۔ یہ زمانہ مغلوں کے سیاسی اقتدار کے دم واپسیں کا تھا لیکن علمی، تمدنی اور فکری صلاحیتوں میں نمو کی بے پناہ قوت کروٹیں لے رہی تھی، جو چند سال بعد شاہ عبدالعزیزؒ، سید احمد شہیدؒ، شاہ محمد اسماعیلؒ، غالب، سرسید، مولانا مملوک العلی، مفتی صدرالدین آزردہ، اور مومن کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ غالب کی دلی وہ دلی تھی جس میں موجودہ ہندوستان کے معمار اور مسلمانوں کی مہتم بالشان درس گاہوں (مثلاً دیوبند، علی گڑھ، ندوہ) کے بانیوں نے تعلیم پائی تھی۔ غالب کی شخصیت اور اس کا فن اُس مرکز علم میں پروان چڑھا، جہاں مشرق و مغرب، قدیم و جدید میں سرگوشیاں ہو رہی تھیں۔ دلی کالج کے ذریعے جدید علم سے واقفیت کا ایک نیا دور شروع ہوا تھا۔ دلی کی تاریخ میں دو مواقع ایسے آئے ہیں جب تمام عالمِ اسلام کے علما کی گردنیں اس کے سامنے

---

[1] علم الکلام ص ۱۱۷۔

جھک گئی ہیں ۔ ایک فتنۂ تاتار کے بعد، جب بقول ضیاء الدین برنی صاحب تاریخِ فیروز شاہی، دہلی میں ایسے لوگ موجود تھے جو رازی اور غزالی کے مرتبے کو پہنچے ہوئے تھے، اور دوسرے اٹھارویں اور انیسویں صدی میں، جب بقول مولانا رشید رضا، علمائے ہند نے عالم اسلام کے علما کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا تھا۔ [۱]

ٹائن بی Toynbee نے تہذیبوں کے عروج اور زوال کی تاریخ سے بحث کرتے ہوئے بتایا ہے کہ جب روح کا انتشار (schism of the soul) اور سیاسی نظام کا خلفشار (schism of the body politic) انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو نئی تہذیبی قوتیں بیدار ہونے لگتی ہیں اور کچھ ایسے افراد وجود میں آجاتے ہیں جو زوال سے احیا کی صورتیں نکال لیتے ہیں۔ جب ناساعد حالات کی تپش اعماقِ روح تک پہنچتی ہے، تو تجدید واحیا کی قوتوں میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے ۔ اگر پرانی تہذیب میں کچھ جان باقی ہے تو اس کو نئی زندگی مل جاتی ہے ورنہ وقت کا دھارا اُن نئی قوتوں کا رُخ کسی دوسری طرف موڑ دیتا ہے ۔ غالب کی دلّی اسی طرح کی تہذیبی حرکت کا مظہر ہے ۔ ہماری نظریں عموماً سیاسی زوال کی داستانوں میں الجھ کر اُن نئی قوتوں کے ادراک سے محروم ہو جاتی ہیں جن میں مستقبل کی تعمیر کا سامان ہوتا ہے

غالب کی نظر میں دلّی کی ہستی پانچ ہنگاموں پر منحصر تھی: قلعہ، چاندنی چوک، جامع مسجد، جمنا، پھول والوں کی سیر۔[۲] یہ پانچ ہنگامے صرف دلّی کی تمدنی زندگی ہی کے محور نہ تھے، اُن کے گرد غالب کے جذبات و احساسات کی ساری دنیا بنی تھی، یہاں غالب کی اسی دلّی کا جائزہ لیا گیا ہے۔

دلّی کی تمدنی زندگی کا قلب قلعہ تھا ۔ شاہ جہاں کے زمانے سے اس کے اِرد گِرد جو لوگ آباد تھے وہ کسی نہ کسی حیثیت سے دربار سے متعلق تھے۔ ان کی زندگی

---

[۱] تاریخی مقالات، خلیق احمد نظامی ص ۲۱۲۔

[۲] غالب کا خط میر مہدی مجروح کے نام (۲ر دسمبر ۱۸۵۹)

میں قلعے کو مرکزی حیثیت حاصل تھی، وہ اپنے محدود وسائل میں قلعے کی زندگی اور روایات کی نقل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اُن کے مکانوں کی تزئین و آرائش میں، اُن کے دیوان خانوں، حمام، آدابِ نشست و برخاست میں قلعے کی زندگی کا پرتو کتنا ہی مدھم سہی، لیکن نظر ضرور آتا تھا۔ حالات اور وسائل کا فرق ضرور تھا لیکن بنیادی جذبہ ایک ہی کار فرما تھا۔ قلعے میں دیوانِ عام اور دیوانِ خاص تھے۔ متمول طبقے کے مکانوں میں دیوان خانے، متوسط گھرانوں میں مردانے، غریبوں کے مکانوں میں بیٹھکیں —— معاشی حالات اس تہذیبی فکر کو نہ بدل سکتے تھے جو اُن کے وجود میں آنے کا باعث تھی۔

یوں تو دلّی ایک مدت سے "لعب صبیان" بنی ہوئی تھی۔ دکن سے جو طوفان اٹھتا تھا وہ لال قلعے سے آکر ٹکراتا تھا۔ پنجاب سے جو آندھی اٹھتی تھی اس کے زلزلے دہلی میں محسوس ہوتے تھے۔ لیکن ۱۸۰۳ء میں جب لیک کی فوجیں دہلی[۱] میں داخل ہوئیں تو مغل بادشاہ کی حیثیت کمپنی کے ایک ملازم کی سی رہ گئی۔ انگریزوں نے بادشاہ کو ہٹانے میں عجلت سے کام نہیں لیا بلکہ اس کے اقتدار کے سہارے جس کے پیچھے صدیوں کی تاریخ تھی، اپنے اثرات کو مضبوط کرتے رہے۔ بہادر شاہ ۱۸۳۷ء میں تخت پر بیٹھا۔ اس وقت اس کی عمر ۶۲ سال تھی۔ اس میں ذاتی کردار کی بعض خوبیاں ایسی تھیں جو اس کو اپنے پیشرووں سے ممتاز کرتی تھیں لیکن ذاتی کردار کی یہ چند خوبیاں ایک سلطنت کا بوجھ نہیں سنبھال سکتی تھیں۔ ادبی اعتبار سے قلعۂ معلا کی اہمیت مسلم تھی۔ اس زمانے میں دہلی بقول اسیر ہندوستان کا ویمر تھی اور غالب یہاں کا گوئٹے تھا[۲] لیکن قلعہ ایک سراب تھا، جس نے مدتوں حقیقت کا احساس نہ ہونے دیا تھا۔

لال قلعے کے بام و در اب بھی وہی تھے، جہاں شاہ جہاں کے زمانے میں سلطنتِ

---

[۱] غالب کا خط میر مہدی مجروح کے نام (۲ دسمبر ۱۸۵۹ء)۔

[۲] Twilight of the Mughuls, p. 73.

مغلیہ کے عروج و کمال کے جلوے دیکھے گئے تھے، جمنا اب بھی قلعے کی تصویر کو سینے سے لگائے بہتی تھی، اب بھی دربار منعقد ہوتے تھے۔ لال پردہ اسی جگہ لٹکتا تھا جہاں شاہ جہاں نے کبھی لٹکایا تھا۔ خلعت ہفت پارچہ، سہ رقم جواہر اب بھی تقسیم ہوتے تھے۔ بہادر شاہ کی سواری جب باہر نکلتی تو اب بھی توپیں داغی جاتی تھیں۔ لیکن یہ سب کچھ ایک حسین خواب سے زیادہ نہ تھا ـــــ ایسا خواب جس کے گریزپا نظارے ایک لمحے کے لیے دل کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیتے ہیں، لیکن جب آنکھ کھلتی ہے تو حقیقت سوہانِ روح بن کر سامنے آ جاتی ہے۔ جس جمنا کے کنارے کبھی ہاتھیوں کی لڑائیاں دیکھی جاتی تھیں وہاں اب ظلِ سبحانی بٹیروں کی لڑائیاں اور پتنگوں کے معرکے دیکھتے تھے۔ ایڈم میز

(Adam Mez) نے Renaissance of Islam میں زوال سے پہلے بغداد کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ دلی پر بھی صادق آتا ہے۔ جہاں کبھی بدخشان و قندھار پر فوج کشی کے نقشے تیار ہوتے تھے، وہاں اب "سلاطین" کے جھگڑے درد سر بنے ہوئے تھے۔ یہ سلاطین قلعہ کے نو محلوں میں رہتے تھے اور وہاں کی ساری فضا کو مکدر رکھتے تھے۔ جن ایوانوں میں امرا اور والیانِ ریاست کی قسمتیں بنتی اور بگڑتی تھیں، وہاں اب ساہوکاروں سے مزید قرضے حاصل کرنے کی تدابیر پر غور ہوتا تھا۔ مالی پریشانیوں کے باعث ملازمتیں فروخت کی جاتی تھیں۔ انحطاط کے زمانے میں چیزوں کی نوعیت بھی کیسی بدل جاتی ہے۔ شاہی نذرانے جن کا ذکر جہانگیر کی تزک میں جگہ جگہ ملتا ہے، اور جو غالباً امرا کی بڑھتی ہوئی دولت پر ایک پابندی رکھنے کا موثر طریقہ تھا، اب عہدوں کی تجارت اور حصولِ زر کا ذریعہ بن گئے تھے۔ بہادر شاہ کو ایک لاکھ پنشن ملتی تھی، لیکن اخراجات اس سے کہیں زیادہ تھے۔ دربار کے ماحول کا اندازہ لگانے کے لیے چند خبریں سُنا دینا کافی ہوگا:

(۱) ۲۸ راگست ۱۸۴۶ء کی خبر ہے:

" رحیم الدین اور عبداللہ دو شخص دربارِ شاہی میں حاضر ہوئے.....
ایک ایک روپیہ نذر اور دو ٹوکریاں مٹھائی کی پیش کیں۔ اور مرید ہوئے

کی التجا ظاہر کی۔ حضور نے مرید کرلیا۔ اس کے بعد سلوک و عرفان
اور عشق و محبت کی باتیں بیان فرمائیں پھر ہر ایک کو ایک ایک
رومال اور ایک ایک تسبیح دے کر رخصت کیا" [۱]

مذہبی رہنمائی کا یہ چسکا نیا نہیں تھا۔ اکبر نے مرید کرنے کے لیے نشست کے طریقے نکالے
تھے۔ لیکن اکبر کے لیے اس کام کی حیثیت ایک تفریح کی سی تھی، بہادر شاہ کے لیے یہ ایک
سنجیدہ مشغلہ بن گیا تھا یا اگر حقیقت پر غور کیا جائے تو بے رحم حالات سے گریز کا
ایک طریقہ تھا۔

(۲) ۲۴ ستمبر ۱۸۴۷ء کی اطلاع ہے:

"حضور انور نے راکھی کے میلے کی تقریب میں راجہ بھولا ناتھ کو پچاس
روپے اور تخت خاص کے کہاروں کو ایک اشرفی مرحمت فرمائی۔
اس عیش و عشرت کے وقت میں حضور انور نے ایک مطربۂ زہرہ پیکر
ماہ طلعت کو شرف مناکحت سے اعتبار و امتیاز کا رتبہ مرحمت فرمایا۔
اختر محل خطاب دیا۔ دو سو روپیہ ماہوار مقرر فرمایا۔ ایک خواجہ سرا
دو خدمت گار ڈیوڑھی پر مقرر کیے اور اعلا اعلا قسم کے بہت سے
زیور عطا فرمائے"۔ [۲]

شادیاں کرنے کا شوق بقول خواجہ حسن نظامی، بڑھاپے میں بھی جوان تھا!

(۳) ۱۵ اکتوبر ۱۸۴۷ء کی خبر ہے:

"آج حضرت بادشاہ جہاں پناہ خلد اللہ ملکہ، نے بٹیروں کی لڑائی
کا تماشا دیکھا اور بہت خوش ہوئے"۔ [۳]

---

[۱] احسن، اخبار (دلی کا آخری سانس) ص ۹۳۔
[۲] " " (" " ") ص ۱۸۶۔
[۳] " " (" " ") ص ۱۹۱۔

بڑھاپے کی شادیاں، پیری مریدی کا چسکا، بٹیر بازی میں دلچسپی — کسی بادشاہ کی زندگی کے اچھے پہلو کی آئینہ دار نہیں ہیں لیکن یہ ناانصافی ہوگی اگر دربار معلیٰ کی زندگی کے اُن پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا جاتے جن کے ذریعے عوام سے اس کا رابطہ قائم تھا۔ بادشاہ کو جو رقم ملتی تھی وہ اپنے ذاتی مصارف سے زیادہ ان روایات کو برقرار رکھنے میں صرف کرتے تھے جن کا تعلق عوام یا مسلکینِ دربار سے تھا۔ بہادر شاہ کے ہاتھی مولا بخش کا واقعہ عقیدت اور محبت کے ان غیر معمولی جذبات کی عکاسی کرتا ہے جو انسانوں ہی کو نہیں، جانوروں کو بھی بہادر شاہ کی ذات سے پیدا ہو گئے تھے۔ ہر خوشی اور غمی پر خلعتوں کی تقسیم، ہر پریشانی اور تکلیف میں ہمدردی اور دل نوازی، نہروں کے لیے صرف خاص سے خرچ، آندھی، بارش، آتش زدگی میں مصیبت زدوں کی مدد، یہ سارے کام بادشاہ کو کرنے پڑتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ بہادر شاہ اگر ایک طرف کمپنی کا قیدی تھا تو دوسری طرف خاندانِ تیموریہ کی روایات نے بھی اس کو جکڑ رکھا تھا۔ کمپنی کی لگائی ہوئی پابندیاں تو صرف اس کا ہاتھ روکتی تھیں، لیکن اپنے آباؤ اجداد کی روش و روایات کو پورا نہ کر سکنے کا احساس اس کے دل کا خون کرتا تھا!

اسی ماحول میں غالب بھی دربار میں آتے جاتے تھے۔ گورنر جنرل کے دربار سے بھی ان کو خلعتِ ہفت پارچہ، سہ رقم جواہر ملتا، اور دربار معلیٰ سے بھی اُس زمانے میں یہ تعلق تضاد نہیں، بلکہ زندگی کی ایک حقیقت تھا۔ لیکن جب قمار بازی کے مقدمے میں وہ گرفتار ہوئے تو بادشاہ نے سفارشی خط لکھ کر ان کو رہا کرانا چاہا اور کہا: یہ معززین شہر میں سے ہیں۔ یہ جو کچھ ہوا ہے محض حاسدوں کی فتنہ پردازی کا نتیجہ ہے[1] لیکن نواب صاحب کلاں بہادر نے یہ جواب دے کر کہ مقدمہ عدالت کے سپرد ہے، ایسی حالت میں قانون سفارش قبول کرنے کی اجازت نہیں دیتا، بات کو ٹال دیا۔ اکبر و جہانگیر کا جانشین اس طرح درخواست کرتا ہے اور وقت کے اقتدار

---

[1] احسن الاخبار (دہلی کا آخری سانس) ص ۱۷

اعلا کی طرف سے اس کو نامنظور کر دیا جاتا ہے! —— ان معاملات کی اطلاع پاکر عوام کے دل پر جو قیامت گزرتی ہوگی اس کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔

بہادر شاہ جب اپنا زیادہ وقت قطب صاحب کی درگاہ کے نواح میں گزارنے لگے تھے تو اُس کے پیچھے تفریح کا جذبہ نہیں تھا بلکہ قلعے میں رہ کر اختیارات سے محرومی کے شدید احساس سے نجات حاصل کرنا مقصود تھا۔ اپنے کو بے بس اور مجبورِ محض پاکر وہ قلعے کے در و دیوار سے بھی شرم کرتا تھا! سچ یہ ہے کہ بہادر شاہ کی زندگی چشمِ بینا کے لیے ایک عبرت تھی۔ غالب نے کتنی ہی "خسروِ شیریں سخن" کے پانو دھوکر پینے کی بات کہی ہو، لیکن اس کے "دیدۂ عبرت نگاہ" نے اس حقیقت کو خوب سمجھ لیا تھا، دربارِ معلا اب ایک جسدِ بے روح تھا۔ جب انھوں نے کہا:

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

تو بے ثباتیِ عالم کی پوری تصویر اُن کے ذہن میں متحرک تھی، وہ فریبِ ہستی سے باخبر ہو چکے تھے اور اب ان کے لیے "عالم تمام حلقۂ دامِ خیال" سے زیادہ نہ تھا۔

جس طرح قدیم دہلی کی تمدنی زندگی کا مرکز حوضِ شمسی تھا، جہاں صوفیہ، شاعر، ادیب اور علما کے علاوہ سوسائٹی کے وہ لوگ بھی جمع ہوتے تھے جن کی زندگی لہو و لعب، تفریح و تماشے سے عبارت تھی، اسی طرح عہدِ مغلیہ کی دتی کا مرکز جامع مسجد تھی۔ اس کی سیڑھیاں صرف مسجد تک پہنچنے ہی کا ذریعہ نہ تھیں، یہاں دتی کی پوری زندگی اپنے جلوہ ہائے صد رنگ کے ساتھ دیکھی جا سکتی تھی۔ کہیں وعظ ہو رہے ہیں، کہیں افسانہ خواں شور مچا رہے ہیں، کہیں دوا فروش دواؤں کی تاثیر بتا رہے ہیں، شعر و شاعری کی محفلیں منعقد ہو رہی ہیں، کہیں خرید و فروخت کا سلسلہ جاری ہے۔ "مرقع دہلی"[1] کے وہ اجزا جن میں یہاں کے ماحول کا نقشہ پیش کیا گیا ہے، بہت دل چسپ ہیں۔

---

[1] مرقع دہلی از نواب ذوالقدر درگاہ قلی خاں، تاج پریس حیدرآباد۔

جو شخص ادھر نکل آتا تھا، پوری دلّی کی نبض دیکھ سکتا تھا۔ جب شاہ ابو سعید مجددی رحنے انگریزوں کے خلاف فتوا دیا تو پہلا معرکہ مسجد ہی کی سیڑھیوں پر پیش آیا[۱]۔ شاہ محمد اسماعیلؒ کے وعظ اسی جگہ ہوتے۔ ان سیڑھیوں سے جو آواز بلند ہوتی تھی اس کی صداے بازگشت تمام دلّی میں سُنی جاتی تھی۔

شاہ جہاں نے قلعے کا نقشہ کچھ اس طرح بنایا تھا کہ وہ ایک گلاب کی طرح اپنی پنکھڑیاں کھولے نظر آتا تھا۔ سامنے جامع مسجد کے فلک بوس مینار تھے۔ قلعے سے جو سڑکیں مختلف سمتوں میں جاتی تھیں اُن میں دکانیں اور بازار تھے۔ چاندنی چوک تک ایک نہر چلی گئی تھی جس نے اس پورے علاقے کو بڑا دلکش بنا دیا تھا۔ ہر بازار کسی خاص چیز کے لیے مخصوص تھا۔ خاص بازار، اردو بازار، خانم کا بازار یہاں کے خاص بازار تھے۔[۲] بازار خانم میں بساطیوں، جڑاؤ کام کرنے والوں، اور مرصع کاروں کی دکانیں تھیں۔[۳] جامع مسجد کے عقب میں مغرب کی طرف دالیں اور مسالے بکتے تھے۔ ساتھ ہی کوٹھوں پر افیون فروش اپنا کاروبار کرتے تھے[۴]۔ جنوبی سیڑھیوں کے نیچے دور تک بساطیوں کی دکانیں چلی گئی تھیں[۵]۔ شمالی سیڑھیوں کے نیچے بھریوں، پاپڑ والوں، آتش بازوں کی دکانیں تھیں۔ ان مشہور بازاروں سے قطع نظر کوچے کوچے میں دکانیں اور تجارت کے مرکز تھے۔ کوچہ بلی ماران میں آہن گر، کوچہ پنڈت میں

۱۔ ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ ص ۸۹-۸۸۔

۲۔ دیکھیے غالب کا خط عبدالغفور سرور کے نام (ستمبر ۱۸۶۰ء)، لکھتے ہیں: "یہاں شہر ڈھے رہا ہے۔ بڑے بڑے نامی بازار، خاص بازار اور اردو بازار اور خانم بازار کہ ہر ایک بجاے خود ایک قصبہ تھا، اب پتا بھی نہیں کہ کہاں تھے۔"

۳۔ سیر المنازل ص ۳۵۔

۴۔ سیر المنازل ص ۳۴۔

چنڑی بنانے والے رہتے تھے[۱] کوچہ سعداللہ سے جنوب کی طرف قصابوں کی دکانیں تھیں۔[۲]

دلّی کی آبادی اور شہری نظام کی ترتیب کچھ اس طرح تھی کہ پورا شہر محلّوں، بازاروں، کوچوں، چوک، چھتّوں، کٹروں، حویلیوں اور منڈیوں میں بٹا ہوا تھا۔ یہ ترتیب بعض اعتبار سے اُس شہری نظام سے مختلف تھی جو عہدِ سلطنت میں نظر آتی ہے۔ محمد بن تغلق نے جب دولت آباد بسایا تو بقول صاحب صبح الاعشیٰ وہاں ہر طبقے کے لیے ایک حصّہ مقرر کردیا تھا۔ دلّی میں یہ ترتیب کبھی پیدا نہ ہوسکی۔ تعجب کی بات ہے کہ گو اسلامی دنیا کے بعض شہروں کی تاریخیں مثلاً مدینہ منورہ، دمشق اور بغداد کی تاریخیں قرونِ وسطیٰ میں مرتب کی گئی تھیں لیکن دہلی کی تاریخ کا خیال سرسید اور سنگین بیگ سے پہلے کسی کو نہیں آیا۔ اگر عمرانیات کی روشنی میں اس پورے شہر کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ گو کچھ علاقے وزرا، امرا وغیرہ کے نام ضرور تھے، لیکن بیشتر اہلِ حرفہ اور فن کاروں کے نام پر تھے۔ محلہ ردگران، محلہ چوڑی والان، کاغذیوں کا محلہ، جوہری بازار، معماروں کا چھتہ، بزازوں کا کٹرہ، منڈی صابون وغیرہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس سے دہلی کی معاشی اہمیت کا اندازہ بھی لگایا جاسکتا ہے۔ ان بازاروں میں خرید و فروخت کی گرم بازاری کا ایک صدی پیش تر تو حال یہ تھا کہ ایک امیر کی بیوہ نے اپنے لڑکے کو چاندنی چوک کی سیر کے لیے ایک لاکھ روپے کی رقم یہ کہہ کر دی تھی کہ اتنی رقم میں چاندنی چوک کی سیر ممکن نہیں لیکن حالات اس سے زیادہ کی اجازت نہیں دیتے۔[۳]

دلّی کی علمی اور تمدنی زندگی کے ترجمان یہاں کے دیوان خانے تھے مولانا آزاد

---

[۱]۔ سیرالمنازل ص ۲۵۔ ۲۴۔

[۲]۔ سیرالمنازل ص ۲۵۔

[۳]۔ مرقع دہلی، مقدمہ ص ۲۶۔

نے صحیح لکھا ہے کہ دہلی کی ہفت صد سالہ زندگی کی انجمن طرازیوں کی یہ آخری بزم تھی جو ان دیوان خانوں میں دیکھی جا سکتی تھی۔ علما کی یہ نشست گاہیں جہاں بعد مغرب دوست احباب جمع ہوتے تھے، یورپ کے سیلون کی طرح علمی اور ادبی افکار کی تشکیل کا مرکز تھیں۔ یہاں فکر و نظر کے سانچے ڈھلتے تھے۔ یہاں فکر سے فکر ٹکراتی تھی۔ یہاں علم کو " برجان زن" کا سبق پڑھایا جاتا تھا۔ مولانا صدر الدین آزردہ کے دیوان خانے کا ذکر کرتے ہوئے سرسید لکھتے ہیں :

" یہ باتیں تو ایسی صحبتوں کی یادگار ہیں جن کی یاد سے آنسو بھر آتے ہیں۔ کجا وہ صحبتیں اور کہاں وہ صلحا، صرف یاد ہی یاد ہے "۔ [۱]

مولانا آزاد کے والد جب ان دیوان خانوں کی نشستوں کا ذکر کرتے تو بار بار یہ شعر پڑھتے اور آب دیدہ ہو جاتے : [۲]

تمتع من شمیم عراد نجد
فما بعد العشیة من عراد

(نجد کی بہاروں سے لطف اندوز ہو لو، شام ہونے کے بعد یہ بہاریں نہ رہیں گی)

دہلی میں صہبائی، مومن، آزردہ، میر، اشرف، حسرتی کے دیوان خانے علم و ادب کے گہوارے تھے۔ یہی نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دہلی کے ہر عالم اور امیر کا گھر ایک علمی مرکز تھا اور علم کے چرچے گلی اور کوچوں تک پھیلے ہوئے تھے۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی ایک عربی نظم میں، جس کو سرسید نے آثار الصنادید میں نقل کیا ہے لکھتے ہیں :

یا من یسائل عن دھلی و رفعتھا   علی البلاد و ما حازتہ من شرف
ان البلاد اماء و ھی سیدۃ   وانھا درۃ والکل کالصدف

---

[۱] ۔ تصانیف احمدیہ ۔ جلد اول حصہ اول ص ۱۳۶۔

[۲] ۔ غالب اور ابو الکلام ص ۱۰۰۔

فیھا مدارس لوطاف البصیر بھا　　لو تنفتح عینہ الا علی الصحف

(اے وہ شخص جو دہلی کے حالات اور دیگر بلاد پر
اس کی رفعت اور بزرگی کے متعلق دریافت کرتا ہے؛
(تو سن لے) کہ بیشک دہلی آقا اور سردار ہے اور تمام شہر اس کی باندیاں۔
دلی موتی ہے اور تمام شہر ایسے ہیں جیسے سیپیاں؛
اس میں اتنے مدارس ہیں کہ اگر کوئی دیکھنے والا
گشت لگائے تو اس کو ہر جگہ کتابیں ہی کتابیں نظر آئیں گی[۱]،

مدرسے اور خانقاہیں تو کتابوں سے بھری رہتی تھیں، ویسے بھی ہر امیر کے پاس کتب خانے تھے اور ہر شخص کے پاس اپنی پسند کا ذخیرہ جو لوگ کتابیں خریدنے کی استطاعت نہ رکھتے تھے یا جن کو غالب کی طرح کتاب خریدنے کا شوق نہ تھا وہ کتابیں کرایہ پر لے کر پڑھ لیتے تھے۔[۲]

اس زمانے میں دلی میں مدرسوں، خانقاہوں اور مسجدوں کی تعداد کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ قدم قدم پر مدرسہ تھا، کوچہ کوچہ میں مسجد تھی اور گلی گلی میں خانقاہیں۔ سعادت یار خاں رنگین کا بیان ہے کہ نواب نجابت خاں نے (جن کو لارڈ لیک نے جاگیر دی تھی) دو سو مسجدیں یا تو تعمیر کرائی تھیں یا مرمت کرائی تھی[۳] جامع مسجد میں رمضان میں جتنی جگہ تراویح ہوتی تھی اس کا ذکر سن کر حیرت ہوتی ہے۔

حضرت شاہ غلام علیؒ کی خانقاہ دہلی کی سب سے زیادہ بارونق خانقاہ تھی اور بقول حالی "دین دار مسلمانوں کا ملجا و ماوا تھی"[۴] یہاں روم، شام، بغداد، مصر،

---

[۱] آثار الصنادید ص ۵۲۲۔
[۲] یادگار غالب ص ۱۷۔
[۳] اخبار رنگین ص ۶۲۔۶۱۔
[۴] حیات جاوید ص ۳۰۳۔

چین اور حبش تک سے لوگ آتے تھے اور روحانی اصلاح و تربیت کے بعد اپنے ملکوں کو واپس جاتے تھے اور سلسلے کی نشرو اشاعت میں لگ جاتے تھے۔ جہاں تک قرب و جوار کے لوگوں کا تعلق تھا، سر سید کا بیان ہے: "قریب قریب کے شہروں مثل ہندوستان اور پنجاب اور افغانستان کا تو کچھ ذکر نہیں کہ ٹڈی دل کی طرح امڈے تھے"۔[1] اُن کے خلیفہ مولانا خالد کردی جن کا مزار دمشق میں مرجع خلائق ہے، اپنے مرشد کے روحانی اثر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

امین قدس عبداللہ[2] کز التفات او
دہد سنگِ سیہ خاصیتِ لعلِ بدخشانی

شاہ غلام علی کی مقبولیت اور شہرت فقید المثال تھی۔ ہندوستان کے کسی صوفی بزرگ کا اثر اس کی زندگی میں اتنا غیر ممالک میں نہیں پہنچا جتنا شاہ غلام علی کا پہنچ گیا تھا۔

اسی دلّی میں ایک خانقاہ شاہ محمد آفاق کی تھی۔ اُن کے آستانۂ فیض پر بھی عقیدت مندوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادیؒ نے ایک بار مولانا محمد علی مونگیری بانی ندوۃ العلماء سے فرمایا تھا: "ہم نے عشق کی دو دکانیں دیکھی ہیں۔ ایک شاہ غلام علی کی اور دوسری حضرت شاہ محمد آفاق رحمۃ اللہ علیہ کی، کہ اس دکان میں عشق کا سودا بکا کرتا تھا"۔[3] یہ دونوں دکانیں دلّی کی تھیں۔ آج اس عشق کی دکان کا مفہوم سمجھنا اور سمجھانا بھی آسان نہیں۔ وہ دنیا ہی ختم ہو چکی جس میں ان الفاظ کا مفہوم سمجھا جاسکتا تھا۔ غالب چاہے ان دکانوں پر خریداری کے لیے نہ گئے ہوں لیکن اُن کے ہمہ گیر اثرات سے وہ کسی طرح بے تعلق نہیں رہ سکتے تھے۔

اسی دلّی میں اس وقت کالے صاحبؒ، خواجہ نصیرؒ، شاہ غیاث الدین چشتیؒ

---

[1] آثار الصنادید ص ۴۶۵۔

[2] شاہ غلام علی صاحب کا نام عبداللہ تھا۔

[3] فضل رحمانی ص ۳۵۔

شاہ صابر حسینؒ، میر محمدیؒ وغیرہم[1] کی خانقاہیں تھیں اور حقیقت میں رشد و ہدایت کا مرکز تھیں۔ سرسید نے بعض خانقاہوں کا ذکر آثار الصنادید میں کیا ہے جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان کی نظر میں ان خانقاہوں کی دہلی کی زندگی میں کیا اہمیت تھی اور ان کا دائرہ اثر و نفوذ کہاں تک پھیل گیا تھا۔ شاہ و گدا سب ہی ان بزرگوں سے عقیدت و ارادت کا تعلق رکھتے تھے۔ کالے صاحب سے بہادر شاہ کو بھی عقیدت تھی اور غالب بھی اُن سے محبت و عقیدت کا گہرا رشتہ رکھتے تھے۔

مدرسوں میں شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ عبدالقادرؒ، شاہ رفیع الدینؒ کے مدرسے علم و ارشاد دونوں کے مرکز سمجھے جاتے تھے۔ ملک کے گوشے گوشے سے لوگ کھنچ کر یہاں آتے تھے۔ شاہ عبدالعزیزؒ نے ۱۷ سال کی عمر میں اپنے عظیم المرتبت باپ شاہ ولی اللہؒ کی مسند درس سنبھالی تھی۔ اور پورے ساٹھ سال بعد اقلیم علم و دانش پر اس طرح حکمرانی کی تھی کہ سارا ہندوستان اُن کی علمی قلمرو بن گیا تھا۔ مولانا عبید اللہ سندھی کا خیال تھا کہ شاہ ولی اللہؒ کے خواص سے اگر دس آدمیوں نے فیض حاصل کیا، تو شاہ عبدالعزیزؒ کے خواص سے دس ہزار مستفید ہوئے[2]۔ اُن کی علمی و روحانی عظمت کا سکہ پورے ملک میں چلتا تھا۔ سرسید نے لکھا ہے کہ جب تک وہ زندہ رہے علم کا معیار اتنا بلند رہا کہ ہر شخص عالم ہونے کا دعوا نہیں کر سکتا تھا۔ شاہ عبدالقادر، مسجد اکبر آبادی[3] میں رہتے تھے۔ غدر میں یہ مسجد انقلابی تحریک کا مرکز بن گئی تھی، اسی وجہ سے انگریزوں نے اس کو اس طرح تباہ و برباد کیا کہ اس کا نشان تک باقی نہ رہا۔ شاہ ولی اللہؒ کے متعلق اقبال نے صحیح لکھا ہے کہ ان کی فکر میں جدید عہد کی جھلک ملتی ہے۔ ان کی اولاد نے بھی وقت اور حالات کے تقاضوں کو سمجھا اور علوم دینی کو

---

[1] مختصر حالات کے لیے: تاریخی مقالات، ۱۸۵۷ء سے پہلے کی دہلی: علما و مشائخ کا اجتماع ص ۲۲۴-۲۲۵۔

[2] شاہ ولی اللہؒ اور ان کی سیاسی تحریک، از مولانا عبید اللہ سندھی ص ۶۴۔

[3] وقائع عبدالقادر خانی ص ۳۱۶۔

اردو زبان میں منتقل کرنے کا کام شروع کردیا۔

شاہ عبدالعزیزؒ کے شاگردوں میں جن علما کی مسند ارشاد غالب کی دلّی میں علمی مرکز کی حیثیت رکھتی تھی، ان میں مولوی رشید الدین خاں، مولانا مخصوص اللہ، مولانا عبدالحیؒ، مولانا محمد اسحاقؒ، مولانا محمد یعقوبؒ، نواب قطب الدین خاںؒ، مولانا مملوک العلیؒ اپنی اپنی علم کے ستون تھے۔ اور اُن کے مدرسوں سے دلّی کی علمی عظمت قائم تھی، مولانا مخصوص اللہ اور مولانا مملوک العلی کے دامن تربیت سے اگر ایک طرف دیو بند کے اکابر علما مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ وابستہ تھے، تو دوسری طرف علی گڑھ کے بانی سر سید احمد خاں نے بھی ان کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا تھا۔ پرانے نظامِ تعلیم میں صدہا خرابیوں کے باوجود بڑی جان تھی۔ ناقدین نے اس کو صرف نصاب کی روشنی میں دیکھا لیکن اس میں سیرت سازی اور تعمیر شخصیت کی جو بے پناہ طاقت تھی اس پر کبھی غور نہیں کیا۔

غدر سے پہلے کی دلّی کی سب سے اہم تحریک مولانا سید احمد شہیدؒ کی تحریک جہاد تھی۔ اس تحریک نے سوتے ہوؤں کو جگا دیا اور جاگے ہوؤں کو سرگرم عمل کردیا۔ بالاکوٹ سے کلکتہ تک اس تحریک نے ایک آگ لگا دی تھی۔ مومن جیسا شخص جو کوچۂ رقیب میں سر کے بل چلنے کا قائل تھا، بے اختیار پکار اٹھا تھا ؂

الٰہی مجھے ہو شہادت نصیب — یہ افضل سے افضل عبادت نصیب
الٰہی اگرچہ میں ہوں تیرہ کار — یہ تیرے کرم کا ہوں اُمیدوار
تو اپنی عنایت سے توفیق دے — عروج شہید اور صدیق دے

اتنی مختلف النوع تحریکوں کے بیک وقت سرگرم ہونے سے غالب کی شخصیت پر کیا اثر پڑا؟ غالب نے یہ کہہ کر

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے

اپنی وہ ذہنی کیفیت بیان کردی ہے، جو اس ماحول میں پیدا ہو جانی ناگزیر تھی۔ عرفی کی

طرح کبھی کبھی وہ بھی "تا در بتکدہ در سایۂ ایماں رفتم" پر عمل کر گزرتے ہیں۔ اللہ کے حضور میں اپنی شراب نوشی کا جواز کس انداز میں پیش کرتے ہیں ؎

حساب مے و رامش و رنگ و بو | ز جمشید و بہرام و پرویز جو
کہ از بادہ تا چہرہ افروختند | دل دشمن و چشم بد سوختند
نہ از من کہ از ناب مے گاہ گاہ | بہ دریوزہ رخ کردہ باشم سیاہ
جہاں از گل و لالہ پر بوے و رنگ | من و حجرہ و دامنے زیر سنگ

غالب کی قلندرانہ روش ہی نے غوث علی شاہ صاحب کا دل موہ لیا تھا۔ وہ اُن کی کسرِ نفسی، فروتنی اور دل آزاری سے پرہیز کے قائل تھے۔ غالب نہ صوفی تھے، نہ ہو سکتے تھے، لیکن اُن کے قلندرانہ انداز میں صوفیانہ فکر کی پرچھائیاں ضرور تھیں۔

دلی حقیقت میں دھوپ اور چھاؤں کا شہر تھا۔ یہاں زہد اور رندی دونوں کے لیے میدان وسیع تھے۔ مرقعِ دہلی میں دہلی کے ان محلوں کا حال بیان کیا گیا ہے جو عیش و عشرت اور ہنگامہ ہائے ناو نوش میں غرق رہتے تھے۔ محمد بن تغلق کے عہد میں تفریح کے بعض مرکز "طرب آباد" کے نام سے مشہور تھے۔ زمانے کے حالات بدلے اور یہ "طرب آباد" چکلوں، قمار خانوں اور طوائف خانوں میں بدل گئے۔ جب زندگی میں مایوسی اور قنوطیت پیدا ہوتی ہے اور حالات گرد و پیش ناسازگار نظر آنے لگتے ہیں، تو بقول ٹائن بی (Toynbee) کچھ طبیعتیں رقص و سرود، عیش و انبساط میں غمِ روزگار کو بھلانے کی کوشش کرتی ہیں، اور کچھ تصوف کے دامن میں اپنے زخمی احساس کا مداوا تلاش کر لیتی ہیں۔ یہ دونوں صورتیں حالات کے دو مختلف ردِ عمل کی ترجمانی کرتی ہیں؛ لیکن زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہتیں جب وقت کا جابر ہاتھ حرکت میں آتا ہے، تو زاہد کو صومعے سے اور رند کو خرابات سے کھینچ نکالتا ہے۔ دلی کی تاریخ میں اُن سماجی اور عمرانی عناصر کا تجزیہ بہت بصیرت افروز ہوگا جنھوں نے قدیم تمدن سے رشتہ کاٹ کر زندگی کے نئے حقائق سے آشنا کیا، اور مدرسہ و خانقاہ کے ساتھ ساتھ اور تمدنی مرکزوں کی حالت بھی بدل دی۔ مغلیہ سلطنت سے ایک پورا معاشی نظام وابستہ

تھا۔ جب مغلیہ سلطنت کا تار و پود بکھرا، تو وہ سب تیلیاں جن سے یہ نظام بندھا ہوا تھا منتشر ہوگئیں۔ نئے سماجی نظریات بننے لگے، نئے طبقات اُبھر آئے، پُرانے کاروبار سرد پڑ گئے، جن پیشوں سے خاندانوں کی گزر بسر ہوتی تھی، ان کو اب کوئی پوچھنے والا نہ رہا، پرانا معاشرہ ٹوٹ کر نئے معاشرے کے لیے راہ ہموار کرنے لگا۔ غالب نے شاعرانہ تیز نگاہی کے ساتھ وقت کے بدلے ہوئے تیور کو سمجھا اور وقت سے صلح کرلی۔ جب سرسید نے آئین اکبری پر تقریظ لکھنے کی فرمائش کی تو انھوں نے اس پورے تمدنی سرمایے سے اپنا تعلق منقطع کرنا چاہا جو اُن کی رگ و پے میں پیوست تھا۔ اور اکبر کے کارناموں کو انگریزی حکومت کے سامنے ہیچ قرار دیا۔ یہ آواز غالب کے دل کی نہ تھی، وقت کی پکار تھی۔ ان کا دماغ اس طرح حالات سے صلح کرنی چاہتا تھا[۱]۔ اس کے پیچھے بھی وہی کیفیت تھی جس سے مجبور ہوکر نواب کلب علی خاں کے سامنے وہ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگے تھے " میں نے خداوند نعمت کا حکم مان لیا اور اپنی تحقیق سے باز آیا۔"[۲]

اس معاشی ابتری اور سماجی شکست و ریخت کے باوجود دلی کی کیفیت بھی عجیب تھی۔ یہاں کے میلے اور تہوار بالخصوص کلب اپنی دلکشی میں جواب نہ رکھتے تھے۔ یہ سب ایک ایسے تمدن کی پیداوار تھے جس کے ارتقا میں ہندو اور مسلمان برابر کے شریک رہے تھے اور جو سلطنت مغلیہ کی توانائی کا حقیقی سبب تھا۔ سرسید نے یہاں کے بہت سے کلبوں میں اپنی ابتدائی زندگی کے اوقات گزارے تھے۔ حالی کا

---

[۱] ۔ کہتے ہیں ؎

گر ز آئیں می رود با ما سخن ۔۔۔ چشم بکشا، اندریں دیر کہن
صاحبان انگلستاں را نگر ۔۔۔ شیوہ و انداز ایناں را نگر
حق ایں قوم است آئین داشتن ۔۔۔ کس ندارد ملک بہ زیں داشتن

[۲] ۔ غالب اور ابوالکلام ص ۲۰۲ ۔

بیان ہے : " باغوں کی سیر کو دوستوں کے ساتھ جاتے تھے اور وہاں راگ رنگ اور دعوتوں کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے، ہولی کے جلسوں اور تماشوں میں جاتے تھے پھول والوں کی سیر میں خواجہ صاحب پہنچتے تھے اور وہاں کی صحبتوں میں شریک ہوتے تھے ... اس زمانے میں خواجہ محمد اشرف ایک بزرگ دتی میں تھے۔ اُن کے گھر پر بسنت کا جلسہ ہوتا تھا .... ایک جلسہ رائے پران کشن کے یہاں ہوتا تھا، ان میں بھی وہ شرکت کرتے تھے " [۱]

تیراندازی، تیرنے اور پتنگ اُڑانے کے کلب تھے۔ تیراندازی کے کلب میں ہندو مسلمان سب شریک ہوتے تھے۔ سرسید نے ایک ہندو تیرانداز کا ذکر کیا ہے جو تیر چلاتے وقت " اللہ غنی" کہتا تھا، چنانچہ اس کا نام " اللہ غنی" ہی پڑگیا تھا۔[۲] رنگین نے دتی میں تیراندازی کا ذکر کرتے ہوئے گلاب سنگھ کا حال لکھا ہے وہ " اللہ اکبر" کہہ کر تیر چلاتا تھا۔[۳]

گرمی اور برسات میں لوگ تیرنے کے لیے جمنا کے کنارے جمع ہوتے تھے۔ سرسید کا بیان ہے :

" میں نے اور بڑے بھائی نے اپنے والد سے تیرنا سیکھا تھا۔ ایک زمانہ تو یہ تھا کہ ایک طرف دلی کے مشہور تیراک مولوی علیم اللہ کا غول ہوتا تھا، جن میں مرزا مغل اور مرزا طغل بہت سربرآوردہ اور نامی تھے اور دوسری طرف ہمارے والد کے ساتھ ساتھ سو سوا سو شاگردوں کا گروہ ہوتا تھا۔ یہ سب ایک ساتھ دریا میں کودتے تھے اور مجنوں کے ٹیلے سے شیخ محمد کی بائیں تک یہ سارا

---

[۱] . حیات جاوید۔ ص ۵۴ اور آگے۔

[۲] . سیرت فریدیہ، از سرسید احمد خاں ص ۴۴۔

[۳] . اخبار رنگین ۔ ص ۶۳۔

گروہ تیرتا جاتا تھا" [1]

تیراکوں کے کچھ گروہ زینت المساجد کے پاس نواب احمد بخش خاں کے باغ کے نیچے جہاں جمنا بہتی تھی، جمع ہوتے تھے اور مغرب کی اذان تک وہاں تیرتے رہتے تھے۔ دلی کی اس زندگی سے غالب کا قریبی تعلق تھا۔ وہ خود نہ تیرتے ہوں لیکن یہ سب استادان فن دہلی کے اس طبقے سے تعلق رکھتے تھے جس کا غالب سے بھی گہرا رشتہ تھا۔

پھول والوں کے میلے میں چھوٹے بڑے، ہندو مسلمان سب شریک ہوتے تھے۔ بہادر شاہ نے ۱۵ر اکتوبر ۱۸۴۷ء کو کلید خانے کے داروغہ کو حکم دیا:

" پھول والوں کی سیر میں ہمارا ابھی جانے کا ارادہ ہے۔ بیگمات کے آنے جانے کی بھی کوئی صورت ہونی چاہیے۔ میرے خیال میں مناسب یہ ہے کہ ڈیوڑھی عدالت سے لے کر لال پردہ تک قناتیں ایستادہ کردی جائیں " [2]

پھر مینا بازار اور جوہری بازار لگانے کا حکم ہوتا ہے اور حسین مرزا ناظر کو ہدایت کی جاتی ہے کہ

" شہر سے جوہری بچوں اور صنعت پیشہ لوگوں کے لڑکوں کو بلاکر مہتاب باغ میں مینا بازار اور جوہری بازار لگایا جائے" [3]

غدر ۱۸۵۷ء نے دلی کی یک دم بساط الٹ دی۔ غالب کے یہ اشعار چاہے کسی وقت لکھے گئے ہوں، لیکن اس صورت حال کی بہترین ترجمانی کرتے ہیں ؎

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گلفروش ہے

---

[1] حیات جاوید ص ۵۰۔

[2] احسن الاخبار (دلی کا آخری سانس) ص ۱۹۳۔

[3] احسن الاخبار (دلی کا آخری سانس) ص ۱۹۳۔

یا صبحدم جو دیکھئے آکر تو بزم میں
نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کو انتقامی آگ کے شعلوں میں ڈال دیا۔ دہلی کے ہزاروں باشندے جن میں عالم بھی تھے، عامی بھی، جوان بھی، بوڑھے بھی، دربار سے متعلق بھی اور بے تعلق بھی، اس ہنگامۂ دار و گیر کی نذر ہو گئے۔ صہبائی کو جس ظالمانہ انداز سے ختم کیا گیا اس نے آزردہ کے دل و دماغ کو معطل کر دیا، اور وہ بے اختیار پکار اٹھے ؎

روز وحشت مجھے صحرا کی طرف لاتی ہے
سر ہے اور جوشِ جنوں، سنگ ہے اور چھاتی ہے
ٹکڑے ہوتا ہے جگر جان پہ بن جاتی ہے
مصطفیٰ خاں کی ملاقات جو یاد آتی ہے
کیوں نہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

غالب کے اس شعر کا پس منظر ان حالات کے سوا کیا ہو سکتا ہے ؎

اس رنگ سے اٹھائی کل اس نے اسد کی نعش
دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے

یہ وہی حلقہ تھا جس سے غالب کو قلبی تعلق تھا۔ اُن کے دل کا اس وقت کیا عالم ہوا ہوگا، اس کا اندازہ اُن کے ایک جملے سے لگایا جا سکتا ہے۔ لکھتے ہیں: "اسی شہر میں قلزم خون کا شناور رہا ہوں۔"[۱] جب وہ اپنے مقتول ساتھیوں کا تصور کرتے تھے تو بے اختیار اُن کی زبان سے نکل جاتا تھا "میں علی کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ ان اموات کے غم میں اور زندوں کے فراق میں عالم میری نظر میں تیرہ و تار ہے۔"

---

[۱] - خط بنام چودھری عبدالغفور سرور، مورخہ ستمبر ۱۸۶۰ء۔

دلی کی یہ تباہی مکمل تھی [1] دلی کتنی ہی بار لٹی اور بسی تھی، لیکن یہ تباہی صرف دلی شہر کی نہ تھی، یہ ایک تہذیب، ایک ثقافت، ایک تمدن کی بربادی تھی۔ غالب نے میر مجروح کے نام ایک خط میں دہلی کو ایک اکھڑے ہوئے درخت سے تشبیہ دی ہے۔[2] افراد اکھڑ کر

---

[1] ۔ غالب کے کچھ خطوں سے اس موقع پر نقل کرنا شاید بے محل نہ ہو۔ انورالدولہ شفق کو ایک خط (مورخہ ۲۴ اگست ۱۸۶۰ء) میں لکھتے ہیں :

"حضرت! انہدام مساکن و مساجد کا حال کیا گزارش کروں؟ بانی شہر کو وہ اہتمام مکانات کے بنانے میں نہ ہوگا جو اب والیان ملک کو ڈھانے میں ہے۔ اللہ اللہ! قلعہ میں اکثر اور شہر میں بعض بعض وہ شاہجہانی عمارتیں ڈھائی گئی ہیں کہ کدال ٹوٹ ٹوٹ گئے ہیں بلکہ قلعے میں تو ان آلات سے کام نہ نکلا، سرنگیں کھودی گئیں اور بارود بچھائی گئی اور مکانات سنگین سے اڑا دیے گئے۔"

مجروح کو لکھتے ہیں :

"پرسوں میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا۔ جامع مسجد ہوتا ہوا، راج گھاٹ دروازے کو چلا۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازے تک بے مبالغہ ایک صحرا لق و دق۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں وہ اگر اٹھ جائیں تو ہو کا عالم ہو جائے۔"

ایک دوسرے خط میں مجروح ہی کو لکھتے ہیں :

"کشمیری کٹرا بگڑ گیا ہے۔ ہائے! وہ کیا اونچے اونچے در اور وہ بڑی بڑی کوٹھریاں دو رویہ نظر نہیں آتیں کہ کیا ہوئیں۔"

حسین مرزا کو لکھتے ہیں :

"نیل خانہ، فلک پیرا، لال ڈگی کے محاذی کے مکانات سب گرائے گئے۔"

مجروح کو لکھتے ہیں :

"دلی، واللہ اب شہر نہیں ہے، کمپ ہے۔"

[2] ۔ مدخو ۲ ستمبر ۱۸۵۹ء

بس بھی جاتے ہیں، لیکن جب تمدن اکھڑتے ہیں تو ان کی آبادکاری آسان نہیں ہوتی۔ ۱۸۵۷ء نے شاہ و گدا سب ہی کو بے یار و مددگار کر دیا۔ اور اس بربادی نے اخلاقی تباہی و گمراہی کی راہیں ہموار کر دیں۔ تفتہ کو ایک خط میں غدر کے چار سال بعد (۹ اپریل ۱۸۶۱ء) غالب لکھتے ہیں:

> " بہ حقیقت جب تم پر کھلتی کہ تم یہاں ہوتے اور بیگمات قلعہ کو پھرتے چلتے دیکھتے۔ صورت ماہ دوہفتہ کی سی اور کپڑے میلے، پائنچے لیر لیر، جوتی ٹوٹی، یہ مبالغہ نہیں۔" [۱]

غالب ہی کا بیان ہے کہ قلعہ کی عورتیں جو بوڑھی تھیں وہ کٹنیاں ہوگئی تھیں اور جوان کسبیاں بن گئی تھیں۔ [۲]

غالب نے دلی پر موج خون کو گزرتے ہوئے دیکھا تھا اور کہا تھا "یہ شہر اب شہر نہیں، قہر ہے۔" [۳] خود اُن پر جو گزری وہ اُن کے خطوط سے ظاہر ہے۔ نان شبینہ کو محتاج ہوئے تو چغہ اور شالی رومال بیچنے پر نوبت آگئی [۴] سردی میں لحاف کی فکر میں بے چین رہے [۵] محل سرائیں برباد، دیوان خانے اجاڑ، گھر کے گھر بے نور و

---

[۱] خط بنام تفتہ، مورخہ ۹ر اپریل ۱۸۶۱ء

[۲] خط بنام علائی، مورخہ ۱۶ر فروری ۱۸۶۲ء

[۳] مکتوب مورخہ ۱۸ر جولائی ۱۸۵۸ء

[۴] تفتہ کو لکھتے ہیں:

" میں نے ایک ولایتی چغہ اور شالی رومال ڈھائی گزا .... دلال کو دیا تھا اور وہ اس وقت روپیہ لے کر آیا" مکتوب مورخہ ۱۸ر جولائی ۱۸۵۸ء

[۵] مجروح کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

" روٹی کھانے کو نہیں، شراب پینے کو نہیں۔ جاڑے آتے ہیں لحاف توشک کی فکر ہے" مکتوب مورخہ اکتوبر ۱۸۵۸ء

بے چراغ [1] غلّہ گراں، موت ارزاں [2] اس پورے ماحول نے غالب کا دل خون کر دیا۔ وہ اپنے کو زندہ درگور سمجھنے لگے۔ یوسف مرزا کو کس ذہنی کیفیت میں لکھتے ہیں :

"آدمی کثرتِ غم سے سودائی ہو جاتے ہیں۔ عقل جاتی رہتی ہے۔ اگر اس ہجومِ غم میں میری قوتِ متفکرہ میں فرق آگیا ہو تو کیا عجب ہے۔ بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے۔ پوچھو کہ غم کیا ہے؟ غمِ مرگ، غمِ فراق، غمِ رزق، غمِ عزت۔"

حالات کی بے رحمی نے اُن کو در بدر پھرایا۔ بڑی کوشش کے بعد پنشن بحال ہوئی۔ اور رام پور سے بھی سو روپے ماہوار وظیفہ ملنے لگا۔ لیکن کیا یہ صورتِ حال کس طرح غالب کے لیے باعثِ تسکین ہو سکتی تھی! اُن کی ہنسی میں گہرا زخم، اور ان کے تبسّم میں ہزاروں جراحتیں پنہاں نظر آتی ہیں۔

غالب کے کلام کا تاریخی حیثیت سے اب تک مطالعہ نہیں ہو سکا ہے۔ ڈاکٹر سید محمود نے غالب کے جن اشعار میں سیاسی شعور اور غدر کے اثرات کی نشان دہی کی ہے، اُن کے متعلق بعض ناقدین کا خیال ہے کہ وہ ۱۸۵۷ء سے پہلے کے اشعار ہیں۔ کلامِ غالب کو عصری تاریخی حالات کے ترجمان کی حیثیت سے دیکھنا ضروری ہے۔ یہ خیال کہ یہ سارے حوادث جو اس وقت دلّی، سلطنتِ مغلیہ اور اس کی تہذیبی قدروں کو پیش آئے تھے، غالب کا شعری تجزیہ نہ بن سکے، غالب کے ساتھ بڑی بے انصافی ہے جس کا پیمانۂ صبر یہ کہہ کر چھلکنا چاہتا ہو ؎

---

[1] تفتہ کو لکھتے ہیں: "رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے، شہر میں ہے کون جو آوے؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں" مکتوب مورخہ ۵ / دسمبر ۱۸۵۷ء

[2] چودھری عبدالغفور سرور کو لکھتے ہیں: "غلہ گراں ہے، موت ارزاں ہے۔ میوے کے مول اناج بکتا ہے۔ ماش کی دال آٹھ سیر، باجرہ سولہ سیر، گیہوں تیرہ سیر، چنے سولہ سیر، گھی ڈیڑھ سیر، ترکاری مہنگی" مورخہ ۱۸۶۰ء

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل　　انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے　　لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

اس پر بے حسی کا الزام حق و دیانت کے خلاف ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے صحیح لکھا ہے کہ "ممکن نہ تھا کہ مرزا غالب جیسے غم دوست شاعر نے یہ سب کچھ دیکھا ہو اور اس کے دل و جگر کے ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو گئے ہوں"۔

اقبال نے ایک خط میں اکبرالہ آبادی کے اس جملہ کی بڑی تعریف کی ہے کہ "غم بڑا مدرک احساس ہے"۔ بے رحم حالات گرد و پیش نے غالب میں اگر ایک طرف "کافور و کفن" کی تمنا پیدا کر دی تھی تو دوسری طرف "احساسِ غم" کو بھی تیز تر کر دیا تھا۔ لیکن ہم جس طرح کے "اظہارِ غم" کی توقع غالب سے رکھتے ہیں، وہ ہماری خام خیالی ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے غالب کی قلبی کیفیات، اور فکری رجحانات دونوں کو اس طرح ایک کڑی میں مربوط کرنا ہوگا، کہ شاعر کا "احساسِ غم" اور "پاسِ ناموسِ غم"[1] دونوں کے عمل اور ردِ عمل کا نقشہ سامنے رہے۔ اس کے لیے نفسیاتی بصیرت، غالب کی شخصیت کا صحیح عرفان، اس کے افکار کی سمت اور اس کے جذبات کی شدت سب پر نظر ہونی چاہیے۔ درد کس طرح حد سے گزر کر "دوا" بن جاتا ہے[2]، اور "خاک میں پنہاں صورتوں" کا تصور کس طرح لالہ و گل کی[3] طرف ذہن کو لے جا سکتا ہے، جب قلبی اور ذہنی کیفیات کی یہ منزلیں واضح ہوں گی تو غالب کے کلام کی روح آشکارا ہو جائے گی"۔

---

[1] ۔ میر کہتے ہیں:

پاسِ ناموسِ غم تھا یاں ورنہ
کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

[2] ۔ درد کا حد سے گزرنا ہے، دوا ہو جانا

[3] ۔ سب کہاں؟ کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

ایک بڑا شاعر، مفکّر یا مصلح حالات کے آگے بڑی مشکل سے سپر ڈالتا ہے۔
بعض اوقات وہ جسم کو جھکانے پر مجبور ہو جاتا ہے لیکن اس کی روح آمادۂ پیکار ہی رہتی ہے۔ غدر کے بعد سر سیّد تو یہ شعر پڑھ کر

حریف کاوشِ مژگانِ خوں ریزم نہ ناصح
بدست آور رگِ جاں و نشتر را تماشا کن

موجِ خون سے گزر گئے۔ غالب "چوں قصِ بل بسمل" رقص کرتے رہے[1] لیکن اُن کا سارا غم، جذبات و احساسات کی مختلف چھلنیوں میں سے چھنتا ہوا، اُن کے اشعار میں ڈھل گیا۔

---

[1] غالب کا شعر ہے ؎

چوں عکس پل بسیل بذوق بلا برقص
جارا نگاہ دار و ہم از خود جدا برقص

پروفیسر این ماری شمل نے صحیح لکھا ہے کہ "یہ شعر غالب کی شخصیت کی بالکل سچی تصویر ہے"۔
اردوئے معلیٰ، غالب نمبر حصّہ سوم ص ۱۰۴۔

— شبیر احمد خاں غوری

عہدِ غالب کا علمی و فکری ماحول

ہر عبقری اپنے عہد کی پیداوار ہوتا ہے۔ غالب بھی اس کلیے سے مستثنا نہ تھے۔ نہ صرف ان کی شخصیت کے بنانے ہی میں اُن کے زمانے کے سیاسی تقلبات احوال، معاشی زبوں حالی اور اخلاقی انتشار کا دخل تھا، بلکہ ان کی عبقریت کی تشکیل میں بھی اُن کے فطری ذوق سخن سرائی اور خدا داد ملکۂ قادر الکلامی کے علاوہ ان کے عہد کی علمی و فکری تحریکوں نے اہم کردار انجام دیا تھا۔ اگرچہ یہ عمل بلا واسطہ سے زیادہ بالواسطہ تھا، پھر بھی اُن کی تخلیقات میں منظوم ہوں یا منثور، وقت کی اہم علمی و فکری سرگرمیوں کے اثرات کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ مگر اس نشان دہی سے پہلے خود ان علمی و فکری تحریکوں کے آغاز و ارتقا پر ایک طائرانہ نظر ڈال لینا مستحسن ہوگا۔

(الف) علمی ماحول

عہد غالب کی دہلی آج کل کی دہلی سے قطعاً مختلف تھی۔ دہلی اُس وقت بھی دارالسلطنت تھی۔ مگر آج کی ہماہمی اور گہما گہمی کے بجائے اُس وقت کی دہلی میں ایک ٹھہراؤ تھا، ایک سکون و وقار تھا، ایک ثقاہت تھی، جس کا تجارتی اور کاروباری کے بجائے علمی مزاج تھا اور علمی مزاج اُس کے یوم تاسیس سے لے کر نام نہاد غدر تک برقرار رہا۔

دہلی کی بساطِ تہذیب کا آغاز دہلی سلطنت کے ساتھ ہوا۔ اس کے علمی مزاج کی ابتدا التتمش کی علم دوستی و معارف پروری کا نتیجہ تھی جس نے اقصائے عالم کے ارباب کمال کو یہاں کھینچ بلایا تھا۔ بین الاقوامی حالات بھی اس کے مساعد تھے۔ فتنۂ تاتار سے عالم اسلام میں ایک رستخیز برپا تھی، لہٰذا وسطِ ایشیا اور مغربی ایشیا کے علما و فضلا تلاش امن و عافیت میں چلے آرہے تھے۔

اس طرح دہلی نہ صرف علم و ادب ہی کا گہوارہ، بلکہ مشرق میں قبۃ الاسلام بن گئی۔

مدارس

دہلی میں مدارس کی ابتدا بھی التتمش ہی کے عہد میں پڑی، اگرچہ اسلامی ہند بالخصوص سندھ اور ملتان میں اس کا تذکرہ اس سے پہلے بھی ملتا ہے۔ یوں تو ہر عالم کا مکان بجائے خود ایک درسگاہ ہوا کرتا تھا، مگر التتمش کی علم دوستی نے مدارس بھی تعمیر کرائے۔ متوفیوں کے ایصال ثواب کے لیے مدرسہ کے قیام سے بڑھ کر صدقۂ جاریہ اور کیا ہوسکتا تھا۔ چنانچہ اُس نے اپنے آقائے ولی نعمت معزالدین کے ایصال ثواب کے لیے مدرسۂ معزی اور اپنے مرحوم بیٹے ناصرالدین محمود کے نام پر مدرسۂ ناصری کی تعمیر کرائی۔

بعد میں بھی مدارس تعمیر ہوتے رہے، چنانچہ بقول صاحب مسالک الابصار محمد تغلق کے زمانے میں شہر دہلی ہی میں ایک ہزار مدرسے تھے۔ اُس کے جانشین فیروز تغلق نے بھی پرانے مدرسوں کی مرمت کے علاوہ بیس نئے مدرسے بنوائے، جن میں سے مدرسہ فیروز شاہی کی تعریف نہ صرف مورخ برنی نے لکھی ہے، مطہر شاعر بھی اس کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہے۔ بعد کی تفصیل غیر ضروری ہے۔

تعمیر مدارس کا یہ سلسلہ عہد غالب تک جاری رہا، چنانچہ شاہ عبدالعزیز صاحب اپنے زمانے کی دہلی کے بارے میں فرماتے ہیں :-

فیها مدارس لو طاف البصیر بها

لم تنفتح عینه الا الی الصحف

[اس میں اتنے مدارس ہیں کہ اگر کوئی دیکھنے والا اس کا گشت لگائے تو اس کو ہر جگہ کتابیں ہی کتابیں نظر آئیں گی]

ان میں مدرسہ غازی الدین خاں اجمیری دروازے کے باہر، مدرسہ دار البقا جامع مسجد کے جنوبی دروازے کے قریب، مدرسہ نواب شرف الدولہ بازار دریبہ میں نواب صاحب کی مسجد کے قریب خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، اور مدرسہ فتح پوری تو آج بھی علم دین کی نشر و اشاعت میں سرگرم ہے۔

علما

دہلی شروع ہی سے علم اور اہل علم کا مسکن و ماوا رہی ہے۔ امیر خسرو پرانی دہلی کے بارے میں فرماتے ہیں :-

حضرت دہلی کنفِ دین و داد　　جنتِ عدن است کہ آباد باد

مردم او جملہ فرشتہ سرشت　　خوشدل و خوشخوے چو اہل بہشت

بیشتر از علم و ادب بہرہ مند　　واہل سخن خود کہ شمارد کہ چند

برنی جس نے بلبن اور علاء الدین خلجی کے عہد کے علما کی ایک طویل فہرست دی ہے، ان کے علم و فضل کے بارے میں رقم طراز ہے :

"وبعضے ازاں استادان در فنون علم و کمالات بدرجۂ غزالی و رازی رسیدہ بودند:

اور علم و علما کی یہ فراوانی غدر تک برقرار رہی، جس کی تفصیل موجب تطویل ہوگی۔ غالب کے زمانہ میں دہلی کی علمی فضا پر شاہ ولی اللہ کا خاندان چھایا ہوا تھا، چنانچہ سرسید لکھتے ہیں :

"علم ان کے خاندان میں بطناً بعد بطن اور صلباً بعد صلب اس طرح سے چلا آتا ہے جیسے سلطنت سلاطین تیمور کے خاندان میں"

شاہ صاحب کے پدر بزرگوار شاہ عبدالرحیمؒ اپنی ذہانت اور علمی ذوق و شوق کی بنا پر

اپنے استاد میرزاہد کے مخصوص شاگرد تھے۔ آپ کے عم محترم شیخ ابوالرضا محمد اپنے عہد کے جید عالم اور شاہ عبدالرحیم کے اُستاد اول تھے۔ مسئلہ وحدت الوجود میں جو اُس زمانے کا بڑا دلچسپ مسئلہ تھا، شیخ محمد سعیدؒ کے ساتھ ان کے مطارحات مشہور ہیں۔ شاہ صاحب کے بھائی شیخ اہل اللہ پھلتی طبیب حاذق ہونے کے ساتھ ساتھ جید عالم بھی تھے، انھوں نے ہدایہ کا اختصار بھی لکھا تھا۔

شاہ صاحب اس خاندان کے گل سرسبد تھے، انھوں نے تعلیمی مراحل اپنے والد بزرگوار کی خدمت میں طے کیے، پھر درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ ۱۱۴۳ھ میں حج بیت اللہ شریف کے لیے تشریف لے گئے جہاں شیخ ابوطاہر مدنی اور دیگر مشائخ سے روایت حدیث کی سعادت حاصل کی اور واپس آکر ہندوستان میں علم حدیث کی تعلیم کو خصوصیت سے فروغ دیا۔

شاہ صاحب نے ۱۱۷۶ھ میں وفات پائی، اور اُن کے بعد مسند درس وافادہ پر پہلے ان کے خلف الرشید شاہ عبدالعزیز قدس سرہٗ اور پھر ان کی پیرانہ سالی میں دوسرے صاحبزادے شاہ رفیع الدینؒ ان کے جانشین ہوتے، شاہ صاحب کے تیسرے صاحبزادے شاہ عبدالقادرؒ تھے۔ علم و دین کی خدمت کے علاوہ اردو ادب کی تاریخ میں بھی ان کا منفرد مقام ہے، کیوں کہ قرآن کریم کا پہلا اردو ترجمہ انھیں کے قلم سے ظہور میں آیا تھا۔

ان تینوں بھائیوں کو دہلی کے عوام و خواص جس عقیدت و احترام سے دیکھتے تھے، اس کا اندازہ غالب کی مثنوی تُوم کے حسبِ ذیل اشعار سے لگایا جاسکتا ہے:

مولوی معنوی عبدالعزیز وان رفیع الدین دانشمند نیز
شاہ عبدالقادر دانش سگال کاین دو تن را بود درگوہر ہمال

تیسرے طبقے میں شاہ ولی اللہ کے احفاد آتے ہیں ان میں مولوی مخصوص اللہ شاہ رفیع الدین کے صاحبزادے، مولانا عبدالحی داماد شاہ عبدالعزیز اور مولانا محمد اسمٰعیل خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ موخر الذکر کی تصانیف میں تقویۃ الایمان صراط مستقیم منصب امامت خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ معقولات میں تبحر و تمہر کا یہ عالم تھا کہ منطق کی شکل اول کو "بعید الانتاج" اور شکل رابع کو "ابدہ البدیہات" ثابت کیا تھا۔ مسند رفیع یدین کی

تائید میں ایک رسالہ بعنوان "قرۃ العین فی اثبات رفع الیدین" اور امکان کذب کے موضوع پر ایک اور مستقل رسالہ لکھا۔ آخر عمر میں سید احمد شہیدؒ کی معیت میں بغرض جہاد تشریف لے گئے اور معرکۂ بالاکوٹ میں شہادت کی سعادت حاصل کی۔

چوتھے طبقے میں شاہ عبدالعزیزؒ کے نواسے مولانا محمد اسحٰق اور مولانا محمد یعقوب آتے ہیں۔ اوّل الذکر نے علم حدیث کی تحصیل شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت میں کی تھی۔ مگر آخر میں دونوں بھائی ہجرت کرکے مکہ معظمہ چلے گئے۔

اولاد و احفاد کے علاوہ ارباب کمال بھی خاندان ولی اللہی سے شرف تلمذ رکھتے تھے جیسے شاہ عبدالعزیزؒ کے شاگرد مولوی محبوب علی، شاہ رفیع الدینؒ کے شاگرد مولوی محمد رشید الدین خاں، شاہ عبدالقادرؒ کے شاگرد مولوی امان علی اور آخون شیر محمد افغانی اور مولانا محمد اسحاق کے شاگرد مولوی قطب الدین خاں، مولوی نوازش علی، مولوی رستم علی خاں اور مولوی نصیر الدین شافعی۔

خاندان ولی اللہی کے علاوہ اس عہد کا مشہور علمی سلسلہ خیرآبادی سلسلہ تھا جس کے گل سرسبد مولانا فضل حق خیرآبادی تھے۔ خیرآبادی سلسلہ میں معقولات پر زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ معقولات کے ساتھ اعتنا تو اُس سلسلہ کا بھی مشغلہ تھا جس سے شاہ ولی اللہ منسلک تھے، حدیث و سنّت کے ساتھ اعتنا تو شاہ صاحب نے شروع کیا۔ بہرحال یہ دونوں سلسلے اصلاً معقولات ہی کے تھے اور دونوں محقق دوانی کے شاگرد رشید خواجہ جمال الدین محمود کے یہاں جاکر مل جاتے ہیں جس کی تفصیل یہ ہے :-

خواجہ جمال الدین محمود کے دو خصوصی شاگرد تھے : مرزا جان شیرازی اور امیر فتح اللہ شیرازی۔ خواجہ جمال الدین محمود کے ایران سے ہجرت کرجانے کے بعد امیر فتح اللہ شیرازی نے دیگر علما بالخصوص امیر غیاث الدین منصور سے بھی کسب فیض کیا۔

مرزا جان شیرازی کے شاگرد ملا یوسف قراباغی، اُن کے شاگرد محمد فاضل بدخشی، اُن کے شاگرد میرزاہد ہروی، اُن کے شاگرد شاہ عبدالرحیم صاحب اور موخرالذکر کے شاگرد شاہ ولی اللہؒ تھے جن سے علمائے دہلی و دیوبند وغیرہ کے سلسلے چلے۔

امیر فتح اللہ شیرازی دکن آئے جہاں سے اکبر کی طلب پر شمالی ہندوستان میں تشریف لائے۔ یہاں دیگر افاضل کے علاوہ اُن سے مُلّا عبدالسلام لاہوری نے پڑھا، ان کے شاگرد مفتی عبدالسلام دیوی تھے، اُن کے شاگرد ملا دانیال چوراسی، اُن کے شاگرد ملا امان اللہ بنارسی اور ان کے شاگرد ملا نظام الدین سہالوی تھے جن سے فرنگی محل کا علمی سلسلہ چلا۔

ملا نظام الدین سہالوی کے ایک شاگرد ملا کمال الدین سہالوی تھے، اُن کے شاگرد ملا محمد اعلم سندیلوی، ان کے شاگرد مولانا عبدالواجد کرمانی اور موخرالذکر کے شاگرد رشید مولانا فضل امام خیرآبادی تھے جو خیرآباد، ٹونک اور رامپور وغیرہ کے سلسلوں کے بانی ہیں۔

مولانا فضل امام دہلی تشریف لے آئے جہاں انھوں نے معقولات کی گرم بازاری کو جو خاندان ولی اللہی کے اعتنا بالحدیث کے نتیجے میں ماند پڑنے لگی تھی، ازسرِ نو فروغ دیا۔ چنانچہ سرسید نے اُن کے تذکرے میں لکھا ہے:

اُس نواح میں ترویج علم حکمت و معقول کی اسی خاندان سے ہوئی گویا اس دودۂ والا تبار سے اس علم نے یکجہتی بہم پہنچائی ہے۔"

سرسید خود مولانا فضل امام کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مؤسس اساس ملت و دین، ماحی آثار جہل..... محی مراسم علم.... قدوۂ علمائے فحول، حاوی معقول و منقول..... واسطۃ العقد سلسلۂ حکمت اشراقی و مشائی..... مقتدائے انام مولانا و مخدومنا مولوی فضل امام۔"

علوم عقلیہ میں اُن کی دستگاہ عالی کے بارے میں کہتے ہیں:

"علوم عقلیہ اور فنون حکمیہ کو ان کی طبع وقاد سے اعتبار تھا اور علوم ادبیہ کو ان کی زبان دانی سے افتخار۔ اگر ان کا ذہن رسا دلائل قاطعہ بیان نہ کرتا، فلسفے کو معقول نہ کہتے اور اگر اُن کا فکر صائب براہین ساطعہ قائم نہ کرتا، اشکال ہندسہ تارِ عنکبوت سے سست تر نظر آتیں۔"

مولانا فضل امام کے شاگرد رشید مولانا فضل حق خیرآبادی تھے جو بجا طور پر خاتم المتکلمین

کہلاتے ہیں۔ غدر میں انھوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتوا دیا تھا اور غدر فرد ہونے کے بعد اسی جرم کی سزا میں انڈمان بھیجے گئے جہاں ۱۲۷۸ھ میں بحالت اسیری وفات پائی۔ تصانیف میں حاشیہ قاضی مبارک شرح سلم العلوم، حاشیۂ افق المبین، الروض المجود فی حقیقۃ الوجود خاص طور سے مشہور ہیں، اُن کے تبحر علمی بالخصوص منطق و حکمت میں اُن کی دستگاہ عالی کے بارے میں سر سید نے لکھا ہے:

"جمیع علوم و فنون میں یکتائے روزگار ہیں اور منطق و حکمت کی تو گویا انھیں کی فکر عالی نے بنا ڈالی ہے۔"

مولانا فضل حق مرزا غالب کے خصوصی احباب میں سے تھے اور انھیں کی فرمائش سے مرزا صاحب نے امتناع نظیر نیز مروجہ اختلافی مسائل کے موضوع پر اپنی مشہور مثنوی لکھی تھی۔ مولانا بھی مرزا صاحب کے کلام کی اصلاح سے دریغ نہ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ غالب نے لکھا تھا:

ہم چناں در تتق غیب ثبوتے دارند
بوجودے کہ ندارند ز خارج اعیان

مولانا نے فرمایا اعیان مجردہ کے لیے "ثبوت" کا لفظ نہیں آنا چاہیے اور مرزا نے اسے اگلے ایڈیشن میں "نمودے" بنا دیا۔

ان باپ بیٹوں کے شاگرد بھی علوم حکمیہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ان میں مولوی کرامت علی اور مولوی نورالحسن خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

دوسرے علمی خاندانوں میں خاندان مجدّدی اور خاندان حقانی زیادہ مشہور ہیں خاندان مجددی میں شاہ صاحب کے ہم نام ولی اللہ مجددی تھے۔ شاہ عبدالحق محدث دہلوی کی اولاد میں کئی بزرگ قابل ذکر ہیں: شیخ سیف اللہ بخاری، مولانا شیخ الاسلام دہلوی شارح صحیح بخاری، مولوی فخرالدین دہلوی، شیخ محمد محسن دہلوی اور مفتی نورالحق دہلوی۔ شیخ سماء الدین ملتانی جن کا خاندان عرصے سے علم و دین کی خدمت کر رہا تھا، اُن کے اخلاف میں مفتی ابوالبرکات دہلوی اسی زمانے میں تھے۔ وہ فتاوائے عالمگیری کی تدوین میں بھی

شریک تھے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ۱۱۱۶ھ میں ایک مستقل کتاب بعنوان مجمع البرکات لکھی تھی۔

ان خاندانی علما کے علاوہ اور بھی علمائے کرام تھے ان میں سب سے مشہور صدرالدین خاں آزردہ تھے جو صدر الصدور کے عہدے پر مامور تھے مگر اس جاہ وثروت کے باوجود ان کا علمی فیض جاری تھا، انھوں نے اپنے صرفے سے مدرسہ دارالبقا کی مرمت کرائی تھی۔ ان کے دوشاگرد حاجی محمد اور ملا سرفراز ان کی جانب سے اس مدرسہ میں مدرس تھے۔ ملا سرفراز خصوصیت سے حکمت و ہندسہ وہیئت بڑی تحقیق سے پڑھاتے تھے۔

دیگر مشاہر علما میں شیخ عبدالعزیز بن عبدالرشید کے شاگرد اور مصنف کشف الخطا کے شاگرد مولانا ایزدبخش، مولانا یعقوب بنانی کے شاگرد مولانا عبدالقدوس دلہوی، شافیۂ ابن حاجب کے شارح مولانا ہادیؔ مازندرانی اور نواب معتمد خاں بن دیانت خاں جو عمائدین ملک میں ایک نمایاں مقام رکھنے کے علاوہ علوم معقول ومنقول کے بھی جامع تھے۔ اور بھی علمار تھے جیسے مفتی رحمت علی خاں عرف میرلال، مولوی نذیر حسین، مولوی عبدالخالق، مولوی کریم اللہ، مولوی محمد جان۔

درس وتدریس کا سلسلہ علمائے مدارس کے علاوہ خانقاہوں میں بھی جاری تھا۔ شاہ غلام علی نقشبندی بعد نماز اشراق حدیث وتفسیر کا درس دیا کرتے تھے علوم درسیہ میں ان کے تبحر کے بارے میں سرسید نے لکھا ہے :

> "اگر باعتبار علوم نقلی خاتم المحدثین والمفسرین تعبیر کیا جائے تو بھی بجا ہے اور اگر باعتبار علوم عقلی سرگروہ فلسفیان متقدمین و متاخرین لکھا جائے تو بھی بجا ہے"

شاہ غلام علی کے صاحبزادے شاہ احمد سعید صاحب کا دن رات مشغلہ تفسیر وحدیث اور فقہ کا درس وتدریس تھا۔ خواجہ میر دردؔ کے نواسے کو "اکثر علوم خصوصاً ریاضیات میں بہت دخل تھا"

لیکن طبقہ مشائخ میں دو بزرگوں کا علم وفضل فیما بین مسلم تھا ایک شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی جن کی عشرۂ کاملہ اپنے فن کی ادبیات عالیہ میں محسوب ہوتی ہے، دوسرے

مولانا فخر الدین دہلوی جنہوں نے تصوف کے ایک اہم اور بنیادی مسئلے میں شاہ ولی اللہ کی ایک تاریخی تحقیق کا لاجواب جواب دیا تھا۔ شاہ صاحب صوفیہ کرام کے شجروں پر معترض تھے کہ حسن بصریؒ کا سیدنا علی کرم اللہ وجہہٗ سے سماع محل نظر ہے اس لیے یہ تمام شجرے ادعائی ہیں۔ مولانا فخر الحسن نے محدثین کبار نے جو اصول حدیث کی مستند کتابیں لکھی تھیں ان کی مدد سے نہ صرف لقار کو بلکہ سماع کو بھی ثابت کیا تھا اور اس موضوع پر ایک مستقل کتاب بعنوان فخر الحسن تصنیف فرمائی تھی۔

اطبائے مسیحا نفس میں حکیم احسن اللہ خاں، حکیم غلام نجف خاں، حکیم صادق علی خاں، حکیم امام الدین، حکیم غلام حیدر خاں، حکیم نصر اللہ خاں، حکیم پیر بخش خاں، حکیم غلام حسن خاں، حکیم محمد یوسف خاں اور حکیم عبدالحکیم المعروف بہ ابو خاں خصوصیت سے مشہور تھے۔ ان میں سے اکثر حضرات طب کے علاوہ دیگر علوم بالخصوص علوم حکمیہ میں بھی دستگاہ عالی رکھتے تھے۔ ان میں حکیم ہاشم خاں خصوصیت سے قابل ذکر ہیں جنہوں نے تحریر اقلیدس، تحریر المجسطی پر شروح اور میبذی پر حاشیہ لکھا تھا۔ حکیم حسن بخش خاں "جمیع فنون اور علوم ہیں مثل معقول و منقول و حکمت و ہندسہ و ہیئت مہارت تمام رکھتے تھے"؛

طبقہ شعرا میں خواجہ ناصر عندلیب اور اُن کے صاحبزادے میر درد نیز مرزا مظہر جانجاناں سخن سنجی کے علاوہ عالم تحریر بھی تھے۔ یہ حضرات وحدت الوجود کے مخالف اور وحدت الشہود کے بڑے علمبردار تھے اور شاہ ولی اللہؒ نے وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے درمیان جو تطبیق کی تھی، اس سے متفق نہ تھے۔ میر درد کی "علم الکتاب" اُن کے تبحر علمی کی شاہد عدل ہے۔ مرزا عبدالقادر بیدل اور اسی طرح سراج الدین علی خاں آرزو اور شمس الدین فقیر شاعر مغلق اور ادیب بے بدل ہونے کے علاوہ عربی کے علوم ادبیہ میں بھی دستگاہ عالی رکھتے تھے۔ آرزو کی عطیۂ کبریٰ و موہبت عظمیٰ اور شمس الدین فقیر کی حدائق البلاغت علوم ادبیہ بالخصوص بلاغت و عروض میں ان کے تبحر و تمہر کی شاہد عدل ہے۔

یہ تو ان مشاہیر فضلا کے نام ہیں جو آسمان جاہ و شہرت پر علم و فضل کے آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے لیکن کتنے درخشاں ستاروں کا کوئی شمار ہی نہیں جنہیں تاریخ و تراجم کی

مسند بقاے دوام پر بار نہ مل سکا جیسے ذوق کے استاد مولوی عبدالرزاق جن کا تذکرہ آزاد تک نے نہیں کیا۔

لیکن مدارس اور مدرسین سے زیادہ اہم ان کا درس نصاب تھا کیوں کہ اسی میں مذکور غامض و عویص مسائل وقت کی فکری تحریکوں کے لیے مواد فراہم کرتے تھے۔

نصاب

دہلی سلطنت کے دوران نصاب عموماً فقہ و اُصولِ فقہ اور عربیت پر مشتمل تھا۔ فلسفہ کی تعلیم متروک ہی نہیں ممنوع تھی۔ محمد تغلق کی تفلسف پسندی اس کا نجی معاملہ تھا ورنہ عام مدارس میں اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ فیروز تغلق نے مدرسہ فیروز شاہی کی صدارت مولانا جلال الدین رومی کو دی۔ مگر انھوں نے قطب الدین رازی جیسے فلسفہ و حکمت کے عظیم محرم راز کا شاگرد ہونے کے باوجود درس میں ان علوم کو داخل نہیں کیا اور دیرینہ روایت کے تتبع میں صرف علوم دینیہ کی تدریس ہی پر اکتفا کیا چنانچہ برنی ان کی تدریسی سرگرمیوں کے بارے میں لکھتا ہے:

> "و مولانا جلال الدین رومی کہ بس اُستادے متفنن است دایما در منصب افادت سبق علوم دینی می گوید و متعلمان را ہموارہ تعلیم می کنند و تفسیر و حدیث و فقہ می خوانند و ہر روز حافظاں در ختمہاے قرآن مشغول می باشند۔"

اسی طرح مطہر شاعر کہتا ہے:

> راوی ہفت قرائت سند چاردہ علم
> شارح پنج سنن، مفتی مذہب ہر چار

ممکن ہے انھوں نے اُستاد کی شرح شمسیہ (قطبی) کو اور مدرسہ بالا بند سیری کے صدر مولانا نجم الدین سمرقندی نے اپنے ہم وطن شمس الدین سمرقندی کی الصحائف فی الکلام کی شرح کو بھی اپنے یہاں داخل درس کیا ہو۔ بہر حال منطق و کلام میں یہی دو کتابیں نویں صدی

ہجری کے آخر تک حرف آخر سمجھی جاتی تھیں تا آنکہ مولانا عبداللہ تلبنی اور شیخ عزیز اللہ ملتانی نے شمالی ہند میں آکر معقولات کو رواج دیا۔

اگلی صدی میں محقق دوانی کے شاگردوں نے آکر معقولات کی گرم بازاری کو فروغ دیا اور صدی کے آخر میں امیر فتح اللہ شیرازی نے علمائے ایران و توران کی مطولات معقولات کو لاکر نصاب میں داخل کیا اور پھر نصاب پر معقولات کا غلبہ ہونے لگا۔ آخر میں تو درس پر معقولات ہی معقولات چھا کر رہ گئی۔ منطق میں صغریٰ کبریٰ سے میر زاہد امور عامہ تک بیس پچیس کتابیں داخل درس تھیں۔ فلسفہ میں ہدیۂ سعیدیہ، شرح ہدایۃ الحکمہ، میبذی، صدرا، شمس بازغہ اور شرح اشارات اس پر مستزاد تھیں۔ زیادہ حوصلہ مند طالب علم شرح حکمۃ العین، افق المبین، محاکمات و شرح محاکمات، شرح مطالع، حاشیۂ قدیمہ و حاشیۂ جدیدہ اور ان حواشی پر بعد کے علما کے حواشی وغیرہ پڑھتے تھے اور اس پر بھی معلمین کو پڑھانے سے سیری ہوتی تھی نہ متعلمین کو پڑھنے سے۔ شوق ہل من مزید کسی طرح قانع ہوتا تھا۔ حالانکہ قرآن فہمی کے لیے جو اصل دین ہے صرف ایک تفسیر بیضاوی پڑھائی جاتی تھی اور وہ بھی صرف سورۂ بقر تک۔

(ب) فکری ماحول

ادب سماج کا آئینہ دار ہوتا ہے، اس کے خارجی حالات کا بھی اور داخلی کیفیات کا بھی۔ جس طرح وہ اس کی سیاسی سرگرمیوں، اقتصادی خوش حالی و بد حالی اور اخلاقی ترفع اور گراوٹ کی ترجمانی کرتا ہے، اسی طرح اُس میں اس کی فکری سرگرمیوں کی جھلکیاں بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔

ان فکری تحریکوں کا مبدء و ماخذ بیشتر حالات میں کم از کم اسلامی ہند بالخصوص اٹھارویں انیسویں صدی کی دہلی میں مدارس کی علمی سرگرمیاں ہوا کرتی تھیں۔

عہد غالب کی یہ فکری تحریکیں نرم بھی تھیں اور گرم بھی۔

گرم تحریکوں سے مراد وہ تحریکیں ہیں جو کچھ ہی دن میں:

کار ملّا در سبیل اللہ فساد

کے مصداق افتراق اُمت اور کبھی کبھی تشدد کا باعث ہوگئیں۔ نرم تحریکیں ان کے مقابلہ میں بے ضرر تھیں، ان کا منشا و منبع علوم حکمیہ کے مبحوث عنہا مسائل ہوا کرتے تھے۔

(۱) گرم تحریکیں

گرم تحریکیں فقہی بھی تھیں اور کلامی بھی۔ ان دو قسموں کے علاوہ ایک اور قسم بھی تھی جو اعتصام بالسنّۃ اور رد بدعت کے عنوان سے مروجہ رسم و رواج کی اصلاح پر مصر تھی۔

اٹھارویں اُنیسویں صدی کے اسلامی ہند میں بہت سی ایسی رسوم مروج تھیں، جن کی اصل کم از کم صدر اسلام میں نہیں ملتی، اس لیے وہ "بدعت" کے تحت آتی ہیں اور بدعت منافی اسلام ہے۔ اس لیے جب شاہ ولی اللہؒ اور اُن کے متبعین نے احیاء سنت پر کمر باندھی تو مروجہ رسوم کی اصلاح پر بھی زور دیا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ ان میں سے اکثر رسوم خانقاہوں سے وابستہ تھیں، اس لیے انھیں بڑے بڑے مشائخ کی تائید حاصل تھی، جن کی دین داری و دیانت اور اسی طرح علم و فضل ولی اللّٰہی جماعت کی طرح عوام میں مسلم تھا۔

ان میں سب سے اہم "استمداد و توسّل" کا مسئلہ تھا۔ مصلحین اسے آیتِ کریمہ

ایاک نعبد و ایاک نستعین

اور اسی مفہوم کی دوسری آیات کے منافی اور اس لیے "منجرالی الشرک" بتاتے تھے۔ مگر حضرات مشائخ بھی قرآن و حدیث ہی سے استدلال کرتے تھے۔ لہٰذا تصادم آرا نے نزاعی شکل اختیار کرلی اور اس نزاع کی جھلکیاں ادب میں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔

غالبؔ کا تعلق جمہور سے تھا اور وہ عوامی مسلک کے قائل تھے لہٰذا "مثنوی ششم" میں فرماتے ہیں :-

از نبی و از ولی خواہی مدد

تا نہ پنداری کہ ناجائز بود

کیوں کہ کشودگی کار تو بادشاہ ہی کے حکم سے ہوتی ہے، مگر مقربین بارگاہ کے توسل سے مشکل آسان ہو جاتی ہے:

برنیاید کار بے فرمانِ شاہ
لیک آسان است باخاصانِ شاہ

لہٰذا جو مشکل کے وقت "یا علی" کہتا ہے تو کام اُس کا حق تعالےٰ ہی سے ہے لیکن شفاعت حضرت علی سے کراتا ہے:

وقت حاجت ہر کہ گوید: یا علی
باحقش کار است دپوزش یا علی

غرض "یا محمد" کہنے سے روح میں بالیدگی آتی ہے اور "یا علی" کہنے سے مشکلیں آسان ہوتی ہیں:

"یا محمد" جان فزاید گفتنش
"یا علی" مشکل کشاید گفتنش

پس اگر تم اللہ تعالیٰ سے نصرت و امداد چاہتے ہو تو خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ تعالےٰ کے پکارنے میں کیا حرج ہے:

چوں اعانت خواہی از یزدانِ پاک
"یامعینُ الدین" اگر گوئی چہ باک

سوال حرفِ ندا "یا" کا تھا، برسر اصلاح جماعت اس سے بھڑک سکتی تھی، اُن کے خیال میں اس کے اندر شائبۂ شرک تھا۔ اس لیے غالب ان کی برافروختگی کو ابلہی و بیدانشی سے تعبیر کرتے تھے:

ابلہان را زانکہ دانش نارواست
گفتگوہا برسر حرفِ "ندا" است

مگر خود غالب کا عربی صرف و نحو کا مطالعہ زیادہ دقیق و تحقیقی نہ تھا، پھر اس مسئلہ کی قیل و قال اور فریقین کے ایرادات و اندفاع کے گرانی غموض کی شعر کی نزاکت متحمل

نہیں ہوسکتی تھی، لہٰذا انھوں نے اپنے وقت کے اساطین علما کی تصویب سے اس مسئلہ کا فیصلہ کیا۔ یہ اساطین علما تھے شاہ ولی اللہؒ کے تینوں صاحبزادے شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر رحمہم اللہ تعالیٰ، نیز شہر دہلی کے دو مستند علما جن کی نہ صرف دین و دیانت ہی مُسلّم تھی، اُن کا علم و فضل بھی فیما بین مسلّم تھا، یعنی شاہ کلیم اللہ جہان آبادی جن کی عشرۂ کاملہ اپنے موضوع پر مستند سمجھی جاتی ہے اور مولانا فخرالحسن دہلوی جن کا پایۂ سامی حدیث و سنت میں کسی طرح شاہ ولی اللہؒ سے کمتر درجہ کا نہ تھا، بلکہ جو اس فن میں شاہ صاحب کے حریف پنجہ شکن تھے اور یہ مبالغہ آرائی نہیں ہے۔ شاہ صاحب کو صوفیۂ کرام بالخصوص چشتیہ، سہروردیہ اور قادریہ کے شجروں میں کلام تھا کیوں کہ یہ سب شجرے سیدنا حضرت حسن بصریؒ کے توسط سے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ اور اُن کے توسط سے جناب نبی کریم تک پہنچتے ہیں اور حسن بصریؒ کا مولا علی کرم اللہ وجہہٗ سے سماع ثابت نہیں۔ یہ ایک بہت بڑا انقلابی اعتراض تھا، جس کے تسلیم کر لینے کے بعد خانقاہوں کی بنیاد ہی متزلزل ہو جاتی۔ پھر حدیث و علوم حدیث میں شاہ صاحب کو جو تبحر و تمہر حاصل تھا، اس کے پیش نظر علماء و مشائخ میں سے کسی کو اس کے جواب کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ یہ کڑی کمان مولانا فخرالحسنؒ نے زہ کی اور اس گرفت کے تحقیقی جواب کے لیے ایک مستقل کتاب بعنوان فخرالحسن تصنیف کی جس میں محدثین سابقین و فحول علمائے حدیث کے افادات سے استشہاد کیا۔

جملۂ معترضہ سے مولانا فخرالحسن کا علمی مقام متعین ہو جاتا ہے۔

بہر حال غالب نے انھیں پانچ بزرگوں کی تصویب سے جمہور کے مسلک کی تائید کی، فرماتے ہیں :-

مولوی معنوی عبدالعزیز — وان رفیع الدین دانشمند نیز
شاہ عبدالقادر دانش سگال — کاین دو تن را بود در گوہر ہمال
بردن نام نبی و اولیا — خود روا گفتند با حرف "ندا"
وان دگر فرزانۂ قدسی سرشت — رہنمائے مسلک پیران چشت

آنکہ شیخ وقت خضر راہ بود	نام والائش کلیم اللہ بود
گفت استمداد از پیران رواست	ہرچہ پیر راہ گوید آن رواست
کے غلط گوید چنین روشن ضمیر	خردہ بر قول کلیم اللہ مگیر
ہم چنین شیخ المشائخ فخر دین	آفتاب عالم علم و یقین
ہمبرین ہنجار و آئین بودہ است	شیخ ما حق گو و حق بین بودہ است

اس استدلال یا استشہاد کے بعد اپنا موقف بتاتے ہیں:

تا نہ پنداری ز پیران خواستیم	حاجت خود را ز یزدان خواستیم
لیک در پوزش بدرگاہ رفیع	ماہمی آریم پیران را شفیع

اسی طرح مولود اور اس میں قیام کا مسئلہ بھی بڑی شدت سے مابہ النزاع تھا۔ جمہور اس کے جواز بلکہ استحسان کے قائل تھے اور علمبرداران اصلاح منکر۔ غالب جمہور کے ہمنوا تھے:

درسخن در مولد پیغمبر است	بزم گاہ دلکش و جان پرور است
خود حدیث از سرور دین می رود	می رود ہر آنکہ با من می رود

میلاد ہی کی طرح عرس کا مسئلہ مابہ النزاع تھا۔ دونوں تقریبوں کے ساتھ مذہبی یا کم از کم نیم مذہبی عقیدت و احترام کے ساتھ اہتمام برتا جاتا تھا۔ مگر اس عقیدت و احترام کا یہی مذہبی پہلو علمبرداران اصلاح کی نظروں میں کھٹکتا تھا۔ لیکن شاعر کی نظر میں یہ تقاریب عوام کی زندگی کی اکتا دینے والی یکسانیت میں وقتی تبدیلی لے آتی تھیں اور اس طرح ان کے تنوع پسندی کے دبے ہوئے جذبے کو کبھی کبھی آسودگی بخش دیتی تھیں۔ اس سے زیادہ یہ کہ غریبوں کی بے نوائی و محرومی جو الوان نعمت کے خواب دیکھا کرتی تھی، میلاد کا تبرک ان کے تھوک کو میٹھا کرکے اور عرس کا لنگر کبھی کبھی ان کے کام و دہن کی ضیافت کر کے ان خوابوں کی تعبیر بن جاتی تھی۔

لہذا غالب نے ان رسوم کے خلاف شرعی دلائل سے صرف نظر کر کے ان کے انسان دوستانہ پہلو پر زور دیا اور یہی انسان دوستی ان کی نظر میں [illegible] کی خوشنودی

کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ تھی :

عرس وایں شمع وچراغ افروختن | عود در مجمر بر آتش سوختن
جمع گشتن در یکے ایوان ہمی | پنج آیت خواندن از قرآن ہمیں
نان بنان خواہندگاں دادن دگر | مردہ را رحمت فرستادن دگر
گرپے ترویح روح اولیا ست | درحقیقت آن ہم از بہر خدا ست

فقہی تحریکوں میں تین مسئلے نمایاں اہمیت کے حامل تھے : قرأۃ فاتحہ خلف الامام (امام کے ساتھ مقتدی کا بھی الحمد پڑھنا) آمین بالجہر (الحمد ختم کرنے کے بعد زور سے آمین کہنا) اور رفع یدین (رکوع کرتے وقت ہاتھوں کا کانوں تک اُٹھانا)۔

علمبرداران اصلاح نے اپنے مسلک کی تائید میں رسائل شائع کرنے کے علاوہ اسے نظم کرکے بھی عوام میں مقبول بنانے کی کوشش کی۔ مگر اُن کی یہ تخلیقات دستبرد حوادث کا شکار ہوگئیں۔ رہے شاعران نغز گفتار، یا تو انھوں نے ان متنازع فیہ مسائل کو درخور اعتنا ہی قرار نہیں دیا، یا پھر شعر کی رنگینی و لطافت کو ان کے دلائل کی خشکی و یبوست کا متحمل نہ سمجھا۔

صرف ایک ناگفتہ بہ مسئلہ اس وقت کے ایک عظیم شاعر کی کلیات تک رسائی پاسکا۔ یہ کوے کی حلت و حرمت کا مسئلہ تھا جسے مرزا رفیع سودا نے اپنے ایک مخمس کا موضوع بنایا، اگرچہ بہ اندازِ استہزا

فقہی نقطۂ نظر سے کوے کی تین قسمیں ہیں : ایک وہ جو صرف مردار کھاتا ہے، یہ باتفاق حرام ہے۔ دوسرا صرف دانہ دنکا کھاتا ہے، مردار نہیں کھاتا، اس کا کھانا حلال ہے۔ یہ غراب زرع کہلاتا ہے۔ تیسرا وہ جو مردار اور دانہ دنکا دونوں کھاتا ہے، اس کا نام عقعق ہے۔ وہ جسامت میں زاغ معروف سے کچھ کم اور کبوتر کے برابر ہوتا ہے، اس میں زاغ معروف کے برخلاف سفید اور سیاہ دو رنگ ہوتے ہیں، اس کی آواز عق عق ہوتی ہے، جب کہ زاغ معروف کائیں کائیں کرتا ہے، اس کی حلت و حرمت کے باب میں امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف کے درمیان اختلاف ہے۔ مگر اس ملک میں نہ عقعق ہوتا ہے،

نہ غراب زرع، صرف زاغ معروف ہوتا ہے۔

خدا جانے کس نکتہ آفریں نے اسے حلال قرار دیا۔ اس کے ذبح کرنے، پکانے اور نوش جان کرنے کا تصور ہی نا قابل برداشت ہے، بالخصوص شعرا کی نازک مزاجی تو کسی طرح اس کی متحمل ہی نہیں ہو سکتی، چنانچہ سودا نے ایک ہجویہ مخمس لکھا، جس کا پہلا بند ہے:

لشکر کے بیچ آج یہی قیل و قال ہے　　کھانے کی چیز کھانے کا سب کو خیال ہے
یوں دخل امر و نہی میں کرنا محال ہے　　جو فقہ داں ہیں سب کا یہ اُن سے سوال ہے
اک مسخرا یہ کہتا ہے کوّا حلال ہے

شاید کچھ لوگ "عقعق" کو پہاڑی کوّا بنا کر موخرالذکر کو حلال کہتے تھے، مگر اس کی حلت کا بھی ثبوت نہ مل سکا اور شاعر کی نفاست پسندی کوہ طور جیسے مبارک اور قابل احترام پہاڑ کے کوّے تک کو حلال سمجھنے پر تیار نہیں:-

حلت کو زاغ کوہی کے نزدیک و دور میں　　تحقیق میں کیا تو نہ آیا ظہور میں
کوّا نہیں حلال جو ہو کوہ طور میں　　سودا کرے ہے عرض یہ آ کر حضور میں
اک مسخرا یہ کہتا ہے کوّا حلال ہے

اُس زمانہ میں آج کل کے سے کافی ہاؤس تو نہیں ہوتے تھے۔ بے فکرے یاران سرِپل کہیں جمع ہو کر مسائل حاضرہ پر رائے زنی کیا کرتے تھے۔ سودا کا مندرجۂ ذیل بند اسی قسم کی غیر ذمہ دارانہ قیل و قال پر ایک دل دوز طنز ہے:

بگڑا ہے آج مجتہدوں بیچ کیا یہ نیل　　ملا لطیف بولے کہ کھانا روا ہے چیل
کہتا ہے چاند خاں کیا کن نے حرام نیل　　حلت پہ مینڈکی کے میاں جی کو ہے دلیل
اک مسخرا یہ کہتا ہے کوّا حلال ہے

اور پھر جب اس قسم کے مسائل غیر ذمہ داروں کے ہاتھ پڑ جاتے ہیں، تو اس کا جو انجام ہوتا ہے، وہ بھی سودا سے سنیے:-

جس وقت بڑھ پڑی آپس میں دو دت دات　　ادھر سے دھول چلنے لگی اور ادھر سے لات

بگڑی انھوں کی ان کہنے، جیب ان کی اُن کے ہات

سب، جو اس فساد کا پوچھو تو اتنی بات

اک مسخرا یہ کہتا ہے کوا حلال ہے

کلامی تحریکوں میں دو تحریکیں زیادہ اہم تھیں: ایک امکان کذب کی، دوسری امتناع نظیر کی۔ امتناع نظیر کا مسئلہ اس طرح پیدا ہوا کہ سورۂ طلاق کی آیت نمبر ۱۲ ہے:

اللہ الذی خلق سبع سموٰت ومن الارض مثلھن

[اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان بنائے اور زمین کی قسم سے بھی اُنھیں کے مانند (جیسے متعد آسمان اُس نے بنائے ہیں ویسی ہی متعدد زمینیں بھی بنائی ہیں اور جس طرح یہ ہماری زمین اپنی موجودات کے لیے فرش اور گہوارہ بنی ہوئی ہے۔ اسی طرح اور زمینیں آبادیوں کے لیے گہوارہ ہیں]

اس آیت کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباس کا ایک اثر ملتا ہے

" قال سبع ارضین فی کل ارض نبی کنبیکم و آدم کآدم و نوح کنوح و ابراھیم کابراھیم و عیسیٰ کعیسیٰ "

[کہا کہ سات زمینیں: ہر زمین پر تمہارے نبی جیسا نبی ہے، آدم جیسا آدم ہے، ابراہیم جیسا ابراہیم ہے اور عیسیٰ جیسا عیسیٰ]

لیکن ختم نبوت پر اجماع اُمت ہے۔ ظاہر ہے نبوت کا سلسلہ ایک ہو یا متعدد، افراد انبیا کا خاتم ایک ہی ہوگا۔ اس طرح یہ مسئلہ مذہبی عقیدت کے دائرے سے نکل کر عقلیت اور منطق کے حدود میں داخل ہوا۔ جیسا کہ سابق میں مذکور ہوا، اس زمانے کے علمی حلقوں میں معقولات کی گرم بازاری تھی، جس کی شدت کی شاہ صاحب اور ان کے متبعین کے اعتنام بالحدیث سے بھی تعدیل نہ ہو سکی۔

چنانچہ اس زمانے کے ایک بزرگ مولوی حیدر علی نے " امکان نظیر " کی تائید میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ اس وقت معقولیوں کے گل سر سبد مولانا فضل حق خیر آبادی تھے۔ وہ خیر آبادی سلسلۂ معقولات کے واسطۃ العقد تھے۔ ممکن ہے انھوں نے اسے اپنے تمنطق کے

خلاف ایک کھلا ہوا چیلنج سمجھا ہو۔ جو بھی سبب رہا ہو، انھوں نے اس کی تردید و ابطال میں ایک مستقل کتاب بعنوان "امتناع نظیر" تصنیف کی۔

مولانا کے دلائل کی ذہانت و پختگی مسلّم، مگر ان کا انداز استدلال اس درجہ غامض و مشکل تھا کہ بڑے بڑے علما کو اس کے کما حقہٗ سمجھنے میں دانتوں پسینا آجائے عوام کا تو کیا مذکور۔ وہ خاتم المتکلمین ہی نہیں خاتم المنطقیین بھی تھے۔ قاضی مبارک شرح سُلَّم العلوم پر ان کا حاشیہ بجا طور پر منطق کی ادبیات عالیہ میں محسوب ہوتا ہے۔ مگر مشکل یہ تھی کہ "امکان کذب" ہو یا "امتناع نظیر" دونوں مسئلے مدارس کی چہار دیواری میں محدود نہیں رہے تھے، واعظین و مقررین کی بدولت عوام میں پہنچ گئے تھے، کیوں کہ اس زمانے میں یہ مجالس وعظ ہی ابلاغ و ترسیل کا موثر ذریعہ تھے۔ مگر ذرائع ابلاغ میں ان سے بھی موثر تر ذریعہ شعر تھا۔ لہٰذا مولانا نے اپنے موقف کی اشاعت کے لیے اس سے بھی کام لیا۔ اس منصوبے کی تکمیل کے لیے انھوں نے وقت کے ایک عظیم شاعر نغز گفتار کا انتخاب کیا۔ یہ مرزا غالب تھے جو مولانا فضل حق کے عزیز ترین دوست بھی تھے۔

خدا جانے مولانا نے مرزا صاحب سے فرمائش کی تھی یا موخرالذکر ہی نے دوست کی خوشنودی طبع کے لیے یہ فریضہ اپنے ذمہ لیا۔ اس طرح یہ مسئلہ مجالس مناظرہ کی گرم گفتاری سے نکل کر شعری ادب کی نغز گفتاری کے حدود میں داخل ہوا اور مرزا نے دوست کے موقف کی تائید میں ایک مثنوی لکھی۔ مگر مولانا کے دلائل برہانی تھے، اُن کا غموض نثر ہی میں ان کی تلخیص سے مانع تھا، نظم کا تو کیا مذکور۔ اس مشکل پر مرزا صاحب نے اس طرح قابو پایا کہ برہان کے بجائے اقناعی و خطابی انداز استدلال کو اپنایا اور اس کے لیے تمثیل سے کام لیا۔

قائلین امکان کی سب سے بڑی دلیل یہ تھی کہ "خاتمیت" کو فرد واحد میں منحصر کر دینے سے قادر مطلق کا عجز لازم آتا ہے جو شان الوہیت کے منافی ہے۔ غالب کہتے ہیں آخر دنیا میں ایک ہی سورج ہے، ایک ہی چاند ہے تو پھر "خاتم المرسلین" بھی ایک ہی ہونا چاہیے۔ اگر سورج اور چاند کی مثل نہ ہونے سے باری تعالیٰ کی قدرت محدود نہیں ہوجاتی

اور اس کا عجز لازم نہیں آتا تو پھر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظیر اور مثال نہ ہونے سے اس کی قدرتِ کاملہ میں نقص کس طرح راہ پاسکتا ہے۔ آخر میں کہتے ہیں: یہ "عجز" نہیں، یہ تو عین "اختیار" ہے اور پھر نتیجہ نکالتے ہیں کہ حضرت رسالت مآب عدیم النظیر اور بے ہمتا ہیں۔ فرماتے ہیں:

صورتِ آرائشِ عالم نگر — یک مہ و یک مہر و یک خاتم نگر
آنکہ مہر و ماہ و اختر آفرید — می تواند مہر دیگر آفرید
حق دو مہر از سوے خاور آورد — کور باد آن کونہ باور آورد
قدرت حق بیش ازین ہم بودہ است — ہرچہ اندیشی کم از کم بودہ است
لیک در یک عالم از روے یقین — خود نمی گنجد دو ختم المرسلین
یک جہان تا ہست یک خاتم بس است — قدرتِ حق را نہ یک عالم بس است

این نہ عجز است "اختیار" است اے فقیہ
خواجہ "بے ہمتا بود" لاریب فیہ

مہر و مہ کی تمثیل کے علاوہ، وہ ایک اور دلیل بھی دیتے ہیں جو منطق سے زیادہ جذباتی ہے۔ کہتے ہیں باری تعالیٰ تو اپنے محبوب کا سایہ بھی پسند نہیں کرتا، بھلا وہ اُس کی "نظیر" کیوں بنانے لگا:

ہر کرا با سایہ نہ پسندد خدا
ہمچو اوے نقش کے بندد خدا

قائلین امکان اگر علی سبیل التنزل "امتناع" کو تسلیم بھی کرتے تھے تو "بالذات" اور "بالغیر" کی تدقیق کے ساتھ کہ خاتم المرسلین کی نظیر "ممتنع بالغیر" ہے۔ مگر غالب کی عقیدت اُنھیں "ممتنع بالذات" یا "محال ذاتی" بتانے ہی پر مصر ہے اور اسی کو اپنا موقف اور عقیدہ بتاتے ہوئے مثنوی کو ختم کرتے ہیں:

منفرد اندر کمال ذاتی است
لاجرم "مثلش محال ذاتی" است

زین عقیدت برنگردم والسّلام
نامہ را در می نوردم والسّلام

(۲) نرم تحریکیں

نرم تحریکوں کا نقطۂ آغاز وہ مسائل تھے جو متنازع فیہ ہونے کے باوجود تشدد آمیز آویزش کا مورث نہیں بنتے تھے، ان کا منشا ومنبع مدارس کی علمی سرگرمیاں ہوا کرتی تھیں۔

اُس زمانے میں نہ تو جامعات (مدارس) کی طرف سے Extension Lectures یا توسیعی خطبات کا انتظام ہوا کرتا تھا اور نہ اجتماعی تنظیمیں ہی ہوتی تھی، جن کے زیرِ سرپرستی مجالس مذاکرہ یا Seminars اور Symposia منعقد ہوتے۔ اس کی تلافی مجالس وعظ و ارشاد اور اہل علم کی محافل سے ہو جاتی جہاں شرکا غیر رسمی طور پر اپنے اپنے مختار مواقف کی موافقت یا فریق ثانی کے موقف کی مخالفت میں گفتگو کیا کرتے تھے۔ موضوع بحث عموماً وہ مسائل ہوا کرتے جن پر مدارس میں تدریس کے وقت اساتذہ تقریر کرتے اور جنھیں بعد میں متعلقہ کتابوں کے محشیین اپنا موضوع تحقیق بنایا کرتے تھے۔

۱۔ ان میں سے ایک اہم مسئلہ منطق کے داخل اقسام حکمت ہونے یا نہ ہونے کا تھا جو اس زمانے میں متداول فلسفے کی دو کتابوں میبذی اور صدرا کے مقدمے میں مذکور ہوا ہے۔ دونوں شارحین نے حکمت کی تعریف اور اس کے اقسام گنانے کے بعد یہ بحث اٹھائی ہے:

"اختلفوا فی ان المنطق من الحکمة ام لا"
(فضلا کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ منطق حکمت کا جز ہے یا نہیں)
اس مسئلہ اور اس نزاع سے پیدا ہونے والی علمی تحریک کی مزید تفصیل یہ ہے:۔

[illegible] زمانے میں نصاب پر معقولات ہی معقولات چھائی ہوئی تھی۔ معقولات کی کتب درسیہ میں ایک اہم کتاب میبذی تھی۔ یہ اثیر الدین ابہری کے متن ہدایۃ الحکمۃ

کی شرح ہے جو شارح قاضی کمال الدین حسین میبذی کے نام پر" میبذی" کہلاتی ہے۔
ہدایۃ الحکمۃ کی دوسری مشہور شرح جو ہمارے یہاں فلسفہ کے اعلا نصاب میں مشمول رہی ہے، صدر الدین ابراہیم شیرازی کی ہے جو اُن کے نام پر" صدرا" کہلاتی ہے۔
ہدایۃ الحکمۃ کے تین حصے یا اقسام ہیں: منطق، طبیعیات اور الہیات لیکن منطق والا حصہ عرصے سے نایاب ہے، لہذا میبذی نے صرف آخری دو قسموں کی شرح لکھی۔ درس میں متداول "صدرا" صرف پہلی قسم " طبیعیات" کے فن اول " مایعم الاجسام" کی شرح پر مشتمل ہے۔
" میبذی" کی ابتدا حسب معمول حمد و نعت اور سبب تالیف کتاب سے ہوتی ہے۔
اصل کتاب کا آغاز فلسفہ یا حکمت کی تعریف سے ہوتا ہے:
"حکمت اعیان (خارجی نہ کہ ذہنی) موجودات کے احوال کا علم ہے جیسا کہ وہ نفس الامر میں ہیں بقدر طاقت بشری کے"۔ پھر حکمت کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے حکمت نظری اور حکمت عملی۔ حکمت نظری کی تین قسمیں بتائی ہیں: طبیعیات، ریاضیات اور الہیات۔ حکمت عملی کی بھی تین قسمیں ہیں: تہذیب الاخلاق، تدبیر المنزل اور السیاستہ المدنیہ۔
ان اقسام شش گانہ میں منطق کہیں نہیں آتا۔ لہذا فطرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نظام تعلیم میں منطق کا کیا مقام ہے؟ آیا وہ فلسفہ میں داخل ہے یا اُس سے خارج؟۔
داخل نہ ہونا تو محررہ بالا تقسیم سے ظاہر ہے۔ رہا خارج ہونا تو یہ فلسفہ کے ذاتی وقار اور Prestige کے منافی تھا جو جملہ علوم کے میزان کل یا Sum Total ہونے کا دعویدار تھا۔
لہذا میبذی ہو یا صدرا کتاب کے شروع ہوتے ہی یہ سوال پیدا ہو جاتا تھا۔
خارج ماننے والوں کا کہنا تھا کہ منطق میں جنس و فصل وغیرہ سے بحث کی جاتی ہے اور ان کا خارج میں کوئی وجود نہیں ہے اس لیے یہ" اعیان (خارجی) موجودات" کے مصداق سے خارج ہیں جن کے علم کا نام حکمت ہے۔ اس لیے منطق حکمت کے تحت نہیں آتا۔
داخل ماننے والے کہتے تھے کہ اگر جنس و فصل وغیرہ اعیان یا موجودات خارجی نہیں ہیں تو وجود و عدم اور امکان و حدوث وغیرہ کا بھی خارج میں کوئی وجود نہیں ہے، لہذا

جن وجوہ کی بنا پر جنس و فصل وغیرہ سے بحث کرنے والے علم یعنی منطق کو حکمت سے خارج کیا جاتا ہے، انھیں وجوہ کی بنا پر "امور عامہ" سے بحث کرنے والے علم یعنی "الہیات" یا "مابعد الطبیعیات" یا Metaphysics کو بھی حکمت سے خارج کیا جائے۔

مگر ایسا نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ "مابعد الطبیعیات" فلسفہ کا جزء لاینفک بلکہ "جان فلسفہ" ہے۔

اس طرح منطق کے تحت اقسام حکمت ہونے نہ ہونے کا مسئلہ اُس وقت کی علمی برادری کا ایک دلچسپ موضوع بحث تھا۔

عمل اہل منطق کا داخل ماننے ہی پر تھا۔ متداول فلسفہ کے بانی و مفتتح شیخ بوعلی سینا نے جو فلسفہ کی کتاب الشفا کے نام سے لکھی ہے اور جو بعد میں یونانی ابن سینائی فلسفہ کی کتاب مقدس سمجھی گئی جیسا کہ انوری کہتا ہے:

مرد را حکمت ہمی باید کہ دامن گیردش

تا شفائے بوعلی خواند نہ زاز بحتری

اس کتاب کے چار حصوں میں سے پہلا حصہ منطق پر ہے۔ شیخ کی دوسری کتابوں "النجاۃ" اور "دانش نامہ علائی" کا بھی پہلا حصہ منطق پر ہے۔ شیخ کے دونوں حریف پنجہ شکن شیخ الاشراق شہاب الدین مقتول کی "حکمۃ الاشراق" اور ابو البرکات بغدادی کی "کتاب المعتبر" کا پہلا جز بھی منطق پر ہے۔ خود ماتن اثیر الدین ابہری نے "ہدایہ الحکمہ" کا پہلا جز منطق ہی کے لیے وقف کیا تھا۔ اس لیے ہر چند کہ میبذی نے حکمت کی تعریف میں "اعیان" کی قید بڑھا کر تشکیک پیدا کر دی تھی، ملّا صدرا نے واضح طور پر کہہ دیا:

"والحق ادخال المنطق فی الحکمۃ وجعلہ من اقسام النظریہ کما فعلہ الشیخ الرئیس"

[منطق کا حکمت میں داخل کرنا اور اُسے حکمت نظریہ کی قسم بنانا جیسا کہ شیخ الرئیس بوعلی سینا نے کیا تھا، حق ہے]

ذوق نے جن کا ظہور و نبوغ غالب ہی کے علمی و فکری ماحول میں ہوا تھا، تو ہدہ

مولوی عبدالرزاق سے کتب معقولات کو پڑھا تھا اور غالباً صدرا تک پہنچ گئے تھے، کیوں کہ ان کے یہاں اس بحث میں کوئی تذبذب نہیں ملتا۔ بلکہ وہ ملا صدرا کے اتباع میں منطق کو اقسام حکمت میں مانتے ہیں اور کہتے ہیں :

گرچہ ہے تحت حکمت

اور اسے اپنی شاعرانہ تعلّی کا ذریعہ بنایا کہ میرے منطق کے ساتھ اعتنا کرنے سے اس فن میں یہ احساس برتری پیدا ہوگیا ہے' اب وہ حکمت کے تحت (بمعنی اُس سے فروتر) رہنے پر آمادہ نہیں حالانکہ بقول مختار وہ "تحت حکمت" ہے۔ کہتے ہیں :

کبھی منطق کو تفوق یہ مرے ناطقہ سے
تحت حکمت ہوئے فن ! گرچہ ہے تحت حکمت

اگلی چار فکری تحریکوں کا ماخذ بھی "میبذی" ہی کی متنازع فیہ ابحاث ہیں۔ اس لیے اس کتاب کے مندرجات کا مختصر تجزیہ مستحسن ہوگا۔

"میبذی" کی قسم دوم "طبیعیات" میں تین فن ہیں : پہلا فن مایعم الاجسام میں ، دوسرا فلکیات میں، تیسرا عنصریات ہیں۔ فن مایعم الاجسام میں دس فصلیں ہیں : پہلی فصل جزء الذی لایتجزیٰ کا ابطال، دوسری فصل ہیولیٰ کا اثبات، تیسری فصل اس بات میں کہ صورۃ جسمیہ ہیولیٰ سے متجرد نہیں ہوسکتی اور چوتھی فصل اس بات میں کہ ہیولیٰ صورۃ سے متجرد نہیں ہوسکتا۔ بقیہ فصول کی تفصیل غیر ضروری ہے۔ تیسری چوتھی فصلوں کا مشترک مقصد ہیولیٰ اور صورۃ جسمیہ میں تلازم ثابت کرنا ہے' دونوں ایک دوسرے سے متجرد ہوکر نہیں پائے جاسکتے۔ دوسرے فن فلکیات میں آٹھ فصلیں ہیں۔ ان میں سے تیسری فصل اس باب میں ہے کہ فلک نہ کون و فساد کو قبول کرتا ہے اور نہ خرق والتیام کو۔ باقی فصول غیر متعلق ہیں۔ تیسرے عنصریات میں چھ فصلیں ہیں' ان میں سے پہلی فصل بسائط عنصریہ میں ہے' اسی میں استحالہ کی بحث آتی ہے۔ باقی فصول کی تفصیل غیر ضروری ہے۔

۲ ۔ میبذی کی القسم الثانی فی الطبیعیات کے فن اوّل" فیما یعم الاجسام" کی تیسری فصل کا عنوان ہے :

" ان الصورۃ الجسمیۃ لاتتجرد عن الھیولیٰ "
[صورت جسمیہ ہیولیٰ سے متجرد ہوکر نہیں پائی جاسکتی]
چوتھی فصل کا عنوان ہے :

" ان الھیولیٰ لاتتجرد عن الصورۃ " ۔
[ہیولیٰ صورت جسمیہ سے متجرد ہوکر نہیں پایا جاسکتا]

صورت حال یہ ہے کہ حکمائے سابقین کے نزدیک وجود کی دو قسمیں ہیں : واجب اور ممکن۔ ممکن کی دو قسمیں ہیں : جوہر اور عرض - جوہر کی پانچ قسمیں ہیں جسم ، صورۃ ، ہیولیٰ ، نفس اور عقل۔ صورت اور ہیولیٰ ایک دوسرے سے علاحدہ ہوکر نہیں پائے جاسکتے ، دونوں کے مجموعہ کا نام جسم ہے ۔

اس طرح صورت اور جسم کا ایک دوسرے سے علاحدہ ہونا ناممکن ہے ۔

یہ قدیم طبیعیات کا مسئلہ تھا ، جس میں انکار کی گنجائش نہیں تھی - مگر ذوق نے اپنے ممدوح کی سپاہ گری اور تیغ زنی میں مبالغہ آرائی کے لیے طبیعیات قدیم کے اس مسئلہ کا انکار کیا اور لکھا :

وہ تری تیغ کی بُرِش ہے کہ سایہ جس کا
کردے اک دم میں ہیولیٰ سے مفارق صورت

۲ - فن ثانی فلکیات کی تیسری فصل کا عنوان ہے

" ان الفلک لا یقبل الکون والفساد ..... والخرق والالتیام "
[فلک نہ کون وفساد کو قبول کرتا ہے ، نہ خرق والتیام کو]

آج جب کہ فلک ہی عہد باستان کے وہم غلط کار کی مشق پیہم سمجھا جاتا ہے اور حوصلہ مند خلابازوں نے چاند پر جھنڈا گاڑ کر افلاک کے وجود کے انکار کو ۔

" آفتاب آمد دلیل آفتاب "

کا مصداق بنا دیا ہے ، اُس کے " خرق والتیام " کا کیا مذکور۔ مگر عہد پیش نظر میں یہ بھی ایک اہم فکری نزاع تھی ۔

ہوا یہ کہ جب یونانی فلسفہ مسلمانوں میں داخل ہوا تو اسلامی معتقدات سے اس کا تصادم ناگزیر ہوگیا۔ اور فلسفہ کی دوسری گل فشانیوں کے ساتھ یہ مسئلہ بھی اسلامی افکار کے ساتھ دست و گریباں ہوگیا۔ اسلامی فکر کی رو سے ملائکہ آسمانوں میں ہوکر آتے جاتے ہیں اور یہ آمد و رفت یقیناً افلاک کے خرق والتیام کو مستلزم ہے مگر اس کی سب سے بڑی زد عقیدۂ معراج پر پڑتی تھی جس پر ایمان ایک حد تک فرض اور اس لیے اس کا انکار کفر اور اس کے بعد سفر آسمانی کا انکار بدعت شنیعہ ہے، چنانچہ "شرح عقائد نسفی" میں ہے:

"والمعراج لرسول الله عليه السلام في اليقظه بشخصه
الى السماء ثم الى ماشاء الله تعالى من العلوحق:
اى ثابت بالخبر المشهور حق ان منكره يكون مبتدعا.
وانكاره وادعاء استحالته انما يبتنى على اصول الفلاسفة والافالخرق
والالتيام على السموت جائز والاجسام متماثلة يصح على كل
ما يصح على الآخر والله تعالى قادر على الممكنات كلها"

[اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بیداری میں اپنی روح انور اور جسد مطہر کے ساتھ معراج یعنی آسمان تک تشریف لے جانا اور وہاں سے جہاں تک اللہ تعالیٰ نے چاہا اوپر جانا حق ہے۔
یعنی یہ بات حدیث مشہور سے ثابت ہے۔ یہاں تک کہ اس کا انکار کرنے والا مبتدع یا بدعتی ہوگا۔

(رہا) اس کا انکار اور اسے محال سمجھنا تو یہ فلاسفہ کے (اس) اصول پر (کہ فلک خرق والتیام کو قبول نہیں کرتا) مبنی ہے (ورنہ) آسمانوں میں خرق والتیام کا واقع ہونا جائز اور ممکن ہے۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ جملہ) اجسام (خواہ فلکی ہوں یا تحت القمری اپنی بنیادی حقیقت کے اعتبار سے) متماثل (ایک دوسرے کے مانند) ہیں۔ (اُن میں سے) ہر ایک (جسم مثلاً فلکی اجسام) پر وہ عوارض صحیح ہوسکتے ہیں جو دوسروں پر (جیسے اجسام تحت القمری کا خرق والتیام) صحیح (ممکن) ہے اور اللہ تعالیٰ (تو) تمام ممکنات پر قادر ہے]

بہرحال اپنے موقف کی تائید میں یونانی فلسفہ کا کہنا تھا کہ خرق والتیام حرکت

مستقیمہ کے مقتضی ہیں جب کہ فلک صرف حرکت مستدیرہ Circular Motion ہی کے قابل ہے اور اس میں حرکت مستقیمہ کا امکان نہیں ہے۔

اس کے جواب میں متکلمین نے بھی اتنے ہی گراں با سنگ دلائل پیش کیے جن کی تفصیل علمائے مدرسین میبذی اور شرح عقائد نسفی نیز اس کے حاشیہ " خیالی " کے درس کے دوران متعلقہ مسائل کی توضیح کے سلسلے میں دیا کرتے تھے۔ اور اس طرح اس مسئلے نے وقت کی اہم فکری تحریکوں میں نمایاں مقام حاصل کر لیا تھا۔

فریقین کے دلائل و براہین کے اشکال و غموض کا تو ادب لطیف متحمل نہیں ہو سکتا تھا، مگر نفس مسئلے سے تعرض کی جھلکیاں اس میں ضرور ملتی ہیں، چنانچہ غالب کے حریف پنجہ شکن استاد ابراہیم ذوق جب اپنے ممدوح کے دوام عز و جاہ کی دعا مانگتے ہیں تو اس دوام کی مدت کو فلاسفہ کے اپنے اسی دعوے پر اصرار سے ناپتے ہیں:

تا زباں زد دہر میں ہو فلسفی کا یہ کلام
ہے پئے افلاک لازم نفی خرق و التیام

۴۔ اس زمانے میں علم ہیئت کے نصاب میں دو کتابیں داخل تھیں: متوسطات میں تصریح (شرح تشریح الافلاک) اور مطولات میں شرح چغمینی۔ دونوں کے مقدمہ میں عناصر اربعہ کے کروی الشکل Spherical ہونے کو فلسفہ طبیعیات کے ایک مسلمہ کی طرح تسلیم کر لیا گیا ہے۔ پھر ریاضی و ہندسہ کی مدد سے اس کی تفریعات بیان کی ہیں۔ ان میں سے ایک تفریع Application کو تصریح میں بدیں طور بیان کیا ہے:۔

" وههنا مسئلة غريبة يتفرع على كروية الماء وميلان الانتقال بالطبع الى مركز العالم ، اراد ان يوردها - فقال :
ولكونه اينما وقع قطعة من كرة مركزها مركز العالم وسع الاناء منه في السفل كان اكثر منه في العلو كما نرى :

[اور یہاں ایک عجیب مسئلہ ہے جو پانی کی کرویت اور اس بات پر متفرع ہوتا ہے کہ تمام بھاری چیزیں بالطبع مرکز عالم کی مائل ہوتی ہیں مصنف نے اسے بیان کرنے کا ارادہ کیا اور کہا کہ جہاں کہیں بھی کرہ کا قطعہ Segment واقع ہو تو نیچی جگہوں پر (مثلاً) کنویں کی تلی) میں پانی کے برتن میں زیادہ گنجائش ہوگی بمقابلہ اونچی جگہوں (مثلاً) منارے کے] اسی طرح "شرح چغمینی" میں ہے :

" ومما يستغرب ان الاناء المملوء ماء يحوى منه وهو
اقرب الى مركز العالم كقعر البير مثلاً اكثر مما يحويه
وهوالبعد منه كرأس المنارة "

[اور جو چیز عجیب معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ پانی کا بھرا ہوا برتن جو مرکز عالم سے زیادہ قریب ہو جیسے کنویں کی تلی میں اُس کا مظروف زیادہ ہوگا بمقابلہ اس حالت کے کہ وہ مرکز عالم سے زیادہ دور ہو، جیسے کسی منارہ کی چوٹی پر۔]

بہرحال اس مسلہ کی روسے پانی کا برتن خواہ کنویں کی تلی میں ہو یا منارہ کی چوٹی پر، ہر جگہ پانی کی بیرونی سطح کروی Spherical ہوگی یعنی ایسے کرۂ حقیقی Mathematical Sphere کے قطعہ Segment کی سطح جس کا نصف قطر مرکز عالم اور پانی کی بیرونی سطح کے فاصلہ کے برابر ہوگا۔ ظاہر ہے یہ فاصلہ پانی کے برتن کی وضع مکانی کی تبدیلی سے چھوٹا بڑا ہو سکتا ہے۔ مثلاً اگر برتن کنویں کی تلی میں ہو تو یہ نصف قطر چھوٹا ہوگا اور اگر منارہ کی چوٹی پر ہو تو بڑا ہوگا۔

اب یہ ایک خالص ہندسۂ کروی Spherical Geometry کی بحث ہے کہ اگر دو کروں کے نصف قطر غیر مساوی ہوں تو جس کرے کا قطر یا نصف قطر بڑا ہوگا، اس کے قطعہ یا Segment کی مساحت چھوٹے نصف قطر والے کرہ کے قطعہ سے کم ہوگی (بشرطیکہ کرے کو قطع کرنے والے دائرے برابر ہوں)۔

مگر ہندسہ کروی کے اس دعوے کا ثبوت اس زمانے کا بڑا ہی غامض اور پیچیدہ مسئلہ تھا اور ریاضی وہیئت کے اساتذہ اس کی توضیح میں پوری قابلیت صرف کر دیتے تھے

اور پھر بھی اس کے سمجھنے میں طالب علموں کے دانتوں تک کو پسینہ آجاتا تھا۔

شاید ابراہیم ذوق کو بھی اس اشکال وغموض کا تجربہ ہوا تھا اور اس کے حل کو کماحقہ سمجھنے کے لیے غیر معمولی ریاض کیا تھا۔ قدرتی بات ہے وہ اپنے معاشرے سے اپنے اس تبحر وتمہر کی قدر شناسی کی توقع رکھتے ہوں گے۔ مگر بدقسمتی سے وہ اس سے محروم رہے لہٰذا اس محرومی قسمت کی شکوہ سنجی میں فرماتے ہیں :۔

کیا ہوا جانا اگر مسئلہ بیر دمنار
پستی بخت سے تجھ کو جو نہیں ہے رفعت

اور بھی متنازع فیہ مسائل تھے، جنھوں نے اس عہد کی فکری تحریکوں کو جنم دیا تھا۔ مگر ان کے استقصا کی کوشش تنگی وقت کے پیش نظر مستحسن نہ ہوگی۔ لہٰذا دو ایک زیادہ اہم مسائل کی نشاندہی کرنے ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے :

اس وقت دو اہم مسئلے تھے : ایک مسئلہ حدوث دہری کا تھا اور دوسرا علم واجب کا۔

۵۔ زمان کا مسئلہ علامہ اقبال کے خیال میں اُمّت مسلمہ کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے، اس لیے قدیم زمانے سے مفکرین اسلام نے اسے اپنی تفکیری سرگرمیوں کا موضوع بنایا۔ مگر زمانے کے تصور میں ایک عجیب بات یہ ہے کہ جوں ہی کسی نحو سے اس کے وجود کا اقرار کیجیے، اگلے لمحے "یہ خود آ" اور پھر "خدا" بن جاتا ہے۔ اس لیے متکلمین اسلام نے سرے ہی سے اس کا انکار کیا۔ ان کے علی الرغم حکما اس کے وجود کے قائل تھے۔ متکلمین کے اعتراضات سے بچنے کے لیے شیخ بوعلی سینا نے "زمان، دہر اور سرمد کی تدقیق" کی تجدید کی، مگر امام رازی نے اسے "تہویل خال عن التحصیل" بتاکر مسترد کر دیا۔ اُن کے علاوہ اور متکلمین نے بھی اس کی تردید کی۔

گیارھویں صدی ہجری کی ابتدا میں مشہور ایرانی فلسفی میر باقر داماد نے "حدوث دہری" کا نظریہ وضع کر کے اس مسئلہ کا سائنٹفک حل پیش کیا۔ مگر جب یہ نیا نظریہ ہندستان آیا تو عبقری وقت ملا محمود جونپوری نے شمس بازغہ میں اس سے اختلاف کیا اور قدیم ارسطاطالیسی نظریۂ زمان کی تجدید کی۔ ہندوستان کے بعض علمائے معقول میر باقر داماد سے

براہ راست کسب فیض کر کے آئے تھے، اُن کے علاوہ یہاں کے اور علما نے بھی ان موخرالذکر تلامذہ کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا تھا۔ اس طرح ملا محمود اور میر باقر داماد کے متبعین میں نزاع چھڑ گئی جو عرصہ تک جاری رہی۔ تاآنکہ ملا امان اللہ بنارسی نے جو ملا نظام الدین سہالوی کے اساتذہ میں سے تھے دونوں کے درمیان محاکمہ کیا۔

مگر اس محاکمہ سے اصل نزاع ختم نہیں ہوئی، کیوں کہ جب "افق المبین" معقولات کے اعلا نصاب میں داخل کی گئی تو پھر مدرسین اور محشیین نے میر باقر داماد کے دوسرے منفردات کے ساتھ اُسے بھی تائید و تردید کا موضوع بنایا۔ انھیں میں مولانا فضل حق خیرآبادی تھے جو غالب کے دوست اور ہم جلیس تھے۔ انھوں نے بھی "افق المبین" پر حاشیہ لکھا جو بجاے خود ہندوستان کے فلسفیانہ شاہکاروں میں نمایاں مقام رکھتا ہے۔ بعد میں اُن کے تلامذہ نے "حدوث دہری" کے نظریہ کی تنقید و تردید کو جاری رکھا، چنانچہ اس سلسلے کے ایک مشہور عالم مولانا معین الدین اجمیری نے "الحجۃ البازغۃ" کا ایک مستقل باب نظریۂ "حدوث دہری" کی توضیح و تردید کے لیے وقف کیا ہے۔

یقیناً اتنا اہم مسئلہ مولانا فضل حق اور مرزا غالب کے مابین علمی گفتگو میں ضرور آیا ہوگا، مگر اس کے غموض و اشکال کے پیش نظر نہ مرزا غالب نے اور نہ کسی شاعر شیریں مقال نے اس پر طبع آزمائی کی جرات کی۔

۲ - دوسرا مسئلہ علم واجب کا تھا، جس کی اہمیت اس بنا پر اور ہے کہ اس سے ہندوستان کے علمی وقار کی ہوا خیزی اور پھر بحالی وابستہ ہے۔

باری تعالی کا عالم ہونا متفق علیہ ہے۔ عامۂ اہل اسلام اور اُن کے ترجمان حضرات متکلمین تو اللہ تعالی کو عالم و علام الغیوب مانتے ہی ہیں۔ حکما بھی اس بات کے قائل ہیں مگر "معلوم" میں اختلاف ہے: عامۂ اہل اسلام کا عقیدہ ہے کہ باری تعالی

عالم الغیب لا یعزب عن علمہ شیٔ

ہے۔ کلیات ہوں یا جزئیات، مجردات و معقولات ہوں یا محسوسات، متغیرہ ہوں یا غیر متغیرہ

اُسے ہر شے کا علم ہے۔ لیکن بوعلی سینا کا کہنا ہے کہ وہ عالم ضرور ہے مگر کلیات کا، جزئیات مادیہ متغیرہ کا اُسے علم نہیں ہے۔ لہذا امام غزالی نے تہافت الفلاسفہ کے تیرھویں مسئلے میں اس ابن سینائی موقف کی تردید کی۔ پھر یہ بحث متکلمین اور حکما کے درمیان چل نکلی۔ اس کی بنا پر متکلمین شیخ کی تکفیر کی طرف مائل تھے، مگر حکما اس کی تصویب کرتے تھے۔

یہ صورت حال تھی کہ ۱۰۵۶ھ میں شاہجہاں نے تعلقات کی بحالی کے لیے جاں نثار خاں کی سرکردگی میں ایران ایک سفارت بھیجی۔ سفارت خانے کے دو عہدیداروں محب علی اور محمد فاروق کو اپنی معقولات دانی پر بڑا غرہ تھا۔ وہ خود وزیر اعظم سے جو اپنے غیر معمولی علم وفضل کی وجہ سے "خلیفہ دانشور" کہلاتا تھا، جا بھڑے۔ خلیفہ دانشور نے صرف ایک سوال پوچھا کہ امام غزالی نے قدمِ عالم، نفی حشر اجساد اور انکار علم باری بجز کلیات مادیہ کی بنا پر شیخ بوعلی سینا کی تکفیر کی ہے مگر بعض لوگوں نے حکما کے موقف کی تصویب کی ہے، اس کی تقریر کیجیے۔ لیکن ان عہدیداروں کا علم بحاثی تک محدود تھا لہذا کوئی شافی جواب نہ دے سکے اور بقول علامی سعد اللہ خاں۔

مدعیاں دروغ چو شمع کشتہ بے فروغ ماندند

جب شاہجہاں کو ہندوستان کے علمی وقار کی اس ہوا خیزی کی اطلاع ملی تو اُسے صدمہ ہوا۔ مگر وزیر اعظم سعد اللہ خاں نے مُلّا عبدالحکیم سیالکوٹی سے اس صورت حال کے لکھنے کے بعد استدعا کی کہ اس موضوع پر ایک ایسی سیر حاصل بحث قلم بند فرمائیں، جس سے ہندوستان کا کھویا ہوا علمی وقار ایران میں بحال ہو جائے۔ اس فرمائش کی تعمیل میں میں مُلّا عبدالحکیم سیالکوٹی نے اپنا مشہور رسالہ الدرۃ الثمینۃ مرتب فرمایا۔ اس میں "قدم عالم" اور "حشر اجساد" کے مسئلوں سے تو یوں ہی سا تعرض کیا، البتہ علم واجب کے مسئلے سے جزئی تفصیلی بحث کی۔ اس طرح انھوں نے ہی "علم باری تعالیٰ" کے باب میں "احتمالات پنجگانہ" اور "مذاہب عشرہ" کی اسکیم کا آغاز کیا۔

مُلّا عبدالحکیم سیالکوٹی کے ایک معاصر متاخر میر زاہد ہروی تھے۔ جب انھوں نے

قطب الدین رازی کے "رسالہ تصور و تصدیق" کی شرح لکھی تو اس کے "منہیہ" میں باری تعالیٰ کے علم تفصیلی کے مراتب اربعہ کی کیفیت معمولی تغیر کے ساتھ "الدرۃ الثمینہ" ہی سے نقل کی ہے۔

میرزاہد ہروی کے سلسلۂ تلمذ میں قاضی مبارک گوپا موی منسلک تھے۔ موخرالذکر کا سلسلہ ملا عبدالحکیم تک بھی پہنچتا ہے اس طرح قاضی مبارک تک یہ پوری تفصیل سینہ بسینہ پہنچی۔ لہٰذا جب وہ "سلم العلوم" کی شرح لکھنے بیٹھے تو ماتن کے قول

"لایتصور ولا یتصور بہ"

کے ضمن میں علم باری تعالیٰ کے ان مذاہب عشرہ کو بھی نقل کیا۔ ان کے بعد جن شارحین نے بھی "سلم العلوم" کی شرح لکھی، انھوں نے اس اسکیم کا تتبع کیا۔ ادھر میرزاہد کے مذکورۃ الصدر "رسالۂ قطبیہ" کے محشیوں نے بھی من و عن اس اسکیم کو متعلقہ مقام پر نقل کیا اور اس طرح "مسئلہ علم واجب" نے اس زمانے کی فکری تحریکوں میں ایک اہم حیثیت حاصل کرلی۔

مرزا غالب اس تحریک سے براہ راست تو متاثر نہیں ہوئے، البتہ عقیدۂ وحدت الوجود کے سلسلے میں بالواسطہ ضرور متاثر ہوئے، جس کی تفصیل باری تعالیٰ کے علم تفصیلی کے "مراتب اربعہ" کے ضمن میں آگے آرہی ہے۔

اور بھی فکری تحریکیں تھیں، جن میں سے بعض اس لیے قابل ذکر ہیں کہ خود غالب کے یہاں اُن کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔

۷۔ ان میں سے ایک عناصر اربعہ کے ایک دوسرے میں مستحیل ہونے سے متعلق تھی۔

یہ بحث اس زمانے کی متداول فلسفہ کی درسی کتاب "میبذی" سے ماخوذ تھی جس کی قسم طبیعیات کے فن ثالث "عنصریات" کی پہلی فصل کا عنوان ہے "فی البسائط العنصریۃ"

بسائط اور عناصر کا مسئلہ قدیم یونانی فلسفہ کا انتہائی مہتم بالشان مسئلہ تھا کیونکہ اسی کی تحقیق و کاوش سے اس عہد کی فلسفیانہ سرگرمیوں کا آغاز ہوا تھا جس سقراط سے قبل کے دور کے یونانی مفکرین کے سامنے بنیادی مسئلہ یہ تھا کہ کائنات کا مبدء اولین جس سے باقی

دوسرے موجودات وجود میں آتے کیا ہے۔ اس سلسلے میں ان مفکرین کو تین طبقوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:-

پہلا طبقہ حکماے ملطیہ کا تھا اُن کا پیشوا تالیس الملطی Thalse of Milletus تھا جس کے نزدیک مبدء اولین کائنات "پانی" ہے، اسی سے دوسری چیزیں پیدا ہوئیں۔ اُس کے شاگرد انکسمنڈر کے نزدیک مبدء اولین "مادۂ غیر مشخص Undifferentiated Matter تھا اور موخرالذکر کے شاگرد انکسمنیس Anaximenese کے نزدیک "ہوا"۔

مگر اب یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر وجود واحد ہے تو پھر اُس سے وجود متعددہ کس طرح پیدا ہوئے؟

اس کا جواب دوسرے طبقہ کے مفکرین نے تلاش کیا، جن کی دو راہیں تھیں: ایلیائی حکما بالخصوص برمینیدس Parmenides کا خیال تھا کہ مبدء اولین ہمیشہ ایک ہی رہتا ہے، رہا حدوث و تغیر تو وہ وہم محض ہے۔ اس کے مقابلے میں ایراقلیطس Heraclitus کا کہنا تھا کہ حدوث و تغیر ہی سب کچھ ہے۔ رہا سکون وثبات تو یہ صرف واہمہ کی مشق پیہم ہے۔

اس تصادم افکار سے بچنے کے لیے تیسرے طبقے کے مفکرین نے قوام کائنات کی اصل مبدء واحد کے بجاے مبادی متعددہ میں تلاش کی۔ ان میں تین نام خصوصیت سے مشہور ہیں: انبذقلیس Empedocles نے کہا کہ قوام کائنات عناصر اربعہ آب، باد، خاک اور آتش کے ترکیب و امتزاج کا نتیجہ ہے۔ دیمقراطیس Democritus نے سالمات Attoms یا اجزاء لایتجزی کو اصل کائنات بتایا اور انکساغوراس Anaxasoras نے اجزاء صغار کو۔ وہ کہتا تھا کہ کائنات کی اصل جملہ اشیا کے اجزاء صغار ہیں۔ انھیں کے مجموعے سے کائنات بنی ہے۔

ان میں سے قبول عام انبذقلیس کے نظریہ "عناصر اربعہ" کو حاصل ہوا۔ ارسطو نے فلسفہ میں اور جالینوس اور دیگر اطبا نے طب میں اُسے ہی درخور اعتنا سمجھا۔ بایں ہمہ دوسرے دو نظریات سے بھی تعرض کیا، اگرچہ از راہ تنقیص۔

یہی فلسفہ مسلمانوں میں منتقل ہوا اور پھر پانچویں صدی ہجری میں شیخ بوعلی سینا نے اُسے کتاب الشفا میں منظم طور پر مدون کیا۔ اسی "ارسطاطالیسی ابن سینائی" فلسفہ کو اثیرالدین ابہری نے ہدایۃ الحکمۃ میں نقل کیا جس کی مشہور و متداول شرح میبذی کے نام سے غالب کے زمانے میں (اور آج بھی) داخل درس ہے۔

غرض عہد غالب میں مسلمہ نظریہ تو عناصر اربعہ اور اُن کے استحالہ کا تھا، چنانچہ "میبذی" میں لکھا ہے:-

"وکل منها قابل للکون والفساد"

[یعنی عناصر اربعہ میں سے ہر عنصر دوسرے عناصر میں مستحیل ہوجاتا ہے]

مگر اس کی تائید و تشیید کے لیے دو اور نظریوں کو بیان کرکے ان کی تضعیف کی جاتی تھی۔ ان دونوں نظریوں کے قائلین اصحاب الکمون والبروز اور اصحاب الخلیط کہلاتے تھے۔ اول الذکر کا کہنا تھا کہ عناصر اربعہ بسیط نہیں ہیں بلکہ ہر عنصر جملہ عناصر حتیٰ کہ جملہ اشیاء کے اجزاء صغار سے مرکب ہے۔ جس شے کا اس پر غلبہ ہوتا ہے، اُسی نام سے موسوم ہوتا ہے۔ ثانی الذکر کا کہنا تھا کہ ہر عنصر کی ظاہری صورت دوسرے عنصر کے نفوذ سے بنتی ہے۔ لہٰذا شیخ نے کتاب الشفا میں نظریۂ عناصر اربعہ کے استحکام کے لیے ان دونوں نظریوں کی تضعیف کی۔ بعد میں امام رازی نے شیخ کے استدلال پر معاندانہ انداز میں تنقید کی جس کا پہلے محقق طوسی نے اور پھر قطب الدین رازی نے جواب دیا۔

بہرحال ان تنقیدات اور باز تنقیدات کا غالب کے عہد میں بھی ہنگامہ گرم تھا۔ لہٰذا فطری تھا کہ اور نہیں تو کم از کم گفتگو ہی میں مرزا غالب اور اُس عہد کے دوسرے افاضل معقولات بالخصوص مولانا فضل حق خیرآبادی کے مابین یہ مسائل آتے رہے ہوں گے۔

بہرحال غالب کی سلالت روی نے افاضل عہد ہی کے موقف کو اپنا مختار بنایا۔ فلاسفہ کا کہنا تھا کہ

"والماء ایضاً ینقلب هواءً بالتبخر"

[اور پانی بھی بخارین کر ہوا میں منقلب ہوجاتا ہے اور یہ تبخیر پانی کو گرمی پہنچنے کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوتی ہے - پھر بھاپ اس درجہ تحلیل ہوجاتی ہے کہ بالکل لطیف ہوجاتی ہے، جیسا دیگچی میں پانی کھولنے کے وقت مشاہدہ کیا جاسکتا ہے]

مگر شعر کی نزاکت منطقی قیل وقال کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی، لہذا مرزا صاحب نے

در دلِ ما غمِ دنیا غمِ معشوق شود
بادہ گر خام بود پختہ کند شیشۂ ما

کے مصداق کے منطقی استدلال کے بجائے شاعرانہ حسن تعلیل سے کام لیا اور معاملات عشق و عاشقی کی مدد سے اس خالص سائنسی حقیقت کو ثابت کیا - فرماتے ہیں :-

ضعف سے گریہ مبدل بہ دمِ سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہوجانا

۸ - ایک اور تحریک جس نے غالب کو متاثر کیا، تشکیک وارتیابیت کی تھی -

تشکیک وارتیابیت Scepticism حد سے متجاوز تحکمیت وادعائیت Dogmatism کا نتیجہ ہوا کرتی ہے - قبل سقراطی دور کا یونانی فلسفہ اسی ادعائیتِ مفرط کا شکار تھا، لہذا تصادم آراء وتکافوء ادلہ نے اس وقت کے انسان کی سوچنے سمجھنے والی قوت ہی کو ماؤف کردیا تھا جس کے نتیجہ میں فرقۂ سوفسطائیہ پیدا ہوا - اس سے بدتر حالت عہد حاضر کی ہے جس نے دانشمندانہ عہد حاضر کو حیرت اور بے یقینی کے گرداب میں پھنسا ڈالا ہے جس سے نکلنے کے لیے وہ ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں - ایک یورپی مفکر Chester Rowell کہتا ہے:

Now we find ourselves in a Whirlpool in
which nothing is fixed not even the direction
of the current in which we are floating

لیکن عہد غالب کی دہلی میں نہ یہ ادعائیت اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والا تکافوء ادلہ تھا نہ یہ تشکیک وارتیابیت - افاضل عہد بطور تعلی ذاتی طور پر " انا ولا غیری "

کا دعوا کرتے ہوں تو کرتے ہوں۔ مگر اپنے انکار کی صحت مطلقہ کے بارے میں خوش فہمی میں مبتلا نہ تھے، کیوں کہ ہر مسئلے کی توجیہ کا اختتام وہ

"واللہ اعلم بالصواب"

کہہ کر ہی کیا کرتے تھے۔

ہذا غالباً مرزا غالب کے یہاں جو تشکیک و ارتیابیت پائی جاتی ہے، وہ مدارس سے ماخوذ تھی۔ اس وقت درس میں عقائد و کلام کے اندر شرح عقائد نسفی اور اس کا حاشیہ خیالی متداول تھے۔ اول الذکر میں سب سے پہلی بحث اسی امکان علم و معرفت کی ہے، جس کے انکار کا دوسرا نام تشکیک و ارتیابیت ہے :-

"قال اهل الحق حقائق الاشياء ثابتة والعلم بها متحقق خلافاً للسوفسطائيه"

[یعنی کائنات کی حقیقتیں بجائے خود ثابت و متقرر ہیں یا بالفاظ دیگر نہ تو نمود سیمیاتی ہیں نہ تابع اعتقاد۔ نیز ان کا تحقیقی علم ممکن ہے، ایسا علم جس میں کسی شک و شبہہ کی گنجائش نہ ہو۔ اور یہ کہ اس باب میں فرقۂ سوفسطائیہ نے خلاف کیا ہے]

پھر شارح (علامہ تفتازانی) نے ان سوفسطائیوں کے تین فرقے بتائے ہیں :-

(۱) عنادیہ جو حقائق اشیا ہی کے سرے سے منکر ہیں،

(۲) عندیہ جن کے نزدیک حقائق تابع اعتقاد ہوتے ہیں،

(۳) لا ادریہ جنھیں اپنے علم پر اعتماد نہیں ہوتا، بلکہ اس میں شک و شبہہ رکھتے ہیں۔

ان میں سے دو مسلک غالب کے یہاں ملتے ہیں :

عنادیہ کے تتبع میں جو سرے سے حقائق اشیا کے منکر ہیں، غالب بھی حقائق کی نفی کرتے ہیں :

ہاں کھائیو مت فریب ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

عندیہ کی پیروی میں جو حقائق کو تابع اعتقاد بتاتے ہیں۔ غالب بھی ظواہر کائنات کو

فریب محض سمجھتے ہیں اور جملہ مظاہر و ظواہر کو دام خیال کے حلقوں سے زیادہ وقعت نہیں دیتے تھے۔ فرماتے ہیں :

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

۹- ایک اور متنازع فیہ مسئلہ "فجائی تخلیق" Emergent Creation اور "تدریجی تخلیق" Gradual Creation کا تھا جو اسلامی فکر میں بہت عرصہ سے چلا آرہا تھا۔

اول الذکر کے قائلین کا آیۂ کریمہ

"انما امرہٗ اذا اراد شیئًا ان یقول لہٗ کن فیکون۔"

[وہ تو جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا کام بس یہ ہے کہ اُسے حکم دے کہ ہوجا اور وہ ہوجاتی ہے]

پر اعتماد تھا کہ جب باری تعالےٰ نے کائنات کو خلق کرنا چاہا تو فرمایا "کُن" (ہوجا) اور وہ پوری آن بان شان سے وجود میں آگئی۔ تصوف کا یہ مشہور مقالہ بھی جسے بعض حضرات حدیث قدسی بتاتے ہیں کہ

"کنت کنزًا مخفیًا فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق۔"

[میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا۔ پس میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں، تو میں نے مخلوق کو پیدا کیا]

اس موقف کا موید تھا۔ پھر جب یونانی فلسفہ مسلمانوں میں داخل ہوا تو اس خیال کو اور تقویت حاصل ہوئی۔ ارسطا طالیسی فلسفہ کی رو سے عالم متناہی ہے اور جب حکمائے اسلام نو فلاطونی دینیات سے متاثر ہوئے تو اُن کے اتباع میں کہنے لگے کہ عالم اپنی بہترین شکل میں خلق ہوا ہے جس میں کسی مزید اصلاح کی نہ ضرورت ہے نہ گنجائش۔ اس خیال کی تائید مزید سورۂ مُلک کی اس آیت سے بھی ہوتی تھی :

"ماتریٰ فی خلق الرحمٰن من تفاوت، فارجع البصر ھل تریٰ من فطور۔ ثم ارجع البصر کرتین ینقلب الیک البصر خاسئًا وھو حسیر۔"

(تم رحمن کی تخلیق میں کوئی بے ربطی نہ پاؤ گے۔ پھر پلٹ کر دیکھو کیا تمہیں کوئی خلل نظر آتا ہے؟ بار بار نگاہ دوڑاؤ، تمہاری نگاہ تھک کر نامراد لوٹ آئے گی (اور کوئی سقم نہ ملے گا)

دوسری جماعت کا اعتماد آیۂ کریمہ

"ان ربکم اللہ الذی خلق السموٰت والارض فی ستۃ ایام"

[درحقیقت تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا]

پر تھا جس کی رو سے خلاق کائنات نے دنیا کو بتدریج خلق فرمایا اور بفحوائے آیت کریمہ

"وکل یوم ھو فی شأن"

(ہر آن وہ نئی شان میں ہے)

یہ "تدریجی تخلیق" کا عمل ہنوز جاری ہے، نہ تجلیات ربانی کی کوئی انتہا ہے، نہ اس کے عمل تخلیق کی۔

اور یہی صوفیۂ صافی مشرب کا مسلک تھا۔ غالب بھی انھیں سے متاثر تھے اور اسی تاثر کے نتیجے میں فرماتے ہیں:۔

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیش نظر ہے آئنہ دائم نقاب میں

۱۰۔ اس زمانہ کا ایک اور مسئلہ "کلیات کے مجعول" ہونے کا تھا۔ سواد اعظم کی رائے میں کلیات مجعول تھیں اور اُن کا جعل "جعل بسیط" کا مصداق تھا۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ "جعل" یا "بنانا" کے دو معنی ہیں: ایک پیدا کرنا یا خلق کرنا۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے دنیا بنائی۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ کائنات پہلے "نیست" یا "عدم صرف" تھی، اللہ تعالےٰ نے اسے نیست سے ہست کیا۔ یہ جعل "جعل بسیط" کہلاتا ہے۔

دوسرے معنی ہیں کہ اُس شے کا مابہ القوام پہلے سے موجود ہو۔ جاعل یا بنانے والے نے اُسے اس ہیولانی شکل سے مجوزہ شکل میں موجود کیا۔ یہ مابہ القوام اُس شے کی "ماہیت" کہلاتا ہے اور یہ "بنانا" "افاضۂ وجود" ہے۔ یہ جعل "جعل مولف" کہلاتا ہے۔

حکما میں سے گروہ اشراقیہ جعل بسیط کا اور مشائیہ جعل مولف کا قائل تھا۔ موخرالذکر

کے نزدیک "ماہیت" پہلے سے موجود تھی۔ جاعل نے اُسے "افاضۂ وجود" سے نوازا۔

اس اندازِ فکر کا بانی افلاطون تھا جس کے نزدیک "ماہیات" یا "اعیانِ ثابتہ" (انگریزی اصطلاح Ideas) غیر مخلوط ہیں۔

جب فلسفہ مسلمانوں میں منتقل ہوا تو بعض معتزلی مفکرین بھی اس افلاطونی تصور سے متاثر ہوئے، اُن کا کہنا تھا کہ معدومات ممکنہ وجود میں آنے سے پہلے ایک طرح کے "ثبوت" اور "تقرر" کے ساتھ متصف تھیں۔

اٹھارویں انیسویں صدی میں یہ مسئلہ دلی کی علمی سرگرمیوں کا بڑا دلچسپ موضوع بنا ہوا تھا، چنانچہ مولانا فضل حق خیرآبادی نے اس مسئلہ کی توضیح میں قاضی مبارک کی "شرح سلم العلوم" پر اپنے حاشیہ کے تقریباً ۲۷ صفحے صرف کیے ہیں۔ اس سے اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا فضل حق کو اس مسئلے سے کس درجہ شغف تھا۔ لہٰذا فطری ہے کہ مرزا غالب کے ساتھ علمی گفتگو میں بھی یہ مسئلہ آتا رہا ہوگا۔ اس لیے مرزا صاحب کا اس سے دلچسپی لینا فطری تھا۔

بہرحال مرزا صاحب نے بھی اشراقیہ اور اشاعرہ کے برخلاف افلاطون کی تقلید کی، چنانچہ شاہ غمگین شاہجہاں آبادی کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"می دانم کہ اعیانِ ثابتہ مجعول بجعلِ جاعل نیستند۔"

شاید شاہ غمگین جی نے اپنے مکتوب میں "فصوص الحکم" کے اس قول کو نقل کیا تھا کہ

"ماشمت الاعیان رائحۃ الوجود"

[اعیان (ثابتہ) نے وجود کی خوشبو تک نہیں سونگھی (اعیان ثابتہ وجود سے قطعاً مُعرّا تھے۔)]

غالب شیخ اکبر سے اختلاف کی تو جرأت نہیں کرسکتے تھے چنانچہ اسی مکتوب میں آگے لکھا:

"آنچہ در باب 'ماشمت الاعیان رائحۃ الوجود' فرو ریختۂ کلک مشکین قلم است، حق حق و عین حق و محض حق است۔ لیک بخاک پاے حضرت سوگند کہ عقیدۂ این روسیاہ نیز خلاف آن نیست و غلط نہ نوشتہ ام۔"

اس کے بعد اپنے موقف کی تاویل میں لکھا کہ اعیان ثابتہ کو وجود مطلق کے ساتھ وہی تعلق ہے جو خطوط شعاعی کو آفتاب کے ساتھ یا نقوش امواج کو سمندر کے ساتھ ہوتا ہے - وجود صرف ایک ہی ہے اور اعیان ثابتہ کا وجود محض واجب الوجود کا وجود ہے:

" اعیان ثابتہ یا وجود مطلق چون ہستی خطوط شعاعی است با آفتاب
و چون نقوش امواج است بہ محیط - ہر آئینہ وجود واحد است و وجود
اعیان ثابتہ محض وجود واجب است تعالیٰ شانہ "

اور یہی اس زمانے کے منطقیوں کا بھی موقف تھا جو کہتے تھے :

" وما الذوات الممکنة فلاتعدد فیها ولاهی مغایرة لذات
الواجب حتی تکون صالحا ان یتعلق بها الجعل "

[رہیں ذوات ممکنہ تو نہ تو اُن میں تعدد و تکثر ہے اور نہ ہی ذات واجب تعالیٰ سے مغائر ہیں جو جعل جاعل کی صلاحیت اُن میں پائی جا سکے ۔]

اور یہی غالب کہتے تھے کہ

" وجود اعیان ثابتہ محض وجود واجب است تعالے شانہ "

۱۱ - لیکن اس عہد کی سب سے زیادہ مہتم بالشان تحریک عقیدۂ وحدت الوجود کی تھی - اس کی اہمیت اس بنا پر اور بڑھ جاتی ہے کہ یہ غالب کا ایمان تھا بلکہ اُن کے نزدیک اس پر ایمان ہی عین اسلام ہے جیسا کہ حالی کہتے ہیں :

" مرزا اسلام کی حقیقت پر نہایت پختہ یقین رکھتے تھے اور توحید وجودی کو اسلام کا اصل الاصول اور رکن رکین جانتے تھے "

عامۂ اہل اسلام کا کلمۂ توحید لا الہ الا اللہ

" لا معبود الا اللہ "

کے مترادف ہے مگر غالب کا کلمۂ توحید

" لا موجود الا اللہ "

تھا - اس کا نتیجہ تھا کہ توحید وجودی اُن کی شاعری کا عنصر بن گئی -

وحدت الوجود کا تصور بہت قدیم ہے۔ ہندو فلسفہ میں ویدانت کا مرکزی خیال یہی عقیدہ ہے۔ قدیم یونانی فلسفیوں میں پہلے رواقیوں کے یہاں اور پھر نو فلاطونی فلسفہ میں اس کا پتا چلتا ہے۔ اسی نو فلاطونی فلسفہ سے قدیم مسلمان مفکرین متاثر ہوتے اور غالباً اس طرح وحدت الوجود کے عقیدے سے آشنا ہوتے، چنانچہ بعض متقدمین صوفیۂ کرام کے یہاں یہ چیز پائی جاتی ہے اور "سبحانی ما اعظم شانی" "لیس فی الجبۃ الا اللہ" اور "انا الحق" اسی کے مظاہر تھے۔ گروہ حکما میں شیخ بو علی سینا کے یہاں عقیدۂ وحدت الوجود کا ایک مخصوص تصور ملتا ہے۔ جس کی رو سے "وجود مطلق بشرط نفی الامور الثبوتیہ" تھا۔

• چھٹی صدی کے آخر میں شیخ محی الدین ابن عربیؒ نے اس کی تجدید کی۔ ان کے نزدیک یہ "وجود مطلق لابشرط شئ" تھا۔ اُن کے خلیفۂ اکبر شیخ صدرالدین قونویؒ تھے، لہٰذا وحدت الوجود کی وہی تعبیر قابل اعتماد سمجھی گئی جو اُن سے مروی ہے۔ ان کے فیض یافتہ شیخ فخرالدین عراقی تھے۔ جس زمانے میں وہ اُن سے "فصوص الحکم" پڑھ رہے تھے اپنی کتاب "لمعات" بھی تصنیف فرماتے جاتے تھے۔ اس کتاب نے جلد ہی تصوف کی ادبیات عالیہ میں نمایاں مقام حاصل کرلیا اور ہندوستان میں بھی بہت جلد مقبول ہوگئی۔ اکثر علما نے اسے کاوش فکر کا موضوع بنایا اور اس پر شروح لکھیں، جن میں شیخ سماء الدین ملتانیؒ کی "شرح لمعات" خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔

اگلی صدی میں اس کے سرگرم مبلغ شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ تھے۔ وجودی صوفیا میں اُن کے معاصر شاہ عبدالرزاق جھنجھانہ اور شیخ امان پانی پتی تھے۔ موخرالذکر نے باری تعالےٰ کی وراثیت پر ایک مستقل رسالہ بعنوان "اثبات الاحدیۃ" لکھا تھا، مگر اس سے مقدم الذکر کو اختلاف تھا۔

لیکن طبقۂ علما میں شیخ احمد سرہندی نے محسوس کیا کہ یہ عقیدہ احکام شریعت کے اتباع میں فتور و وہن عظیم کا موجب ہے، لہٰذا انھوں نے اس عقیدہ کی بڑی سختی سے مخالفت کی اور اس کے مقابلے میں وحدت الشہود کا نظریہ پیش کیا۔ مگر وحدت الوجود کا

عقیدہ بڑی سختی سے جڑیں پکڑ چکا تھا اور شیخ محب اللہ الہ آبادی نے اور بھی زیادہ پائدار بنیادوں پر اس کی تجدید کی۔ اسی وجہ سے وہ "ثانی ابن عربی" کہلاتے ہیں۔ انھیں کا عقیدت مند دارا شکوہ تھا جو اس عقیدے کا سرگرم مبلغ تھا۔ اور تو اور دارا کے حریف پنجہ شکن عالمگیر اورنگ زیب کو بھی اس سے دلچسپی تھی۔

عالمگیر کی وفات کے بعد جب سیاسی انتشار و اختلال کے نتیجہ میں فکری بے راہ روی کا دور دورا ہوا تو اس عقیدے کو بھی معاشرے میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہونے لگی، اور عوام میں شعرا اور خواص میں اکثر اکابر علما اس کے ترجمان بن گئے۔ شاہ ولی اللہؒ نے "فیصلہ وحدت الوجود و وحدت الشہود" کے عنوان سے ان دونوں نظریوں پر محاکمہ فرمایا مگر واقعہ یہ ہے کہ ان کا اور اُن کے خاندان کا رجحان وحدت الوجود ہی کی جانب تھا۔ اُن کا ردعمل بھی ناگزیر تھا، چنانچہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے متبعین میں سے پہلے خواجہ میر ناصر عندلیب نے نالۂ عندلیب میں اور پھر ان کے صاحبزادے خواجہ میر درد نے واردات اور علم الکتاب میں وحدت الوجود کے عقیدے کی تغلیط کی۔ مگر ان دونوں بزرگوں نے صراحتاً شاہ ولی اللہؒ کے رسالے کی تردید نہیں کی۔ یہ فریضہ مرزا مظہر جانجاناں کے مرید مولوی غلام یحییٰ بہاری نے انجام دیا۔ وہ اپنے عہد کے منطقیوں میں ممتاز مقام رکھتے تھے اور میر زاہد کے رسالہ قطبیہ پر اُن کا حاشیہ لوامع الہدیٰ فی اللیل والدجیٰ عرصہ تک منطق کے اعلا نصاب میں مشمول رہا۔ انھوں نے شاہ ولی اللہؒ کے رسالے کا جواب کلمۃ الحق کے نام سے لکھا۔ جس کا دنداں شکن جواب شاہ صاحب کے منجھلے صاحبزادے شاہ رفیع الدینؒ نے "دمغ الباطل" میں دیا۔ اس قسم کی دوسری کوشش شاہ اسمٰعیل شہید نے عبقات میں کی۔ مگر اُن کے پیر سید احمد شہید نے "صراط مستقیم" میں وحدت الوجود کو ملحدین وجودیہ کی بدعت قرار دیا۔ پھر بھی وہ کھل کر اس عقیدے کی مخالفت نہ کر سکے کیوں کہ عوام و خواص دونوں ہی میں اس کا رواج بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔

اس تفصیل سے واضح ہو گیا ہوگا کہ ایک جانب شاہ ولی اللہ اور اُن کا خاندان و

دیگر متبعین وحدت الوجود کے علمبردار تھے اور دوسری جانب حضرت مجدد الف ثانی رح کے متبعین بالخصوص خواجہ ناصر عندلیب، میر درد، مرزا مظہر جانجاناں اور ان کے مریدین اس کے منکر تھے۔

غرض یہ وقت کی اہم ترین علمی تحریک تھی۔ مشائخ کرام اپنے کشف و شہود کو اور علمائے عظام اپنے زور استدلال کو اس نظریے کی تائید و تردید پر مرکوز کیے ہوئے تھے اور آئے دن اس نظریہ کی تائید یا تردید میں کوئی نہ کوئی رسالہ نکلتا رہتا تھا۔ مرزا غالب تو اس عقیدے پر جان دیتے تھے، لہٰذا وہ ان رسائل کا بڑے ذوق و شوق سے مطالعہ کرتے اور اپنے مقدور بھر ان کے انداز استدلال کو اپنی گرفت میں لانے کی کوشش فرماتے۔

غالب کے ذاتی مطالعے کے علاوہ دو اور عوامل نے بھی ان کے مزاج میں اس عقیدے کے پختہ کرنے میں کام کیا تھا، ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ نہ جانے کیونکر نومجوسی تحریکات یعنی دساتیری اور آذرکیوانی تحریکوں سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے، اگرچہ خود ان کا دعوا ہے کہ فارسی زبان اور ایرانی تاریخ وتہذیب سے گہری دلچسپی پیدا کرانے میں ان کے استاد مُلا عبدالصمد کو دخل ہے، لیکن بعض محققین کے نزدیک ان کا وجود فرضی ہے، بہرحال واقعہ کچھ بھی ہو، غالب کو ان تحریکوں سے بے پناہ دلچسپی ہوئی، چنانچہ اُن کی تحریروں میں اس کا بے حد اثر پایا جاتا ہے، دساتیر کے جعلی کتاب ہونے میں شبہہ نہیں اس کے باوجود غالب کے یہاں سینکڑوں دساتیری الفاظ بلاتکلف استعمال ہوئے ہیں، ان کی فکر پر بھی ان تحریکوں کا بخوبی اثر ملتا ہے، پارسیوں کی طرف منسوب گروہ جمشائیاں کے بارے میں دبستان المذاہب[1] میں ہے:

"نزد ایشاں جہان را در خارج وجودے نیست، گویند ہر چہ ہست ایزد است، ورائے او چیزے نیست۔"

غالب کے "لاموجود الا اللہ" کے عقیدے کی پختگی میں جمشائی عقیدے

کا دخل معلوم ہوتا ہے۔

دوسرا عامل جس نے عقیدۂ وحدت الوجود کے باب میں مرزا کے یقین محکم کو استوار سے استوارتر بنانے کا فریضہ انجام دیا، مولانا فضل حق خیرآبادی کی دوستی تھی۔ یہ بھی حُسنِ اتفاق تھا کہ مولانا بھی وحدت الوجود پر یقین رکھتے تھے اور توحیدی وجودیوں کی تصویب فرماتے تھے۔ مولانا خاتم المتکلمین تھے اور فلسفہ و کلام کے اسرار و غوامض کے محرم راز۔ غالب کی اُن کے ساتھ اکثر صحبت رہتی تھی۔ دونوں کے خلوص و یگانگت کا اس واقعہ سے اندازہ لگائیے کہ ہرچند مرزا کو نہ وہابیوں سے کوئی خصوصیت تھی اور نہ اُن کے مخالفین سے کوئی تعلق۔ صرف دوست کی رضا جوئی کے لیے دوست کے موقف مختار امتناع نظیر کے اثبات میں ایک مثنوی لکھی اور ہرچند کہ خود ان (غالب) کا ذاتی خیال یہ تھا کہ:

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود
رحمۃ للعالمینے ہم بود

مگر مولانا کے پاس خاطر سے مثنوی کا اختتام انھیں کے مسلک کے مطابق کیا:

منفرد اندر کمالِ ذاتی است
لاجرم مثلش محالِ ذاتی است

زین حقیقت بر نگردم والسّلام
نامہ را در می نوردم والسّلام

غرض مرزا نے مولانا کی صحبت میں بہت کچھ سیکھا تھا۔ ان صحبتوں میں وقت کے اہم علمی مسائل پر بھی تبصرہ ہوتا تھا۔ انھیں میں "علم واجب" کا بھی مسئلہ تھا، جس کی تفصیل عرض کی جا چکی ہے۔ اس مسئلہ کے ضمن میں باری تعالےٰ کے علم تفصیلی کے مراتب چہارگانہ کی توضیح بھی آتی ہے۔ جس کے چوتھے مرتبہ کی تفصیل میں مُلا عبدالحکیم اور اُن کی تقلید میں میر زاہد ہروی نے لکھا تھا:

"ورابعھا سائر الموجودات الخارجیۃ بذواتھا العینیۃ الحاضرۃ

عندہ تعالیٰ "

[باری تعالیٰ کے علم تفصیلی کا چوتھا مرتبہ جملہ خارجی و ذہنی موجودات ہیں جن کا باری تعالیٰ کو علم حضوری حاصل ہے]

یہی تقریر مختلف اساتذہ کے ذریعے منتقل ہوتی ہوئی سلّم العلوم کے مختلف شارحین اور ان کے محشیوں تک پہنچی۔ ان میں ایک اہم شخصیت مولانا فضل حق خیرآبادی کی تھی، چنانچہ انھوں نے اپنے "حاشیۂ قاضی مبارک" میں فرمایا :

" وذهب الصوفية الكرام قدس الله اسرارهم الى انه ليس فى الكون الاذات واحدة مطلقة لاكليه ولا جزئيه منطورات بتطورات شتى ...... فعلمه تعالى بالممكنات منطوى علمه بذاته "

[صوفیہ کرام قدس اللہ اسرارہم کا مذہب یہ ہے کہ کون میں صرف " ذات واحد " ہے جو مطلق ہے نہ کلی ہے نہ جزئی مختلف اطوار میں منطور و نمایاں ہوتی ہے .... بس باری تعالےٰ کا ممکنات کا علم اُس کے اپنی ذات کے علم ہی میں منطوی (لپٹا ہوا) ہے]

پھر مولانا نے علم واجب کے باب میں جملہ مذاہب کی تضعیف و تردید کی، اگر تصویب فرمائی تو اسی مذہب صوفیہ کی

" وهذا المذهب هوالحق وبالقبول احق "

[یہی مذہب حق ہے اور قبول کیے جانے کا سب سے زیادہ حقدار ہے]

یہی نہیں بلکہ مولانا خود وحدت الوجود کے قائل تھے اور اس کی تائید میں ایک مستقل رسالہ بعنوان " الروض المجود فی حقیقة الوجود " تصنیف کیا تھا ؛ جس کا حوالہ قاضی مبارک کی شرح سُلّم پر اپنے حاشیہ میں دیتے ہیں :-

" وقد برهنا على وحدة الوجود فى رسالتنا المسماة بالروض المجود "

[اور ہم نے وحدت الوجود کی صحت پر اپنے رسالہ مسمی " الروض المجود " میں دلائل د

براہین قائم کیے ہیں]

لہٰذا مرزا غالب نے جہاں مولانا سے اور علمی مسائل اخذ کیے "صورِ علمیہ" اور "ممکنات اور علم باری تعالےٰ" کی عینیت کا مسئلہ بھی اخذ کیا۔ یہ بھی حسن اتفاق تھا کہ جتنا سپیوں کا بھی، جن کی یگانہ بینی کے غالب قائل تھے، یہی مسلک تھا۔ جتنا سپیوں کے اس باب میں دو فرقے ہوگئے تھے: آبادیاں اسے رمز گردانتے تھے۔ مگر یگانہ بینا جن کی اکثریت تھی اُسے بے تاویل قبول کرتے تھے۔

بہرحال غالب نے اکثریت کے مسلک کو اپنایا، کیوں کہ اُن کے مخلص دوست مولانا فضل حق خیرآبادی کا بھی یہی عقیدہ تھا۔ اور اس سے زیادہ یہ کہ خود اُن کی افتادِ طبع اسے اختیار کرنے کی متقاضی تھی۔

مگر اس خشک اور مغلق مسئلہ کا نظم میں ڈھالنا بڑا مشکل مرحلہ تھا۔ یہاں پر اُن کی شاعرانہ عبقریت نے "قادر الکلامی کا ثبوت دیا اور جس طرح انھوں نے "غم روزگار" کو "غم عشق" بناکر انگیز کرلیا تھا۔ اس مغلق فلسفیانہ مسئلے کو ایک بتِ طناز کی "خود بینی" بتاکر دل کش و گوارا بنادیا۔

"خود بینی" اردو غزل کے معشوق کا بڑا نمایاں وصف ہے۔ بایں ہمہ یہی "خود بینی" یا INTROSPECTION جتنا سپیوں اور صوفیہ صافی مشرب دونوں کے "صورِ علمیہ" کا اصل الاصول ہے۔ عاشق کا عشق معشوق کی "خود بینی" کا رہینِ منت ہو یا نہ ہو، مگر اہلِ وحدت اور "یگانہ بینوں" کے نزدیک کائنات کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ یہ باری تعالےٰ کا اپنی ذات کے علم کا نام ہے جسے شاعر "خود بینی" سے تعبیر کرتا ہے۔

اس طرح ان "صورِ علمیہ" کے طفیل میں اُردو غزل کا حسین ترین اور جمیل ترین شعر ظہور میں آیا:

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

دہر اور کائنات جو نام ہے 'ممکنات کا' ذات واحدہ یعنی وجود مطلق سے مغائر نہیں، بلکہ اسی کی وحدت و یکتائی کی ایک تجلی ہے اور اس کے ظہور میں آنے کا راز مضمر ہے ''علم باری تعالی بذاتہ'' میں، جسے شاعرانہ زبان میں 'خود بینی' کہتے ہیں۔

ڈاکٹر ضیاءالدین ڈیسائی

غالب اپنے دو معاصرین کی نظر میں

اس مختصر مقالے میں غالب کے متعلق دو معاصر حوالوں کا تجزیہ مقصود ہے۔ ان حوالوں میں غالب کی تعریف بھی ہے اور ان پر تنقید بھی۔ ان میں پہلا بیان آغا احمد علی مؤلف مؤید برہان کے قلم سے ہے۔ جنھیں عام طور پر غالب کا حریف کہا گیا ہے حالانکہ یہ بات کچھ زیادہ صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ دوسرا بیان آغا احمد علی کے شاگرد پروفیسر ہنری بلاخمن (H. Blochmann) کے قلم سے ہے جو اپنے دور میں عربی، عبرانی اور فارسی کے عظیم دانشور مانے جاتے تھے۔

آغا احمد علی اور غالب کی چشمک کا اندازہ اول الذکر کی دو تالیفات مؤید برہان اور شمشیر تیز تر سے ہو سکتا ہے۔ ان میں پہلی کتاب غالب کی قاطع برہان کا جواب ہے اور دوسری غالب کی تیغ تیز کا، ان دونوں تالیفات کے بارے میں خاصا لکھا جا چکا ہے اور یہاں ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ حال ہی میں بنگلہ دیش کے ڈاکٹر کلیم سہسرامی نے مجلۂ غالب نامہ (جلد ۲ شمارہ ۲، جولائی ۱۹۸۱ء) میں "غالب کے ایک حریف" کے عنوان سے ایک مقالہ شائع کیا ہے۔ فاضل مقالہ نگار نے مذکورۂ بالا مضمون کے لیے جن منابع سے استفادہ کیا ہے ان میں آغا احمد علی کی کتاب ہفت آسمان بھی ہے جسے بلاخمن نے کلکتہ سے ۱۸۷۳ء میں ایک سوانحی مقدمہ بزبانِ انگریزی کے ساتھ شائع کیا تھا۔

مگر اس تالیف (ہفت آسمان) میں غالب کا جو ترجمہ شامل ہے اسے دوسرے نقادوں کی طرح ڈاکٹر کلیم سہسرامی نے بھی نظر انداز کر دیا ہے۔ البتہ اس موضوع پر پہلے جن دانشوروں نے قلم اٹھایا ہے ان میں قاضی عبدالودود اور پروفیسر نذیر احمد شامل ہیں لیکن ناگپور میں غالبیات پر کسی اچھی لائبریری کے نہ ہونے سے میں اس موضوع پر حرف آخر کہنے سے قاصر ہوں، پھر بھی اگر مجھ سے کہیں تسامح ہو جائے تو میں اس کی تصحیح اور معذرت کے لیے ہر وقت حاضر ہوں۔

یہ امر قابل تعجب ہے کہ ڈاکٹر کلیم سہسرامی نے آغا احمد علی کی ہفت آسمان میں شامل ترجمۂ غالب کو سرے سے نظر انداز کر دیا۔ ہفت آسمان فارسی مثنویات کی تاریخ ہے لیکن اسے فارسی مثنوی نگاروں کا غیر مکمل مگر انتہائی مفید تذکرہ کہا جا سکتا ہے۔ اس کتاب میں سات ابواب ہیں جن میں سے آغا احمد علی نے صرف پہلا باب مکمل کیا۔ ۳۵ سال کی کم عمر میں وہ فوت ہو گئے اور اس طرح ان کا یہ منصوبہ جس میں صنف مثنوی پر مکمل نقید اور مثنوی کی ساتوں بحروں کی تفصیل شامل تھی، پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔

ہفت آسمان کے پہلے باب (آسمان) میں ان مثنویوں کا ذکر ہے جو بحر سریع سطوی موقوف (مفتعلن مفتعلن فاعلن) میں لکھی گئی ہیں:

بسم اللہ الرحمن الرحیم ہست کلید در گنج حکیم

یہاں غالب کی چار مختصر مثنویوں میں سے پہلی مثنوی درد و داغ کا ذکر کرتے ہوئے آغا احمد علی نے اپنے عظیم ہم عصر شاعر کا مختصر ترجمہ بھی شامل کیا ہے جو درج ذیل ہے:

" برین وزن است مثنوی درد و داغ غالب:

نام او اسد اللہ خان تخلص غالب، او خودش گفتہ:

غالب نام آورم، نام و نشانم مپرس ہم اسد اللہم و ہم اسد اللہیم

عرف مرزا نوشہ، اکبر آبادی المولد، دہلوی المسکن، شاگرد میرزا عبدالصمد اصفہانی کہ پیشتر ہرمزد نام داشتہ۔ قوت طبع و قدرت سخن گزاری نظماً و نثراً مرا و را مسلم است بلکہ بیشتر نثر او دل ربا تر، لیکن حال

سخن دانی اوست، کیفیت قاطع برہان او کہ پستر درفش کاویانی خطابش کردہ و ہمچنین جوہر تیغ او از مطالعۂ جوابہاے آن خصوصاً مؤید برہان و شمشیر تیز تر بر تماشائیان سخن حالیست - در لارنس گزٹ میرٹھ مطبوعہ ۲۷ر فروری ۱۸۶۷ء نوشتہ: عمرِ او تخمیناً ہشتاد و دو سال بودہ است - مولوی عبدالحکیم جوش تخلص، مدرس اسکول میرٹھ تاریخ وفات او کہ درسنہ ع:

یک ہزار و دو صد و ہشتاد و پنج

واقع شدہ، چنین یافتہ: ع:

"مرد ہیہات میرزا نوشہ"

اما شمس الملک منظفر الدین حیدر خان بہادر مظفر جنگ فرماید:

سال میلادِ اوست لفظ "غریب"
سال فوتش "بمرد غالب آہ"

پس عمرِ او ہفتاد و سہ باشد۔"

اس کے بعد مؤلف مثنویات غالب کا تعارف کراتے ہوئے کہتے ہیں:

"آغاز این مثنوی (کہ پنج ورق بیش نیست در کلیات او بطبع آمد) -

اولش اینکہ: بیت:

بے ثمری برزگری پیشہ داشت
در دلِ صحراے جنون ریشہ داشت

آنچہ از اعتراض و اصلاح برین شعر "خوک شدہ" واقع شدہ در مؤید برہان (ص ۴۴۲) مرقوم گشتہ، فلا نکررہ۔

(۷۳) دہم برین وزنست مثنوی رنگ و بوی او کہ ہمین چار ورق

لہ ہفت آسمان تالیف آغا احمد علی مع انگریزی مقدمہ از ہنری بلاخمن کلکتہ، ۱۸۷۳ء) ص ۶۷-۱۲۶

است - اولش اینکہ :

بود جوان دولتی از خسروان ۔
غازہ کش عارضِ ہندوستان ۔

(۷۴) دہم برین وزنست مثنوی یک ورقہ او کہ در تہنیت عید الفطر بہ ابوظفر بہادر شہ نوشتہ - ابتدایش اینکہ، بیت :

بازبرانم کہ بدیبایے راز
از اثرِ ناطقہ بندم طراز

(۷۵) دہم برین وزنست دیگر مثنوی یک ورقہ او کہ در تہنیت عید بہ ولی عہد فتح ملک رقم کردہ - سرآغاز اینست، بیت :

من کہ درین دائرۂ لاجورد
کردہ ام از حکم ازل آبخورد

قافیہ بہ لہجۂ قدما (و) الفاظ و تراکیب متقدمان در کلامش بسیار یافت می شود۔ ہرچہ دلش خوش می کند می نویسد۔ قبیح بود یا فصیح، در پایانِ این مثنوی گفتہ، بیت :

گرچہ بہ از نظم نظامی است این
مدح خوان خطِ غلامی است این[1]

دانشوروں کی اس عظیم مجلس میں مندرجہ بالا اندراجات کی توضیح کی ضرورت نہیں۔ غالب کا یہ مختصر ترجمہ اگرچہ عام تذکروں کے روایتی انداز میں ہے لیکن اس میں لارنس گزٹ، میرٹھ مورخہ ۲۷ رفروری ۱۸۶۷ء میں شائع ہونے والے ایک حوالے کا بھی اندراج ہے جو خود غالب کے عہد میں لکھا گیا تھا اور جس میں ان کی عمر بیاسی سال بتائی گئی ہے، آغا احمد علی نے میرٹھ اسکول کے ایک ٹیچر منشی عبدالحکیم جوش کا یہ مصرع تاریخ بھی نقل کیا ہے:

---

[1] ہفت آسمان ص ۱۶۷

"مرد ہیہات میرزا نوشہ"

جس کی رو سے غالب کی وفات 'یک ہزار د دو صد د ہشتاد و پنج' میں واقع ہوئی لیکن خود اس مصرع سے ۱۲۸۴ برآمد ہوتا ہے یعنی سال وفات سے ایک برس کم۔

آغا احمد علی نے شمس الملک مظفر الدین حیدر خاں مظفر جنگ کا ایک شعر بھی نقل کیا ہے جس سے غالب کی تاریخ ولادت اور تاریخ وفات دونوں کا ذکر ہے:

سالِ میلادِ اوست لفظِ "غریب"
سالِ فوتش "بمرد غالب آہ"

پہلے مصرع میں "غریب" سے ۱۲۱۲ھ اور دوسرے مصرع میں "بمرد غالب آہ" سے ۱۲۸۵ھ کے سنہ برآمد ہوتے ہیں۔ اس طرح قمری حساب سے غالب کی عمر صرف ۷۳ سال ہوتی ہے۔

ناگپور میں منابع کے فقدان کے سبب جس کا ذکر اوپر ہوا، راقم الحروف منشی عبدالحکیم جوش اور شمس الملک مظفر الدین حیدر خاں مظفر جنگ کی شخصیت کا تعین کرنے سے قاصر ہے۔ حاضرین کرام میں سے کوئی دانشور شاید اس پر روشنی ڈال سکے۔

آغا احمد علی نے غالب کی فارسی شاعری اور نثر نگاری کے بارے میں جو اظہار خیال کیا ہے وہ بھی توجہ کا طالب ہے۔ مؤلف نے غالب کی تعریف کرتے ہوئے ان کی استادی کو "مسلّم" بتایا ہے نیز نظم و نثر میں ان کی "قوت طبع" اور "سخن گزاری" کو سراہا ہے۔ راقم الحروف بھی آغا احمد علی کی اس رائے سے متفق ہے کہ غالب کی فارسی شاعری کے مقابلے میں ان کی نثر زیادہ دل کش اور جذاب ہے۔

آغا احمد علی نے یہ ترجمہ برہان قاطع کے قضیہ کے بعد لکھا ہے جس میں غالب اور ان کے طرفداروں کی طرف سے انھیں گالی کھانا پڑی تھی۔ البتہ آغا احمد علی کو غالب کی سخن دانی یا فارسی زبان وادب میں ان کی استادی پر شک ہے جیسا کہ غالب کی قاطع برہان (بشکل دیگر درفش کاویانی) اور تیغ تیز سے ظاہر ہے، آغا احمد علی کا دعوا ہے کہ انھوں نے اپنی تالیفات مؤید برہان اور شمشیر تیز تر میں غالب کی فارسی دانی کا جائزہ لیا ہے۔

غالب کے سلسلے میں دوسرا اہم عصر حوالہ مشہور مستشرق پروفیسر ہنری بلاخمن کے قلم سے ہے۔ یہ بیان بھی برہان قاطع کے نزاع سے متعلق ہے۔ چونکہ اس عظیم دانشور اور محقق کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں اس لیے یہاں ان کی سوانح کا مختصر ذکر بیجا نہ ہوگا۔

بلاخمن ڈرس ڈن Dresden جرمنی میں ۱۸۳۸ء میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ۱۸۵۵ء سے ۱۸۵۷ء تک مقامی اسکول میں تعلیم پائی۔ پھر انھوں نے لائپزگ Leipzig یونی ورسٹی میں عبرانی اور دیگر مشرقی زبانوں کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد بلاخمن ہندوستان کے سفر پر روانہ ہوئے اور ۱۸۵۸ء میں کلکتہ پہنچے۔ ۱۸۶۰ء میں مدرسہ کالج، کلکتہ میں بحیثیت ماتحت استاد کے ان کا تقرر ہوا۔ لیکن ۱۸۶۲ء میں انھوں نے یہ ملازمت ترک کردی اور ڈوونن Doveton کالج میں ریاضیات کی پروفیسری منظور کرلی۔ اس کالج میں بلاخمن تین سال تک رہے، اسی سال انھوں نے کلکتہ یونی ورسٹی سے عبرانی زبان میں ایم۔ اے کیا۔ اور دوبارہ وہ مدرسہ کالج میں بحیثیت معاون پروفیسر آگئے۔ ۱۸۶۹ء میں بلاخمن کو پورے کالج کا چارج دے دیا گیا اور اگلے سال ۱۸۷۰ء میں وہ پرنسپل کے نائب کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ ۱۸۷۵ء میں بلاخمن کو مدرسہ کالج کا باقاعدہ پرنسپل مقرر کیا گیا اور اپنے انتقال یعنی ۱۸۷۸ء تک وہ اس عہدہ پر فائز رہے۔

بلاخمن نے ۱۸۶۴ء میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کی ممبری اختیار کی۔ ۱۸۶۸ء میں وہ سوسائٹی مذکور کے سکریٹری منتخب ہوئے اور اس عہدہ پر بھی وہ آخری عمر تک قائم رہے۔ انتقال کے وقت بلاخمن کی عمر صرف چالیس سال تھی، ان کی قبل از وقت موت سے ہندسلم تاریخ کے مطالعہ اور کتبہ شناسی کے علم کو بہت نقصان ہوا۔

بلاخمن نے ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کلکتہ کے مجلہ (جلد ۳۷، سنہ ۱۸۶۸ء) میں ایک مقالہ شائع کیا تھا جس کا عنوان تھا Contribitions to Persiam Lexicography یعنی فارسی لغت نویسی کی خدمات۔ اس مقالے میں جو آج سے

تقریباً ایک سو دس سال قبل شائع ہوا تھا بلاخمن نے محمد حسین برہان پسر خلف التبریزی کی برہان قاطع کا جائزہ لیتے ہوئے غالب کی قاطع برہان کا بھی ذکر کیا ہے اور اس مسئلہ میں اپنی سوچی سمجھی رائے کا اظہار کیا ہے۔ بلاخمن جیسے دانشور کی یہ رائے غالب کے ہم عصر حوالوں میں تقدم بھی رکھتی ہے اور بڑی حد تک غیر جانبدار بھی ہے۔ اگرچہ یہ بھی صحیح ہے کہ بلاخمن اپنے آپ کو آغا احمد علی کا شاگرد کہتے تھے اور استاد کے حضور میں نذرانۂ عقیدت کے طور پر انھوں نے ان کی کتاب رسالۂ ترانہ بھی ۱۸۶۷ء میں شائع کی تھی[1]

بہرحال بلاخمن کی رائے کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں توازن اور پختگی ہے۔ قاضی عبدالودود اور پروفیسر نذیر احمد جیسے دانشوروں نے بھی کم و بیش اس رائے کی تائید کی ہے۔ اس لیے اب اس پر مزید کچھ لکھنے کے بجائے میں بلاخمن کا من وعن اقتباس (ترجمہ) پیش کرتا ہوں تاکہ حضار محترم خود ان کی تنقید یا تعریف کا جائزہ لے سکیں: بلاخمن لکھتے ہیں:

"برہان کے لغت کی وجہ سے ہندوستان میں خاصی بحث چل پڑی ہے۔ موجودہ دہے میں دہلی سے ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس کے مؤلف اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ المتخلص بہ غالب ہیں۔ مؤلف موجودہ ہندوستان کے بہترین فارسی نویس ہیں۔ ان کی دیگر تخلیقات میں مجموعہ، خطوط، دیوان شعر اور ہندوستانی بادشاہوں کی تاریخ مہر نیمروز شامل ہیں۔ انھوں نے غدر ۱۸۵۷ء پر خالص فارسی میں دستنبو کے عنوان سے ایک کتاب لکھی ہے۔ قاطع برہان غالب کی اس کتاب کا عنوان ہے جس میں انھوں نے برہان پر حملے کیے ہیں۔ اس اعتراض سے بحیثیت محقق ان کی شہرت کو خاصا دھکا پہنچا ہے۔ ساری کتاب میں غالب کا انداز دشنام سے بھرا ہوا بلکہ فحش ہے۔ کتاب میں ہر جگہ وہ برہان کو "دکنی" یا" ایں مرد دکنی" کہتے ہیں (غالب) برہان کو مستقل لغت نویس سمجھتے ہیں حالانکہ خود برہان دیباچے میں اپنے آپ کو "فقیر جامع لغات و تابع ارباب لغت است نہ واضع" کہ کر متعارف

---

[1] ہفت آسمان (مقدمہ انگریزی)

کرتا ہے اس پر غالب کے بیشتر اعتراضات فرہنگ (جہانگیری) یا (فرہنگ) سروری کے مطالعہ کے بعد رفع ہو جاتے ہیں۔ اس کتاب (قاطع برہان) میں جان بوجھ کر غلط بیانات پیش کیے گئے ہیں، (غالب) نے بعض الفاظ کے جو اشتقاقات بتائے ہیں وہ ہندوستانی نقطۂ نظر سے غیر تحقیقی ہیں۔ ڈھاکہ کے آغا احمد علی نے جو کلکتہ مدرسہ میں فارسی کے استاد ہیں، ان (غالب) کی خوب خبر لی ہے۔ ان کی جوابی کتاب کا نام مؤید برہان ہے، یہ کتاب دو سال قبل کلکتہ سے شایع ہو چکی ہے۔ مؤید کے مؤلف کے یہاں تنقیدی کنج کاوی اور سائنسی صداقت نظر آتی ہے جو ہندوستانی ادیبوں میں شاذ و نادر ہی پائی جاتی ہے۔ بعض لغات مثلاً آتش، ایثار بخش اور آذر وغیرہ کے سلسلہ میں ان (آغا احمد علی) کی بحث قابل مطالعہ ہے۔ مؤلف نے حال ہی میں اپنی کتاب میں اشاریہ کا بھی اضافہ کر دیا ہے۔ بعد میں آنے والے لغت نویسوں کو اس کتاب کا ایک نسخہ رکھنے سے خاصا فائدہ ہوگا۔

اس جوابی کتاب (مؤید برہان) کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے جن چار سو الفاظ پر اعتراضات کیے ہیں ان میں سے تیس لفظ کے بارے میں خود برہان نے غلطی کی ہے۔ دیگر ساٹھ الفاظ مشتبہ ہیں اور فرہنگ (جہانگیری) و سروری میں بھی کسی شاہد کے بغیر درج کیے گئے ہیں بعض اور غلطیوں کی نشاندہی سراج اللغۃ کے مؤلف نے بھی کی ہیں لیکن مجموعی طور پر خود برہان کی غلطیاں اتنی کم ہیں کہ بحیثیت ایک محتاط لغت نویس ان کی شہرت میں کوئی کمی نہیں واقع ہوتی (برہان قاطع) کی بعض غلطیوں کی تصحیح کپتان روبک Rockbick نے اپنے مطبوعہ ایڈیشن کے حواشی میں کر دی ہے۔

غالب نے ۱۸۶۷ء میں تیغ تیز کے عنوان سے (مؤید) کا جواب لکھ کر غلطی کی۔ انھوں نے خارج از بحث مسائل کو شامل کر کے بات ٹالنے کی کوشش کی ہے۔ (غالب) نے اپنی کتاب کے آخر میں دہلی کے مختلف با اثر حضرات حق نوابین کی تصدیق اور مہر درج کی ہے کہ یہ حضرات بھی مجھ سے متفق ہیں۔ آغا احمد علی کا جواب الجواب بہ عنوان شمشیر تیز تر ابھی زیر طبع ہے [1]۔

---

[1] جرنل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال ج ۳۰ (۱۸۶۸ء) جزو اول ص ۱۹ : ۲۰

آپ میں سے جن حضرات نے قاضی عبدالودود اور پروفیسر نذیر احمد کے خیالات کا مطالعہ کیا ہے وہ اس حقیقت کا بہ آسانی ادراک کر سکتے ہیں کہ بلاخمن نے غالب کے رویہ اور ان میں تحقیقی صلاحیت کی کمی کے بارے میں جو اظہار خیال کیا ہے وہ امکانی حد تک غیر جانبدارانہ ہے۔ پروفیسر نذیر احمد فرماتے ہیں:

"مختصراً یہ کہ برہان قاطع کے نقائص کی نشان دہی جن صلاحیتوں کا تقاضا کرتی تھی، غالب میں وہ صلاحیتیں نہ تھیں۔" [1]

بلاخمن غالب کو اپنے دور کا بہترین فارسی نویس مانتے ہیں اور ان کی مختلف تخلیقات کا مناسب الفاظ میں ذکر کرتے ہیں لیکن وہ آغا احمد علی کے تنقیدی تجسس اور سائنسی صداقت کے زیادہ مداح ہیں کیوں کہ بلاخمن کے خیال میں ہندوستانی ادیبوں میں یہ خوبیاں کم نظر آتی ہیں۔ اس ستایش کی وجہ یہ نہیں تھی کہ بلاخمن، آغا احمد علی کے شاگرد تھے بلکہ وہ خود گہری علمیت کے مالک تھے۔ دوسری طرف بلاخمن نے برہان کی غلطیوں کی حمایت نہیں کی ہے بلکہ جن چار سو الفاظ پر غالب نے اعتراض کیا ہے ان میں سے بقول بلاخمن تین لغت کے بارے میں خود برہان سے غلطی سرزد ہوئی ہے۔ علاوہ ازیں ساٹھ الفاظ مشتبہ ہیں جو برہان نے فرہنگِ جہانگیری اور سروری سے نقل کیے ہیں حالانکہ ان میں ان الفاظ کے لیے کوئی شہادت نہیں دی گئی ہیں۔ بہرحال بلاخمن کا یہ عقیدہ تھا کہ برہان سے جو غلطیاں سرزد ہوئی ہیں ان کی تعداد اتنی حقیر ہے کہ اس سے برہان کو ایک "محتاط مؤلف" کہنے میں کوئی حرج نہیں، اور خود برہان کا ادعا بھی یہی ہے۔

بلاخمن اس حقیقت کو بھی نہیں چھپاتے کہ کپتان روبک نے ۱۸۱۸ء میں برہان قاطع کا جو پہلا ایڈیشن شائع کیا تھا اس کے حواشی میں برہان کی غلطیوں کی نشاندہی کی تھی۔ بلاخمن نے غالباً پہلی بار یہ انکشاف کیا ہے کہ سراج الدین علی خاں آرزو نے

---

[1] غالب نامہ ج ۲، شمارہ ۲ (جولائی ۱۹۸۱ء) ضمیمہ ص ۳

سراج اللغۃ میں برہان کی غلطیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ بقول پروفیسر نذیر احمد ان خامیوں کا ذکر فرہنگ نظام کے مقدمے میں دس اوراق میں ہوا ہے [۱]۔

بلاخمن کا یہ خیال کہ غالب کی پوری کتاب نہ صرف گالیوں سے پُر بلکہ فحش بھی ہے، غلط نہیں۔ ڈاکٹر نذیر احمد کی بھی یہی رائے ہے، وہ لکھتے ہیں:

"فحش و دشنام سے قاطع برہان بھرا پڑا ہے" [۲]

بلاخمن کا کہنا ہے کہ غالب میں انتقادی تحقیق کا فقدان ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد بھی فرماتے ہیں:

"قاطع برہان میں مطالعے کی کمی کا نقص قدم قدم پر موجود ہے" [۳]

مختصراً یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ بلاخمن نے غالب کا جو محاکمہ کیا ہے وہ غالب کے حریف کے شاگرد کا تحقیر آمیز بیان نہیں ہے بلکہ بڑی حد تک غالب کے اس دعوے کا تجزیہ ہے کہ ان کا فارسی کا علم ان لوگوں سے بھی بہتر ہے جن کی مادری زبان فارسی ہے۔

آخر میں ڈاکٹر کلیم سہسرامی کے بعض بیانات کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر کلیم نے آغا احمد علی کے بارے میں بیشتر مواد ہفت آسمان کے انگریزی مقدمے سے لیا ہے جو بلاخمن کا نوشتہ ہے لیکن خود احمد علی نے ہفت آسمان میں اپنے حریف (غالب) کا جو ترجمہ شامل کیا ہے اسے فاضل مقالہ نگار نے سرے سے نظر انداز کر دیا ہے جس کی بظاہر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر سہسرامی نے جو بعض نتائج اخذ کیے ہیں ان میں بھی کہیں کہیں تسامح ہوا ہے۔

مثلاً فاضل مقالہ نگار نے بلاخمن کی اطلاع پر آغا احمد علی کا تاریخی نام "مظہر علی" لکھا ہے اور بتایا ہے کہ اس سے ۱۲۵۵ ہجری (مطابق ۱۸۳۸ء) کا سنہ برآمد ہوتا ہے [۴] حالانکہ یہ

---

[۱] ایضاً

[۲] ایضاً ص ۱۲

[۳] ایضاً ص ۹

[۴] ایضاً ص ۵۰

صحیح نہیں ہے کیوں کہ ۱۰ر شوال ۱۲۵۵ ہجری جو بقول ڈاکٹر سہسرامی آغا احمد علی کی تاریخ ولادت ہے، ۱۷ر دسمبر ۱۸۳۹ء کے مطابق ہے۔

آگے ڈاکٹر سہسرامی لکھتے ہیں کہ آغا احمد علی کا "خاندان اصفہان سے ہجرت کر کے نادر شاہ درانی کے ہمراہ ہندوستان آیا۔"[۱] لیکن بلاخمن نے نادر شاہ کو درانی نہیں لکھا ہے۔ نادر شاہ جس نے مغل شہنشاہ محمد شاہ کے عہد میں ہندوستان پر حملہ کیا ترکوں کے افشار قبیلہ کی قیریقلو شاخ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا کوئی تعلق افغانی قبیلہ درانی سے نہیں تھا۔

علاوہ ازیں بقول ڈاکٹر کلیم سہسرامی: "احمد علی اصفہانی ۱۸۶۲ء میں ڈھاکے سے کلکتے منتقل ہو گئے اور اپنے نام کی مناسبت سے وہاں مدرسہ احمدیہ کی بنیاد رکھی"۔[۲] چونکہ مقالہ نگار نے اس بیان کے لیے کوئی حوالہ نہیں دیا ہے اس لیے یہ اطلاع بھی انھوں نے بلاخمن سے لی ہوگی لیکن مؤخر الذکر نے آغا احمد علی کے کلکتہ آنے کی تاریخ کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ انھوں نے صرف یہ لکھا ہے کہ آغا احمد علی نے ۱۸۶۲ء میں مدرسہ قائم کیا۔ اس سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ آغا احمد علی اسی سال یا اس سے قبل کلکتہ آ چکے تھے۔

ڈاکٹر سہسرامی بظاہر بلاخمن ہی کے حوالے سے یہ لکھتے ہیں کہ آغا احمد علی کا "پروفیسر کاول Cowell کی سفارش پر مدرسہ عالیہ کلکتہ میں بحیثیت مدرس فارسی تقرر ہو گیا"۔[۳] جہاں تک میری اطلاع ہے مدرسہ کا یہ نام بعد میں پڑا۔ ان دنوں اسے گورنمنٹ مدرسہ یا مدرسہ کالج کہا جاتا تھا۔ بلاخمن بھی جنھوں نے اس مدرسہ میں مختلف عہدوں پر کام کیا اور جو اپنے انتقال کے وقت اس کے پرنسپل تھے، اسے "کلکتہ مدرسہ" کہتے ہیں۔ اتفاق سے ڈاکٹر سہسرامی نے یہ نہیں بتایا کہ پروفیسر کاول کون تھے؟ بلاخمن

---

[۱] ایضاً

[۲] ایضاً

[۳] ایضاً ص ۵۰ – ۵۱

بھی انھیں صرف 'پروفیسر کاول' کہتے ہیں اور ان کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں دیتے۔
دراصل پروفیسر ای۔ بی۔ کاول E. B. Cowell اس سال ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے مختلف سکریٹریوں میں سے ایک سکریٹری تھے۔

ڈاکٹر سہرامی، آغا احمد علی کی تاریخ وفات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :
"عبدالغفور نساخ نے" داصل حق آغا احمد" تاریخ وفات کہی جس سے ۱۲۹۱ ہجری قمری نکلتے ہیں"
لیکن بلاخمن نے ۱۲۹۰ ہجری لکھا ہے اور چونکہ اس نے ہجری اور عیسوی دونوں سنہ لکھے ہیں نیز مہینے اور دن کا بھی ذکر کیا ہے اس لیے اس کا بیان زیادہ قابلِ قبول ہے۔ درحقیقت مذکورہ بالا مادۂ تاریخ سے ۱۲۹۰ھ ہی برآمد ہوتا ہے۔ بظاہر ڈاکٹر سہرامی نے "آغا" کے الف ممدودہ کو دو کے برابر مان لیا ہے۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر سہرامی نے بلاخمن کے تتبع میں عیسوی تاریخ صرف جون ۱۸۷۳ لکھی ہے حالانکہ ۶ / ربیع الاول ۱۲۹۰ ہجری، ۳ / جون ۱۸۷۳ء کے برابر ہے۔

ڈاکٹر سہرامی نے آغا احمد علی کی تالیفات کی فہرست دی ہے اور ان کتابوں کا بھی ذکر کیا ہے جن کی موخر الذکر نے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے لیے تصحیح کی۔ غالباً یہ اطلاع بھی فاضل مقالہ نگار نے بلاخمن ہی سے لی ہے۔ لیکن انھوں نے کئی کتابوں کا ذکر چھوڑ دیا ہے۔ مثلاً آغا احمد علی نے فخرالدین اسعد گرگانی کی مثنوی ویس ورامین بھی ایڈٹ کی تھی۔ ڈاکٹر سہرامی نے صرف سکندرنامہ لکھا ہے جو دراصل سکندرنامۂ بحری یا اقبال نامۂ سکندری ہے۔ ڈاکٹر سہرامی نے " اقبال نامہ" کا ذکر بھی کیا ہے لیکن ان کے بیان سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ اقبال نامہ سے ان کی مراد کیا ہے ؟ اقبال نامۂ جہانگیری یا اقبال نامۂ سکندری۔ آغا احمد علی نے ایشیاٹک سوسائٹی کے لیے اقبال نامۂ جہانگیری کی تصحیح کی تھی۔ جہاں تک بدایونی کی منتخب التواریخ کا ذکر ہے اس کی دوسری جلد کی تصحیح میں آغا احمد علی کے ساتھ کپتان لیس Capt. W.N. Lees بھی شامل تھے۔

ڈاکٹر سہرامی کا کہنا ہے کہ آغا احمد علی نے ابوالفضل کے اکبر نامہ کی بھی تصحیح کی تھی،

درحقیقت انھوں نے اس کتاب کے صرف دو جزو کی تصحیح کی تھی حالانکہ ایشیاٹک سوسائٹی کی طرف سے وہ تین "جلدوں" میں شائع ہوئی۔

بلاخمن نے آغا احمد علی کی پانچ کتابوں کا ذکر کیا ہے، ڈاکٹر سہسرامی نے بھی انھی کا اعادہ کیا ہے لیکن انھوں نے دو کتابوں کے موضوع کی وضاحت نہیں کی۔ ان میں سے ایک کتاب ترانہ یا رسالۂ ترانہ ہے جسے بلاخمن نے تالیف کے ایک سال بعد ۱۸۶۷ء میں شائع کیا۔ یہ کتاب فارسی رباعیات پر ہے۔ دوسری کتاب اشتقاق یا بقول بلاخمن رسالۂ اشتقاق ہے جو فارسی کی ابتدائی گرامر کے بارے میں ہے بلاخمن اسے ایک عمدہ تالیف کہتے ہیں۔ احمد علی نے یہ کتاب اپنی وفات سے ایک سال قبل ۱۸۷۲ء میں شائع کی تھی۔

۳۵ سال کی عمر میں آغا احمد علی کی موت سے فارسی زبان وادب کے مطالعہ کو بہت دھکا لگا۔ پچھلی صدی میں اس مطالعہ کا مرکز کلکتہ تھا۔ آغا احمد علی کی موت پر بقول بلاخمن' ان کے بہت سے ہوا خواہوں، دوستوں اور شاگردوں نے ماتم کیا۔ ان کے دل میں فارسی ادبیات کی گہری محبت تھی، انھیں فارسی زبان کا عمیق علم تھا۔ ان میں قربانی اور شفقت کا جذبہ تھا، انھیں ذہنی یکسوئی حاصل تھی اور ان خوبیوں کی بنا پر وہ سب کے محبوب تھے۔

بلاخمن کا کہنا ہے کہ آغا احمد علی کی موت سے ان کے شاگردوں نے جن میں خود بلاخمن شامل ہیں، ایک شفیق استاد کھو دیا اور ایشیاٹک سوسائٹی ایک ایسے صاحب ضمیر اور محنت کش دانشور سے محروم ہوگئی جس کا بدل ملنا بہت مشکل ہے۔ [۱]

(ترجمہ : ڈاکٹر نور الحسن انصاری)

---

[۱] ہفت آسمان (مقدمہ انگریزی)

جناب محمد صادق صفوی

غالبؔ اور نوّاب سیّد محمد علی خاں شمس آبادی

راقم کے جدِ اعلا نواب سید محمد علی خاں معروف بہ نواب دولھا دہلوی مولد شمس آبادی مسکن و مدفن، اور غالب کے مابین روابطِ شخصی برقرار تھے۔ ان روابط کی تحریری اور زبانی روایتیں راقم کے خاندان میں موجود ہیں ان روایتوں کو ذیل میں بطور یادگار نقل کیا جاتا ہے۔ [۱]

---

[۱] ماخذ:

۱۔ نواب مرحوم کے پانچ رسالوں کے مجموعے کا نسخۂ خطی، بقلم مؤلف، در کتاب خانۂ راقم: (۱) شجرۂ طیبہ (ص ۱۰ ص ۲۰) (۲) انقلابِ نصیری (ص ص ۲۲۔۲۶) (۳) معادن ثروت (ص ص ۳۲۔۸۶) (۴) عجایب التاثیر (ص ص ۹۰۔۱۷۴) (۵) رسم دنیا (ص ص ۱۸۰۔۲۷۶) مخففاً: رسایل۔

۲ — خلاصہ روز نامچۂ نواب مرحوم موسوم بہ کتاب سوانح جلد ہشتم، در کتاب خانۂ راقم

۳ — روز نامچۂ نواب مرحوم موسوم بہ کتاب سوانح جلد دہم، در کتاب خانۂ راقم

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

نواب مرحوم کی ولادت ۲۹ رجب ۱۲۲۲ھ کو دہلی کوچۂ چیلان میں ہوئی (کتاب سوانح، ج ۱۱، ورق ۸۹ ب) اُن کے والد میر سیف اللہ مخاطب بہ حکیم شاہ میرزا خان (تولد: ۱۱۷۰ھ) دہلی سے چند بار لکھنؤ تشریف لے گئے۔ پہلا سفر عصر آصف الدولہ میں کیا اور لکھنؤ میں بعض سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۲۰۷ ہجری کے قحط کے بعد دہلی چلے آئے۔ دوسری بار عصر غازی الدین حیدر میں ۱۲۳۱ھ یا ۱۲۳۲ھ میں دہلی سے مع عیال و اطفال لکھنؤ گئے اور" سالہا بعزت و امتیاز بسر بردہ"۔ آخر آغا میر کی "بر خلافی و فتنہ انگیزی" سے اپنے "تین بیٹوں (نواب دولہا منجھلے صاحب، سنجھلے صاحب) کو ساتھ لے کر دہلی چلے آئے اور دو سال تک دہلی اور اس کے نواح میں رہے۔ اس کے بعد تیسری بار عصر نصیر الدین حیدر میں" اغلب در سال چہل و چند از مأۂ سیزدہم" پھر لکھنؤ آئے اور مرتے دم تک (۱۲۵۲ھ) وہیں رہے۔ (رسائل، ص ص ۱۵ - ۱۷)

سطور بالا کی بنا پر قیاس کیا جاسکتا ہے کہ نوابؔ دولھا صاحب اپنی ولادت (۱۲۲۲ھ) سے اپنے والد کے دوسرے سفر لکھنؤ (۱۲۳۱ یا ۱۲۳۲ھ) تک دہلی میں رہے۔ یعنی انھوں نے اپنی عمر کے ابتدائی نو دس سال دہلی میں گزارے۔ یہ عمر غالبؔ سے دوستی پیدا ہونے کے لائق نہ تھی۔ اس کے بعد اُن کے والد اپنے اہل و عیال کو ساتھ لے کر دہلی سے لکھنؤ چلے گئے اور چند سال

بقیہ حاشیہ

---

۴ —— روز نامچۂ نواب مرحوم موسوم بہ کتاب سوانح جلد یازدہم، در کتاب خانۂ راقم۔

۵ —— بیاض "مجموعۂ حسابات وغیرہ" حاوی خلاصۂ روزنامچۂ نواب مرحوم در آخر: در کتابخانۂ راقم۔ مخففاً: مجموعہ

۶ —— مرغوب دل، تالیف نواب مرحوم، نسخۂ خطی بقلم مؤلف، در کتاب خانۂ راقم۔

۷ —— خطوطِ غالب، گرد آوردۂ منشی مہیش پرشاد۔

۸ —— نسب نامۂ صفویان شمس آباد، تالیف راقم (نسخۂ خطی)

۹ —— مثنوی ابر گہر بار، نسخۂ اہدائی غالب بہ نواب دولھا، در کتاب خانۂ نواب فرخ حیدر۔

۱۰ —— سبد چین، نسخۂ اہدائی غالب بہ نواب دولھا، در کتاب خانۂ راقم۔

وہاں رہ کر نواب دولھا صاحب اور اُن کے دو بھائیوں کے ساتھ پھر "رونق افزائے شاہجہان آباد و اضلاع آن شدند"، اور دو سال دہلی میں رہے۔ شاید اس وقت نواب دولھا صاحب کی عمر ۱۵۔۲۰ سال کے درمیان ہو۔ میرے نزدیک یہ عمر اور یہ حالات بھی غالب سے دوستی پیدا کرنے کے قابل نہ تھے۔ دو سال کے بعد اُن کے والد پھر دہلی سے لکھنؤ گئے اور اپنی عمر کے آخر تک وہیں رہے۔ لکھنؤ میں نواب دولھا صاحب کے ممتد اور متوالی قیام کا زمانہ اُسی وقت سے شروع ہوتا ہے اور ۱۲۵۴ھ میں ختم ہوتا ہے (یعنی وہ سال جب نواب مرحوم لکھنؤ سے شمس آباد آئے) قیام لکھنؤ کی اس طویل مدت میں اُن کے کسی سفر دہلی کا ذکر اُن کے روزنامچوں میں نہیں ہے، اس بنا پر یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں بھی غالب سے اُن کی ملاقات نہ ہوئی۔

بالآخر اپنے والد کے انتقال کے بعد نواب مرحوم جمعہ ۱۸ رجمادی الآخر ۱۲۵۴ھ/۹ ستمبر ۱۸۳۸ء کو لکھنؤ سے شمس آباد وارد ہوئے اور یہی شمس آباد اُن کا وطن اور مدفن بنا (م: دوشنبہ ۱۱ یا ۱۲ رصفر بربنائے اختلاف رویتِ ہلال، ۱۲۹۴ھ/ ۲۶ رفروری ۱۸۷۷ء۔ کتاب سوانح، ج ۱۱، ورق ۱۸۱ ب)۔ (ضمناً یہ بھی لکھ دیا جائے کہ دہلی میں نسبتہً قلیل، اور لکھنؤ اور شمس آباد میں نسبتہً طویل مدت تک سکونت پذیر رہنے کے باوجود نواب صاحب نے اپنے کو ہمیشہ شاہجہان آبادی لکھا، لکھنوی یا شمس آبادی لکھنے سے گریز کیا۔ بہ شہادتِ روزنامچہ دہلی تشریف لے جاتے تھے تو وہاں کے رہنے والوں سے ہم وطنوں کی طرح ملاقات ہوتی تھی۔)

نواب مرحوم نے شمس آباد تشریف لانے کے بعد یہاں سے دہلی کے سات سفر فرمائے۔ راقم نے قیاس کیا کہ دہلی کے انھیں سفروں میں غالب سے اُن کی ملاقات ہوئی ہوگی۔ وہ مرحوم ۱۲۴۹ھ سے یقیناً روزنامچہ لکھتے تھے اس لیے کہ سال مذکور کی ایک یادداشت، 'مجموعہ'، ورق ۵۶۳ ب، میں موجود ہے۔ اُن روزنامچوں کے تتبع سے ان کے دہلی کے سفروں اور غالب سے ملاقاتوں کا حال معلوم ہو سکتا تھا۔ نواب صاحب کے روزنامچوں کا دورۂ کامل، اصل و خلاصہ، گیارہ جلدوں میں تھا۔ لیکن افسوس کہ اب وہ گیارہ جلدی دورۂ کامل اس خاندان میں باقی نہیں۔ فتح گڑھ کے ایک انگریز کلکٹر والس نام نے فتح گڑھ کی تاریخِ غدر (۱۸۵۷ء) لکھنے کے سلسلے سے نواب صاحب کے روزنامچے منگوائے۔ بیشتر جلدیں اُسے بھیج دی گئیں اور

پھر پلٹ کر نہ آئیں۔ تین جلدیں یہاں باقی رہیں اور راقم کے کتاب خانے میں موجود ہیں:

۱ــــ خلاصۂ روز نامچہ، "گویا جلد ہشتم سوانح خود"، انتخاب و خلاصۂ سوانح مہم، از سہ شنبہ ۷ر صفر ۱۲۵۲ھ تا شنبہ غرۂ ذی الحجہ ۱۲۷۰ھ/ ۲۶ر اگست ۱۸۵۴ء۔

۲ــــ کتاب سوانح، جلد دہم، در ابتدا احوال مفصل ہر روزہ، از جمعہ ۲۹ر محرم ۱۲۸۰ھ/ ۱۷ر جولائی ۱۸۶۳ء تا شنبہ ۲۹ر ذیقعدہ ۱۲۸۸ھ۔

در آخر: خلاصۂ کتب سوانح سابق: از ۱۱ر جمادی الاولی ۱۲۵۰ تا جمعہ ۲۸ محرم ۱۲۸۰/ ۱۶ر جولائی ۱۸۶۳ء۔

۳ــــ کتاب سوانح، جلد یازدہم، احوال مفصل ہر روزہ، از یک شنبہ یکم ذی الحجہ ۱۲۸۸/ ۱۱ر فروری ۱۸۷۲ تا ۱۱ر یا ۱۲ر صفر ۱۲۹۴/ ۲۶ر فروری ۱۸۷۷ء۔

(روزِ درگذشتِ صاحب روز نامچہ۔ آخر کی چار تاریخیں، ۲۳-۲۶ر فروری، نواب صاحب کے پوتے سید محمد عسکری عرف نواب وزیر پسر ارشد نواب سید محمد ولی خان عرف نواب جان کے قلم سے۔)

ان کتب سوانح کے علاوہ ایک بیاض 'مجموعۂ حسابات وغیرہ' بھی راقم کو ملی۔ یہ بیاض، روزنامچوں کے دورۂ یازدہ جلدی سے خارج ہے، لیکن نواب صاحب نے اس کے اوراقِ آخر (۵۶۳ ب - ۶۱۷ ب) میں بھی "یادداشت ضروری سالہای ہجری بطور سوانح از دہ کتب خود" نقل فرمادی ہیں۔ یعنی اپنے روز نامچوں کا خلاصہ کیا ہے، ۱۲۴۹ سے ۲۹ر ذیقعدہ ۱۲۸۸ھ/ ۱۰ر فروری ۱۸۷۲ء تک (یعنی از ابتدای روز نامچہ نویسی تا انتہای کتاب دہم سوانح)۔

مذکورہ بالا روز نامچوں کے مطالعے سے دہلی کے ساتوں سفروں کی تاریخیں معلوم ہوگئیں، لیکن افسوس کہ ابتدا کے پانچ سفر کا مختصر حال ۱۲۸۰ھ سے پہلے کے روز نامچوں کے خلاصوں سے صرف معلوم ہوا۔ افسوس بالاے افسوس یہ کہ نواب صاحب نے اُن خلاصوں میں غالب کا ذکر نہیں کیا ہے۔ غالب کا ذکر صرف آخر کے دو سفروں کے ذیل میں ہے: ۱۲۸۰ اور ۱۲۸۱ھ۔ یہی دو سفر ایسے ہیں جن کا مفصل روز نامچہ موجود ہے، کتاب دہم سوانح کی شکل میں۔ نواب صاحب کی یہ تحریریں ذیل میں نقل کی جائیں گی۔

یہ بھی لکھ دیا جائے کہ نواب مرحوم دہلی میں نواب سید حامد علی[۱] خاں کی کوٹھی (واقع محلۂ کشمیری دروازہ) میں قیام فرماتے تھے۔ یہ دونوں بزرگ ایک دوسرے کے ہم زلف تھے:

---

[۱] یہ وہی حامد علی خاں ہیں جن کا ذکر ان کی منظورِ نظر طوائف مغل جان کے ذکر کے ساتھ غالب کے ایک خط میں موجود ہے۔ نواب کی شخصیت تاریخی تھی اور اپنی بقا کے لیے غالب کی تحریر سے بے نیاز البتہ بی مغل جان غالب ہی کے قلم کی روشنائی کا آبِ حیات پی کر زندۂ جاوید ہوئی ہیں۔ راقم کا جی چاہتا ہے وہ بھی میرزا کا ہم زبان ہو کر عمرِ خضر کی درازی کی دعا مانگ لے اور بی مغلو کے متعلق بطورِ یادگار دو خاندانی روایتیں لکھ دے۔ ایک روایت تحریری ہے، دوسری شفاہی:

منظورۂ مذکورہ دلّی کے شوقینوں میں مغل جان تھیں، اور ہمارے خاندان میں مُغلو۔ نواب حامد علی خاں شوہرِ نواب حاجی بیگم کے دامنِ دولت سے وابستہ تھیں۔ اس زمانے کے سازمانِ امارت میں ایسے روابط چنداں معیوب بھی نہ سمجھے جاتے تھے، بلکہ یہ پتلیاں بڑی سرکاروں کے قصرِ ہفت رنگ کی زینت شمار کی جاتی تھیں۔ بی مغلو اور نواب کا رابطہ بیگم صاحبہ کو معلوم تھا، بس آنکھ کا پردہ تھا کہ بعد میں وہ بھی نہ رہا۔ نواب صاحب کے گھر والوں کا سلوک مُغلو اور اس کے گھر والوں کے ساتھ ایسا تھا جیسا امرا کا اپنے اہلِ توسل سے ہوتا ہے، یعنی اُدھر سے خدمت و ارادت، اِدھر سے رافت و عنایت۔ اس کا تحریری ثبوت نواب دولھا صاحب کے رسالۂ رسمِ دنیا میں موجود ہے۔ نواب فیض النسا بیگم نے جمعہ ۱۶؍ شوال ۱۲۶۴ھ کو شمس آباد میں رحلت فرمائی۔ جمعہ ۷؍ ذیقعدہ سال مذکورہ کو نواب حاجی بیگم صاحبہ اُن کے پُرسے کو دہلی سے یہاں تشریف لائیں۔ اُس زمانے میں اُن کے شوہر نواب حامد علی خاں اودھ کی سرکار میں علاقہ دار تھے اور ظاہراً اُن کا مستقر نواب گنج (مابین کانپور و لکھنؤ) تھا۔ شنبہ ۲۹؍ ذیقعدہ ۱۲۶۴ھ/ ۲۸؍ اکتوبر ۱۸۴۸ء کو حاجی بیگم صاحبہ شمس آباد سے روانہ ہوئیں، شوہر کے پاس جاتی تھیں۔ نواب جعفری بیگم صاحبہ (زوجۂ نواب دولھا) بڑی بہن کے بدرقے کے لیے فتح گڑھ تک اُن کے ساتھ گئیں۔ وہاں کی چھاؤنی ("کمپ") میں ان کا ذاتی بنگلہ موجود تھا۔ دونوں بہنیں ایک شب اُس بنگلے میں ٹھہریں۔ میزبان بہن کی طرف سے مہمان بہن کی ضیافت عمل میں آئی۔ نواب دولھا صاحب اِس قیام اور ضیافت

اس طرح کہ اعتماد الدولہ میر فضل علی خاں کی ایک صاحبزادی حاجی بیگم کی شادی نواب حامد علی خاں سے ہوئی تھی، اور دوسری صاحبزادی جعفری بیگم کی شادی نواب دولھا صاحب

کا حال لکھ کر تحریر فرماتے ہیں: "شب از خانۂ سجاکسبی خواہر مغلو ہم دعوت آمدہ بود"۔ نواب حاجی بیگم کو یہ کھانا سجا نے مغلو کے رشتے سے بھیجا تھا (نواب دولھا صاحب کا قلم بیان وقائع میں کسی مجاملت کا روادار نہیں۔ 'کسبی' کا لفظ بھی اسی صاف گوئی بلکہ فاش گوئی کا نتیجہ ہے۔)
[رسم دنیا، ص ۲۰۸]

دوسری روایت شفاہی ہے اور دل چسپ: جیسا اوپر عرض کیا گیا، حاجی بیگم صاحبہ کو نواب اور مغلو کے رابطے کی خبر تھی، بس آنکھ کا پردہ تھا۔ بارے ایک روز زوجہ نے شوہر سے اصرار کیا کہ نواب تمھاری مغلو کو ہم بھی دیکھیں گے۔ نواب نے فرمایا: صاحب، کیسی مغلو! کس نے تمھارے کان بھر دیے۔ بیگم صاحبہ کا اصرار جب بھی باقی رہا۔ نواب صاحب خاموش ہو کر باہر تشریف لائے۔ مغلو آئی تو فرمایا: تجھے بیگم صاحب نے یاد کیا ہے، ان کی خدمت میں جانا۔ لیکن خبردار خبردار، بن ٹھن کر نہ جانا، پھٹے پرانے کپڑے پہن کر جانا، اور اُن کے برابر نہ بیٹھنا، زمین پر بیٹھنا۔ اُس نے عرض کی بہت خوب۔ ایک روز اسی ہیئت سے محل میں پہنچی۔ بیگم صاحبہ پلنگڑی پر بیٹھی سر جھکائے رئیسانہ شغل بے شغلی میں مصروف تھیں۔ مغلو وہیں زمین پر بیٹھ گئی۔ ایک خواص نے پہچان کر کہا: ہائیں، یہ تو نواب کی مغلو ہے! یہ سُن کر بیگم صاحبہ نے بھی سر اٹھایا۔ مغلو کی ہیئتِ گدائی دیکھ کر فرمایا: تو ہی مغلو ہے؟ ہے ہے! تو نواب کے پاس اسی حیثیت سے جاتی ہے۔ خواصوں کو حکم ہوا اسے حمام میں لے جاؤ۔ بی مغلو نے بیگم صاحبہ کے حمام میں استحمام کیا۔ بیگم صاحبہ کے حکم سے اُنھیں کے زربافتہ جوڑے میں ملبس ہوئیں، اُنھیں کے ایک جوڑ مرصع زیور سے ازسرتاپا آراستہ کی گئیں اور بیگم صاحبہ کے سامنے لائی گئیں۔ دیکھ کر خوش ہوئیں۔ فرمایا: ہاں، اب تو میرے نواب کے قابل ہوئی، اب اُن کے پاس جا۔ بی مغلو بنی ٹھنی، چھم چھم کرتی محل سے نکلیں اور نواب کے پاس پہنچیں۔ انھوں نے جو یہ زرق و برق دیکھی برہم ہوئے اور فرمایا: میں نے تجھ سے کیا کہا تھا، تو نے کیا کیا، بیگم صاحب کو طمطراق دکھانے محل میں پہنچی۔ اس نے عرض کی میں کیا کروں، یہ سب بیگم صاحب ہی کی عنایت ہے۔ پھر سارا واقعہ بیان کیا۔ نواب صاحب اُس فرشتہ خصال

(بقیہ اگلے صفحے پر)

ہے - اس کے علاوہ نواب مرحوم کے بڑے صاحبزادے (راقم کے پردادا) نواب سید محمد ولی خاں عرف نواب جان کی شادی نواب حامد علی خاں اور نواب حاجی بیگم کی نواسی رقیہ بیگم بنت سیدہ بیگم سے ہوئی تھی - ذیل کے شجرے سے یہ پیچ در پیچ قرابتیں واضح ہو جائیں گی ، یہ شجرہ راقم کی تالیف موسوم "بنسب نامۂ صفویان شمس آباد" (نسخۂ خطی) سے ماخوذ ہے -

(میر نور علی نقوی الہ آبادی)

نواب غلام حسین خاں — فیض النساء بیگم عرف "بی مغلانی" (بادشاہ بیگم زوجۂ غازی الدین حیدر کی سرکار میں)

موتی بیگم — اعتماد الدولہ ضیاء الملک سید فضل علی خاں بہادر سہراب جنگ

عماد الدولہ اعظم الامراء افتخار الملک سید حامد علی خاں غضنفر جنگ، = حاجی بیگم — امراؤ بیگم — جعفری بیگم = نواب سید محمد علی خاں عرف نواب دولہا

حیدری بیگم — سیدہ بیگم

نواب محمد جعفر علی خاں عرف پیارے میاں — نواب محمد مہدی علی خاں عرف اچھے میاں

رقیہ بیگم = نواب سید محمد ولی خاں عرف نواب جان

نواب سید محمد کاظم حسین عرف نواب بہادر — نواب سید محمد اصغر حسین عرف لاڈلے صاحب واقف تخلص — نواب بیگم

نواب قاسم عباس — باقری بیگم = — نواب فرخ حیدر

راقم آثم صادق

بقیہ حاشیہ

بی بی کی کشادہ دلی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ مغلو سے فرمایا : نیک بخت ! میں نے تجھے آزاد کیا ، ے گھر ... ب میرے گھر میں نہ آنا -

اس تمہید کے بعد نواب دولھا صاحب کے چھٹے اور ساتویں سفرِ دہلی کا حال لکھا جاتا ہے:

سفرِ ششم - ربیع الثانی - رجب ۱۲۸۰ھ اپنے بیٹے نواب جان اور ان کی زوجہ رقیہ بیگم کے درمیان اصلاح کے لیے - دہلی میں ورود: جمعہ ۲۴/ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ/۱۰/اکتوبر ۱۸۶۳ء - دہلی سے روانگی: جمعہ ۲۰/رجب ۱۲۸۰/۱/جنوری ۱۸۶۴ء - دہلی میں قیام کی مدت تقریباً ۲ ماہ ۱۱ یوم - قیام گاہ نواب حامد علی خاں کی کوٹھی - غالب کا ذکر صرف ایک بار (کتاب سوانح، ج ۱۰، اوراق ۲۶ ب - ۲۹ ب):

"دوشنبہ ۳ [جمادی الآخرہ ۱۲۸۰/۱۶/نومبر ۱۸۶۳ء] ... شام ناظر حسین مرزا سہ بند نوشتہ و گفتۂ مرزا اسد اللہ غالب عرف مرزا نوشہ آوردند کہ طرز نو دارد۔

ہاں اے نفسِ بادِ سحر شعلہ فشاں ہو	اے دجلۂ خوں چشمِ ملائک سے رواں ہو
اے زمزمۂ قُم لبِ عیسیٰ پہ فغاں ہو	اے ماتمیانِ شہِ مظلوم کہاں ہو
بگڑی ہے بہت بات بنائے نہیں بنتی	اب گھر کو بغیر آگ لگائے نہیں بنتی
تابِ سخن و طاقتِ غوغا نہیں ہم کو	ماتم میں شہِ دیں کے ہیں سودا نہیں ہم کو
گھر پھونکنے میں اپنے محابا نہیں ہم کو	گر چرخ بھی جل جائے تو پروا نہیں ہم کو
یہ خرگہِ نُہ پایہ جو مدت سے بپا ہے	کیا خیمۂ شبیر سے رتبے میں سوا ہے
کچھ اور ہی عالم ہے دل و چشم و زباں کا	کچھ اور ہی نقشہ نظر آتا ہے جہاں کا
کیسا فلک اور مہرِ جہاں تاب کہاں کا	ہوگا دلِ بیتاب کسی سوختہ جاں کا[1]
اب صاعقہ و مہر میں کچھ فرق نہیں ہے	گرتا نہیں اس رُو سے کہ کچھ برق نہیں ہے

سفرِ ششم میں اس موقع کے سوا غالب کا ذکر کہیں اور نظر نہیں آتا۔ بدیہی ہے کہ اس سفر میں غالب سے نواب مرحوم کی ملاقات بھی نہ ہوئی ہوگی۔

سفرِ ہفتم، ۱۲۸۱ - حامل اہمیت - غالب سے بعض مسائل ادبی و لسانی کا استفسار،

---

[1] شاعر نے اس بند کے تیسرے مصرعے میں فلک اور مہرِ جہاں تاب کا ذکر کیا ہے۔ لیکن چوتھے مصرعے میں صرف مہرِ جہاں تاب کی تشبیہ فراہم کی ہے، بیچارہ فلک محروم رہ گیا - ظاہرا حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش نہ تھی، امرِ آخوند کی بجا آوری تھی؛ اس رندِ چالاک نے آخوندی شعر کہہ دیے۔

غالب کا تحریری جواب، نواب صاحب کا استفسار بھی غالب کے شاگرد سراج الشعرا سلطان الذاکرین میرزا یوسف علی خاں عزیز کے وسیلے سے، غالب کا جواب بھی میرزا یوسف علی خاں کے نام۔ غالب سے نواب مرحوم کی دو بار ملاقات۔ روزنامچے میں غالب کا چار بار ذکر۔ غالب کا خط طویل ہے۔ یہاں نقل کیا جائے تو روزنامچے کی تحریروں میں خلا پیدا ہو جائے گا۔ لہذا اس خط کی بحث بعد میں کی جائے گی اور ذیل میں روزنامچے کی تحریریں نقل کی جاتی ہیں :

" پنجشنبہ ۱۵ر صفر ۱۲۸۱ ہجری مطابق ۲۱ر جولائی ۱۸۶۴ عیسوی ... یوسف علی شاعر شاگرد مرزا نوشاہ چند بند مرثیۂ ہفت صد بند گفتہ خود خواندند و از ایشان برای تحقیقات از مرزا نوشاہ نویسانیدہ شد۔ تذکیر و تانیث حروف تہجی و سبب عدم تبدیل نام تکیہ دگل تکیہ و اینکہ چرا خبر لفظ معنی جمع می آید و اصل خوزادہ و فق چیست، و دریولا بفضلہ ہمہ روز انبہ خوب خوردہ می شود۔ سہ پہر چپکن پوشیدہ عمامہ بستہ سوار نیس شدہ ... چہار ملاقات نمودہ شد .... "
(کتاب سوانح، ج ۱۰، ورق ۱۱۷)

ابتدائی عبارت کو آخر کی عبارت کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا یوسف علی سے ۱۵ر صفر کو تیسرے پہر سے پہلے ملاقات ہوئی ہوگی۔

۲۔ " جمعہ ۱۶ر صفر ۱۲۸۱ ہجری [۲۲ر جولائی ۱۸۶۴ء] بفضلہ بیرون رسیدہ تواضع مرزا یوسف علی کو رقعۂ جواب مطالب دیروز نوشتۂ اسد اللہ خاں غالب عرف مرزا نوشاہ رسانیدند للعہ [چار روپے] از نام شیرینی اطفال شد۔"
(وہی کتاب وہی ورق)

یوسف علی غالب کا جواب لے کر نواب صاحب کے پاس ۱۶ر صفر کی صبح کو آئے ہیں۔ قیاس غالب ہے کہ انھوں نے روز قبل یعنی ۱۵ر صفر کو نواب مرحوم کے پاس سے جا کر غالب کو خط لکھا ہوگا اور اس میں نواب صاحب کے سوال تحریر کیے ہوں گے اور غالب نے اسی روز اپنا تحریری جواب میرزا یوسف علی

کو بھیج دیا ہوگا اور میرزا یوسف علی اگلے روز یعنی ۱۶ر صفر کی صبح کو وہ جواب لے کر نواب مرحوم کی خدمت میں آئے ہوں گے۔ اِس طرح غالب کے خط کی تاریخ تحریر پنجشنبہ ۱۵ر صفر ۱۲۸۱ھ/ ۲۱ر جولائی ۱۸۶۴ء قرار پائی ہے۔ (یہ امر فی الجملہ بعید از قیاس ہے کہ یوسف علی کے ۱۵ر صفر کے خط کا جواب غالب نے ۱۶ر صفر کو اتنے سویرے لکھ کر بھیج دیا ہو کہ صبح کے مختصر وقت میں یوسف علی خاں وہ خط لے کر نواب صاحب کے پاس آ گئے ہوں۔)

اوپر عرض کر چکا ہوں کہ نواب مرحوم کے سوالوں اور غالب کے جوابوں سے بعد میں بحث کی جائے گی۔

۳— شنبہ ۲۴ر صفر ۱۲۸۱ ہجری مطابق ۳۰ جولائی ۱۸۶۴ عیسوی بفضلہ از ضروریات معمولی فراغ یافتہ بہ نواخت نہ گھنٹہ بیرون رسیدہ جائزہ اشیای نوخرید..... دیدہ سوار بس شدہ با وزیر دولہ و میر فرخندہ علی در گلی قاسم جان رسیدہ ملاقات اسد اللہ خاں غالب عرف مرزا نوشاہ نمودہ پان حقہ د رسالۂ ابر گہر بار چھاپہ گرفتہ آمدم عمر ایشاں لگ [۶۹] سال است و از کلیات چھاپہ خود دو نوحۂ فارسی .... خواندند کہ گریستم۔" (منقوط میں چار جگہ میں کلمے پڑھنے میں نہیں آ سکے ہیں وہ الفاظ اس قدر پھیکی سیاہی سے لکھے ہیں کہ میں ان کو کسی طرح پڑھ نہیں سکا ہوں)

متن کی تحریر کے پہلو میں حاشیے کی یہ عبارت:

"یک شعر ہندی قدیم گفتہ خود خواندند:

وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

پشت خار من گرفتہ، دیدہ، حال پشت خارِ کلان خود گفتہ، شعر ہندی ہمراہ کندہ کردہ بودند، خواندند:

ما ہم زدہ جنون تو دامن گدائے بے سروپا نیم   کز بے سر خیرہ مژگان تو پشت خار اینم

(کتاب ایضاً، ورق ۱۱۸ ب)

روز نامچے میں مثنوی ابر گہر بار کے جس نسخۂ اہدائی کا ذکر ہے وہ اب بھی اس خاندان میں نواب فرخ حیدر صاحب کے پاس موجود ہے۔ انھیں ان کے نانا نواب پیارے صاحب نے عطا فرمایا تھا۔ نواب پیارے صاحب، نواب دولھا صاحب کے منجھلے فرزند تھے۔ نسخۂ مذکورہ ۱۲۸۰ھ میں اکمل المطابع دہلی میں چھپا تھا۔ اس کے سرورق پر نواب دولھا صاحب کے قلم کی یہ یادداشت موجود ہے:

"پاسی روز بر آمدہ شنبہ ۲۴ صفر ۱۲۸۱ ہجری کہ برائے ملاقات اسد اللہ خاں غالب عرف مرزا نوشاہ صاحب در شاہجہان آباد رفتم از دست خود عنایت فرمودند، ۱۲ سید محمد علی عرف نواب دولہ"

مثنوی ابر گہر بار کا یہ نسخہ معروف ہے، لہذا اس کی تفصیل لکھنے کی ضرورت نہیں۔ بازدید مزبور میں نواب مرحوم کے ہمراہی:

۱ — وزیر دولھا - حاجی سید عنایت علی نام، وزیر دولھا سسرالی خطاب۔ نواب مرحوم کے بہنوئی، یعنی اُن کی بڑی بہن کلثوم بیگم کے شوہر۔

۲ — میر فرخندہ علی شمس آباد، محلۂ میران دروازہ کے رہنے والے، نواب مرحوم کے مصاحب۔ اُن کے بیٹے میر وزیر علی اثر کو راقم نے بھی دیکھا تھا۔

۴— "۔۔ر شنبہ ۲۷ صفر ۱۲۸۱ھ ۲ اگست ۱۸۶۴ء - اول مرزا یوسف علی صاحب آمدن مرزا نوشاہ صاحب گفتہ کاغذ بہ تفصیل ذیل رسانیدند: دو ورقہ اشعار منتخب مرزا صاحب مُہری اوشان سوائے دو ورق دیگر۔ یک عرضی خاندان خود و اظہار ۔۔ دختر ناکتخدا۔ دو دعای چھاپہ۔ ویک جزو پنج سورۃ طلاق ویک پرچہ صنعت صمغ برائے نواب ضیاء الدین خاں بردند وقریب نواخت دہ گھنٹہ مرزا نوشاہ صاحب نجم الدولہ تشریف آوردند۔ برخاستہ تعظیم کردہ نشانیدم وگفتگوی عذر نرفتن [illegible] و [illegible] آنجا و آمدن خود بہ شمس آباد وشعر وسخن ماند۔ چند شعر خود ہم خواندم

از جملہ قصیدۂ نعت بفضلہٖ تعریف مضمون مہر نبوت کردند۔ بوقت رخصت کشتی عطر پان ڈلی الاچی تواضع شد و برخاستہ رخصت شدند۔ ۔ ۔ ۔" (کتاب سوانح، جلد ۱۰، ورق ۱۱۹ و)

تداول میں "اشعار منتخب مرزا صاحب" سے مراد اشعار منتخب غالب ہیں، نہ اشعار منتخب میرزا یوسف علی عزیز۔ مجموعہ، ورق ۵۸۷ ب، میں خلاصۂ سوانح ۱۲۸۱ھ کے ذیل میں اس ملاقات کا خلاصہ بھی موجود ہے اور اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ شعر غالب کے تھے:

"۲۷ [صفر] آمدن مرزا یوسف عزیز تخلص و دو ورقہ اشعار چیدۂ استاد خود مرزا نوشاہ غالب تخلص رسانیدن و آمدن مرزا نوشاہ و کشتی عطر پان۔"

اس صحبت میں نواب مرحوم نے اپنا جو قصیدہ غالب کو سنایا اُس کا مطلع یہ ہے:

بہار آمد و سرسبز شد درین ایام
نہال در چمنستان و سبزہ در آجام

غالب نے جس شعر کی تعریف کی وہ یہ ہے:

بہ ہر نبی سندی داد رب عرش و ترا
سپرد مُہرِ نُبوّت نمود ختم پیام

یہ قصیدہ نواب مرحوم کے رسالۂ معادن ثروت (رسایل، ص ص ۳۸ - ۴۱) میں موجود ہے۔ بہت دنوں کی فکر سخن کے بعد چہارشنبہ ۴ رجمادی الآخرہ کو مکمل ہوا۔ نواب صاحب ابتدا میں مجرم تخلص کرتے تھے، پھر انور، اس قصیدے میں انور تخلص ہے۔ تقریباً ۱۱۳ شعر ہیں اُن کی نثر فارسی کے نمونے اس مقالے میں جابجا موجود ہیں۔ نظم کا قیاس بھی اُسی نثر سے کرنا چاہیے۔

میں نے نواب مرحوم کے پوتے اور اپنے نانا اور استاد نواب لاڈلے صاحب واقف تخلص سے ذیل کی روایت سُنی ہے، غالباً اسی صحبت کے متعلق ہوگی:

"ایک بار دادا ابا مرحوم [نواب دولھا صاحب] نے غالب کو اپنا قصیدہ سُنایا۔ غالب بہت کم تعریف کرتے تھے۔ آنکھیں بند کیے سُنتے رہے۔ جب دادا صاحب نے یہ شعر پڑھا: سپرد مُہرِ نبوت نمود ختم پیام۔ تو غالب نے

آنکھیں کھولیں اور کلمے کی انگلی اٹھائی یعنی اس اشارے میں تعریف کی۔"

ظنِ غالب ہے کہ جناب واقفؔ نے یہ روایت اپنے والد نواب پیارے صاحب سے اور انھوں نے اپنے والد نواب دولھا صاحب سے سُنی ہوگی۔ یہ تینوں راوی نہایت ثقہ اور امین تھے۔ میں اس سلسلۂ رُواۃ کو سلسلۃ الذّہب کہتا ہوں۔ بعض اوقات یہ تینوں بزرگ اپنی روایت میں متکلّم کے منہ سے نکلے ہوئے لفظ بھی بعینہٖ نقل کر دیتے تھے۔ واقعی نواب مرحوم کے سارے قصیدے میں شعر بس وہی ہے جس کی تعریف غالبؔ نے کی۔ باقی تبرک ہے۔

حضرت واقفؔ کی روایت کی بنا پر راقم، نواب دولھا صاحب کے روز نامچے کی عبارت مربوط کی قرات ذیل کی سجاوندی کے ساتھ قرار دیتا ہے:

" از جملۂ قصیدۂ نعت بفضلہ تعریفِ مضمونِ مُہرِ نبوت کردند۔"

اس سفرِ ہفتم کے بعد نواب مرحوم نہ کبھی دہلی تشریف لے گئے، نہ غالبؔ سے ملاقات ہوئی۔ البتہ اس کے بعد اسی جلد دہم سوانح میں غالبؔ کا ذکر تین بار اس طرح اور آیا ہے:

۱۔ " روز یک شنبہ ۷ رجمادی الاول ۱۲۸۴ ہجری مطابق ۸ ستمبر ۱۸۶۸ عیسوی۔۔۔۔ خطوط وغیرہ رسیدند

خط حسین مرزا صاحب از دہلی۔۔۔۔	اخبار نامک چند	پولندہ دہلی دو ٹکٹ بہرہ [بھرا] شاید دو آنہ چسپیدہ، مرسلہ اسداللہ خاں غالبؔ، رسالہ چھاپہ سبدِ چین نام قصائد و قطعات وغیرہ، دو رسالہ یک برائے من و یک برائے ڈپٹی مرزا صاحب"

تیسری مد کے اوپر تحریر فرمایا ہے: " رسالۂ حصۂ خود بہ پیارے صاحب دادہ شد۔"
(کتاب سوانح، ج ۱۰، ورق ۳۷۱ و۔)

سبدِ چین کا یہ مطبوعہ نسخہ راقم کے کتاب خانے میں موجود ہے۔ اُس کے سرورق پر

نواب مرحوم کے قلم سے یہ عبارت تحریر ہے:

"بفضلہ مرسلہ شاعر بی نظیر اسد اللہ خان غالب دوشنبہ ۹ر جمادی الاولی ۱۲۸۴ ہجری

"برخوردار اقبال آثار سید محمد جعفر علی خاں عرف پیارے صاحب طال عمرہ دادہ شد ۱۲، سید محمد علی"

اس عبارت میں نواب مرحوم کو یا دن لکھنے میں سہو ہوا، یا تاریخ لکھنے میں۔ روزنامچے کی شہادت کے مطابق دوشنبے کو ۸ر جمادی الاولی تھی، اور ۹ر جمادی الاولی کو سہ شنبہ۔

روزنامچے کے "ڈپٹی مرزا صاحب" سے میرزا کلب حسین خاں نادر مراد ہیں۔ وہ فتح گڑھ میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ نواب مرحوم انھیں ڈپٹی مرزا کہتے تھے۔ ان کی صاحبزادی کی شادی نواب صاحب کے چھوٹے بھائی محمد حسین عرف چھوٹے صاحب سے ہوئی تھی۔

۲۔ "روز چہارشنبہ ۱۰ر جمادی الاولی ۱۲۸۴ ہجری مطابق ۱۱ر ستمبر ۱۸۶۷ عیسوی ....

ٹکٹ نیم آنہ چسپانیدہ بدست لال محمد بہ ڈاک خانہ رفت

"بفضلہ اول خط بہ دہلی باسد اللہ خاں غالب بعبارت و قلم مولوی عرفان علی القاب عبارت آرائی رسیدن رسالہ سبد چین و تعریف آن و خوشی دہ آخر از مولوی صاحب سلام الراقم الآثم بنام تاریخ ۱۱ر جمادی الاولی ۱۲۸۴ھ (کتاب سوانح، ج ۱۰، ورق ۲۷۱ ق)

مولوی عرفان علی بریلوی نواب مرحوم کے دار الانشا کے دبیر اور اُن کے بچوں کے معلم تھے۔ شاعر بھی تھے۔ عرفاں تخلص تھا۔

۳۔ کتاب سوانح: ج ۱۰، ورق ۴۲۴ ق:

عبارت متن: روز پنجشنبہ ۴ر ذی الحجہ ۱۲۸۵ ہجری مطابق ۱۸ر مارچ ۱۸۶۹ عیسوی۔

از شاہجہان آباد

اخبار ۱۱ مارچ | مع پرچہ | "

عبارت حاشیہ :"از نجم الاخبار تاریخ وفات مرزا اسد اللہ خان مرزا نوشاہ
شاہجہان آبادی غالبؔ تخلص
کشتۂ ناوک اجل شد آہ

۱۲۸۵"

بیاض 'مجموعہ حسابات وغیرہ' ورق ۲.۶ ب کے حاشیے میں بھی یہ تاریخ اسی طرح درج فرمائی ہے :

" تاریخ وفات مرزا نوشاہ غالبؔ تخلص دہلوی: کشتۂ ناوک اجل شد آہ

۱۲۸۵ ہجری "

اس مصرعے سے ۱۲۸۵ نہیں ۱۱۴۷ حاصل ہوتے ہیں ۔ 'آہ' کے الفِ ممدودہ کے دو عدد مانے جائیں جب بھی ۱۱۴۸ ہوتے ہیں ۔ اگر پہلے مصرعے میں کوئی تعمیہ تھا تو اُس کی خبر نہیں ۔ نواب صاحب نے بس یہی ایک مصرع تحریر فرمایا ہے ۔

نواب مرحوم کے روز نامچوں میں راقم کو غالبؔ کا ذکر بس انھیں آٹھ جگہوں پر نظر آیا ۔ ایک بار سفرِ ششم میں، چار بار سفرِ ہفتم میں، ایک بار سبد چین کا اندراج وصول، ایک بار اُس کی رسید کے خط کی یادداشت، ایک بار نجم الاخبار سے غالبؔ کی تاریخ وفات کی نقل ۔

البتہ روز نامچوں کے علاوہ نواب مرحوم کی ایک اور کتاب موسوم بہ مرغوب دل میں بھی غالبؔ کا ذکر موجود ہے ۔ کتاب مذکورہ ضخیم تالیف ہے اور اس کے موضوع مختلف ہیں ۔ اُس کے ایک حصے میں نواب صاحب نے بعض مشاہیر کا تذکرہ لکھا ہے ۔ چنانچہ غالبؔ کی نسبت تحریر فرماتے ہیں :

" یہ شاعر ماہر شیعہ و نازک خیال پختہ رنگ و ریشدار و درازقد و آزاد وضع و درویش طبع و میوش و تیز ہوش آج ہمارے زمانے میں نظم و نثر فارسی و ہندی میں بے مثل ہیں ۔" (مرغوب دل، ورق ۲۲۱ ب)

غالبؔ کے مذہب کی نسبت نواب صاحب کی شہادت کو قولِ فیصل سمجھنا چاہیے ۔

یہ شہادت ایک معاصر دیندار شیعہ محقق کی ہے۔

البتہ عبارت مذکور میں 'پختہ رنگ' کا مطلب صحیح طور سے سمجھ میں نہیں آیا۔ اگر یہ صفت اپنے سے پہلے کی صفت 'نازک خیال' سے مربوط ہے تو کوئی الجھن نہیں، یعنی یہ بھی شاعری کے سلسلے کی ایک بات ہے۔ لیکن اگر 'پختہ رنگ' 'ریشدار' کی ردیف سے ہے تو پھر یہ بھی غالب کے قیافے کے بیان کا ایک جزو ہے۔ اس صورت میں 'پختہ رنگ' کے معنی کیا ہوں گے؟ غالب کالے تو نہ تھے۔ انھوں نے اپنا رنگ جوانی میں چمپئی لکھا ہے۔ بڑھاپے میں گورے تو ضرور ہوں گے۔ والعلم عنداللہ۔

جیسا اوپر مذکور ہوا، نواب صاحب کے روز نامچے میں اُن کے سفرِ ہفتم دہلی کے ذیل میں غالب سے اُن کی دو ملاقاتوں کا ذکر ہے۔ لیکن ہماری ایک روایت خاندانی شاہد ہے کہ سفرِ ہفتم سے پہلے بھی کم سے کم ایک بار اُن کی ملاقات غالب سے ضرور ہوئی ہوگی، جس کا ذکر اُن کے تلف شدہ روز نامچوں میں ہوگا۔ نواب مرحوم کے منجھلے فرزند نواب پیارے صاحب نے افضل حسین ثابت کی کتاب حیاتِ دبیر پر متعدد حاشیے تحریر فرمائے ہیں۔ کتاب مذکور کا وہ نسخہ راقم کے کتاب خانے میں موجود ہے۔ نواب پیارے صاحب کا ایک حاشیہ یہ ہے:

> "میرے والد مرحوم سے دہلی میں مرزا غالب نے ایک موقع پر ارشاد کیا تھا کہ بھیا میرببر علی انیس کا دارو نہ دبیر سے ملا ہوا ہے۔ جو مضمون وہاں سے اِلقا ہوتے ہیں وہ اسی کو دیتا ہے۔ ۱۲ جعفر"

اس عبارت میں "بھیا" کا لفظ توجہ طلب ہے۔ نقل روایت میں ان بزرگوں کی امانت کا ذکر ہو چکا ہے "بھیا" کا لفظ اس بات کی مُہرِ تصدیق ہے کہ یہ فقرے ہو بہو اسی طرح نقل ہوئے ہیں جس طرح غالب کے منہ سے نکلے تھے۔

افسوس کہ نواب مرحوم کے ابتدائی روز نامچے اس خاندان میں باقی نہ رہے۔ ورنہ سفرِ ہفتم سوانح کے آغاز (صفر ۱۲۸۰ھ / جولائی ۱۸۶۳ء) سے پہلے ان کی جو ملاقاتیں غالب سے ہوئی تھیں ان کا حال بھی معلوم ہو جاتا۔ مزید افسوس اس بات کا ہے کہ اُن مرحوم نے

اگلے روز ناموں کے خلاصوں میں بھی ان ملاقاتوں کا ذکر نہ کیا۔ ان خلاصوں میں سفر لکھنؤ (۱۲۷۸ھ) کے ضمن میں میرزا دبیر مرحوم سے ملاقات کا ذکر بار بار ہے۔ دبیر سے نواب صاحب کے گہرے اور برادرانہ تعلقات تھے، اور غالب سے رسمی دسر سری۔ شاید اسی لیے خلاصوں میں غالب کا ذکر چھوڑ دیا اور دبیر کا ذکر مکرر فرمایا۔

آخر میں نواب مرحوم اور غالب کے اُن ادبی استفسارات اور جوابات سے بحث کی جاتی ہے جن کا ذکر سفر ہفتم دہلی کے ذیل میں ہو چکا ہے۔

جیسا اس سے قبل تحریر کیا گیا، غالب کا ایک خط میرزا یوسف علی خاں عزیز کے نام ہمارے خاندان میں موجود ہے۔ یہ خط نواب پیارے صاحب نے اپنے نواسے نواب فرخ حیدر کو عطا فرمایا تھا اور اب انھیں کے ذخیرے میں محفوظ ہے۔ گمان غالب ہے کہ یہ خط نواب پیارے صاحب نے اپنے والد نواب دولھا صاحب سے پایا ہوگا۔ بارے اب اس خاندان میں یہ خط تو موجود تھا لیکن پرانے بزرگوں کے اٹھ جانے کے بعد کسی کو اس بات کی خبر نہ تھی کہ یہ خط غالب نے کب لکھا (خط پر تاریخ درج نہیں) کیوں لکھا، اور یہاں کیوں کر پہنچا؟ بنارس یونی ورسٹی کے منشی مہیش پرشاد نے جب خطوط غالب چھاپنے کا ارادہ کیا اور غالب کے غیر مطبوعہ خطوط کی خواستگاری روز ناموں میں چھپوائی تو نواب فرخ حیدر نے مکتوب مذکور انھیں بھیج دیا۔ منشی صاحب نے اپنی کتاب میں یہ خط چھاپا اور قیاس سے اس کا سال تحریر ۱۸۵۶ء لکھا۔ لیکن راقم کو نواب دولھا صاحب کے روز نامچے کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ اس کی تاریخ تحریر پنجشنبہ ۱۵/ صفر ۱۲۸۱ھ/ ۲۱/ جولائی ۱۸۶۴ء ہے اور غالب نے یہ خط نواب مرحوم کے سوالوں کے جواب میں لکھا ہے۔ نواب صاحب کے سوال اُن کے سفر ہفتم کے ذیل میں درج کیے جا چکے ہیں۔ یہاں ان کی عبارت کو دوبارہ نقل کرنا مناسب ہے:

"پنجشنبہ ۱۵/ صفر ۱۲۸۱ ہجری مطابق ۲۱/ جولائی ۱۸۶۴ عیسوی ... یوسف علی شاعر شاگرد مرزا نوشاہ چند بند مرثیۂ ہفت صد بند گفتہ خود خواندند و از ایشاں برائے تحقیقات از مرزا نوشاہ نویسانیدہ شد: تذکیر و تانیث حروف تہجی و سبب عدم تبدیل نام تکیہ ذکی تکیہ

و اینکہ چرا خبر لفظ معنی جمع می آید و اصل خزادہ و نق چیست ....“

” جمعہ ۱۶/ صفر ۱۲۸۱ ہجری (۲۲/ جولائی ۱۸۶۴ء) بفضلہ بیرون آمدہ تواضع مرزا یوسف علی کہ رقعہ جواب مطالب دیروز نوشتہ اسد اللہ خاں غالب عرف مرزا نوشاہ رسانیدند.....“

اس کے بعد خطوط غالب، ص ص ۱۷۲ - ۱۷۳، سے غالب کا وہ خط میرزا یوسف علی خاں عزیز کے نام نقل کیا جاتا ہے۔ نواب مرحوم اور غالب کی تحریروں کے مقابلے سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہوتی ہے کہ غالب کے جوابات نواب مرحوم کے سوالات ہی سے مربوط ہیں:

” سعادت و اقبال نشان مرزا یوسف علی خاں کو بعد دُعا کے دل نشیں ہو کہ تذکیر و تانیث ہرگز متفق علیہ جمہور نہیں۔ اے لو! 'لفظ' اس ملک کے لوگوں کے نزدیک مذکر ہے۔ اہلِ پورب اس کو مونث بولتے ہیں۔ خیر، جو میری زبان پر ہے وہ میں لکھ دیتا ہوں۔ اس باب میں کسی کا کلام حجت اور برہان نہیں ہے۔ ایک گروہ نے کچھ مان لیا۔ ایک جماعت نے کچھ جان لیا۔ اس کا قاعدہ منضبط نہیں۔ الف مذکر، ب ت ث مونث۔ جیم مذکر، ح خ مونث، دال ذال مونث، رے زے مونث، سین شین مذکر، ص ض ط ظ مونث۔ عین غین مذکر، ف مونث، قاف کاف لام میم نون مذکر، واو ہے یے مونث، ہمزہ مذکر، لام الف حروفِ مفردہ میں نہیں، مگر بولنے میں مذکر بولا جائے گا۔ مثلاً 'لام الف کیا خوب لکھا ہے!' کہیں گے 'کیا خوب لکھی ہے!' نہ کہیں گے۔

” 'خزادہ'، 'خداوندزادہ' کا مخفف ہے؛ لیکن فارسی عربی نہیں، اردو کا روزمرہ تھا۔ 'خزادہ' اور 'خزادی'، مرادف 'صاحبزادہ' اور 'صاحبزادی' ہے۔ مگر فی زمانہ متروک ہے۔

” 'نق' فارسی لغت نہیں ہو سکتا۔ عربی بھی نہیں۔ روزمرہ اردو

ہے ؛ جیسا میر حسن لکھتا ہے : کہ رستم جسے دیکھ رہ جائے نق. شعرای حال کے کلام میں نظر نہیں آتا ہے۔

"تکیہ لفظ عربی الاصل ہے، فارسی و اردو میں مستعمل، دونوں زبانوں میں ہم بہ معنی 'بالش' اور ہم بہ معنی 'مکان فقیر' آتا ہے ؛ ایران میں 'تکیۂ مرزا صائب' مشہور ہے۔ 'گل تکیہ' لفظ مرکب ہے ہندی اور فارسی سے 'گل'، مخفف 'گال'، کا اور 'تکیہ' بہ معنی 'بالش'۔ وہ چھوٹا گول تکیہ جو رخسار کے تلے رکھیں 'گل تکیہ' کہلاتا ہے۔ 'گل' بہ معنی پھانسی انگریزی لغت ہے۔ انگریزی زبان نے بنگالے میں سو برس سے اور دلّی، اکبر آباد میں ساٹھ برس سے رواج پایا ہے۔ 'گل تکیہ' وضع کیا ہوا نور جہاں بیگم کا ہے۔ جہانگیر کے عہد میں اہل ہند کیا جانتے تھے کہ 'گل' کیا چیز ہے ؟

" 'معنی مفرد بہ لفظ جمع' ؛ اس جملے کو میں اچھی طرح نہیں سمجھا۔ معنی مفرد 'معانی' جمع۔ اور یہ جو اردو کے محاورے میں تقریر کرتے ہیں کہ 'اس شعر کے معنی کیا ہیں' یا 'اس شعر کے معنی خوب ہیں'، اس میں دخل نہیں کیا جاتا۔ خاص و عام کی زبان پر یوں ہی ہے۔ 'معانی' کی جگہ معنی بولتے ہیں۔

" 'رت' لفظ ہندی الاصل 'رتھ' ہے بہ ہائے مضمرہ۔ بعض مذکر بولتے ہیں، بعض مونث۔ شعر بہت اچھا ہے، صاف و ہموار۔ راقم غالب"

(غالب کے اِس فقرے " 'گل' بہ معنی پھانسی انگریزی لغت ہے" کے متعلق خطوطِ غالب کے محشی ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے یہ حاشیہ لکھا ہے : "شاید GALLOWS مراد ہے۔ ع۔ص۔")

غالب کے مکتوب فوق میں نواب دولھا صاحب کے ہر سوال کا جواب موجود ہے۔ اس سے بدیہی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ خط انھیں کے سوالوں کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ نواب مرحوم کے سفرِ ہفتم دہلی کی یادداشت کے ضمن میں غالب کے اس خط کی تاریخ تحریر

بطور دقیق ۱۵ صفر ۱۲۸۱ھ/ ۲۱ جولائی ۱۸۶۴ء مقرر ہو چکی ہے۔

غالب نے اپنے خط کے آخر میں 'رتھ' کی تذکیر و تانیث کے متعلق اپنی رائے اور ایک شعر کی تعریف لکھی ہے۔ ان باتوں کا ذکر نواب صاحب کے روزنامچے میں نہیں ہے۔ شاید یوسف علی خاں عزیز نے اپنے نامۂ استفسار میں ان کا اضافہ اپنی طرف سے کیا ہو۔ قیاس غالب ہے کہ وہ شعر بھی عزیز کا ہوگا اس لیے کہ وہ غالب کے شاگرد تھے۔ غالب کی ردیف ("صاف و ہموار") میں صاد استاد کا انداز بھی ہے۔ 'رتھ' کی تذکیر و تانیث کا سوال عزیز کی طرف سے بھی ہو سکتا ہے اور نواب صاحب کی طرف سے بھی۔ ممکن ہے نواب مرحوم روزنامچے میں اس کی یاد داشت لکھنی بھول گئے ہوں۔ بہر حال ان سب قراین سے کچھ ایسا گمان ہوتا ہے کہ عزیز نے نواب مرحوم کے حضور میں اُن کے سوالوں کی یاد داشت لکھ لی، پھر گھر جا کر غالب کے نام خط لکھا اور اس میں نواب صاحب کے سوال بھی تحریر کیے اور بعض امور اپنی طرف سے بھی بڑھائے۔

نواب صاحب کے روزنامچے اور غالب کے خط سے یہ بات بخوبی ثابت ہوتی ہے کہ یہ خط نواب صاحب کے سوالوں کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ اِس ثبوت کو ایک اور امر سے مزید قوت پہنچتی ہے۔ نواب صاحب کے ایک پرانے روزنامچے کے خلاصے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اِس سے قبل انھیں پانچ سوالوں میں تین سوال لکھنؤ میں میرزا دبیر سے بھی کیے تھے۔ اِس سے قیاس ہوتا ہے کہ یہ مسائل ان کے دل میں کھٹک رہے تھے اور اُنھیں اِن کے متعلق کسی بڑے زباندان سے تحقیق کرنی منظور تھی۔ انھوں نے لکھنؤ کا یہ سفر ۱۲۷۸ھ/ ۱۸۶۱ء میں کیا تھا۔ اس سال کے روزنامچے کا خلاصہ جلد دہم سوانح کے آخر میں بھی موجود ہے، اور بیاض 'مجموعۂ حسابات وغیرہ' میں بھی۔

جلد دہم سوانح، ورق ۵۱۴ ب:

"چہارشنبہ ۲ [جمادی الاولی ۱۲۷۸ھ/ ۶ نومبر ۱۸۶۱ء] رفتن برائے ملاقات سید نقی صاحب دہم مرزا دبیر صاحب کہ رو بروے ایشان و حکیم میر میر علی دبیر کلو غرتی بن میر تقی شاعر و میر صفدر علی اعتراض کرا ہت

لفظ تکیہ و استفسار نق و خوزادہ و مصرعوں گفتہ شد۔"
مجموعہ، ورق ۸ ۷ ۵ ب :

"۲۳ [جمادی الاولیٰ ۱۲۷۸ھ/۲۶ نومبر ۱۸۶۱ء] رفتن بمکان سید نقی صاحب و ہم مرزا دبیر صاحب کہ حکیم میر امیر علی و میر کلو عرش ہم بودند و ذکر کراہت لفظ تکیہ و تحقیق نق و خوزادہ۔"

گویا ۱۲۷۸ھ میں نواب صاحب نے لکھنؤ میں لفظ 'تکیہ و نق و خوزادہ' کی نسبت جو استفسار دبیر وغیرہ سے کیے تھے وہی ۱۲۸۱ھ میں دہلی جاکر غالب سے کیے۔ لکھنؤ اور دہلی کے سوالوں میں بس دو فرق ہیں۔ اول یہ کہ لکھنؤ میں دبیر سے 'مصرعوں' کے متعلق بھی استفسار کیا (شاید راجع بہ تلفظ کلمۂ مذکور) اور دہلی میں غالب سے نہ کیا۔ دوسرے یہ کہ دہلی میں حروفِ تہجی کی تذکیر و تانیث اور 'معنی' کے جمع و واحد کی نسبت غالب سے پوچھا، لکھنؤ میں دبیر وغیرہ سے نہ پوچھا۔ بہر حال ان تحریروں سے صاف ظاہر ہے کہ غالب نے جن استفسارات کا جواب لکھا وہ وہی تھے جو مدت سے نواب مرحوم کے دل میں خلش پیدا کر رہے تھے اور غالباً غالب نے انھیں کے سوالوں کا جواب لکھا ہے۔

نواب مرحوم نے دبیر و غالب سے جو استفسار فرمائے ہیں اُن میں ایک سوال 'تکیہ' اور 'گل تکیہ' کی نسبت بھی ہے۔ انھوں نے اِن لفظوں کی کراہت کے متعلق اپنا خدشہ مرغوب دل میں بھی تحریر فرمایا ہے۔ نواب صاحب رسالۂ مذکور (ورق ۵۲۲ ب)، میں لکھتے ہیں :

"اور ہمارے لکھنؤ کے بادشاہوں نے بھی کچھ اصطلاحیں مقرر کی تھیں۔ چنانچہ بادشاہ نصیر الدین حیدر مغفور حقہ کو 'حسن محفل' فرماتے تھے اور بادشاہ واجد علی شاہ 'چلم' کو 'غنچہ' اور 'مہنال' کو 'لب معشوق' ارشاد کرتے تھے مگر راقم آثم کو نہایت تعجب ہے کہ 'تکیہ' کے نام سے کہ معنی قبرستان بھی ہے۔ باوصف ہر وقت پاس رہنے کے اور 'گل تکیہ' بولنے سے کہ دو معنی سے برا ہے۔ کسی کو بھی وسواس نہ آیا اور کسی نے ان کا کوئی نام اچھا اصطلاحی ۔ نہ رکھا۔

راحت یا چَین وغیرہ کے مقرر نہ کیا اور اس میرے اعتراض کا جواب آج تک کسی شاہجہان آبادی اور لکھنوی نے نہیں دیا۔"

اس عبارت میں "آج تک" کے لفظ قابلِ غور ہیں۔ مرغوبِ دل ۵۹۵ ورق یعنی ۱۱۹۰ صفحوں کی کتاب ہے۔ اس کی تالیف کا آغاز داخلی شہادت کی بنا پر ۱۲۷۸ھ میں ہوا، ۱۲۸۲ھ تک زیرِ تالیف تھی، صفحۂ آخر کی یادداشت کے مطابق اس کی تصحیح ۲۳ صفر ۱۲۸۳ھ / ۷ جولائی ۱۸۶۶ء کو ختم ہوئی۔ منقولۂ بالا عبارت، آخر کتاب کے قریب تحریر ہوئی ہے (ورق ۵۲۳ ب = صفحہ ۱۰۴۶)۔ قیاس غالب ہے کہ یہ عبارت ۱۲۸۲ اور ۱۲۸۳ھ کے درمیان لکھی گئی ہوگی، اور اس کے "اب تک" سے یہی ۱۲۸۲ اور ۱۲۸۳ کے درمیان کا زمانہ مراد ہوگا۔ لیکن یہ زمانہ دبیر (۱۲۷۸ھ) اور غالب (۱۲۸۱ھ) سے سوال کرنے کے بعد کا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا چنداں بعید از قیاس نہیں کہ ظاہراً نواب مرحوم نہ ۱۲۷۸ھ میں دبیر کے جواب سے مطمئن ہوئے نہ ۱۲۸۱ھ میں غالب کے جواب سے، اور ان لفظوں کی کراہت کی نسبت اُن کا وسوسہ باقی رہا[1]۔

یادداشتِ حاضر کے آخر میں راقمِ سطور، نواب مرحوم کے سوالات اور غالب کے جوابات کی نسبت کچھ شخصی اظہارِ نظر کرتا ہے۔

نواب صاحب نے غالب سے ذیل کے سوال کیے تھے:

۱- حروفِ تہجی کی تذکیر و تانیث۔

---

[1] ضمناً یہ بھی کہوں کہ نواب صاحب کو مکروہاتِ لفظی سے بحد وسواس اجتناب تھا، انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ میں کراہتِ لفظی کے خیال سے مالی نہیں کہتا، باغبان کہتا ہوں۔ دوسری جگہ لکھا ہے کہ میں کراہتِ لفظی کے سبب سے گاڑی اور گاڑی بان نہیں کہتا، بہل اور بہلبان کہتا ہوں۔ نواب صاحب اگرچہ دہلوی مولد تھے لیکن اُن کا رشد لکھنؤ میں ہوا تھا۔ یہ وسوسے دہلوی نہیں لکھنوی ہیں۔ اور خوبیٔ قسمت سے یہ لکھنوی وساوس اب تک اُن کی اولاد، خصوصاً اولادِ اناث کے دامن سے وابستہ ہیں۔

۲ — سبب عدم تبدیل نام تکیہ وگل تکیہ۔
۳ — "اینکہ چرا خبر لفظ معنی جمع می آید"
۴ — اصل لفظ خوزادہ
۵ — اصل لفظ نق

حروف تہجی کی تذکیر و تانیث والے جواب سے غالب کی حق پسندی ظاہر ہے۔ انھوں نے حروف مذکور کی تذکیر و تانیث بیان تو کی لیکن یہ بھی صاف لکھ دیا کہ "تذکیر و تانیث ہرگز متفق علیہ جمہور نہیں۔۔۔۔ جو میری زبان پر ہے وہ میں لکھ دیتا ہوں۔ اس باب میں کسی کا کلام حجت اور برہان نہیں ہے۔۔۔" ظاہرا یہاں غالب نے 'کسی کے کلام' میں اپنا کلام بھی شامل کرلیا ہے اور اپنے قول کو بھی حجت تصور نہیں کیا ہے۔ ایسا استاد، جس کی استادی اس کے معاصرین کو بھی تسلیم ہو، ایسی منصفانہ بات کہے، انانیت اور خود پسندی کے شایبے سے پاک! اگر ہمارے اہل لغت اور عموم اہل تحقیق اسی انکسار کو اپنا شعار بنائیں اور اپنے ارشادات کو قول فیصل تصور نہ فرمائیں تو اُن کی کوشش و پژوہش زیادہ قابل توجہ اور موجب ستایش ہوگی۔

لفظ 'خوزادہ' کی نسبت غالب نے لکھا کہ اِس کی اصل 'خداوندزادہ' ہے۔ اس میں بھی کوئی تردید نہیں ہوسکتی۔

لفظ 'نق' کی نسبت وہ لکھتے ہیں کہ "فارسی نہیں ہوسکتا"۔ بیشک قاف کے ہوتے فارسی نہیں ہوسکتا۔ "عربی بھی نہیں"۔ اسے عرب کے اہل لغت جانیں۔ البتہ راقم کو غالب کے اس قول سے اختلاف ہے کہ "شعرائے حال کے کلام میں نظر نہیں آتا"۔ انھوں نے میرحسن کا مصرع نقل کیا ہے۔ لاریب اُس وقت میرحسن شعرائے حال میں نہ تھے۔ لیکن میرحسن کے پوتے انیس اور غالب کے دوست ناسخ ۱۲۸۱ھ کے شعرائے حال میں ضرور تھے۔ دونوں کے کلام سے اس لفظ کے شواہد لکھے جاتے ہیں:

انیس : چہرے تو نق ہیں اور کھلے ہیں سروں کے بال (مرثیہ : جب قطع کی مسافت شب الخ)

انیس : صبح کا ذکر ہے کیا چاند کا چہرہ فق تھا (مرثیہ: نمک خوان تکلم ۱/۲)

ناسخ : کس گل کا منہ چمن میں ترے آگے فق نہیں
یہ رنگ گُل اڑا ہے اُفق پر شفق نہیں

عصر غالب کا ذکر کیا ہے، فق کا لفظ تو اب تک فصحا کے روزمرہ میں شامل ہے۔

لفظ تکیہ' و 'گل تکیہ' کی نسبت نواب صاحب کے سوال کا جو مطلب تھا وہ اُن کی مرغوب دل والی عبارت سابق سے واضح ہوتا ہے۔ ان کی مراد یہ تھی کہ تکیہ بمعنائے قبرستان بھی ہے، اور گل، پھانسی کو کہتے ہیں، لہٰذا دونوں کو استعمال کرنا برا ہے۔'تکیے' میں اکہری بدشگونی ہے، اور گل تکیے' میں دُہری۔

اوپر لکھا جا چکا ہے کہ اگرچہ نواب صاحب دہلوی مولد تھے اور ہمیشہ اپنے کو شاہجہان آبادی لکھتے تھے لیکن ان کی عمر کا وہ حصہ جس میں مزاج کی تشکیل ہوتی ہے لکھنؤ میں گزرا تھا لہٰذا ان کی اکثر خصلتیں لکھنؤ والوں کی تھیں۔ اس طرح کے وسوسے اور اوہام عموماً اہلِ دہلی میں نہ ہوتے تھے، اہلِ لکھنؤ میں ہوتے تھے۔ نواب صاحب اور غالب کے سوال وجواب میں اسی فرق کی جھلک نظر آتی ہے۔ نواب صاحب ان لفظوں کی بدشگونی کی نسبت اپنا وسوسہ بیان کرتے ہیں۔ غالب اس وسوسے کی طرف التفات نہیں کرتے بلکہ الفاظ کے معنی اور وضع کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ان کے جواب کے آخر میں ہلکی سی جھڑکی کا انداز بھی نظر آتا ہے۔ ("جہانگیر کے عہد میں اہلِ ہند کیا جانتے تھے کہ 'گل' کیا چیز ہے؟") ان کی طرف سے نواب صاحب کے وسوسوں کا جواب اگر کچھ ہے تو بس یہی جھڑکی ہے۔

بارے غالب نے نواب صاحب کے سوال کا جواب لکھا ہے:

"'تکیہ' لفظ عربی الاصل ہے، فارسی واردو میں مستعمل، دونوں زبانوں میں ہم بمعنیِ 'بالش' اور ہم بہ معنی 'مکان فقیر' آتا ہے: ایران میں 'تکیہ مرزا صاحب' مشہور ہے 'گل تکیہ' لفظ مرکب ہے ہندی اور فارسی سے 'گل' مخفف 'گال' کا اور 'تکیہ' بہ معنی 'بالش' وہ چھوٹا گول تکیہ جو رخسار کے تلے رکھیں، 'گل تکیہ' کہلاتا ہے۔ 'گل' بہ معنی پھانسی انگریزی لغت ہے۔ انگریزی زبان نے

بنگالے میں سو برس سے اور دہلی، اکبر آباد میں ساٹھ برس سے رواج پایا ہے۔ 'گل تکیہ' وضع کیا ہوا نور جہاں بیگم کا ہے۔ جہانگیر کے عہد میں اہل ہند کیا جانتے تھے کہ 'گل' کیا چیز ہے۔"

غالب کے استدلال کو بخوبی سمجھنا چاہیے۔ نواب صاحب کے نزدیک تکیے کے معنی (قرار گاہِ درویشاں کے علاوہ) قبرستان بھی تھے، اور 'گل' پھانسی کے معنی میں تھا، اور یہ دونوں چیزیں منحوس و مکروہ تھیں۔ غالب نے جواب دیا کہ عربی اور فارسی میں 'تکیہ' بمعنائے مقرِ درویشاں ہے گویا انھوں نے تکیے کو بمعنائے قبرستان تسلیم نہیں کیا۔ انھوں نے 'تکیہ' میرزا صائب کا شاہد بھی لکھا۔ راقم عربی کی نسبت کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن ایران میں یہ لفظ اب بھی اسی مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ تکیہ بھی اور اُس کی جمع 'تکایا' بھی۔ اس طرح غالب نے ضمناً یہ بات بھی لکھ دی کہ تکیے کے معنی ("مکان فقیر") میں کسی نحوست یا کراہت کا شایبہ نہیں ہے۔

اب رہا گل کا لفظ۔ غالب اس کے معنی کو تسلیم کرتے ہیں لیکن وہ کہتے ہیں کہ جس زمانے میں "گل تکیہ" وضع ہوا تھا (بقول اُن کے عصر جہانگیر میں) اس وقت 'گل' کے لفظ کے ساتھ اس مفہوم کی وابستگی نہ تھی۔ اس لفظ کے یہ معنی انگریزی عصر میں پیدا ہوئے۔ پس 'گل تکیے' کی اصطلاح کے واضع کو اس کی نحوست کا خیال کیوں آتا اور وہ اس ترکیب سے کیوں وسوسہ کرتا۔

صاحب نوراللغات نے 'گل' کے لفظ کو سنسکرت قرار دیا ہے، اس کے معنی پھانسی لکھتے ہیں، اور سند میں رشک کا یہ شعر نقل کیا ہے:

گلے لگیے بت فرنگی کے　　　واجب القتل ہیں تو گل دیگا

صاحب فرہنگ آصفیہ نے 'گل' کے معنی میں یہ تقریر کی ہے:

"گل ... پھانسی۔ وہ سزاے موت جو گلے میں ریشم کی رسّی کا پھندا ڈال کر دی جاتی ہے۔ مجازاً سولی۔ دار۔ صلیب۔ (بعض لوگ اس معنی میں انگریزی GALLOWS گیلوز بمعنی تختۂ دار سے، اور بعض سنسکرت گل بہ معنی سر و گلو سے خیال کرتے ہیں، اگر بالفرض انگریزی تسلیم کیا جاتے تو بھی

ہندوستانیوں نے اس لفظ کو گلے سے خیال کرکے استعمال کیا ہے جو نہایت قریب الفہم ہے"

گویا ہمارے دو اہلِ لغت اس لفظ کی اصل سنسکرت قرار دیتے ہیں، اور ہمارے دو شاعر، غالب اور رشک اس کا رشتہ انگریزی اور انگریزوں سے جوڑتے ہیں۔ غالب نے صاف لکھا ہے کہ "گل، بمعنی پھانسی انگریزی لغت ہے" اور میر علی اوسط رشک نے بھی بُت فرنگی کہہ کر اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ 'گل' کا تعلق انگریزوں سے ہے۔ تعجب ہے کہ صاحب نور اللغات، رشک کے شعر میں اس اشارے کو نہ سمجھے۔ فرہنگ نویس کو شواہد شعری سے استناد کرنا پڑتا ہے۔ اسے سخن شناس ضرور ہونا چاہیے تاکہ وہ جان لے کہ کونسا شعر اس کے مفید مطلب ہے، کونسا نہیں۔ ظاہرا ہندوستان میں پھانسی تو انگریزوں سے پہلے بھی دی جاتی ہوگی۔ پس اگر گل دینا سنسکرت کے گل سے نکلا ہوتا تو اُس وقت بھی پھانسی دینے کو گل دینا کہتے۔ لیکن رشک کے شعر سے صاف ظاہر ہے کہ یہ اصطلاح انگریزوں کی ابداع ہے۔ پس قیاس چاہتا ہے کہ اس کا ریشہ بھی انگریزی ہو۔ ہمیں وہ ریشہ gallows میں نظر آتا ہے۔ پس راقم کے نزدیک گل کی اصل gallows کو سمجھنا چاہیے۔ البتہ صاحب فرہنگ آصفیہ کے اس قول میں کچھ صداقت ہوسکتی ہے کہ "ہندوستانیوں نے اس لفظ کو گلے سے خیال کرکے استعمال کیا ہے۔"

ایک صورت یہ بھی ممکن تھی کہ خود gallows کی اصل سنسکرت ہو۔ راقم نے اس امر کی تحقیق کے لیے امریکہ کی مشہور اور معتبر فرہنگ Webster's International Dictionary سے رجوع کی۔ اُس نے gallows کے ریشے میں دس زبانوں کا ذکر کیا ہے۔ اُن میں سنسکرت کا نام نہیں ہے۔ اُس کی عین عبارت یہ ہے (ویبسٹر میں زبانوں کے نام بطور مخفف درج ہیں، میں نے تسہیل فہم کے لیے انھیں بشکل مفصل لکھ دیا ہے):

"Middle Endlish gallowes, Pl., fr. Anglo-Saxon galga, gealga, gallows, cross, akin to Dutch galg gellows, old Saxon & Old High German galgo, German galgen, old Norse galgi, Gothic galga, a cross, Lithuanian zalga, rod, pole, Armenian jalk."

اگرچہ یہ منفی شہادت ہے لیکن خاصی مبہم ہے۔ محققینِ مغرب کا قدم درمیان ہے۔ راقم کے نزدیک اُن کی 'نہیں' ہماری 'ہاں' سے زیادہ وزن رکھتی ہے۔

میری فرمایش سے اے. وی. انٹر کالج شمس آباد کے سنسکرت کے لائق ادھیاپک پنڈت گوسوامی شاستری نے بقول خود ایک اچھی فرہنگ سنسکرت سے رجوع کی۔ انھیں اُس میں 'گل' کا لفظ گلے کے معنی میں ملا، پھانسی یا رسّی کے معنی میں نہ ملا۔

اب نواب مرحوم کے اس استفسار کو دیکھنا چاہیے: "اینکہ چرا خبرِ لفظِ 'معنی' جمع می آید" راقم اپنا ایک قیاس اس سے پہلے بھی لکھ چکا ہے اور یہاں پھر لکھتا ہے۔ مجھے کچھ ایسا گمان ہوتا ہے کہ میرزا یوسف علی عزیز نے نواب مرحوم کے سوالوں کی یادداشتیں اُن کے محضر میں لکھیں، لیکن غالب کو خط اپنے گھر جاکر لکھا اور اُس میں وہ یادداشتیں نقل کیں اور کچھ مطالب اپنی طرف سے بڑھائے۔ اس اُلٹ پلٹ میں انھوں نے نواب مرحوم کے اس سوال کے لفظ بدل دیے۔ نواب صاحب نے پوچھا تھا: "چرا خبرِ لفظِ معنی، جمع می آید"۔ عزیز نے لکھا: "معنی مفرد بہ لفظ جمع"۔ (ر.ک: نقل جواب غالب در سطور فوق۔) واقعی یہ فقرۂ اخیر مبہم اور افادۂ معنی میں نارسا ہے، اور اس کی نسبت غالب کا یہ لکھنا بجا ہے کہ "اِس جملے کو میں اچھی طرح نہیں سمجھا۔"

لیکن خود نواب صاحب کے سوال میں کوئی ابہام نہیں ہے۔ اُن کا سوال ہے: "چرا خبرِ لفظِ معنی، جمع می آید"۔ یہاں انھوں نے بطور توسّع لفظ خبر کو بمعنائے مُسنَد استعمال فرمایا ہے جس میں خبر بھی شامل ہوتی ہے اور رابطہ بھی۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ اردو میں اگرچہ کلمۂ 'معنی' واحد ہو لیکن اُس کے لیے روابط و افعال بصیغۂ جمع استعمال ہوتے ہیں۔ نواب صاحب نے اسی اختلاف کی نسبت استفسار فرمایا ہے۔

ظاہرا میرزا یوسف علی خاں کی عبارت کی پیچیدگی سے غالب اس نکتے کو نہ سمجھے ۔ انھیں گمان ہوا کہ سوال یہ ہے کہ 'معنی' کبھی بطور واحد اور کبھی بطور جمع استعمال ہوتا ہے' اس کا سبب کیا ہے ۔ انھوں نے جواب دیا کہ محاورۂ عموم میں یونہی ہے لہٰذا اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا : " خاص و عام کی زبان پر یوں ہی ہے ۔ 'معانی' کی جگہ 'معنی' بولتے ہیں "۔

فی الواقع ایک ہی لفظ کا جمع و واحد دونوں صیغوں میں استعمال ہونا اردو میں اتنا عام ہے کہ نواب مرحوم اس کی نسبت ہرگز کوئی استفسار نہ فرماتے ۔ گُل' پھول' دانت' کان' بات' اور اسی قبیل کے کثیر کلمے ہیں کہ گردان کی بعض صورتوں میں اُن کا واحد و جمع یکساں آتا ہے ۔ مثلاً : ایک پھول کھلا ۔ دَو پھول کھلے' ایک دانت گرا' دَو دانت گرے' وغیرہ ۔ البتہ ان جملوں کی 'خبر' کلمات مذکور کے صیغے کے مطابق ہوتی ہے ۔ یعنی وہ کلمے واحد ہوں تو اُن کی 'خبر' بھی واحد ہوتی ہے (ایک پھول کھِلا) ' اور وہ کلمے جمع ہوں تو اُن کی 'خبر' بھی جمع ہوتی ہے (دَو پھول کھِلے) ۔ (میں نے اس عبارت میں لفظ 'خبر' سے وہی معنی مراد لیے ہیں جو نواب مرحوم نے مراد لیے تھے ' یعنی مسند ' بشمول خبر و رابطہ)

اس کے برخلاف کلمۂ 'معنی' خواہ واحد ہو خواہ جمع ' اُس کی خبر بہرحال بصیغۂ جمع آتی ہے ۔ غالب نے مثال میں جو فقرہ لکھا (" اس شعر کے کیا معنی ہیں ") وہاں تو 'خبر' بصیغۂ جمع کی یہ تاویل ہوسکتی ہے کہ یہاں لفظِ 'معنی' قایم مقام 'معانی' ہے لیکن بعض موارد میں کلمۂ 'معنی' صریحاً بصیغہ واحد ہوتا ہے ' اس کے باوجود اُس کی خبر بصیغۂ جمع آتی ہے ۔ مثلاً یہ فقرہ : لفظِ دار کے ایک معنی گھر ہیں ' دوسرے معنی سولی ہیں ۔ ان دونوں کی خبر بصیغۂ جمع (" ہیں ") کی یہ تاویل ہرگز نہیں ہوسکتی کہ یہاں 'معنی' قایم مقام 'معانی' ہے ۔ بلکہ یہاں دونوں جگہ صریحاً ' واضحاً ' بہ نصِ لفظی (" ایک معنی " اور اس کا قرینہ " دوسرے معنی ") کلمۂ " معنی " بصیغۂ واحد آیا ہے اور اُس کی خبر (" ہیں ") بصیغۂ جمع ۔ نواب صاحب کا سوال اسی عجیب ترکیب کی نسبت ہے ۔ عجالۃً راقم کو اردو

میں لفظِ "معنی" کے علاوہ کوئی اور لفظ ایسا نظر نہیں آتا جو خود بصیغۂ واحد استعمال ہو لیکن اس کی خبر بصیغۂ جمع بولی جائے۔

بہر حال نواب مرحوم کے اس سوال کا جواب وہی ہے جو غالب نے لکھا (البتہ معنای سوال کے ادراک میں کچھ مسامحے کے ساتھ):

"اس میں دخل نہیں کیا جاتا۔ خاص و عام کی زبان پر یوں ہی ہے۔"

سیّد ضمیر حسن دہلوی

عہدِ غالبؔ میں لال قلعے کی معاشرتی زندگی

انیسویں صدی کے شروع کا زمانہ ہے۔ شاہ عالم از دہلی تا پالم لال حویلی میں براجمان ہیں۔ اپنی جنرسی اور دکنیوں کی خدمات شائستہ سے خزانے کی حالت انھوں نے خاصی سدھار لی ہے۔ تختِ طاؤس بھی بنوا لیا ہے۔ قلعے میں جہاں پناہ کا دور دورہ ہے۔ باہر نائب پیشوا کی باندھی بندھتی اور کھولی جاتی ہے خلق خدا کی ملک بادشاہ کا اور حکم باٹیوں کا ہے۔ دلّی بھری پُری اور شاد آباد دکھائی دیتی ہے۔ بخت اُڑ گئے بلندی رہ گئی ہے۔ ہاتھی لٹا لٹایا پھر بھی سوا لاکھ کا۔ اگلی شان شوکت کے آثار ابھی باقی ہیں رتھ، بہلیاں، تانگے، منجھولیاں، ہوادار، تام جھام، پالکیاں، تختِ رواں ہکھپال، چنڈول، نالکیاں، ہاتھی گھوڑے، امیر امرا بناؤ سنگھار کیے، مرقع بنے خدم حشم کے ساتھ، نقیبوں کی آواز، کڑکیوں کے کڑکے، چوبدار، ملازم، عصا بردار، مرزا سب جوں کے توں سلامت ہیں۔ رات کو سواری نکلتی ہے تو مشالچی مشالیں لیے ایک ہاتھ میں مشال دوسرے میں برنجی کپی تیل ٹپکاتے چلے جاتے ہیں۔ مشالوں کا دھواں اٹھتا ہے تو اپنی خوشبو سے فضا کو معطر کر دیتا ہے۔ کہاروں کی ہنکار، چوبداروں کی ہٹو بچو کی صداؤں سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔

حکومت کی بے مقدوری اور معاشی تنگ دامانی کے باوجود قلعے کی شاہی زندگی میں ایک بجھنے کے وقت بھڑکتے ہوئے چراغ کی سی رونق اور شفقِ شام کی سی رنگا رنگی موجود

ہے مولوی ذکاءاللہ نے لکھا ہے: "قاعدہ ہے کہ جب چراغ بجھنے کو ہوتا ہے تو بھڑکتا ہے اسی طرح سلطنتِ تیموریہ کا چراغ گل ہونے کو ہوا اور آخری وقت آیا تو اس نے اپنی روشنی چمکائی اور ایسا اجالا کیا کہ اس کی نظیر مشکل سے تاریخ میں ملے گی!" [۱]

"تیموری جاہ و جلال اور شاہجہانی شان و شکوہ رخصت ہو چکا تھا مگر شاہی ادب قرینے کی جھلک قلعۂ معلّیٰ کی بادشاہت میں اب بھی نظر آتی تھی۔ سلطنت کا دائرہ سمٹتے سمٹتے قلعے کی سنگین دیواروں تک محدود ہو کر رہ گیا تھا مگر اس محدود دائرے میں بھی سب کچھ نہیں تو بہت کچھ تھا اور اس انداز سے تھا کہ دیگ کا ایک ہی چاول اور پھول کی ایک ہی پنکھڑی ساری داستان سنا دے" [۲]

آخر زمانے کے تینوں مغل بادشاہوں کے سیاسی حالات میں تو جا بجا فرق دکھائی دیتا ہے۔ کبھی اندرونِ ملک شورشیں سر اٹھاتی ہیں اور کبھی بیرونی طاقتیں سیاست، تدبیر اور سازشوں کے ذریعے اقتدار کی کلائی مروڑتی دکھائی دیتی ہیں لیکن جہاں تک قلعے کی معاشرت کا تعلق ہے وہاں ابداد کی روایات اور مغلوں کے آبائی رسم و رواج کو تادمِ زیست نبھانے کی جان توڑ کوشش ہنوز جاری ہے۔ دربارِ شاہی میں امیر وزیر، منشی متصدی، محاسب، محافظ، خواص و خواجہ سرا، صنّاع و کاریگر، خدمت گزار، مصاحب، نمک پروردے سب اپنی اپنی جگہ پر تھے اور مجرے اور سلام، نذر و پیش کش، خطاب و خلعت، انعام و اکرام وغیرہ رسومِ دربار اب بھی ادا ہوتی تھیں۔ بادشاہ کی زندگی اس لُٹی اور مٹی ہوئی حالت میں بھی دلی والوں کو تاج دارانِ مغلیہ کی جھلک دکھاتی تھی۔ لوگ شاہی جشنوں اور جلوسوں کو شوق سے دیکھتے اور ذوق سے اس میں شریک ہوتے تھے چنانچہ جشنِ عید کے سلسلے میں صاحبِ سیر المتاخرین، نے لکھا ہے۔

"جو لطف نمازِ عیدین کا شاہجہاں آباد میں ہوتا ہے کسی شہر میں نہیں

۱۔ تاریخِ اسلامیانِ ہند۔ مولوی ذکاءاللہ ص ۳۶۰

۲۔ زوالِ ظفر۔ راشد الخیری ص ۱۴

ہوتا۔ بادشاہ تزک و احتشام سے سوار ہوتے ہیں اور تمام جلوس اور جملہ سلاطین و امرا ہمراہ ہوتے ہیں اور قلعے سے تا عید گاہ برابر میلا رہتا ہے۔ قریب لاکھ آدمی کے نماز عیدین میں شامل ہوتا ہے۔ توپیں اور زنبورکیں چھوٹتی ہیں۔ بالاخانوں پر ہزاروں آدمی واسطے زیارت سواری حضور انور کے بیٹھتے ہیں۔ عجب طرح کا جلوہ اور کیفیت ہوتی ہے[۱]۔"

آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے متعلق راشد الخیری کی رائے ہے کہ "ظفر تو وہ انسان تھا کہ انسانیت تیرے ساتھ ختم ہو گئی[۲]۔" پھر دہلی کی عام فضا کا، جو اصل میں قلعے والوں ہی کی زندگی کا پرتو تھی، بیان کرتے ہوئے علامہ نے لکھا ہے "موجودہ دلی کو بھول جاؤ ..... عالم خیال اس بستی میں پہنچا دے گا جہاں پر ... وضع داری کے نور سے مزین ہوگی[۳]۔" اسی مصنف نے چند مغل شہزادیوں کی آپ بیتی بیان کرتے ہوئے دہلی کی عام فضا کی تعریف بھی کی ہے اور لال قلعے کی زندگی کو سراہا ہے[۴]۔

ٹیوننگ نے جو اٹھارویں صدی کے آخر میں دہلی آیا تھا شاہ عالم کے دربار میں پذیرائی، خلعت دیے جانے، قلعہ کے محلات کی خوش نمائی، شاہی باغوں کے دلکش ماحول اور دعوتِ طعام کا ذکر کیا ہے۔ ایک اقتباس اُس زمانے کی معاشرتی اہمیت کے پیشِ نظر نقل کیا جاتا ہے:

"شام کو ابو محمد، داروغۂ شاہی مطبخ آتشِ خالص لے کر پہنچا۔ اس ضیافتی کھانے کو تقریباً بیس آدمی لے کر گئے تھے۔ ان میں سے بیشتر اپنے ہمراہ دو طشت لائے تھے۔ ان طشتوں کو بہنگیوں پر لٹکا کر کندھوں پر رکھ کر لایا گیا تھا، غالباً بڑی دیگیں تھیں۔ مہمان موصوف کے بڑے کمرے میں جو قالین بچھی ہوئی تھی، اس پر انھوں نے کھانے چن دیے۔ داروغہ ان کے قریب بیٹھ کر انھیں کھانوں کی

۱۔ سیر المتاخرین ص ۶۱۸ ۲۔ وداع ظفر راشد الخیری ص ۷ ۳۔ دلی کی آخری بہار، راشد الخیری ص ۷ ۴۔ بزم میں میلہ راشد الخیری ص ۴۔۱۱

اقسام کے بارے میں بتا رہے تھے اور یہ کہہ رہے تھے کہ فلاں کھانا زیادہ لذیذ اور عمدہ تھا۔ ایک دلچسپی کی بات یہ ہوئی کہ داروغۂ مطبخ کے ہمراہ رقاصائیں اور سازندے بھی آئے تھے۔ رقاصائیں بہت عمدہ زرق برق لباسوں میں ملبوس تھیں اور زیوروں سے آراستہ پیراستہ تھیں لقریباً دو گھنٹے تک رقص کی محفل منعقد رہی لہ"

قلعے میں جشنِ نوروز، جشنِ سالگرہ، عید بقرعید، محرم اور اہلِ ہنود کے تہوار ہولی، دیوالی، سلونو، وغیرہ بڑی دھوم دھام سے منائے جاتے تھے۔ یہ سلسلہ اس وقت ٹوٹا جب بادشاہت تاج چھوڑا۔ ان جشنوں اور جلوسوں پر تبصرہ کرتے ہوئے سی۔ ایف۔ اینڈریوز نے لکھا ہے "تہواروں کے رتھوں پر شاہی ہاتھیوں کے وہ جلوس جو چاندنی چوک میں سے ہو کر گزرتے تھے۔ دنیا بھر کے لوگ مختلف رنگ کے لباسوں سے آراستہ ہو کر انھیں دیکھا کرتے تھے۔ یہ جلوس محض سرکاری تقریبات نہ تھے جن کا تعلق مذہب سے ہو بلکہ وہ مسرت اور شادمانی، ہنسی ٹھٹھے اور دل لگی کے مواقع تھے جو مختلف دستکاریوں اور کھیلوں میں دن بھر محنت و مشقت کرنے والوں کی بے لطفی کو توڑا کرتے تھے۔ وہ زندگی میں نیا لطف پیدا کرتے تھے جو اپنے اندر بے انتہا معاشرتی اہمیت رکھتا تھا۔ وہ انسانی زندگی کو خوش گوار اور مسرت بخش بھی بناتے تھے۔"[۲]

مرزا کی شادی خانہ آبادی نواب الٰہی بخش معروف کی دخترِ نیک اختر سے ہوئی شادی کر کے مرزا آگرے چلے گئے اور پھر جب مستقل اقامت کے لیے دہلی آئے تو ان کی عمر بائیس برس کی تھی۔ دلّی میں رونق برقرار تھی لیکن آلِ بابر کی عظمت و سطوت کے نشانات روز بروز دھندلے ہوتے جاتے تھے۔ قلعہ اس وقت بھی ایک ادبی اور تہذیبی انجمن کی حیثیت رکھتا تھا۔ اکبر شاہ ثانی تخت نشین تھے۔ شہر میں انتظام انگریزوں کا تھا۔ قلعے میں دربار بادشاہ کا اور شہر میں دربارِ صاحب کلاں کی کوٹھی پر لگتا تھا۔ اس زمانے کی دلّی کا یہ عالم تھا کہ

لہ شاہجہاں آباد کی سیاحت۔ ٹوئننگ ترجمہ ڈاکٹر محمد عمر بحوالہ ذاکر حسین کالج میگزین شاہجہاں آباد۔

۲ے بحوالہ ذکاء اللہ ص ۳۷ (انگریزی سے ترجمہ)۔

سلطنت کو گھن لگ چکا تھا۔ اکبر شاہ ثانی چولہے آگ نہ گھڑے پانی، بچے بچے کی زبان پر تھا مگر وہ جو اگلی دولت کی فراوانی نے بزم آرائی کے خط و خال میں نفاست اور نزاکت بھر رکھی تھی وہ البتہ ضرور قائم تھی۔ اسی زمانے کے قلعے لیے کہا جاتا ہے کہ یہاں آٹھ دن نو میلے تھے۔ روز ایک نت نیا تہوار منایا جاتا تھا۔ مذہبی رسوم موسمی تہواروں اور شادی غمی کو تقریبات کا بہانہ بنا لیا گیا تھا۔ رمضان، عید، شب برات، آخری چہار شنبہ محرم، بارہ وفات، گیارھویں شریف، خواجہ صاحب کی چھڑیاں، رجب کے کونڈے، بسنت، دسہرہ، دیوالی، ہولی، پنکھوں کا میلا اور نوچندی جمعرات سب بڑی آن بان سے منائے جاتے تھے۔ وزیر حسن کے خیال میں "قلعے کی جان اس کی آن تھی...... برس کے بارہ مہینے چہل پہل رہتی تھی۔ جب دیکھو میلے ٹھیلے، سیر تماشے، ناچ رنگ ہو رہے ہیں[۱]" پھول والوں کی سیر جسے غالب نے دلی کے چار تہذیبی عناصر میں سے ایک قرار دیا ہے۔ اسی زمانے کی یادگار ہے۔

"مرزا جہانگیر بلا کے پینے والے اور غضب کے منہ پھٹ تھے۔ اس مخالفت سے دلوں میں بیر تو پڑ ہی گیا تھا۔ ایک دن بھرے دربار مرزا جہانگیر نے سٹین صاحب کو "لولو ہے بے" کہہ دیا۔ یہ صاحب کسی نہ کسی طرح پی گئے تھوڑے دن بعد یہ غضب کیا کہ ان پر گولی چلائی۔ آخر کہاں تک طرح دی جاتی۔ قید ہو کر الہ آباد گئے۔ ممتاز محل کو بڑا صدمہ ہوا۔ منت مانی کہ مرزا جہانگیر چھوٹ کر آئیں گے تو حضرت خواجہ بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر چادر اور پھولوں کی مسہری چڑھاؤں گی۔ خدا کی قدرت کہ صاحب عالم قید سے رہا ہوئے بادشاہ بیگم نے منت بڑھانے کی تیاریاں کیں۔ بڑی دھوم دھام سے چادر گئی۔ شہر بھر کے ہندو مسلمان شریک ہوئے۔ قطب میں کئی دن تک میلا لگا رہا۔ پھول والوں نے جو مسہری بنائی تو اس میں ایک پھولوں کا پنکھا بھی لٹکا دیا۔ بادشاہ کو یہ میلا بہت پسند آیا۔ دلی والوں سے پوچھا کہ اگر ہر سال

---

[۱] دلی کا آخری دیدار۔ وزیر حسن ص ۱۱۔

ساون بھادوں کے شروع میں یہ میلا ہوا کرے تو کیسا؟ مسلمان درگاہ
شریف پر پنکھا چڑھائیں اور ہندو جوگ مایاجی پر پنکھا چڑھائیں مسلمانوں
کے پنکھے میں ہندو اور ہندوؤں کے پنکھے میں مسلمان شریک ہوں میلے
کا میلا ہو اور دونوں قوموں میں میل جول بڑھے۔ بھلا نیکی اور پوچھ پوچھ۔
دلی والے راضی ہو گئے۔ لیجئے پھول والوں کی سیر کی بنیاد پڑ گئی [۱]"

"اکبر شاہ ثانی کا انتقال رات کے دو بجے ہوا خبردار دم بدم کی خبر ولی عہد کو دے رہے تھے اور ولی عہد تاج اور لباس اور زر و جواہر اور زیور کا خوان لیے بیٹھے تھے اور اس انتظار میں تھے کہ کب یہ سنوں کہ گھی کا کپا لنڈھ گیا اور تختِ بادشاہی پر جا بیٹھوں۔ چنانچہ ایک خبردار نے خبر دی کہ حضور مبارک ہو مسافر گیا بس فوراً ولی عہد بہادر نے شاہانہ لباس پہنا اور چاہا کہ تخت پر قدم رکھیں جو نجومی اور جیوتشیوں نے کہا کہ وقت اچھا نہیں ہے۔ سورج نکلے جلوس فرمائیے گا۔ اندھیرے میں تخت پر بیٹھنا نحس ہے ولی عہد نے کہا میرے لیے نحس ہے یا رعایا کے لیے؟ نجومی کہنا تو یہ چاہتے تھے کہ دونوں کے لیے بُرا ہے مگر ولی عہد کے ڈر سے کہہ دیا کہ حضور رعیت کے لیے اچھا نہیں ہے۔ ولی عہد نے کہا خیر دیکھا جائے گا۔ آفتاب نہ ہوگا تو کیا روشنی نہ ہوگی اور مشعل و مہتاب اور شمع و چراغ کی ایسی روشنی ہوئی کہ دن نے مات کھائی، ولی عہد تخت پر بیٹھے ابوظفر محمد سراج الدین بہادر شاہ ثانی لقب اختیار کیا [۲]"

یہ پہلے ہی عرض کیا جا چکا ہے کہ لال قلعے کی تہذیبی اور ثقافتی روایات گنگا جمنی تھیں۔ بادشاہ کی نظر میں ہندو مسلم شیعہ سنی سب برابر تھے چنانچہ قلعے میں ہولی کے موقع پر ایک زبردست چہل پہل ہوتی تھی۔ شہر بھر میں جو سوانگ رچائے جاتے وہ سب بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوتے تھے۔ سراج الاخبار کی ایک خبر کے مطابق بادشاہ اور ہندو مسلم امرا ایک طرف اور شہزادیاں اور امیرزادیاں دوسری طرف جھروکوں میں بیٹھ جاتیں۔ بادشاہی طائفے ہولی کھیلتے۔

---

[۱] پھول والوں کی سیر، مرزا فرحت اللہ بیگ ص ۸،۷۔
[۲] دلی کی ایک جھلک، ناصر نذیر فراق، ص ۱۹۔

بادشاہ کے سامنے ہولی کھیلی جاتی۔ تخت کے کہاروں کو ایک ایک اشرفی انعام ملتی[1]

"دیوالی کے موقعہ پر بادشاہ خود اس میں حصّہ لیتا تھا اور انعام و اکرام تقسیم کرتا تھا۔ لو آج یہ پہلا دیا ہے۔ روشنی ہوئی، نوبت، روشن چوکی اور باجا بجنے لگا۔ چاروں کونوں میں ایک ایک گنا کھڑا کیا۔ نیبوؤں میں ڈورے ڈال کر ان میں لٹکا دئے۔ صبح کو وہ گنّے اور نیبو حلال خوری کو دے دیے۔ رتھ بان بیلوں کو سنوار بنا کر لائے میں مہندی رنگ برنگ کی اس پر نقاشی کر، سینگوں پر قلعی اور رنگ گھوٹیاں۔ گلوں میں گھنگھرو اور پر کار چوبی بانات جھولیں پڑیں، چھم چھم کرتے چلے آتے ہیں[2]"

بہادر شاہ کی والدہ راج پوت مہارانی لال بائی تھیں۔ پھر یہ کہ تصوف سے انھیں گہری دلچسپی تھی۔ وہ کالے صاحب کے باقاعدہ مرید تھے اسی لیے ان میں بڑی آزاد خیالی، وسیع المشربی اور کشادہ ذہنی پیدا ہو گئی تھی۔ قلعے کے ملازمین میں ہندوؤں کی کمی نہیں تھی۔ بادشاہ ان کے دکھ درد میں برابر کے شریک ہوتے تھے چنانچہ سی۔ ایف۔ اینڈریوز نے بھی یہ اعتراف کیا ہے کہ بادشاہ ہندو مسلمانوں میں قطعی تفریق نہیں کرتے تھے وہ لکھتا ہے:

"شہر دہلی میں دونوں فرقے ہندو مسلمان مغل شہنشاہوں کی دانشمندانہ رہنمائی میں جنھوں نے ہندوؤں پر اعتماد کرنا سیکھ لیا تھا اور اس کے جواب میں ہندو بھی ان پر اعتماد کرتے تھے نہایت پر امن طریقے سے پہلو بہ پہلو رہتے تھے مغل شہنشاہ بجا طور پر اس نیک نامی کے حق دار ہیں کہ وہ اندرونی مذہبی تعصب پر غالب آگئے اور اس بنیاد پر اس قابل ہو گئے تھے کہ اپنی ہندو رعایا کے ساتھ مہربانی کا سلوک کریں اور غیر جانبدارانہ انصاف کریں[3]"

اسپیئر نے بہادر شاہ کی درباری زندگی کے عام کوائف سے بحث کرتے ہوئے جو نتیجے

---

[1] بزم آخر کی کہانی۔ سب رنگ کراچی، شمارہ ۔ انور حسین خاں۔ [2] بزم آخر منشی فیض الدین۔ ص ۲۰۔
[3] تذکرہ مولوی ذکاء اللہ دہلوی ۳۵ (انگریزی سے ترجمہ)۔

نکالے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ بہادر شاہ کا دربار پورے برِ صغیر کے لیے رفتار و گفتار کا ایسا نمونہ تھا جیسا فرانسیسی بادشاہ کا دربار یورپ کے لوگوں کے لیے ہے۔ اس کے عہد میں ایک تمدنی استقامت تھی جو نوابی لکھنؤ پر بھی اپنا عکس ڈالتی تھی صرف نشست و برخاست اور رفتار میں ہی لوگ دربار کی پیروی نہیں کرتے تھے بلکہ لباس بھی وہی مقبول سمجھا جاتا تھا جو اہلِ دربار پہنتے تھے۔ چنانچہ بہادر شاہ کا دربار گویا تمدن اور تہذیب کا محور و مرکز تھا اور طبقاتِ معاشرت کا امتزاج اور تال میل اسی دربار کی مرکزیت پر منحصر تھا۔ اس دربار میں فنونِ لطیفہ کی ترقی کے وسائل بھی مہیا تھے۔ لہٰذا زبان و ادب کی بھی پرورش ہوتی رہی اور مصوری کا دبستان بھی قائم رہا۔ راجا جیون رام اور حسن ناظر مشہور مصور اسی دبستان سے تعلق رکھتے تھے۔ بہادر شاہ کا دربار پرانے وقتوں کی صحت مند روایات کا محافظ تھا۔ آثار الصنادید طبع اول کی ورق گردانی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بعض تصویریں شہزادگانِ مغل نے بنائی تھیں۔ قلعے میں آئے دن مشاعرے ہوا کرتے تھے۔

> ”حضورِ والا کی جانب سے جو مشاعرہ ہوتا وہ شاہانہ انداز سے ہوتا تھا بادشاہ سلامت خود بہ نفسِ نفیس شرکت فرما کر عزت بخشتے تھے، تمام شاعر حضورِ معلّٰی کے سامنے حسبِ ارشاد بیٹھ جاتے تھے۔ بادشاہ کے مقابل شمع رکھی جاتی تھی جس شاعر کو حکم ہوتا تھا وہ سامنے حاضر ہو کر غزل پڑھتا تھا۔ بادشاہ جس شعر کی تعریف فرماتے حاضر باش امیروں میں سے ایک بلند آواز سے اس شاعر سے کہتا تھا۔ ظلِ سبحانی آپ کے شعر کی تعریف فرماتے ہیں۔ وہ شاعر سرو قد کھڑے ہو کر حسبِ قاعدہ تین بار آداب بجالاتا۔ واہ واہ کے شکریے میں سلام کرتے کرتے تھک جاتا تھا۔ حسبِ رسم ایک علاحدہ مکان میں مٹھائی ترمیوے شربت اور قہوہ وغیرہ مہیا رہتا تھا[1]۔“

جہاں پناہ کے چڑیا خانے میں ایک بلبلِ ہزار داستان پلی ہوئی تھی۔ وہ سونے کے پنجرے میں رہتی تھی۔ استاد میرن جو چڑیا خانے اور کبوتر خانے کے داروغہ تھے اس کی رکھوالی کیا کرتے تھے۔

---

[1] مرقع زبان و بیان دہلی ص ۸ سید احمد دہلوی۔

اس کے پنجرے پہ کئی کئی بستنیاں منڈھی رہتی تھیں۔ جب بہار کا موسم آتا تو بلبل کو چہکنے کا شوق ہوتا تھا۔ استاد میرن اس کا پنجرہ لے کر بیگم کے باغ میں آتے تھے اور رکھٹے کے درخت کی ٹہنی میں اسے لٹکا دیتے تھے۔ شہر میں ایک روز پہلے سے دھوم مچ جاتی کہ کل مغرب کے وقت استاد میرن بادشاہی بلبل کا پنجرہ لے کر بیگم کے باغ میں آئیں گے۔ شوقین لوگ اپنی اپنی اگن، چنڈول، طوطے، مینا، شاما وغیرہ بولنے والے جانوروں کے پنجرے لے کر باغ میں پہنچ جاتے۔ گھاس کے تختوں پر جو مخمل کو مات کرتی تھی بھسکڑا مار کر بیٹھتے اور اپنے اپنے پرندوں کے پنجرے اپنے آگے رکھ لیتے تھے۔ بادشاہی بلبل ہزار بولیاں بولتی جنھیں سن کر سننے والے سبحان اللہ کہتے بلبل کے دم کو سن کر ہر ایک شوقین کا چہکنے لگتا تو اس کا مالک پنجرے کو تھپک دیتا جس سے یہ مراد تھی کہ بلبل ہزار داستان کی بولی کان لگا کر سن اور چپ رہ تاکہ تجھے بھی یہ بانک آجائے اور فی الواقع بلبل کی بولیاں سن کر شاہجہاں آباد کے شوقین لوگوں کے اگن، چنڈول خوب بولنے لگے تھے۔ لوگ فخریہ کہتے تھے کہ جناب ہمارے اگن، چنڈول نے بادشاہی ہزار داستان کی مار کھائی ہے۔

دیوانِ خاص کے وسط میں تختِ طاؤس نصب ہوتا تھا اور بالائے تخت نمگیرہ زرین، چوب پائے نقرہ ملمع طلائی پر نصب ہوتا تھا۔ تختِ طاؤس کے برابر چار گوشوں میں چار طاؤس طلائی میناکار نصب ہوتے تھے اور ان کے منقاروں میں بڑے موتیوں کی مالائیں جن میں زمرد کے گچھے تھے آویزاں ہوتی تھیں .... تختِ طاؤس میں مسند تکیے لگائے جاتے تھے۔ جب بادشاہ دربار فرماتے تختِ طاؤس کے دونوں پہلوؤں میں دو طرفہ دو صفیں درباریوں کی دست بستہ استادہ ہوتیں سب نیچی نگاہیں کیے کھڑے رہتے تھے۔ خاموش۔ مجال کیا کہ کوئی کسی طرف دیکھ لے یا کھجائے یا مسکرائے یا بات کرے۔ دیوانِ خاص کے مقابل لال پردے کا دروازہ تھا۔ وہاں سرخ بانات کا پردہ کھنچا رہتا تھا۔ جو شخص دروازے میں سے داخل دیوانِ خاص ہوتا تھا پہلے لال پردے کے آگے آکر سلام گہ پر استادہ ہوتا تھا۔ آداب و تسلیمات بجالاتا اور نقیب لال پردے کے برابر سے آواز لگاتا تھا۔ ملاحظہ آداب سے آداب بجالاؤ۔ جہاں پناہ بادشاہ سلامت، عالم پناہ بادشاہ سلامت۔ بعد اس کے یہ شخص سلامی پہلو میں ہو کر عقب حمام کی جانب کے زینے سے دیوانِ خاص کے چبوترے پر چڑھتا اور نعلین خالی کرتا اور دیوانِ خاص

میں جاکر دوبارہ دوسری سلام گاہ پر آداب بجالاتا اور نقیبِ دربار بطورِ اوّل آواز لگاتا اور سلام کراتا۔ اگر نذر گزارنی ہوتی تو سیدھا تخت کی جانب جاکر نذر پیش کرتا۔ نذر دے کر پھر پچھلے قدموں پلٹ کر سلام گاہ تک جاتا اور بقاعدۂ اوّل پھر اسی طرح آداب بجالاتا اور جہاں جگہ ملتی صفِ دربار میں جا ملتا تھا۔ یہ نقشہ دربارِ شاہی کا تھا۔

شہزادوں کی شادیوں کے موقع پر جشن منعقد ہوتے تھے تزکِ جہانگیری میں جہانگیر بادشاہ نے اپنے بیٹے خرم کی شادی کی تقریبات اور جشن کا ذکر کیا ہے۔ کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ تیموریہ خاندان کا جب چراغ ٹمٹما رہا تھا اس وقت بھی شادی کی تقریبات جیسی کہ شاہزادہ خرم کی شادی میں بیان کی گئی ہیں:

> "ہر چند کہ تقریبات بسیار ریاستہائے ہندوستان میں نظر سے گزری ہیں مگر جیسی شادی بازیب وتجمل شاہزادہ مرزا جواں بخت کی ہوئی ایسی نگین محفل وتقریبِ دلفریب باجاہ وحشم اس دریادل کے ساتھ کہیں نظر سے نہیں گزری۔ بیانِ تکلفاتِ رسوم ساچق، مہندی برات، آرائشِ شہر وروشنی ونقار خانہ جات وغیرہ فضول جان کر قلم انداز کیا جاتا ہے۔ البتہ دو امر قابلِ نگارش ہیں ایک یہ کہ قرینۂ محفل سب سے جداگانہ تھا۔ دیوان کی بارہ دری میں جدا جدا محفلیں ترتیب دی گئی تھیں۔ ہر در میں ایک طائفہ جدا رقص کرتا تھا شاہزادگان کی محفل جدا، ملازمینِ معززین کی انجمن جدا، فرقۂ سپاہ کی بزم جدا شاگرد پیشہ کے لیے بھی جدا۔ اس طرح ہر فریق کی محفل جدا تھی۔ اہلِ شہر کے لیے حکم عام تھا کہ آئیں اور تماشائے رقص وسرود سے محظوظ ہوں۔ کل ملازمینِ شاہی ورؤسائے شہر کے لیے تورہ جات کا حکم تھا جس کا جی چاہے زرِ نقد پچاس روپے تورے کی قیمت لے۔ ایک تورے میں طعام اس قدر ہوتا تھا کہ ایک محفل شکم سیر ہو کر کھالے۔ ایک ایک طباق میں پانچ پانچ طرح کے پلاؤ رنگ برنگ کے میٹھے چاول۔ پانچ سیر کی باقرخانی ایک شیرمال ایک نشین اور کئی قسم کے نان غرض کہ اقسام خوردنی کی کوئی شے باقی نہ تھی

گئی تھی، اس کے علاوہ جن شعرا نے قصائد تہنیت اور سہرے لکھے تھے باوجودیکہ ملازم تھے مگر سب کو صلے، خلعت و انعام عطا ہوئے اور شاگرد پیشہ کو جوڑے تقسیم کیے گئے لے

بادشاہ کی سواری میں سولہ گھوڑے لگائے جاتے تھے اور نواب زینت محل بیگم صاحبہ کی سواری میں آٹھ گھوڑے لگائے جاتے تھے۔

"بادشاہ سوار ہوئے چرن بردار نے باناتی زیر انداز میں چرن لپیٹ بغل میں مارے۔ دو خواص تخت رواں کے دونوں طرف مورچھل لے کر ساتھ ہوئے اور خواص گشتی دست بغچہ، رومال بینی پاک، اگالدان اور ضرورت کی چیزیں لے کر چلے بھنڈے بردار بھنڈا لے تخت رواں کے برابر آگیا۔ بھنڈے کا پیچ بادشاہ نے ہاتھ میں لیا۔ ایک ٹوکرے میں آب حیات کی صراحیاں برف میں لگی ہوئی۔ ایک طرف آگ کی انگیٹھی، کوئلوں کے گل، بھلیا، تمباکو کہار بہنگی میں لیے ساتھ ساتھ ہے۔ امیر امرا تخت کا پایہ پکڑے اپنے اپنے رتبے سے چلے جاتے ہیں۔ کہار پنکھا آفتابی لیے حبشی ملار چاندی کے شیر دہان سونٹے لال لال آنکڑے دار لکڑیاں ہاتھوں میں لیے گرد و پیش تخت رواں کے چلے جاتے ہیں ٢ے"

بہادر شاہ اور اس کے خاندان کے بارے میں بعض غلط باتیں ہماری تاریخی کتابوں میں بیان کی گئی ہیں ان کی تصحیح ضروری ہے۔ یہ بات غلط ہے کہ قلعے والوں کی اکثریت فسق و فجور میں مبتلا تھی اور یہ بھی درست نہیں کہ بہادر شاہ صرف میلوں ٹھیلوں اور تقریبات میں منہمک رہتا تھا۔ وہ اعلا درجہ کا خوشنویس، شاعر، نشانہ باز، شہسواری میں مشاق اور دور اندیش تھا۔ شراب سے احتراز کرتا تھا البتہ کھانے کے معاملے میں غیر محتاط تھا۔ تیموری خانوادے کے چشم و چراغ کی حیثیت سے اس نے کئی بار اپنی جرات اور شجاعت کا مظاہرہ کیا تھا۔ حکیم احسن اللہ کو اس نے دو بار مرنے

لے طراز ظہیری بحوالہ بزم آخر کی کہانی سیپ رسالہ کراچی شمارہ، ص ۳۱۰۔

٢ے بزم آخر منشی فیض الدین ص ۲۱۔

سے بچایا تھا کیونکہ ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں لوگ حکیم صاحب کو ہلاک کر دینا چاہتے تھے۔ یہ کہنا بھی درست نہیں کہ قلعہ میں جنگجو سپاہی ناپید ہو گئے تھے۔ بہادر شاہ کے زمانے کی ثقافتی سطح کی صورت کچھ اور ہے لیکن اس سطح کے نیچے معنویت کی ایک رو ہے کوشش کا ایک رجحان ہے سعی کا ایک رُخ ہے اسی رجحان اور رُخ کا مطالعہ کرنے سے بہادر شاہ کے عہدِ شہزادگی اور دورِ حکومت کی دہلی کے کوائف سمجھ میں آئیں گے اور پتا چل سکے گا کہ بہادر شاہ خود اور دہلی کے عوام کس طرح بیرونی حکومت کے فشار کا مقابلہ کر رہے تھے اور وہ تحریک کس طرح اندر ہی اندر شروع ہو چکی تھی جسے ۱۸۵۷ء میں جنگ کا روپ دھارنا تھا۔

قلعے والوں کی زندگی میں حرم سرا، موسیقی، رقص و سرود، مصوری، شعر و نغمہ، کھیل کود، پتنگ بازی، مختلف جانوروں کی لڑائیاں، کشتی اور پرندوں کی پڑیاں دیکھ کر کچھ لوگوں نے یہ خیال کیا کہ شہزادے صرف لہو و لعب میں مبتلا تھے۔ ان لوگوں پر رندی اور اوباشی کے جو الزامات لگائے گئے ان میں صداقت کے ساتھ ساتھ مبالغہ آرائی کو بھی دخل ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس دور میں رزم اور بزم کا توازن بگڑ گیا تھا لیکن ہمیں یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ بزم آرائی، حسن و شعر، شراب و نغمہ اور خوش باشی مغل تہذیب کے وہ عناصر ہیں جو کم و بیش ہر زمانے میں دکھائی دیتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ سیاسی زوال کی بنا پر ہمارے نقاد اس ضمن میں کچھ زیادہ حساس ہو گئے تھے اور انگریز مورخین نے دانستہ اُن باتوں کو ہوا دی جن سے وہ اپنی کی ہوئی زیادتیوں کا جواز پیدا کر سکتے تھے۔ میں ایک انگریز مصنف سپیئر کی رائے اپنے اس بیان کی تائید میں پیش کر کے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

> "جب حوادث کی آندھیاں چلتی ہیں اور مصیبتوں کے مینہ برستے ہیں اور خانۂ سلطنت خراب ہو جاتا ہے تو پھر اس کے بعد فولاد آہن کا دور آتا ہے۔ عام طور پر معاشرتی اور سیاسی انتشار اور زوال کے زمانوں میں افراد مخصوص فعالیت اور طاقت کا مظاہرہ کرتے ہیں جو غیر معمولی ہوتی ہے۔ مغلوں کے زوال کے زمانے میں قلعے کی داستان ان کمزور یا بیہودہ افراد کی داستان نہیں ہے جو فریب اور دغا سے کام لیتے ہیں بلکہ یہ تنومند انسانوں کی داستان ہے جو حصولِ حکومت کے لیے کوشاں ہیں۔ ان لوگوں کو جو مکافات نے آلیا تو

اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ کمزور تھے بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں کی طاقت بے اصولی تھی ....

اگر ہم غور و فکر سے کام لیں گے تو معلوم ہوگا یہ عام خیال غلط ہے کہ آخری تین مغل بادشاہ عورتوں کی طرح کمزور تھے اور فسق و فجور میں غرق۔ ان تینوں میں سے صرف ایک کو خدا نے یہ توفیق ارزانی کی کہ وہ حکومت کرکے دکھائے۔ وہ ناکامیاب رہا لیکن حالات غیر معمولی طور پر نامساعد تھے اور اس کی ناکامی میں بھی عظمت اور جلالت قدر ہے[1]"۔

کتابیات

۱۔ ۱۸۵۷ء پہلی جنگِ آزادی میاں محمد شفیع مکتبہ جدید لاہور ۱۹۵۷ء

۲۔ دلی کا آخری دیدار وزیر حسن ساقی بکڈپو دہلی

۳۔ بیلہ میں میلہ۔ راشد الخیری عصمت بکڈپو دہلی ۱۹۴۱ء

۴۔ داستانِ غدر ظہیر دہلوی اکادمی پنجاب لاہور ۱۹۵۵ء

۵۔ نوبتِ پنج روزہ راشد الخیری عصمت بکڈپو دہلی ۱۹۴۱ء

۶۔ دلی کا سنبھالا۔ محمد شفیع دہلوی مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۳۸ء

۷۔ اسبابِ بغاوتِ ہند سر سید احمد خاں اردو اکیڈمی سندھ ۱۹۵۷ء

۸۔ تحریکِ ریشمی رومال حسین احمد مدنی کلاسیک لاہور ۱۹۶۰ء

۹۔ بزمِ آخر منشی فیض الدین دانش محل دہلی ۱۹۴۵ء

۱۰۔ تاریخ مشائخ چشت خلیق احمد نظامی ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۵۳ء

۱۱۔ دلی کا آخری دیدار وزیر حسن مکتبہ ساقی ۱۹۴۱ء

---

[1] TWILIGHT OF THE MOGHULS از پرسیول اسپیر ص ۶۰-۶۵ (انگریزی سے ترجمہ)

۱۲۔ دلی کی آخری بہار۔ راشد الخیری عصمت بکڈپو ۱۹۳۷ء
۱۳۔ بہادر شاہ ظفر رئیس احمد جعفری۔ کتاب منزل لاہور
۱۴۔ مقدمہ زبان و بیان دہلی سید احمد دہلوی بحوالہ "فکر نو"
۱۵۔ ذاکر حسین کالج میگزین شاہجہاں آباد نمبر ۱۹۸۰ء
۱۶۔ TWILIGHT OF THE MOGHULS PERCIVAL SPEAR CAMBRIDGE UNIVERSITY PRESS 1951.
۱۷۔ ذکا اللہ آف دہلی سی۔ ایف اینڈریوز
۱۸۔ دہلی کی چند عجیب ہستیاں۔ اشرف صبوحی۔ انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۴۳ء
۱۹۔ سیر دہلی مرتبہ مختار الدین احمد۔ انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۶۲ء
۲۰۔ دہلی کا آخری سانس۔ خواجہ حسن نظامی ۱۹۲۵ء
۲۱۔ لال قلعے کی ایک جھلک۔ ناصر نذیر فراق۔ امپریل پریس دہلی۔
۲۲۔ سیر المحتشم۔ نواب عبد الغفور مطبع سرکار جاورہ
۲۳۔ تاریخ ہند بعہد برطانیہ ترجمہ عبد السلام۔ دار الترجمہ حیدر آباد دکن
۲۴۔ آثار الصنادید۔ سر سید احمد خاں (طبع اول) دلی یونیورسٹی لائبریری
۲۵۔ واقعات مولوی کریم الدین مطبع سرکار لاہور ۱۸۶۶ء

ڈاکٹر محمد انصار اللہ

غالب کے تذکرہ نویس

(ذکا سے صابر تک)

تیرھویں صدی ہجری کے ربع اوّل کے بعد اردو شاعروں کے جتنے تذکرے لکھے گئے تقریباً سبھی میں مرزا اسداللہ خاں غالب کے حالات کم و بیش مندرج ہیں۔ ان سب تذکروں میں مندرج مرزا کے تعارف کا اگر تفصیلاً جائزہ لیا جائے تو ایک ایسی کتاب تیار ہو جائے گی جو اس زمانے میں تذکرہ نویسی کے ارتقا کی بھی آئینہ دار ہوگی۔ طوالت سے بچنے کے لیے اس مقالے کو ابتدا سے قادر بخش صابر کے تذکرۂ گلستانِ سخن تک محدود رکھا گیا ہے۔

معمولاً ہونا یہ چاہیے تھا کہ ابتدائی تذکروں میں نوعمر نومشق مرزا غالب کے حالات کمتر ہوتے اور جیسے جیسے متعارف ہوتے گئے اور ان کے شاعرانہ کمال نمایاں ہوتے گئے، ان کے حالات کے بیان میں تفصیل اور ان کے کلام کی خامیوں اور خوبیوں کے اظہار میں صراحت پیدا ہوتی جاتی لیکن عموماً ایسا نہیں ہوا ہے۔ اوّلین تذکروں میں مرزا کے بارے میں بیشتر ضروری معلومات موجود ہیں لیکن آخر زمانے کے بعض تذکروں میں ان کا واجبی تعارف بھی نہیں کرایا گیا ہے۔ یہ صورتِ حال اہلِ تذکرہ کے مزاج اور تذکرہ نویسی کے بارے میں انفرادی نقطۂ نظر کی بھی غماز ہے۔

مرزا کا تعارف سب سے پہلے خوبچند ذکا نے اپنے تذکرے میں کرایا ہے۔ اُس کے تذکرے کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے لکھا ہے کہ:

"عیار الشعرا کا اوّلین مسودہ ۱۲۱۳ھ اور ۱۲۲۶ھ کے درمیان ہر طرح مکمل ہو گیا تھا۔ جہاں تہاں اضافے البتہ اس کے بعد بھی ہوتے رہے۔"

امتیاز علی خاں صاحب عرشی کا خیال تھا کہ اس تذکرے میں ان اضافوں کا سلسلہ ۱۲۴۸ھ/۳۳-۱۸۳۲ء تک جاری رہا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مرزا غالب کے حالات ذکا نے ۱۲۲۶ھ/۱۸۱۱ء میں

لکھ لیے تھے۔ اس وقت تک مرزا کی سکونت اکبرآباد میں تھی، اگرچہ ان کی شادی ۹ اگست ۱۸۱۰ء کو ہو چکی تھی۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ذکا نے ان کو خود دیکھا بھی ہو لیکن جو بھی اطلاعات اُسے حاصل ہو چکی تھیں ان کو پوری قطعیت کے ساتھ اُس نے قلم بند کر دیا تھا۔ عبارت آرائی اس نے بالکل نہیں کی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں۔

"(۳) مرزا اسداللہ خاں عرف مرزا نوشہ المتخلص بہ غالب، ولد مرزا عبداللہ خاں عرف مرزا دولھا، بنبیرۂ مرزا غلام حسین خاں کمیدان، ساکن بلدۂ اکبرآباد، شاگرد مولوی محمد معظم، شاعرِ فارسی و ہندی است"

ذکا نے مرزا کے دہلی سے تعلق کی طرف بالکل اشارہ نہیں کیا ہے۔ غالباً اُسے ان کی شادی کے بارے میں بھی علم نہیں تھا۔ اس نے جو اطلاعات فراہم کی ہیں، اُن میں بعض خصوصیت سے قابلِ توجہ ہیں۔

(الف) غالب کے والد کا عرفی نام "مرزا دولھا" تھا۔ اس اطلاع سے نہ صرف بیشتر ہمعصر تذکرے خالی ہیں، بلکہ غالب کے خود نوشت حالات میں بھی عموماً اس کا مذکور نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ (شادی کے بعد؟) مرزا نے اپنے والد کے اِس نام کی رعایت سے اپنے لیے "مرزا نوشہ" نام پسند کیا اور وہ اسی عُرفی نام سے اکبرآباد میں بھی معروف تھے۔

(ب) مرزا اسداللہ خاں غالب اپنے ابتدائی زمانے میں مولوی محمد معظم کے شاگرد تھے۔ اُن کے اس تلمذ کا ذکر بعد کے تذکرہ نویسوں نے بھی کیا ہے چنانچہ تفصیل اپنے موقع پر بیان ہوگی۔

(ج) خوبچند ذکا نے مرزا کا تخلص غالب لکھا ہے۔ جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ تخلص انہوں نے بالکل ابتدائی زمانے میں اختیار کیا تھا۔ اس حقیقت پر کہ مرزا اسداللہ خاں شروع زمانے سے غالب تخلص کرتے رہے ہیں، ۱۲۲۷ھ / ۱۸۱۲ء سے قبل کے اُن کے درج ذیل مقطعے بھی دلالت کرتے ہیں۔

غالب ہے رتبہ فہم تصور سے کچھ پرے ہے عجز بندگی کہ علیؑ کو خدا کہوں

جو حقِ تقوا ادا نہ ہووے تو اپنا مذہب یہی ہے غالب
ہوس نہ رو بیٹے کوئی باقی، گناہ کیجے تو توبہ کیجے

(د) ذکا نے غالب کو شاعرِ فارسی و ہندی کہا ہے۔ یعنی وہ ابتدا سے ہی دونوں زبانوں میں شعر کہتے رہے ہیں۔

خوبچند ذکا کے معاصر اعظم الدولہ میر محمد خاں سرور نے عمدۂ منتخبہ کے نام سے ایک تذکرہ لکھا تھا۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے لکھا ہے کہ :

"عمدۂ منتخبہ کی ابتدا ۱۲۱۶ھ میں ہوئی اور ابتداے ۱۲۲۴ھ میں (اس نے) کتابی صورت اختیار کرلی۔ اضافے آخر دم تک ہوتے رہے۔"

سرور نے ذکا کے حال میں لکھا ہے کہ "مشارٌالیہ ہم تذکرۃ الشعرا تالیف کردہ"۔ اس سے ظاہر ہے کہ تذکرۂ ذکا کی تالیف کے بعد بھی سرور اپنے تذکرے میں اضافے کرتے رہے تھے۔ خیال ہے کہ انھوں نے جس زمانے میں ذکا کا حال لکھا، اسی وقت غالب کا ذکر بھی قلمبند کیا تھا۔

میر محمد خاں سرور نے مرزا اسداللہ خاں غالب کے ساتھ اپنے روابط کا ذکر کیا ہے۔ یہ روابط اسی زمانے میں قائم ہوئے ہوں گے جب شادی کے کچھ عرصہ بعد مرزا نے دہلی میں آنا جانا شروع کردیا ہوگا۔ سرور مرزا کی ذاتی لیاقت اور اُن کے مزاج سے بھی واقف تھے۔ بخوبی ممکن ہے کہ انھوں نے مرزا کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ خود مرزا سے معلوم کرکے یا کم سے کم اُن کی خواہش اور پسند کے مطابق لکھا ہوگا۔ سرور کے یہاں لفاظی زیادہ نہیں ہے لیکن عبارت مقفیٰ اور مسجع بنادینے کی طرف میلان ضرور ہے۔

"اسد تخلص، اسداللہ خاں عرف مرزا نوشہ، اصلش از سمرقند، مولدش مستقرالخلافہ اکبرآباد، جوانِ قابل و یار باش و دردمند، ہمیشہ بہ خوش معاشی بسر بردہ۔ ذوقِ ریختہ گوئی در خاطر متمکن غمہاے عشقِ مجاز تربیت یافتہ، غمکدۂ ناز، درفنِ سخن سنجی تتبعِ محاوراتِ میرزا عبدالقادر بیدل علیہ الرحمۃ و ریختہ در محاوراتِ فارسی موزوں میکند۔ بالجملہ موجدِ طرزِ خود ست و با راقم رابطۂ یکجہتی مستحکم دارد، اکثر اشعارش از زمینِ سنگلاخ بہ مضامینِ نازک موزوں گشتہ۔ دوئیہ خیال بندی بیش از بیش پیش نہادِ خاطر دارد۔"

روابط کے باوجود سرور نے غالب کے والد کا عرفی نام اور غالب کے نانا اور استاد کا بالکل ذکر نہیں کیا ہے۔ ان امور کا ذکر شیفتہ اور سرسید نے بھی نہیں کیا ہے اور یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ان دونوں کے ساتھ بھی غالب کے عمدہ تعلقات تھے۔ غالب نے خود بھی اِن باتوں کا ذکر عموماً نہیں کیا ہے۔ سرور کے تذکرے سے ہی اس بات پر زور دیا جانے لگا کہ مرزا غالب کے اجداد بہت موقر اور باحیثیت لوگ تھے کیونکہ وہ باہر سے آئے تھے۔

سرور نے شاہجہاں آباد سے مرزا کے تعلق کی طرف بھی کوئی اشارہ نہیں کیا ہے لیکن یہ بات یقینی ہے کہ وہ دہلی آکر یہاں کے مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ سرور کا کہنا ہے کہ وہ "محاوراتِ فارسی" میں اردو شاعری کرتے تھے اور اس طرز کو سرور نے مرزا کا ایجاد کہا ہے لیکن یہ طرز اردو والوں میں مقبول نہیں ہو سکتا تھا بلکہ وہ اس پر معترض ہوتے تھے چنانچہ سرور نے مرزا کا یہ قطعہ بھی نقل کیا ہے ؎

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل　　ہوتے ہیں ملول اُس کو سن کو جاہل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش　　گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

دیوانِ غالب میں ذیل کا مقطع بھی موجود ہے جسے کالیداس گپتا رضا صاحب نے ۱۲۳۶ھ ۱۸۲۱ء کے بعد کا قرار دیا ہے[۷]۔

دلّی کے رہنے والو اسد کو ستاؤ مت
بیچارہ چند روز کا یاں میہمان ہے

(ب) اگرچہ سرور نے مرزا کا تعارف اسد تخلص کے ساتھ کرایا ہے، انھوں نے مرزا کی ایسی غزل کے شعر بھی نقل کیے ہیں، جس کے مقطع میں غالب تخلص نظم ہوا ہے۔ تذکرہ نویسوں نے ان تخلصوں کے بارے میں مختلف باتیں لکھی ہیں مثلاً:

"اشعارِ فارسی میں غالب تخلص لکھتے تھے[۸]"

اور: "اوائل میں اردو غزلوں میں اسد تخلص کرتے تھے[۹]"

صحیح یہ ہے کہ تخلصوں کے بارے میں اِن بحثوں کا سلسلہ خود مرزا نے شروع کیا تھا۔ انھوں نے خود لکھا ہے:

"ایک شخص نے یہ مطلع میرے سامنے پڑھا اور کہا: قبلہ آپ نے کیا خوب مطلع کہا ہے"

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی
مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

میں نے سن کر عرض کیا کہ: صاحب جس بزرگ کا یہ مطلع ہے اُس پر بقول اس کے رحمت خدا کی، اور اگر میرا ہو تو مجھ پر لعنت۔ اسد اور شیر اور بت اور جفا اور وفا میری طرزِ گفتار نہیں ہے بات یہ ہے کہ ایک شخص میر امانی اسد ہو گزرے ہیں۔ یہ مطلع، یہ غزل اُن کے کلامِ معجز نظام

یں سے ہے اور تذکروں میں مرقوم ہے:"

بس یہی واقعہ بتایا جاتا ہے کہ جس کے سبب سے مرزا نے اسدؔ تخلّص ترک کرکے غالبؔ تخلّص اختیار کرلیا۔ تذکروں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسدؔ تخلّص کرنے والے شاعر میرامانی سے بہت کمتر درجے کے شاعر بھی غالبؔ تخلّص کرتے رہے ہیں۔ یقین ہے کہ ان کے کچھ مقطعے میرامانی کے مذکورہ مقطع سے پست تر بھی ہوں گے۔ ایک شخص نواب اسداللہ خاں غالبؔ دہلوی اور بھی ہو گذرا ہے[۱] جو علی ابراہیم خاں خلیل سے ملا تھا لیکن مرزا نے غالبؔ تخلّص کو ترک نہیں کیا۔ میرامانی اسدؔ ایک باصلاحیت شاعر تھا۔ سوداؔ کا شاگرد تھا۔ مفتی آزردہ اور شیفتہؔ وغیرہ بھی اُس کے مداح تھے بلکہ اس کے قتل کر دیے جانے پر غم وغصہ کا اظہار کرتے ہوئے شیفتہؔ نے لکھا ہے:

"[۱] در راہِ لکھنو حرامیانِ تبہ کار بد سرانجام خونش ریختند"۔

اسدؔ تخلّص ترک کرنے کے لیے جو سبب بیان کیا جاتا ہے وہ محض من گھڑت ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ یہ بات ہی غلط ہے کہ مرزا نے ایک تخلّص ترک کرکے دوسرا اختیار کیا تھا۔ ذکاؔ نے سب سے پہلے ان کا تعارف کرایا تھا اور اُس نے غالبؔ تخلّص لکھا۔ سرورؔ نے اگرچہ اسدؔ تخلّص لکھا۔ لیکن غالبؔ تخلّص کی طرف بھی اس کے یہاں اشارہ موجود ہے۔ ۱۸۱۷ء کی ایک غزل کا مقطع یہ ہے[۱]:

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ
ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

اُنھوں نے اپنی بعض غزلوں میں ایک سے زائد مقطعے کہے ہیں اور دونوں تخلّص نظم کیے ہیں مثلاً ۱۸۱۲ء کی ایک غزل میں ہے[۱۳]:

نہ پوچھ وسعتِ میخانۂ جنوں غالبؔ
جہاں یہ کاسۂ گردوں ہے ایک خاک انداز

اسدؔ سے ترکِ وفا کا گماں وہ معنی ہے
کہ کھینچیے پرِ طائر سے صورتِ پرواز

اسی طرح ۱۸۲۱ء کے بعد کی ایک غزل کے دو مقطعے یہ ہیں[۵]

عشق نے پکڑا نہ تھا غالب ابھی وحشت کا رنگ
رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے

گر مصیبت تھی تو غربت میں اٹھا لیتا اسد
میری دلّی ہی میں ہونی تھی یہ خواری ہائے ہائے

مرزا اِن دو تخلصوں پر ہی قانع نہیں تھے۔ انھوں نے چند غزلوں میں اپنے نام کو بھی بطورِ تخلص صرف کیا ہے مثلاً:

اسد اللہ خاں تمام ہوا   اے دریغا وہ رندِ شاہد باز

مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمھیں
وہ ولولے کہاں، وہ جوانی کدھر گئی

یہی نہیں بلکہ "ذخیرۂ بالگوبند" کے ایک مضمون میں تو یہ مذکور بھی ہے کہ:

"[۶۶] کلام میں تخلص اپنا اس نے کہیں غالب اور کہیں نوشہ لکھا ہے۔"

(ج) سرور کا یہ بیان کہ مرزا "زمینِ سنگلاخ" میں شعر کہتے تھے، بہت اہم نہیں ہے۔ اُس زمانے میں سنگلاخ زمینوں میں شعر کہنے کے لیے شاہ نصیر نے امتیاز حاصل کیا تھا اور کم و بیش سبھی نو مشق ان کے طرز سے متاثر تھے۔ مرزا غالب نے خیال بندی پر زور دیا تھا اور وہ نئے نئے زاویے پیش کر کے خود کو نمایاں کرنے کی کوشش میں تھے۔ یہ بات توجہ طلب ہے کہ سرور نے مرزا کی فارسی گوئی کا ذکر نہیں کیا ہے۔ انھوں نے مرزا کی "خوش معاشی" کا ذکر کیا ہے لیکن اس کی کیفیت معلوم نہیں ہو سکی۔

(۲)

باوجودیکہ میر محمد خاں سرور نے مرزا غالب کو "موجدِ طرزِ خود" کہہ کر "رابطۂ یکجہتی" کا حق ادا کر دیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کے نکتہ سنجوں نے ان کی شاعرانہ حیثیت کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ مفتی صدر الدین خاں آزردہ نے ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء اور ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۸ء کے مابین اپنا

تذکرہ لکھا تھا۔ اُس میں مرزا کا ذکر شامل نہیں کیا ہے۔

(۴) مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کے دوستوں میں نواب مصطفےٰ خاں شیفتہؔ کو خصوصیت تھی۔ وہ مرزا کے بارے میں زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر معلومات قلمبند کر سکتے تھے' لیکن انھوں نے عبارت آرائی تو بہت کی' اطلاعات زیادہ قلمبند نہیں کیں۔ مرزا کے خاندان کو "فخیم" تو کہا لیکن اس کی تفصیل بیان نہیں کی۔

''غالبؔ تخلص' اسمِ شریفش اسد اللہ خاں المشتہر بہ مرزا نوشہ' از خاندانِ فخیم است وا ز رؤساے قدیم۔ سابقاً مستقر الخلافت اکبر آباد از استقرارش سرگرم کبر و ناز بود' اکنو دار الخلافۃ شاہجہاں آباد بدین نسبت غیرت افزاے صفاہان و شیراز واگرامروز بتلاشِ متاعِ نفیس شتابی بخز بدکانش در نیابی۔ سالہا ست کہ پا بدیرۂ شاعری نہادہ' در اوایلِ حال بتقاضاے طبعِ دشوار پسند طرزِ مرزا عبد القادر بیدلؔ سخن میگفت و دقت آفرینہا میکرد۔ آخر الامر ازاں طریقہ اعراض کردہ' اندازِ دگر مطبوع ابداع نمودہ' دیوانش را بعد ترتیب و تکمیل دیگر نگریست۔ فراواں ابیات ازاں حذف و ساقط کردہ' قدر قلیلے انتخاب زدہ مدتہا کہ بہ نظمِ ریختہ سرے ندارد۔ در زبانِ فارسی نیز دستگاہے بلند و مایۂ وافر بہم رسانیدہ ...... بالجملہ چنیں نکتہ سنجِ نغز گفتار کمتر مرئی شد۔ دیدنش ہر چند گاہ گاہ صورت می بندد اما پیوند معنی مستحکم است۔ دیوانش بنظر رسید و ایں ابیات ازاں منتخب گردید''۔

شیفتہؔ نے یہ وضاحت نہیں کی کہ مرزا غالبؔ کہاں کے "رؤساے قدیم" میں سے تھے۔ مرزا کے والد اور دادا کے بارے میں جو کچھ معلوم ہے اس سے اُن کا "رئیس" ہونا معلوم نہیں ہوتا۔ البتہ مرزا کی بیوی ضرور "نواب نادی" تھی۔

شیفتہؔ نے یہ نہیں بتایا کہ مرزا نے اکبر آباد چھوڑ کر شاہجہاں آباد میں سکونت کیوں اور کب اختیار کی تھی۔ اگر اکبر آباد اُن کی اقامت پر "سرگرم کبر و ناز" تھا تو مرزا کو وہاں کی اقامت ترک نہیں کرنی چاہیے تھی۔ شیفتہؔ کی عبارت مبالغہ آمیز اور گمراہ کن ہے۔

میر محمد خاں سرورؔ کے تذکرے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کا کلام اعتراضات کا ہدف بنتا آرہا تھا۔ شیفتہؔ نے یہ اطلاع دی ہے کہ بالآخر مرزا غالبؔ کو اپنے قدیم طرزِ شعر گوئی کو ترک کرنا پڑا

اور نتیجے کے طور پر انھوں نے اپنے دیوان کا انتخاب کر ڈالا۔ اس کی جو کیفیت شیفتہ نے بیان کی ہے وہ وہی ہے جو مرزا غالب نے اِن لفظوں میں تحریر کی ہے:

"ابتدائے فکرِ سخن میں بیدل و اسیر و شوکت کے طرز پر ریختہ لکھتا تھا۔۔۔ پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامینِ خیالی لکھا کیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہوگیا۔ آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا۔ اوراق یکقلم چاک کیے۔ دس پندرہ شعر واسطے نمونے کے دیوانِ حال میں رہنے دیے۔"

شیفتہ نے مرزا غالب کی فارسی میں دستگاہ کا بھی ذکر کیا ہے لیکن یہ بھی کہا ہے کہ مدت سے نظمِ ریختہ کا خیال نہیں رکھتے۔ مرزا نے جب نیا طرز ایجاد کر لیا تو اردو شاعری کو ترک کرنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہ گئی تھی۔ جناب کالیداس گپتا رضا نے غالب کا دیوان "تاریخی ترتیب سے" مرتب کیا ہے۔ اس سے اردو میں شعر گوئی کا ترک کرنا ظاہر نہیں ہوتا اور یہ ترکِ شاعری کا سلسلہ "مدتہا" تک جاری رہا ہو، یہ بات کسی طرح قرینِ قیاس نہیں ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ طرزِ قدیم کو ترک کرنے کے بعد مرزا نے کچھ مختصر عرصے تک غور و فکر اور مطالعہ میں خود کو مصروف کر لیا ہو اور شعر نہ کہے ہوں۔ شیفتہ نے اِس کے بیان میں بہت زیادہ مبالغہ کیا ہے۔

(۵)

اگرچہ سرور اور شیفتہ کے تذکرے کی اشاعت کے بعد مرزا غالب کو شاعر کی حیثیت سے خاصی شہرت حاصل ہوئی تھی، ان کے کلام کو اس لائق نہیں مانا گیا تھا کہ اسے درس میں شامل کیا جاسکے۔ ۱۲۶۰ھ/۱۸۴۴ء میں شیخ امام بخش صہبائی نے شعرائے اردو کے دواوین کا ایک انتخاب دہلی کالج کے لیے تیار کیا تھا۔ اس میں مرزا کا نام اور کلام شامل نہ کیا جاسکا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ صاحبانِ عالیشان کے نزدیک مرزا کے شوق پسندیدہ نہیں تھے۔ ان کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔

(۶)

لکھنوی تذکرہ نویس احمد حسین سحر نے اپنے تذکرہ "بہارِ بےخزاں" (تالیف ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء) میں مرزا غالب کے تعارف میں خاصی عبارت آرائی کی ہے لیکن اطلاعات بہت کم قلمبند کی ہیں۔

"مرزا نوشہ اسد اللہ خاں اسد تخلص، از خاندانِ عالی ست. بیشتر غالب می‌کرده وحالا اسد کرده. دریں زماں بہ دار الخلافہ شاہجہاں آباد سکہ بہ نامش می زند. در اوایل بمقتضائے طبعِ دشوار پسند بطرزِ بیدل وقت آفریں بادر شعر می‌کرده وآخر براں طریقہ پشت پا زده، ہمچو نظیری طرزِ خاص ایجاد کرده۔ دیوانے مختصر بعد از ترتیب وتکمیل مرتب ساختہ... بحضورِ والا بس نزاکت بنداں زانوے ادب تہ میکنند۔"

مرزا کے تخلصوں کے بارے میں صحیح صورتِ حال کا بیان کیا جا چکا ہے۔ اس لیے سحر نے جو خیال کیا ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے۔ غالب کے جدید طرز کو نظیری کے طرز کا تتبع قرار دینا اہم بات ہے۔ اگرچہ مرزا غالب کے ایک شاگرد میر حسین تسکین کا ذکر اپنے تذکرے میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کر چکے تھے، سحر پہلا تذکرہ نویس ہے جس نے غالب کی استادانہ حیثیت کا ذکر کیا ہے۔

(۷)

سعادت خاں ناصر نے بھی اگرچہ اپنے تذکرے کی ابتدا اُسی زمانے میں کی تھی اس کا تذکرہ خوش معرکۂ زیبا ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۶ء میں مکمل ہوا۔ ناصر نے اپنے تذکرے میں سلسلۂ تلمذ کے اعتبار سے شاعروں کا حال لکھا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مرزا غالب کے ذکر کے لیے اس نے گلشنِ بیخار ہی کو اپنا ماخذ بنایا تھا اسی لیے وہ مرزا کے تلمذ کا حال نہ لکھ سکا۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

"... مرزا نوشاہ (کذا) اسد اللہ خاں، تخلص غالب.... خلاصۂ خاندانِ فخیم، خوش لہجہ، معجز بیاں۔ کہیں مقطع میں غالب، کہیں اسد۔ سخن اُس کا مستند بھی مسکن اُس کا دہلی، کبھی اکبر آباد۔"

ناصر نے مرزا کے شاگردوں میں سے صرف میر حسین تسکین کا ذکر کیا ہے۔ کسی دوسرے کا حال اس سے دریافت نہیں ہو سکا۔

(۸)

سر سید احمد خاں نے مرزا اسد اللہ خاں غالب کے ساتھ اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "راقم آثم کو جو اعتقاد اِن کی خدمت میں ہے۔ اس کا بیان نہ قدرتِ تقریر میں ہے اور نہ احاطۂ تحریر میں آسکتا ہے۔" سر سید کی کتاب آثار الصنادید کو اس بات کے لیے

شہرت ہے کہ اس میں انھوں نے تحقیق کی ہے لیکن مرزا غالب کے ذکر میں تحقیق پر عقیدت پوری طرح غالب آگئی ہے۔ سرسید نے عبارت آرائی بہت زیادہ کی ہے۔ انھوں نے جو اطلاعات قلمبند کی ہیں، ان میں سے بعض یہ ہیں۔ لکھا ہے :

"۔۔۔۔۔ اسم سامی اِن کے والد ماجد کا عبداللہ بیگ خاں تھا۔ آپ اتراک سے ہیں اور سلسلہ آپ کی نسبت کا افراسیاب و پشنگ تک پہنچتا ہے۔ آپ کے بزرگ سلجوقیوں کے عہد میں بہ سبب اِس کے کہ اِن کے ہم جنس و ہم گہر تھے، فرمانروائی رکھتے تھے۔ جب سلجوقیوں کے عہدِ سلطنت کا دورہ تمام ہوا اُن کے آبا و اجداد نے سمرقند میں توطن اختیار کیا۔ اس حضرت کے جدِ امجد اپنے پدر شفق سے ایک امرِ سہل پر قدرے شکر رنج ہم پہنچا کر ہند میں تشریف لائے اور لاہور میں معین الملک کے رفیق ہوئے اور اس کے تباہ ہونے کے بعد وارد دہلی ہو کر سلطانِ عہد کی سرکار میں سر رشتۂ ملازمت کو ہاتھ میں لا کر سلسلہ چاکری کو استحکام دیا۔ حضرت ممدوح کے والد ماجد دہلی میں متولد ہوئے اور یہیں نشو و نما حاصل کی۔ پھر کسی سبب سے بود و باشِ اکبرآباد اختیار کی اور حضرتِ ممدوح کو والدۂ مشفقہ کے کنارِ شفقت اور آغوشِ عاطفت میں پانچ برس کا چھوڑ کر جناتِ نعیم کی گلگشت کی طرف متوجہ ہوئے۔ آپ کے حقیقی چچا نصراللہ بیگ خاں کہ اُس عہد میں مرہٹہ کی طرف سے اکبرآباد کے صوبیدار تھے، آپ کی پرورش اور تربیت میں مصروف ہوئے۔ جب ہندوستان میں تصرف حکام انگریزی کا ہوا، نصراللہ بیگ خاں، لارڈ لیک بہادر کے رفیق ہو کر چار سو سوار کے رسالے سے امداد کی بادیہ پیمائی کے ساتھ سرگرم جنگ رہے۔ جرنیل لیک صاحب نے اس کارِ نمایاں کے صلے میں دو پرگنے مضافاتِ اکبرآباد سے اُن کی حینِ حیات تک جاگیر میں عطا کیے۔ پھر اِن کے سانحۂ ناگزیر کے بعد جو ۱۸۰۶ء میں پیش آیا، وہ جاگیر موافق قرار داد کے ضبط ہوئی اور جاگیر کے عوض میں حضرت کیواسطے نقدی مقرر ہوگئی۔ پھر وہاں سے بہ سبب انس طبیعت اور میل خاطر کے شاہجہاں آباد میں تشریف لائے اور اس معاش پر قناعت کر کے گوشہ نشینی

اختیار کی ہے اور بہترین شغل آپ کا اس عالم تنہائی میں سخن سنجی اور معنی پروری ہے۔ . . . ایک دیوان قصاید و غزلیات کا تیس جزو سے زیادہ مرتب اور منطبع ہوا ہے اور اسی طرح سے نثر۔ اور ایک کتاب پنج آہنگ نام نہایت فوائد جمیلہ پر مشتمل قریب چودہ پندرہ جزو کے آپ کے نتائج فکر سے ہے۔ . . . اور ایک مثنوی مشتمل اوپر غزواتِ حضرتِ رسالت دستگاہی ختمی پناہی صلعم کے اگرچہ ہنوز ناتمام ہے۔ لیکن پھر بھی پندرہ سولہ جزو کے ہو چکی ہے۔ . . .''

مرزا کے بزرگوں کے بارے میں اس اقتباس میں جو کچھ مذکور ہے وہ سب مرزا غالب کے بیانوں پر مبنی ہے۔ مرزا نے نثر اور نظم دونوں میں بار بار یہ کہا ہے کہ:

''[18]ما ترک نژادم و نسبتِ من بہ افراسیاب و پشنگ می پیوندد۔''

لیکن یہ دعوا بالکل بے دلیل اور بے بنیاد ہے۔ خسرو مرزا لیسوی نے اس دعوے کی صحت کو ثابت کرنے پر بہت[19] محنت کی ہے لیکن وہ بھی شجرۂ نسب پیش نہیں کر سکے ہیں۔ یہ بھی فضول بات ہے کہ سلجوقیوں کے زمانے میں مرزا کے اجداد فرمانروائی رکھتے تھے۔ اول تو اُن کا شاہانِ سلجوق کے ساتھ ''ہم جنس و ہم گہر'' ہونا ہی ثابت نہیں ہے اور اگر ایسا ہو تو بھی بادشاہ کا ہم گہر تو کیا' ہر بیٹا بھی لازماً بادشاہ نہیں ہوتا ہے۔ مرزا کے جن اجداد نے سمرقند میں سکونت اختیار کی تھی' ان میں سے کسی کا نام تک نہیں معلوم ہے۔ کوئی شخص ''قدرے شکر رنجی'' کی وجہ سے جلاوطنی اختیار نہیں کرتا۔ ترکِ وطن کے لیے ضرور ایسی وجہ ہونی چاہیے جو کم سے کم متعلق شخص کی نگاہ میں بڑی ہو۔ خود مرزا غالب نے اپنے دادا کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''[20] دادا قوقان بیگ خاں شاہ عالم کے عہد میں سمرقند سے دلّی میں آیا۔''

اور: ''[21] میرا دادا ماوراءالنہر سے شاہ عالم کے وقت میں ہندوستان میں آیا۔ . . . شاہ عالم کا نوکر ہوا۔ ایک پرگنہ سیر حاصل ذات کی تنخواہ میں پایا۔''

اس میں قباحتیں دو ہیں۔ اول یہ کہ سمرقند اور ماوراءالنہر ایک جگہ کے[22] دو نام نہیں ہیں۔ دوم یہ کہ شاہ[23] عالم کا زمانہ معین الملک کے دور کے کئی برس کے بعد شروع ہوتا ہے۔ قوقان بیگ کو جو پرگنہ ملنا بتایا گیا ہے وہ پہاسو ہے۔ یہ نہیں بتایا گیا کہ وہ پرگنہ قوقان بیگ کی اولاد کے قبضے سے کس طرح نکل گیا۔

مرزا غالب نے ایک دوسرے مقام پر اپنے دادا کے ہندوستان آنے سے متعلق وہی داستان سنائی ہے جو سرسید نے اقتباسِ بالا میں قلمبند کی ہے:

"۲۴ از پدرِ خود رنجیدہ، آہنگِ ہند کرد و بہ لاہور ہمرہی معین الملک گزید۔ چوں بساطِ معین الملک در نوشتند، بدہلی آمدہ، با ذوالفقار الدولہ میر نجف خاں بہادر بپیوست۔ لاں پس پدرم عبداللہ بیگ خاں بہ شاہجہاں آباد بوجود آمدہ و من بہ اکبر آباد۔"

اگرچہ اس میں معین الملک کی ہمراہی کا ذکر ہے لیکن دہلی میں قوقان بیگ کے ذوالفقار الدولہ کی ملازمت اختیار کرنے کا مذکور ہے اور یہ بادشاہ شاہ عالم ثانی کی ملازمت سے مختلف بات ہے۔

خواجہ قمر الدین راقم نے جو مرزا غالب کے ہم جد ہونے کا دعوا کرتے ہیں۔ اپنے خاندان کے بارے میں تفصیلات اس طرح قلمبند کی ہیں:

"۲۵ اس خاندان میں دو برادرانِ حقیقی جن کا نام راقم کو یاد نہیں ان کی اولاد میں دو فرزند ہوئے۔ بڑے بھائی کا بیٹا ترسم خاں اور چھوٹے بھائی کا رستم خاں تھا ان کے والدین فوت ہو گئے۔ یہ دونوں کسی حالت میں اضلاعِ سمرقند میں آکر آباد ہوئے۔ پھر ایک مدت کے بعد بدخشاں آکر رہے۔ یہ دونوں بھائی بھی شرفِ اسلام سے فیضیاب ہوئے اور ترسم خاں نے بدخشاں میں کسی شریف خاندان میں اپنا نکاح بیاہ کر لیا۔ ترسم خاں کی اولاد میں تین دختر اور دو فرزند پیدا ہوئے یعنی ایک فرزند کا نام نصر اللہ بیگ خاں، دوسرے کا عبداللہ بیگ خاں تھا۔ پھر ترسم خاں نے وفات پائی۔ ان کی اولاد مدت تک بدخشاں میں رہی مگر رستم خاں بھائی کے رنج میں بدخشاں میں نہ رہے۔ ۔ ۔ ۔ (رستم خاں کے انتقال کے بعد) نصر اللہ بیگ خاں اور عبداللہ بیگ خاں مع اپنی بہنوں بھتیجے وغیرہ کے ہندوستان میں آئے اور شہر شاہجہاں آباد میں مقیم ہوئے۔ یہ زمانہ شاہ عالم کی سلطنت کا تھا۔ اُن کی بسر اوقات کے لیے ایک پرگنہ پہاسو ۔ ۔ ۔ جاگیر میں دیا۔"

یہ داستان مرزا غالب کے بیانوں سے پوری طرح مختلف ہے۔ ایک بات جس کی صحت

خسرو مرزا لیسوی بھی تسلیم کرتے ہیں، یہ ہے کہ:

"۲۶ مرزا غالب کا شجرہ ترسم خاں سے شروع ہوتا ہے۔"

لیکن مرزا غالب کے بیانوں کی روشنی میں خود ترسم خاں کی شخصیت کا تعین بھی آسان نہیں ہے۔ اُن کے بارے میں راقم کے بیان کی روشنی میں بس یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ نومسلم تھے۔

اتنی بات درست ہے کہ مرزا اسداللہ خاں غالب نے خود تو لمبی عمر پائی تھی لیکن اُن کے والد اغلب ہے کہ عمرِ طبعی کو بھی نہیں پہنچ سکے تھے۔ دادا تو کجا، مرزا نے اپنے والد کو بھی ہوشمندی کی عمر میں نہیں دیکھا تھا، انھوں نے اپنی پھوپی وغیرہ کا بھی ذکر نہیں کیا ہے۔ اپنے اسلاف کے بارے میں اُن کا علم بس واجبی سا تھا البتّہ ان کی کوشش یہی رہی کہ اپنے نسب کو زیادہ سے زیادہ بڑھا چڑھا کر بیان کریں۔ انھوں نے بات سمرقند سے شروع کرکے افراسیاب و پشنگ تک پہنچا دی، جبکہ حال یہ تھا کہ اُنھیں اپنے والد کے انتقال کے بارے میں بھی صحیح بات نہیں معلوم تھی اور انہوں نے لکھا کہ وہ "کسی لڑائی میں مارا گیا"۔

مرزا غالب کا کہنا ہے کہ جب وہ پانچ برس کے تھے اُن کے والد نے انتقال کیا۔ اگر اس بیان پر اعتماد کرلیا جائے تو عبداللہ بیگ خاں کا سالِ وفات ۱۲۰۷ھ/۹۳-۱۷۹۲ء ہوگا۔ اگر بوقتِ وفات اُن کی عمر تیس برس رہی ہو تو وہ شاہ عالم ثانی کے عہد میں پیدا ہوئے ہوں گے۔ امکان ہے کہ جس وقت بادشاہ پر ادبار آیا عبداللہ بیگ اپنے چھوٹے بھائی نصراللہ بیگ وغیرہ کے ساتھ دہلی سے آگرے چلے گئے ہوں گے۔

مرزا عبداللہ کی وفات کے بعد مرزا اسداللہ خاں نے اپنی والدہ کے دامنِ شفقت میں پرورش پائی۔ مرزا غالب نے اپنی والدہ کے بارے میں اطلاع دینا تو کجا، اپنے نانا کا نام بھی عموماً نہیں لیا ہے۔ البتّہ اُن کو اعتراف ہے کہ اُن کے چچا نے اُن کی پرورش کی۔

مرزا غالب کے چچا نصراللہ بیگ نے ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء میں وفات پائی۔ اس کے بعد بھی چند سال تک مرزا اپنے شہر آگرے میں رہے۔ وہاں[۲۸] ان کی کفالت نواب احمد بخش کے ذمّہ تھی۔ سرسیّد کا کہنا ہے کہ دہلی آنے کے بعد مرزا غالب نے گوشہ نشینی اختیار کرلی تھی۔ یہ بات ثبوت طلب ہے۔

مولوی کریم الدین نے اردو شاعروں کے بعد یکے دیگرے دو تذکرے شایع لیے۔ پہلا گلدستۂ نازنیناں جو ۱۲۶۱ھ / ۱۸۴۵ء میں چھپ کر شایع ہوا۔ دوسرا طبقاتِ شعراے ہند جو ۱۲۶۴ھ / ۱۸۴۸ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔ دونوں تذکروں میں مرزا غالب کے حالات کے لیے مولف نے گلشنِ بیخار کو ہی ماخذ بنایا ہے۔ تذکرہ نویسوں کے معمول کے مطابق کریم الدین نے بھی عبارت آرائی زیادہ کی ہے اور اطلاعات کم قلمبند کی ہیں البتہ مولف نے اپنے طور پر جو اضافے کیے ہیں، وہ اہم ہیں۔ گلدستۂ نازنیناں میں ہے:

"اسد تخلص، اسم شریف ان کا نواب اسد اللہ خاں بہادر معروف بمرزا نوشہ خاندانِ فخیم اور رؤسا ے قدیم اکبرآباد نیک بنیاد کے، مدت سے وارد شاہجہاں آباد خجستہ نہاد کے ہیں۔ صاحب دیوان و تصانیف ہیں مگر مدت سے فکرِ ریختہ گوئی زبانِ اردو کا ترک کیا مگر ایک دیوان چھوٹا سا قریب پانچ جز کے تصانیفِ نواب ممدوح سے نظرِ عاجز سے گذرا۔ مگر چونکہ نواب ممدوح حالتِ صبا سے آج تک شوق زبان فارسی کا رکھتے ہیں اور اشعارِ فارسی میں غالب تخلص لکھتے ہیں، چنانچہ ایک دیوان چالیس جز کا زبان مذکور میں شاعر ممدوح کا قالبِ طبع میں آچکا ہے اِس لیے اب فکر اشعارِ اردو کا نہیں کرتے۔"

مرزا کی تصانیف کی تفصیل آثار الصنادید میں مذکور ہے۔ باقی سب باتیں گلشنِ بیخار سے منقول ہیں۔ تخلص کے بارے میں صحیح صورتِ حال کا بیان کیا جا چکا ہے۔

مولوی کریم الدین کے دوسرے تذکرے طبقات شعراے ہند میں مرزا غالب کا تعارف بایں الفاظ کرایا گیا ہے:

"غالب تخلص، اسد اللہ خاں، مشہور مرزا نوشہ، خاندان فخیم اور رؤساے قدیم سے۔ ابتدا میں درمیان اکبرآباد کے رہتے تھے۔ اب شاہجہاں آباد میں ۱۲۵۰ھ ہجری کے قبل سے رہتے ہیں۔ مہارت کتبِ فارسی کی اِن کو بہت ہے۔ اکثر آدمی شاہجہاں آباد میں اِن کے شاگرد ہیں۔ فارسی شعر بھی ان کا بہت اچھا ہوتا ہے۔ ایک دیوان فارسی زبان کا ان کی تصانیف سے منشی نور الدین صاحب کے اہتمام سے مطبعِ صادق الاخبار میں چھپا ہے۔

بہت بڑا دیوان ہے۔ یہ دیوان ۱۲۶۲ ہجری میں مطابق ۱۸۴۷ء کے چھپ کر تیار ہوا ہے۔ اور ایک دیوانِ اردو اِن کی تصنیف سے بہت چھوٹا ہے، وہ بھی مطبعِ سید الاخبار میں درمیان ۱۲۵۷ھ کے چھپا تھا۔ حال اس دیوان کا یہ سننے میں آیا ہے کہ مرزا نوشہ نے ایک بڑا دیوان کئی ہزار اشعار کا فراہم کیا تھا۔ اس کو منتخب کر کے چھوٹا سا دیوان دو تین جز کا بنالیا۔ اس مقولہ کا مؤید صاحب تذکرہ گلشنِ بےخار کا بھی ہے۔ قصیدہ اور غزل دونوں اس شاعر مذکور کے فارسی زبان میں بہت ہیں۔ اردو میں صرف غزلیں ہیں، اور قسم کے اشعار دیکھنے میں نہیں آئے۔ اِن ایّام میں یعنی درمیان مئی ۱۸۴۷ء کے ایک حادثہ اِن پر جانب سرکار سے بڑا بُرا پڑا؛ جس کے سبب اِن کو بہت رنج لاحق ہوا۔ عمر اِن کی اِس سال قریب ساٹھ برس کے ہوگی۔"

مولوی کریم الدّین کے اس تذکرے میں مرزا غالب کے دو اور شاگردوں زین العابدین خاں عارف اور احمد حسین میکش کا ذکر بھی ملتا ہے۔

"۲۹" مرزا اسد اللہ خاں غالب کا اردو دیوان پہلی مرتبہ سید المطابع عرف مطبعِ سید الاخبار دہلی میں باہتمام سید عبدالغفور شعبان ۱۲۵۷ھ، اکتوبر ۱۸۴۱ء میں چھپا تھا۔ اس میں قصیدے قطعے اور رباعی بھی ہیں۔ تعجب ہے کریم الدّین نے یہ بات کس طرح لکھی کہ اردو میں صرف غزلیں ہیں۔

دیوانِ غالب اردو دوسری مرتبہ منشی نور الدّین احمد لکھنوی کے اہتمام سے مطبعِ دارالسلام عرف مطبعِ صادق الاخبار دہلی میں ۱۲۶۳ھ / مئی ۱۸۴۷ء میں اٹھانوے صفحوں میں چھپ تھا۔ اس میں سابقہ کلام کے علاوہ جیسی روٹی والا دو شعر کا قطعہ بھی مندرج ہے۔

مولوی کریم الدّین نے مئی ۱۸۴۷ء کے جس حادثے کا ذکر کیا ہے، وہی چھے برس پہلے بھی پیش آیا تھا۔ ۱۵ / اگست ۱۸۴۱ء کے دہلی اردو اخبار میں مذکور ہے کہ:

"سنا گیا ہے کہ اِن دنوں تھانہ گذر قاسم جان میں مرزا نوشہ کے مکان میں اکثر نامی قمار باز پکڑے گئے، مثل ہاشم علی خاں وغیرہ کے ... کہتے ہیں کہ بڑا قمار ہوتا تھا لیکن بہ سبب رعب اور کثرتِ مرداں کے یا کسی طرح سے، کوئی تھانیدار دست انداز نہیں ہو سکتا تھا، اب تھوڑے دن ہوئے یہ تھانیدار قوم سے

سید اور بہت جری سنا جاتا ہے، مقرر ہوا ہے۔۔ بہت بے طمع ہے۔ یہ مرزا نوشہ ایک شاعر نامی اور رئیس زادہ نواب شمس الدین خاں قاتلِ ولیم فریزر صاحب کے قرابتِ قریبہ میں سے ہے۔ یقین ہے کہ تھانیدار کے پاس بہت رئیسوں کی سعی اور سفارش بھی آئی لیکن اس نے دیانت کو کام فرمایا سب کو گرفتار کیا۔ عدالت سے جرمانہ علیٰ قدرِ مراتب ہوا۔ مرزا نوشہ پر سو روپے۔ نہ ادا کریں تو چار مہینہ قید لیکن ان تھانیدار کی خدا خیر کرے۔ دیانت کو تو کام فرمایا انہوں نے لیکن اس علاقے میں بہت رشتے دار متموّل اس رئیس کے ہیں۔ کچھ تعجب نہیں کہ وقت بیوقت چوٹ پھٹ کریں اور یہ دیانت اِن کی وبالِ جان ہو۔۔۔۔!!

اس واقعہ سے مرزا کی نیک نامی کو زبردست دھکا لگا۔ اِسی دوران دہلی کالج میں فارسی کے استاد کی حیثیت سے امام بخش صہبائی کا تقرر ہوا۔ امیدوار مرزا غالب بھی تھے۔ کریم الدین نے مرزا کا تقرر نہ ہو سکنے کا جو سبب بتایا ہے، اس کے پسِ پشت مذکورہ واقعہ کا اثر بھی ہو سکتا ہے۔

کریم الدین نے مئی، ۱۸۴۷ء کے جس حادثہ کا ذکر کیا ہے، اُس کا ذکر اخبار فوایدالناظرین کلکتہ بابت ۳۱ رمئی ۱۸۴۷ء میں اس طرح آیا ہے۔

> ۲۵ رماہ مئی کو بیچ مکان جناب مرزا نوشہ اسداللہ خاں صاحب کے قمار بازی ہو رہی تھی، چنانچہ کوتوال صاحب خبر پا کر وہاں گئے اور جناب مرزا صاحب کو مع چند قمار بازوں کے گرفتار کر کے کوتوالی میں لے آئے۔ اب دیکھا چاہیے کہ صاحب مجسٹریٹ ان کے متعلق کیا حکم دیتے ہیں۔“

اِس بار خود بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے مرزا کی سفارش کی لیکن احسن الاخبار بمبئی مورخہ ۲۵ رجون، ۱۸۴۷ء سے پتا چلتا ہے کہ انھیں بھی سبکی اٹھانی پڑی۔ احسن الاخبار، بمبئی مورخہ ۲ رجولائی ۱۸۴۷ء میں مرزا کو سزا ہونے کی خبر اس طرح چھپی۔

> ” میرزا اسداللہ خاں غالب پر عدالت فوجداری میں جو مقدمہ دایر تھا، اس کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ مرزا صاحب کو چھ مہینے کی قید بامشقت اور دوسو روپے جرمانہ کی سزا ہوئی۔ اگر دوسو روپے جرمانہ ادا نہ کریں تو چھ مہینے قید میں اور اضافہ ہو جائے گا۔

اور مقررہ جرمانہ کے علاوہ اگر پچاس روپے زیادہ ادا کیے جائیں تو مشقت معاف ہو سکتی ہے .... امید کی جاتی ہے کہ اگر سیشن جج بہادر کی عدالت میں اپیل کی جائے اور اس مقدمہ پر نظر ثانی ہو تو نہ صرف یہ سزا موقوف ہو جائے بلکہ عدالتِ فوجداری سے مقدمہ اٹھا لیا جائے ''

اس واقعہ کو خود مرزا غالب نے اس طرح بیان کیا ہے کہ :

''[۲۲] کوتوال دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناواقف ۔ فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں ۔ باوجودیکہ مجسٹریٹ کوتوال کا حاکم ہے ' میرے باب میں وہ کوتوال کا محکوم بن گیا اور میری قید کا حکم صادر کر دیا ۔ سیشن جج باوجودیکہ میرا دوست تھا اور ہمیشہ مجھ سے دوستی اور مہربانی کے برتاو برتتا تھا اور اکثر صحبتوں میں بے تکلف ملتا تھا ' اس نے بھی اغماض کیا اور تغافل اختیار کیا ۔ صدر میں اپیل کی گئی ۔ مگر کسی نے نہ سنی اور وہی حکم بحال رہا ۔ پھر معلوم نہیں کیا باعث ہوا کہ آدھی میعاد گزر گئی تو مجسٹریٹ کو رحم آیا اور صدر میں میری رپورٹ کی اور وہاں سے حکم رہائی کا آگیا ''

اس تفصیل سے دو باتیں سامنے آتی ہیں ۔ اوّل یہ کہ مقدمات کے فیصلے بہت جلد سنا دیے جاتے تھے اور کسی کے دوست یا دشمن ہونے سے اصل معاملہ پر اثر نہیں پڑتا تھا ۔ بڑی سے بڑی سفارش بھی بے اثر رہتی تھی ۔

مولوی کریم الدین نے مرزا غالب کی عمر کے بارے میں پہلی مرتبہ بتایا ہے کہ ۱۲۶۴ھ ۔ ۱۸۴۸ء میں ساٹھ برس کے قریب تھی ۔ مولوی آغا احمد علی احمد کے تذکرہ[۲۳] ہفت آسمان ' میں ہے کہ

'' در لارنس گزٹ میرٹھ مطبوعہ ۲۷ فروری ۱۸۶۷ء نوشتہ ' عمرِ او تخمیناً ہشتاد و دو سال بودہ است[۲۴] ''

باوجودیکہ غدر سے پہلے ہجری سال لکھنے اور حساب میں اسی کو کام میں لانے کا معمول تھا ۔ مولوی کریم الدین نے عموماً عیسوی سنہ پر زیادہ زور دیا ہے چنانچہ ان کے بیان کے مطابق مرزا غالب کا سالِ ولادت ۱۷۸۶ء مطابق ۱۲۰۲ھ کے قریب ہوگا ۔ اس حساب سے ۱۲۸۳ھ ۔ مطابق فروری ۱۸۶۷ء میں مرزا کی عمر بہ سی برس کے قریب ہو گئی اور یہی بات لارنس گزٹ میں

مذکور ہے۔ اپنے بارے میں خود مرزا غالب کا کہنا ہے:

"میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوا ہوں"

یہاں ان سے تحریر میں غلطی ہوگئی ہوگی یعنی ۱۲۰۲ کو ۱۲۱۲ لکھ گئے ہوں گے۔ بعد کے لوگوں نے اسی کے مطابق مادۂ تاریخ "غریب" مقرر کرلیا اور یہی ان کا سال ولادت مشہور ہوگیا۔

(۱۰)

حکیم میر قطب الدین باطن آگرے کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے نواب مصطفا خاں شیفتہ کے تذکرہ گلشنِ بیخار کے جواب میں اپنا تذکرہ گلستانِ بیخزاں عرف نغمۂ عندلیب ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء میں شروع کرکے ۱۲۶۵ھ/۱۸۴۹ء میں مکمل کیا۔ شیفتہ کے تذکرہ میں جو مقامات انھیں گرفت کے قابل نظر آئے ان کی باطن نے نشاندہی کرکے اپنے خیال کے مطابق تصحیح کردی ہے۔ باطن نے مرزا غالب کے مولد اکبرآباد میں ان کے بارے میں جو سنا تھا کاغذ کی تحویل میں دیدیا ہے۔ ان کے تذکرے سے مرزا کے بارے میں کئی نئی باتیں سامنے آتی ہیں اس لیے ان سے متعلق اس تذکرے کی اہمیت زیادہ ہے۔

باطن نے اپنا تذکرہ اردو میں لکھا ہے اور اپنی لیاقت اور صلاحیت کے اظہار کے لیے انھوں نے طرزِ بیان کو ہر طرح رنگین بنانے کی کوشش کی ہے چنانچہ ان کے یہاں عبارت آرائی اور طولت بہت زیادہ ہے اور جو بات وہ کہنا چاہتے ہیں اکثر لفظوں میں کھو کر رہ جاتی ہے۔ بایں ہمہ اُن کی فراہم کردہ اطلاعات سے صرفِ نظر کرلینا بیجا ہے۔ غالب کے تعارف میں انھوں نے لکھا ہے:

"غالب و اسد تخلص اسد اللہ خاں نام ملقب بہ مرزا نوشہ، آپ دو تخلص کرتے ہیں۔ کچھ تو سبب ہے کہ دو تخلص کرنے پر دل دھرتے ہیں۔ ازنبایر غلام حسین خاں کمیدان، قبل اس سے جدِ دہلی (اکبرآباد) ان کی سکونت کا مکان۔ استادانِ باشعور کے مثل خلیفہ معظم جو بڑے معظم و مکرم اور ہادیِ شعرا، جو بے نظیر روزگار تھے، جن سے تعلیم پائی۔ ایّام صبا سے ببرکتِ انفاس متبرک اِن استادوں کے بمرتبۂ علم پہنچے تب ان کی فکر رسا نے یہ صورت دکھائی

کیوں نہ خوشگو ہوں جن کے ایسے استاد دو ہوں . . یہ تونکہ وہ استاد مر گئے، یہ جذر دہلی سے اُدھر گئے، اب خواہ شاگردی سے انکار کریں یا شاید اقرار کریں، ہاں خود استاد ہیں . .

گو فارسی میں متین ہیں، پر اردو میں تو ذوق ہی نکتہ چیں ہیں . اب بعد وفاتِ ذوق ان کو شاعری میں کمال ہو . کلام ان کا سحرِ حلال ہو مگر زمانہ خالی نہیں . کیا اور کسی کی طبیعت عالی نہیں . غالب جو کسی سے مقابلہ ہو تو حاکمانِ محکمہ شعر کے روبرو معاملہ ہو .

بندے کے والد مرحوم سے کمال ملاقات تھی اور از حد اتحاد کی بات تھی . . . جس طرف طبیعت آئی اُسی کی خاک اڑائی چنانچہ دخترِ رز سے جو تاک لگائی تو وہ ظرف پیدا کیا . . . اور قمار بازی پر جو دھیان کیا تو وہ چھٹے جواری ہوئے کہ . . . . اب یہ دہلی والے ہیں اور بڑے ارادے والے ہیں . شاید قدیم کی نظم و نثر کو خفیف جانتے ہیں غرور کی راہ چاہیں سو فرمائیں . پر دل میں تو ان کا لوہا مانتے ہیں . . . . . روزے کے نام سے انہیں کیا کام، نماز کو ان کا ہر دم سلام .

دیوانِ فارسی ضخیم ہے مگر اردو کا دیوان مانند آمد نامہ قلیل و قدیم ہے . اسدِ فکر نیستانِ کا غذ میں ڈکارتا ہے، روباہِ مضامین کو ناحق جان سے مارتا ہے ؛ ؛

(الف) باطن کا یہ سوال اچھا ہے کہ مرزا دو تخلص کیوں کرتے ہیں ؟ وجہ تو ظاہر نہیں لیکن مرزا کا کلام شاہد ہے کہ دو تخلص بھی ان کے لیے کافی نہیں تھے . وہ کبھی کبھی اپنے نام کو بھی تخلص کے طور پر صرف کرتے تھے .

(ب) مرزا کے نانا کا ذکر اُن تذکرہ نویسوں نے جن کے مرزا سے روابط تھے عموماً نہیں کیا ہے . ذکا کے بعد اُن کا نام پہلی بار باطن نے لیا ہے . باطن نے مرزا غالب کو "از نبائر غلام حسین خاں کیدان" کہ کر متعارف کرایا ہے یعنی مرزا غلام حسین خاں اپنے علاقے کے معروف اور متعارف شخص تھے . ان کے نبیرے کئی تھے . اس کا امکان ہے غالب کی ماں کے علاوہ بھی

ان کی کوئی بیٹی رہی ہو۔ افسوس ہے کہ غالب کے ننھیالی رشتہ داروں کے حالات کی جستجو نہ کرنے کے برابر کی گئی ہے۔ بخوبی ممکن ہے کہ مرزا غالب کے عقاید کی تشکیل میں اُن کی ماں اور نانا کے عقاید کو دخل رہا ہو۔

(ج) باطن نے اکبرآباد میں غالب کی "سکونت کا مکان" بتایا ہے۔ وہ مکان ان کے والد یا چچا کا متروکہ ہوگا۔ باطن نے یہ اہم بات کہی ہے کہ غالب اور پدرِ باطن یعنی حکیم میر محمدی ظاہر کے مابین مضبوط روابط تھے۔ باطن نے یہ بھی کہا ہے کہ اُن کے دادا حکیم میر واجد علی کے احمد بخش خاں کے ساتھ تعلقات تھے۔

"۳۵ مدتِ مدید نواب احمد بخش خاں مرحوم مخاطب بہ فخرالدولہ کو ان کی خدمت کی سعادت سے توقیر"

(د) باطن نے مرزا غالب کے دو استاد بتائے ہیں۔ اوّل نظیر اکبرآبادی، جن کے ذکر میں لکھا ہے کہ:

"۳۶ مرزا اسد صاحب کہ بادیِ شعرا (نظیر) کے شاگرد اور ان کی کیفیت سے خوب آگاہ تھے"

دویمؔ خلیفہ معظم جن کا ذکر ذکا نے بھی اپنے تذکرہ عیار الشعرا میں کیا ہے اور بعد میں امیر مینائی نے بھی لکھا ہے کہ:

"۳۷ (غالب نے) ابتدا میں شیخ معظم نامی ایک معلم سے کچھ تعلیم پائی"

افسوس ہے کہ معظم کے بارے میں کوئی بات معلوم نہیں۔ باطن نے بھی ان سے متعلق کوئی اطلاع نہیں دی بجز اس کے کہ وہ "بڑے معظم و مکرم تھے"۔ مرزا غالب نے نظیر اور معظم کا تو کہیں نام نہیں لیا ہے البتہ یہ کہا ہے کہ:

"۳۸ مجھ کو مبدأ فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے"

اور اس طرح انھوں نے تمام استادوں کی شاگردی سے انکار کر دیا ہے لیکن محض یہ انکار ذکا اور باطن وغیرہ کے بیان کے غلط مان لیے جانے کے لیے کافی نہیں ہے۔

(ہ) غالب کی فارسی کے بارے میں شمس العلما مولوی ذکاء اللہ نے لکھا ہے کہ:

"۳۹ عام اعتقاد مرزا پر یہاں کے لوگوں کا یہ ہے کہ فارسی کا شاعر اچھا تھا

لیکن اردو کی نظم و نثر اُس کی یہاں کے لوگوں کو پسند نہیں۔ تاریخی یا علمی مضامین کے نہ ہونے کا اعتراض مدرسے کے تربیت یافتوں کو سوجھتا ہے۔ نکاتِ غالب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ زبان کی تحقیق میں طفلِ مکتب تھا۔ سوائے چند مصادر کی تحقیقات کے اُس کو اور کسی مضمون سے خبر ہی نہیں۔"

باطن نے بعد وفاتِ ذوقؔ مرزا غالبؔ کے عروج کی جو پیشینگوئی کی ہے یہ دلچسپ بات ہے کہ وہ پوری ہوئی اور کوئی دوسرا شخص اُس درجے کو حاصل نہیں کرسکا۔ (امکان ہے کہ یہ مذکور تذکرۂ باطن میں بعد میں شامل کیا گیا ہو۔)

یہ اہم بات ہے کہ مرزا غالبؔ کی شراب خوری اور قمار بازی کے ذکر کے باوجود باطنؔ نے پوری صراحت کے ساتھ ان کی استادانہ حیثیت اور شاعرانہ کمال کا اعتراف کیا ہے۔ باطنؔ نے مرزا کے دو شاگردوں یعنی عارفؔ اور فگارؔ کا تعارف بھی اپنے تذکرے میں کرایا ہے۔

(۱۱)

لکھنوی تذکرہ نویس سید محسن علی موسوی محسنؔ نے ۱۲۶۹ھ / ۵۳-۱۸۵۲ء میں اپنا تذکرہ سراپا سخن مکمل کیا اور اس تذکرے میں اختصار کے ساتھ مرزا غالبؔ کا تعارف ان لفظوں میں کرایا ہے۔

"غالبؔ مرزا اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ غالبؔ ولد عبداللہ بیگ خان، قوم ترک، اولادِ میں گشتاسپ کی، مولد اکبر آباد، مسکن دہلی، دیوان فارسی اور ریختہ اور پنج آہنگ اِن کی طبعزاد ہے۔ مشاہیر شعرائے دہلی میں ہیں۔"

اِس اقتباس میں کوئی نئی اطلاع فراہم نہیں کی گئی، سوائے اس کے کہ اس سے پہلے کسی تذکرے میں گشتاسپ کا ذکر مرزا کے سلسلے میں نہیں آیا ہے۔

اسپرنگر کے تذکرے "یادگارِ شعرا" اور ڈپٹی نصر اللہ خاں خویشگی کے تذکرے "گلشن ہمیشہ بہار" میں بھی کوئی نئی یا قابلِ ذکر اطلاع مندرج نہیں ہے۔

(۱۲)

مرزا قادر بخش صابر نے اپنا تذکرہ گلستانِ سخن جو اصلاً تذکرۂ معاصرین ہے، ۱۲۷۱ھ / ۵۵-۱۸۵۴ء میں مکمل کیا۔ اس تذکرے میں مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کی شخصی اور شاعری

حیثیت سے تعریف کی گئی ہے اور اِس مقصد کے لیے عبارت آرائی کی گئی ہے اور ان کے حالات میں کوئی قابلِ ذکر اضافہ نہیں کیا گیا ہے۔ مرزا کا تعارف مختصراً اس طرح کرایا گیا ہے:

"غالب تخلص، شیرِ نیستانِ سخنوری، بیشۂ معنی پروری ... مرزا اسداللہ خاں معروف بہ مرزا نوشہ .... ابیاتِ ریختہ عمارتِ ریختہ، دقایقِ فارسی جواہر قدس کا بیختہ۔ ہرچند اشعارِ ریختہ حدِ حصر سے خارج اور اندازۂ شمار سے افزوں تھے لیکن .... ایک دیوان مختصر مرتب کیا، اور مجموعہ فارسی کا تو دیوانِ محشر سے بھی زیادہ .... ریختہ میں گاہ گاہ اسد تخلص بھی کیا ہے لیکن غالب غالب اور ہر طالب اِس نام سے ہندو فارس میں اس کے نشان کا طالب ہے ...."

اوپر مختلف تذکروں میں مرزا غالب کا جس طور پر تعارف کرایا گیا ہے اس کا جائزہ پیش کیا گیا۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ سرور سے کریم الدین کے تذکروں تک میں مرزا کے جو حالات لکھے گئے ہیں، وہ وہی ہیں جو خود مرزا نے اپنی تحریروں میں قلمبند کیے ہیں۔ صرف ذکا اور باطن نے مرزا کا تعارف اپنی معلومات کے مطابق کرایا ہے۔ باطن کے بعد کے تذکروں میں عموماً مرزا کے سوانح میں نہ ہونے کے برابر اضافہ کیا گیا ہے۔ غدر کے بعد مولانا محمد حسین آزاد نے اپنے مشہور تذکرے آبِ حیات میں غالب کے حالات بہت جستجو کے ساتھ قلمبند کر کے مولانا الطاف حسین حالی کی "یادگارِ غالب" کے لکھے جانے کے لیے گویا زمین ہموار کر دی تھی۔

حواشی

(۱) تذکرہ نویسی ص ۲۰۲

(۲) اصبارالغالب ص ۵۱، احوالِ غالب ص ۲۶۷

(۳) بحوالہ تذکرہ نویسی ص ۲۰۶، نگار، جنوری ۱۹۶۳ء ص ۳۳۔

(۴) سرگذشت غالب ص ۱، احوالِ غالب ص ۲۷

(۵) دیوانِ غالب، کامل ص ۱۰۷، ۱۰۹

(۶) تذکرہ نویسی ص ۲۱۶

(۷) دیوانِ غالب، کامل ص ۲۵۹۔ خسرو مرزا یسوی کا یہ کہنا کہ ''مرزا غالب ۱۸۱۲ء ۱۸۱۳ء میں آگرے سے دہلی چلے آئے تھے۔ (اصبارالغالب ص ۵۵) صحیح نہیں ہے۔ اس بارے میں دیوانِ غالب، کامل صفحہ ۱۸، ۱۹ کو بھی دیکھا جائے۔

(۸) گلدستۂ نازنینان ص

(۹) سخنِ شعرا ص

(۱۰) سرگذشت ص ۸۵۔ مرزا ہی کا بیان یہ بھی ہے کہ '' میں نے کوئی دو چار برس ابتدا میں اسد تخلّص رکھا ہے، ورنہ غالب تخلّص ہی لکھتا رہا ہوں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اور کی غزل میرے نام پر لوگ پڑھ دیتے ہیں۔'' (سرگذشت ص ۸۶)

(۱۱) یادگارِ شعرا ص ۱۲۶

(۱۲) گلشنِ بیخار ص ۲۲

(۱۳) دیوانِ غالب کامل ص ۳۶۴

(۱۴) ایضاً ص ۲۳۱

(۱۵) ایضاً ص ۲۵۹

(۱۶) احوالِ غالب ص ۲۰۔ (مرزا کے اردو کلام میں نوشہ تخلص دیکھنے میں نہیں آیا۔

(۱۷) سرگذشت غالب ص ۶۴، ۶۵

(۱۸) احوالِ غالب ص ۲۰۳

(۱۹) اصہارالغالب ص ۵۹ تا ۶۱

(۲۰) احوالِ غالب ص ۲۷

(۲۱) سرگذشت غالب ص ۱

(۲۲) در اقلیم پنجم ... ماوراء النہرولایتے ست۔ شرقیش فرغانہ، غربیش خوارزم وشمالش تاشکند وجنوبیش بلخ وسمرقند، از معظم بلادِ توران است (غیاث اللغات ص ۴۷۹)

(۲۳) مولانا غلام رسول مہر نے شاہ عالم سے مراد شاہ عالم اوّل سے لی ہے اور لکھا ہے کہ "نواب معین الملک کی وفات اور شاہ عالم کی تخت نشینی کے سنین نہ معلوم ہونے کی وجہ سے وہ (غالب) اِس بیان کی تصحیح نہ کر سکے۔ (غالب ص ۳۴) لیکن اُس قدیم زمانے میں سرسید وغیرہ کے روابط کے باوجود غالب سے اِس قسم کی غلطی کی توقع نہیں۔

(۲۴) غالب ص ۳۲

(۲۵) احوالِ غالب ص ۳۰، ۳۱

(۲۶) اصہارالغالب ص ۶۱

(۲۷) سرگذشت غالب ص ۲

(۲۸) اصہارالغالب ص ۲۱، ۲۲

(۲۹) غالب ببلیوگرافی ص

(۳۰) طبقات شعرائے ہند ص ۴۱۴

(۳۱) نگار، جون ۱۹۶۳ء ص ۴۰

(۳۲) سرگذشت غالب ص ۱۳

(۳۳) نگار، جنوری ۱۹۶۳ء ص ۴۰

(۳۴) سرگذشت غالب ص ۱۰

(۳۵) گلستانِ بیخزاں ص ۵۲

(۳۶) الفاز ص ۲۶۰

(۳۷) انتخابِ یادگار ص ۲۴۰

(۳۸) احوالِ غالب ص ۲۳۶

(۳۹) نگار فروری ۱۹۶۳ء ص ۱۱

مآخذ

احوالِ غالب ، ڈاکٹر مختار الدین احمد ، انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ ۱۹۵۳ء
اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نویسی ، ڈاکٹر فرمان فتحپوری ، مجلس ترقی ادب (لاہور) ۱۹۷۲ء
اصبار الغالب ، ناصر الدین احمد خاں عرف خسرو مرزا یسوی ، کتابستان دہلی ۱۹۶۲ء
انتخابِ یادگار امیر احمد امیر مینائی یوپی اردو اکادمی لکھنو ۱۹۸۲ء
تذکرہ بہارِ سخن ، احمد حسین سحر (مرتب) ڈاکٹر نعیم احمد ، علمی مجلس ، دہلی ۱۹۶۸ء
تذکرہ اہلِ دہلی ، سر سید احمد خاں مرتب قاضی احمد میاں اختر ، انجمن ترقی اردو پاکستان ، کراچی
خوش معرکۂ زیبا جلد ۲ سعادت خاں ناصر (مرتب) مشفق خواجہ ، مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۲ء
دہلی اردو اخبار (مرتب) خواجہ احمد فاروقی شعبۂ اردو ، دہلی یونیورسٹی دہلی ۱۹۷۲ء
دیوانِ غالب کامل - تاریخی ترتیب سے (مرتب) کالیداس رضا گپتا ، ساکار پبلشرز بمبئی ۱۹۸۸ء
سخنِ شعرا عبدالغفور خاں نساخ یوپی اردو اکادمی لکھنو ۱۹۸۲ء
سراپا سخن سید محسن علی محسن لکھنوی مطبع نولکشور ، لکھنو ۱۲۷۷ھ / ۱۸۶۱ء
سرگذشتِ غالب میرزا محمد بشیر عزیزی پریس ، آگرہ ۱۹۳۲ء
طبقاتِ شعرائے ہند مولوی کریم الدین یوپی اردو اکادمی لکھنو ۱۹۸۳ء
عمدۂ منتخبہ ، تذکرۂ سرور میر محمد خاں سرور (مرتب) خواجہ احمد فاروقی ، ادبی پرنٹنگ پریس ، بمبئی ۱۹۶۱ء
غالب غلام رسول مہر خواجہ پریس دہلی
غالب ببلیوگرافی محمد انصار اللہ ایجوکیشنل بک ہاؤس / لیتھو کار پرنٹرس ، علی گڑھ ۱۹۷۲ء

گلدستۂ نازنینان ، مولوی کریم الدین دہلی

گلستانِ سخن ، مرزا قادر بخش صابر مطبع نولکشور، لکھنو ۱۲۹۹ھ / ۱۸۸۳ء

گلستانِ بیخزاں قطب الدین باطن " ۱۲۹۲ھ / ۱۸۷۵ء

گلشن بیخار نواب مصطفا خاں شیفتہ رام پرشاد پریس، دہلی ۱۲۵۳ھ/ ۱۸۳۷ء

تذکرہ ہمیشہ بہار نصر اللہ خاں خویشگی (مرتب) ڈاکٹر اسلم فرخی انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی ۱۹۶۷ء

یادگارِ شعرا اسپرنگر (مترجم) طفیل احمد یوپی اردو اکادمی لکھنو ۱۹۸۵ء

ماہنامہ نگار، رام پور جنوری تا جون ۱۹۶۳ء (مدیر) اکبر علی خاں

پروفیسر نثار احمد فاروقی

مطالعۂ غالب کے نئے امکانات

مرزا غالب کی زندگی اور ان کے فن پر پچھلی ایک صدی میں خاصی تحقیق اور تنقید ہو چکی ہے۔ یہ مرزا غالب کی خوش بختی ہے کہ انھیں ہر دور میں اچھے ذہین اور ذی علم لکھنے والے میسر آتے رہے اور امید ہے کہ یہ سلسلہ جاری رہے گا کیونکہ غالب شناسی ہمارے ادب کا ممتاز اور پسندیدہ موضوع بن چکا ہے۔ غالب کے نام سے ہر عالم اور عامی، وضیع و شریف، اپنا اور بیگانہ آشنا ہو چکا ہے، اس کے متداول دیوان کی اشاعت اتنی کثرت سے ہوئی ہے کہ اب اگر دیوان غالب کے کل مطبوعہ اور قلمی نسخے ضائع ہو جائیں تو اُردو والے مل کر اس کا پورا دیوان حافظے سے دوبارہ لکھوا سکتے ہیں۔ غالب کے نام پر ہندوستان کے دل میں دو ایوان بن گئے ہیں، یہاں ریسرچ کی سہولتیں فراہم ہوں گی تو آنے والی نسلیں مختلف موضوعات پر اچھے اور سنجیدہ تحقیقی کام کریں گی۔ اس طرح غالب فہمی کی راہیں زیادہ روشن ہوتی جائیں گی۔ اور اس خوش نصیب شاعر کی زندگی کے معمولی سے معمولی گوشے بھی اُجاگر ہو جائیں گے۔ تب ہم پورے غالب کو دیکھ سکیں گے اور اسی وقت یہ سمجھ میں آئے گا کہ وہ کس عہد کا شاعر تھا، اس کا تخیل کتنا رسا تھا، اس نے اُردو شاعری کو بالکل نئی مگر حد درجہ مانوس آواز کس طرح دی۔ وہ کیوں اپنے اسلوب کا

اردو کی ابتدا اور خود ہی خاتم رہا۔ غالب اردو سے بھی زیادہ وقت تک زبان زد عام بن چکے ہے۔ عالمی ادب کی محفل میں جہاں ہم تو ابھی اس دنیا کو زندگی کے پیچھے بیٹھے وہاں رفتہ رفتہ غالب بھی اپنی جگہ بنا رہا ہے۔ آنے والے زمانے میں جب اس کی تصانیف کے مکمل اور اچھے تراجم دنیا کی بڑی بڑی زبانوں میں ہو جائیں گے تو اسے یقیناً اس سے بھی برتر مقام حاصل ہوگا جس پر وہ آج نظر آتا ہے۔ جس طرح فارسی میں سعدی و حافظ، عربی میں المتنبی، انگریزی میں شیکسپیئر ایسے شاعر ہیں کہ وہ اس حیاتِ جاوداں حاصل کر چکے ہیں کہ اب خواہ یہ زبانیں فنا ہو جائیں، ان کے نام نہیں مٹ سکتے۔ اسی طرح غالب ہر تنقید و اضافت سے ماورا ہو گیا ہے۔ اس کی مقبولیت کا دائرہ ابھی اور وسیع ہوگا۔ یہاں تک کہ آنے والی نسلیں اسے ہم سے زیادہ عزیز رکھیں گی۔ اس لیے ہمیں یہ سوچنا ہے کہ غالب کے ذکر میں تحقیق و تنقید کے کون سے پہلو ابھی تشنہ ہیں، غالب شناسی کو ابھی کیا درکار ہے اور کون سے گوشے ناپیمودہ رہ گئے ہیں۔

ابھی غالب پر جتنے کام ہوئے ہیں سب انفرادی ذوق اور کوشش کا نتیجہ ہیں۔ ہر شخص کے وسائل محدود ہوتے ہیں۔ قوتِ کار، استعداد اور تخصیصات انفرادی کام کو ایک حد میں ہی رکھتے ہیں۔ لیکن اب وقت آ رہا ہے کہ غالب شناسی اجتماعی کوششوں کا موضوع بنے۔ آئندہ غالب کے سلسلے میں بہتر اور برتر کام اجتماعی شکل ہی میں ہو سکتے ہیں۔ ابھی تک غالب کو پھیلانے کا کام ہوا ہے۔ اب اسے سمیٹنے Accumulation کی ضرورت ہے۔ یہاں ایسے کاموں کا ایک اشاریہ پیش کیا جاتا ہے جنھیں ہم کسی ادارے کے وسائل اور اجتماعی کوششوں کو بروئے کار لا کر انجام دے سکتے ہیں۔

۱۔ مستند متن:

دیوانِ غالب کے سوا غالب کی دوسری تصانیف کے مستند اور محشّٰی متن موجود نہیں ہیں۔ یہ کام بہت ضروری ہے کہ غالب کی کل تصانیف نظم و نثر کو جو اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں ہیں نئے سرے سے ایڈٹ کیا جائے۔ پہلے ہمیں کچھ اصول و ضوابط وضع کرنے ہوں گے کہ ان تصانیف کی تدوین کن خطوط پر ہو۔ کون سے متن کو اساس

بنایا جائے۔ اختلافات روایت کو کس طرح درج کیا جائے۔ املا کون سا ہو یعنی جو غالب کا اختیار کردہ تھا، یا جو آج رائج ہے یا جو از روئے لغت و قواعد درست ہے اس طرح کے جتنے مسائل سامنے آئیں ان پر غور و فکر کے بعد جو طریق اور نسخ اختیار کیا جائے گا اُس کی روشنی میں ہم تصانیف غالب کے مکمل، مستند اور خوبصورت یونیفارم ایڈیشن تیار کر سکتے ہیں۔ انگریزی میں بہت سے شاعروں اور ادیبوں کے Uniform Editions چھپے ہیں، ان کو سامنے رکھ کر یہ خاکہ بنایا جا سکتا ہے۔ غالب کی تصانیف کے یونیفارم ایڈیشن چھاپنے کے لیے Henry Irwing کے مرتب کردہ شکسپیر کے Works بھی ایک نمونہ بن سکتے ہیں۔ سرسری طور پر اس کا خاکہ یوں ہوگا:

پہلی جلد: اس کے دو حصے ہوں:

حصہ اول: متداول دیوان۔

حصہ دوم: منسوخ کیا ہوا اور متفرق کلام۔

دوسری جلد: اس کے تین حصے ہوں:

پہلے حصے میں: اُردو خطوط جو عودِ ہندی اور اُردوئے معلّی میں موجود ہیں، تاریخی ترتیب کے ساتھ۔

دوسرے حصے میں: وہ خطوط جو متفرق ماخذ میں ہیں اور پچھلی ایک صدی میں وقتاً فوقتاً دریافت ہوتے رہے ہیں۔

تیسرے حصے میں: غالب کی متفرق اُردو تحریریں، تقریظیں، نوٹس وغیرہ۔

تیسری جلد: اس کے تین حصے ہوں:

پہلا حصہ: غزلیات فارسی۔

دوسرا حصہ: قصائد فارسی۔

تیسرا حصہ: مثنویات اور دوسری اصناف سخن۔

سبدِ چیں اور سبد باغ دو در کا کلام بھی انھیں حصوں میں اپنے اپنے محل پر شامل

ہو جائے گا۔ اور اسے گوارا کیا جائے تو ترتیب یہ ٹھہرتی ہے۔ اس سے خارج جتنا متفرق کلام ہے وہ علیحدہ ایک حصے میں فراہم کیا جا سکتا ہے۔

چوتھی جلد : یہ تصنیف نثری ہوگی اس کے چار حصے کیے جائیں :

پہلا حصہ : مہر نیمروز

دوسرا حصہ : دستنبو

تیسرا حصہ : فارسی خطوط جو "پنج آہنگ" میں شامل ہیں۔ اور جو "باغ دودر" "متفرقات غالب" "نامہ ہائے فارسی غالب" "تلامذہ غالب" وغیرہ میں ملتے ہیں۔ یہ تاریخی ترتیب سے یک جا ہوں گے۔

چوتھا حصہ : قاطع برہان و رسائل متعلقہ۔

پانچواں حصہ : غالب کی متفرق فارسی تحریریں۔ اسی میں پنج آہنگ کے نثری حصے جو خطوط کے ماسوا ہیں شامل ہو سکتے ہیں۔

اگر یہ ترتیب متفق علیہ نہ ہو تو اور صورتیں بھی ہو سکتی ہیں۔ ان میں ایک سامنے کی صورت یہی ہے کہ غالب کی زندگی میں ان کی جتنی تصانیف جن ناموں سے چھپیں وہ اسی طرح چھاپ دی جائیں اور متفرق کلام نظم و نثر جو اہل تحقیق کھوجتے رہے ہیں وہ علیحدہ جلد میں آ جائے اس میں یہی خرابی رہے گی کہ بعد میں دریافت ہونے والی تحریریں اپنی صحیح جگہ پر نہیں پہنچ سکیں گی۔ مثلاً غالب کا ایک اردو خط بنام ہرگوپال تفتہ میں نے دریافت کیا تھا جو "تلامذہ غالب" میں موجود ہے۔ اس کا زمانہ جون ۱۸۵۴ء متعین ہوتا ہے۔

خطوط غالب مرتبہ مہیش پرشاد میں یہ خط نمبر ۲۵ اور ۲۶ کے درمیان آنا چاہیئے۔ اگر اسے علیحدہ جلد میں ڈال دیا تو پورا سیاق و سباق ہر شخص کے سامنے نہیں آ سکتا جب تک وہ اصل کتاب کے ساتھ متفرقات کی جلد کا بھی مطالعہ نہ کرے۔ لیکن ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ غالب کی تصانیف نظم و نثر کا متن ہم اپنی سہولت اور ضرورت کے لحاظ سے اور وضع کردہ اصولوں کی روشنی ہی میں ترتیب دیں اور یہ ہرگز خیال نہ کریں کہ غالب کی زندگی میں "پنج آہنگ" ایک کتاب کی صورت میں چھپی تھی ہم نے پانچواں آہنگ کسی جلد میں رکھ دیا اور

پر توجہ کریں اور متن کو چند مسئلوں پر ترتیب دے کر تمام اہم نکات کی تعبیر و تشریح اور تقاضوں کا خیال کریں۔ اور تصانیف غالب یا غالب سے متعلق اہم کتابوں کے نئے ایڈیشن صحیح چھاپے جائیں۔ مثلاً دیوان غالب کے پانچوں ایڈیشن جو غالب کی زندگی میں چھپے تھے فوٹو آفسٹ کے ذریعے دوبارہ جوں کے توں چھاپے جائیں۔ اسی طرح کلیات نظم غالب کے ایڈیشن پھر نسخۂ امروہہ، نسخۂ حمیدیہ، نسخۂ شیرانی، گل رعنا، سبد چین، پنج آہنگ، مہر نیم روز، درفش کاویانی یہ سب عکسی طباعت میں آسکتے ہیں۔ غالبیات کے سلسلے کی بعض اہم کتابیں مثلاً انتخاب غالب اور مکاتیب غالب کے اولین ایڈیشن بھی اس منصوبے میں شامل ہوسکتے ہیں۔

۲۔ تصانیف غالب کے تراجم۔ دوسرا اہم اور ضروری کام ترجمے کا ہے۔ اس منصوبے کو بھی بڑے پیمانے پر پھیلایا جا سکتا ہے۔ ترجمے کا کام تین حصوں میں تقسیم ہوگا۔

۲ : ۱۔ غالب کی فارسی تصانیف کا ترجمہ اردو زبان میں۔ اس میں کلیات نظم فارسی کی مکمل شرح بھی شامل ہے۔

۲ : ۲۔ غالب کی تصانیف کے وہ حصے جن سے ہندستان کی دوسری علاقائی زبانوں کو بھی دلچسپی ہوسکتی ہے۔ دیوان کا ترجمہ اور شرح تو ہندستان کی تمام علاقائی زبانوں میں ہو۔ البتہ خصوصیہ اردو اور فارسی کے ضروری انتخابات اسی مقصد سے کرائے جائیں۔

۲ : ۳۔ غیرملکی زبانوں میں دیوانِ غالب، خطوط غالب اور دوسری تصانیف کے منتخب حصوں کا ترجمہ۔ ان میں فارسی، عربی، ترکی، انگریزی، جرمن، چینی، فرنچ، روسی، اطالوی اور ازبک زبانوں کو ترجیح حاصل ہوگی۔

غالب کے افکار کا ایک ایسا نمائندہ انتخاب بھی تیار کیا جائے جس میں نئی نسل کے لیے غور و فکر اور پسندیدگی کا سرمایہ ہو اور وہ انتخاب دنیا کی تمام بڑی زبانوں میں ترجمہ کرایا جائے۔

ہم نے غیر اردو داں دنیا کے سامنے ابھی تک غالب کا نام ہی پیش کیا ہے۔ اس کے فن کی نمائندگی نہیں ہوسکی ہے۔ ایسے انتخابات اور ان کے تراجم میں اسی بات پر زیادہ

زور دینا ہوگا۔

۳۔ فرہنگ اور اشاریہ۔ تیسرا بڑا منصوبہ متعلقات غالب کی فرہنگ اور اشاریہ بنانے کا ہے۔ یہ فرہنگ دو جلدوں میں ہو۔ پہلی جلد لغات فارسی اور دوسری لغات اردو۔ اس میں وہ کل الفاظ آجائیں جو غالب کی جملہ معلوم تحریروں میں استعمال ہوئے ہیں۔ اُن کا مکمل حوالہ ہو بلکہ وہ جملہ یا مصرع بھی درج کردیا جائے جس میں لفظ استعمال ہوا ہے۔ اسے حسب ضرورت وسیع بھی کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً ایک لفظ کی مثالوں میں متقدمین شعرا کی سند بھی درج ہو۔ کچھ اور ضروری تشریح یا دوسری لغات کے حوالے وغیرہ۔

اشاریۂ غالب میں ایسے تمام اسما و اعلام جمع کیے جائیں جن کا غالب کی تحریروں میں تذکرہ ملتا ہے۔ مثلاً ہمیں یہ معلوم کرنا ہو کہ دلی کے محلہ چاندنی چوک کا حوالہ غالب کی تحریروں میں کہاں کہاں ملتا ہے تو یہ اشاریہ ہماری رہنمائی کرے۔ یہ ہرگوپال تفتہ کا ذکر کہاں کہاں ملے گا، یہ اشاریہ بتائے۔

۴۔ کتابیات۔ چوتھا منصوبہ کتابیات غالب Ghalib Bibliography کا ہے۔ چھوٹے پیمانے پر کچھ حضرات نے بشمول راقم الحروف یہ کام کیا ہے مگر ان میں سے کوئی بھی مکمل نہیں ہے۔ ببلیوگرافی کبھی مکمل ہو بھی نہیں سکتی۔ اس کے لیے بہترین طریق یہ ہوگا کہ ایوان غالب میں اس کا ایک شعبہ علیحدہ قائم کیا جائے جسے Documentation برانچ کہا جاسکتا ہے۔ اس میں ایک ریسرچ اسکالر یا Documentation Officer ایک دو اس کے معاون اور Typist وغیرہ ہوں۔ کیٹلاگ Cabinet بنوائی جائیں اور Cards پر تمام کتابوں، مضامین اور متقاطع حوالوں کے اندراج ہوں، جنھیں ۱۰ یا ۱۵ ہزار حوالوں کی ایک جلد میں چھاپ دیا جائے۔ اسی طرح جب مزید دس ہزار حوالے فراہم ہوجائیں تو انھیں دوسری جلد میں جگہ دی جائے۔ اس میں ہر مضمون کا خلاصہ لازماً دینا ضروری نہیں۔ البتہ جہاں عنوان سے ظاہر نہ ہوتا ہو کہ مندرجات کیا ہیں وہاں کم سے کم لفظوں میں اس کا اظہار کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً کسی مضمون کا عنوان ہے: "مرزا غالب کے دربار اودھ سے تعلقات" اس سے ظاہر ہے کہ مضمون میں کیا ہوگا۔ لیکن

اگر دیوانِ اردو "غالب کی ایک ادبی تفسیر" تو یہاں ضرور بتانا پڑے گا کہ کون سے تفسیر سے استفادہ کیا گیا ہے۔ غالب پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اب جمع گری نئی نہ ہونے کی صورت میں غلط فہمی پیدا ہونے یا تکرار ہو جانے کا شدید اندیشہ رہتا ہے۔ اس لیے اگر دوسرے منصوبوں پر اسے ترجیح دی جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

۵۔ جہانِ غالب۔ یہ پانچواں بڑا منصوبہ جہانِ غالب کا ہے۔ اسے آپ غالب انسائیکلوپیڈیا کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ اس میں اسماء الرجال کے علاوہ ہر چیز جس کا غالب کی تحریروں میں حوالہ ملتا ہے، آجائے گی۔ غالب کے رشتہ دار، احباب، تلامذہ، ممدوحین، معاصرین یا جن کتابوں میں غالب کا حوالہ ملتا ہے، جن شہروں اور محلوں کا تذکرہ ان کے خطوط میں ہے یا جو تلمیحات ان کے کلام اردو و فارسی میں استعمال ہوئی ہیں ان سب کا ذکر 'جہانِ غالب' میں شامل ہوگا۔ مثلاً صدرالدین آزردہ عنوان ہے تو اس میں آزردہ کے مختصر اور جامع حالات، غالب سے ان کے تعلقات، غالب کی جن تحریروں میں آزردہ کا ذکر ہے ان کے حوالے، اور پھر حالاتِ آزردہ کے مآخذ۔ اسی طرح سلطان جی کی باؤلی، قاری کا کنواں، مرزا گوہر کا باغیچہ وغیرہ دہلی کے محلوں کا ذکر ہے 'جہانِ غالب' میں تفصیل کے ساتھ ان کا محل وقوع بتایا جائے گا۔ کتابوں میں آمد نامہ، انشائے من، بوستانِ خیال یا شبستان کا غالب نے حوالہ دیا ہے۔ اُن کی تفصیل 'جہانِ غالب' کا موضوع ہوگی۔

بہت سی شخصیات کا تذکرہ غالب کی تحریروں میں ملتا ہے مگر اُن کا حال معلوم نہیں مثلاً بدرالدین کاشف کے نام غالب کے پانچ اُردو خطوط ملتے ہیں۔ غلام رسول مہر نے خطوطِ غالب میں یہ اہتمام کیا ہے کہ مکتوب الیہم کے ضروری اور مختصر حالات درج کریں مگر بدرالدین کاشف کا انھیں کچھ حال معلوم نہ ہوا۔ مالک رام صاحب نے انھیں تلامذۂ غالب میں شمار کیا ہے مگر صرف نام درج ہوا ہے حالات یا کلام میں ایک سطر بھی نہیں۔ عبدالرؤف عروج نے 'بزمِ غالب' میں اتنا ہی لکھا ہے جو مہر نے 'خطوطِ غالب' میں لکھا تھا۔ حالات معلوم نہ ہونے سے قباحت یہ ہے کہ بدرالدین کاشف کے نام جو خطوط ہیں اُن کے مشمولات اچھی طرح سمجھ میں نہیں آتے۔ مثلاً ان میں نواب محمد میر خاں کا حوالہ ہے

سید محمد صاحب ... ان کے دونوں بھائیوں کا ذکر ہے۔ غالب کی تحریروں میں ... خان صاحب
صاحب کا تذکرہ ہے۔ جب تک کہ شخص کے حالات منکشف نہ ہوں یہ سب پردۂ
خفا میں رہتے ہیں۔ ... الدین کا شخص در اصل سید وحید الدین بیخود دہلوی کے دادا اور
شاہ ... الدین محمد سعید ... کے نواسے تھے۔ سید علی غمگین دہلوی ثم گوالیاری ان کے
بھی تھے۔ ان کے خاندان کے حالات سیرت الصالحین میں ملتے ہیں۔

دوسرا مجھے حال ہی میں ایک "تذکرۂ ... فقرائے ملتان" کا مؤلف ... حسین جعفی
ہے۔ یہ ... کے رہنے والا اور ... حسین خان ... کا پوتا ہے۔ انھیں ... حسین خان
کا حوالہ ... الدولہ شفق کے موسومہ خطوط میں متعدد بار آیا ہے۔ ایسی شخصیات یا اسما و
اعلام جن کا نسخۂ غالب میں حوالہ ہے اگر ہم نہ ہیں اور ہم ان کے بارے میں ضروری
باتیں جانتے ہوں تو اس سے غالب کی تحریروں کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ بلکہ بعض
اوقات حیرت انگیز باتیں معلوم ہوتی ہیں اور اندازہ ہوتا ہے کہ کل وقت ... دلچسپ ہوا
تھا۔ اس لیے جہانِ غالب کی تکمیل بھی ضروری ہے۔ اس کام کا آغاز تو نئی خبر ... و
... حصہ ہو کر چکے ہیں انھیں خطوط پر اس منصوبے کو مکمل کیا جا سکتا ہے۔

۶۔ اصل تحریریں: چھٹا منصوبہ یہ ہے کہ غالب کی جتنی تحریریں اب تک دستیاب
ہوں میں انھیں یک جا کیا جائے۔ اب تو پوری پوری دو کتابیں غالب کے خط میں لکھی ہوئی
دستیاب ہیں ایک "دیوانِ غالب نسخۂ امروہہ" دوسرے "گلِ رعنا کا نسخۂ لاہور"۔ ان کے
علاوہ غالب کے اصل خطوط ان کے قلم سے لکھی ہوئی بعض غزلیں یا کتابوں پر اُن کے حواشی۔
یہ سب ابھی تک بکھرے پڑے ہیں انھیں یا تو اس طرح Catalogue کیا جائے
کہ ان کی تاریخی ترتیب ہو جائے۔ یا نظم و نثر اُردو و فارسی کی ترتیب ہو۔ سب سے بہتر شکل
یہ ہوگی کہ غالب کی تصانیف کے یونیفارم ایڈیشن جس کا تذکرہ میں نے منصوبہ نمبر ا کے
تحت کیا ہے اس میں ہر تحریر اُسی موقع پر کتاب میں بصورت عکس آجائے۔ اصل
کی تصویر دینے سے تین فائدے ہوں گے ایک تو وہ اپنی صحیح جگہ پہنچ کر محفوظ ہو جائے گی،
دوسرے جتنی عبارت کا عکس شامل کتاب ہوگا کم سے کم اتنا حصہ متن کا شک و شبہ سے

ہو جائے گا۔ جس سے غالب کی تحریروں کا مطالعہ اور ان کے املا کی تحقیق کرنے میں سہولت ہو سکے گی۔

۷۔ غالب کا تفصیلی مطالعہ: ہمارے غالب شناسوں میں قاضی عبدالودود، شیخ محمد اکرام، غلام رسول مہر، مالک رام، اور مولانا عرشی نے غالب کی زندگی کا بڑی کاوش سے مطالعہ کیا ہے۔ ان حضرات نے اپنی سالہا سال کی محنت اور تلاش و تحقیق سے جزئیات کے ایسے ڈھونڈ نکال لیے ہیں کہ اگر وہ ان کی کوشش سے دریافت نہ ہوئے ہوتے تو اب تک ضائع ہو جاتے ہیں۔ یادگار غالب، غالب نامہ، ذکر غالب، غالب از مہر وغیرہ: ان سب کتابوں کے مصنفین کا انداز تحقیق اور طرز استنباط جداگانہ ہے۔ ان میں سے کوئی کتاب ہمیں دوسری کتاب سے بے نیاز نہیں کرتی۔ یہ ان تصانیف کی خوبی ہے لیکن اب یہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ یک جلدی سوانح عمریوں سے آگے بڑھ کر غالب پر ایسا کام سامنے آئے جو کئی جلدوں پر پھیلا ہوا ہو اور غالب سے متعلق سارے مباحث کو پوری تفصیلات اور حوالوں کے ساتھ اس میں یکجا کر دیا گیا ہو۔ ایسی جامع کتاب کا ایک خاکہ کچھ اس طرح کا ہو سکتا ہے کہ

پہلی جلد۔ ۱۷۹۷۔ ۱۸۱۵۔ خاندان، آبا و اجداد، ابتدائی تعلیم و تربیت اور غالب کی آگرے کی زندگی سے متعلق کل مباحث۔ یہ تقریباً ۱۸۱۶ء تک کے واقعات کو محیط ہو۔

دوسری جلد۔ ۱۸۱۵۔ ۱۸۵۰۔ دلی میں مستقل قیام سے ۱۸۵۰ء تک۔ جس میں مقدمہ پنشن، حادثۂ اسیری وغیرہ سب آجاتے ہیں۔

تیسری جلد۔ ۱۸۵۰۔ ۱۸۵۸۔ اس میں قلعے کی ملازمت، دلی کی ادبی اور سماجی زندگی اور دوسری جزوی تفصیلات ہوں۔ ان کے علاوہ 'غدر' کا حال اور اُس کے اثراتِ مابعد۔

چوتھی جلد۔ ۱۸۵۸۔ ۱۸۶۹۔ دلی بعد غدر، معرکۂ قاطع برہان، دربار رامپور سے تعلقات وغیرہ۔

پانچویں جلد۔ غالب کی کل تصانیف نظم و نثر فارسی و اردو کا تفصیلی تذکرہ، تنقید

اور جوا ہے۔

چھٹی جلد۔ غالب کی شاعری کا عہد بہ عہد مطالعہ، اُردو شاعری پر اُن کے اثرات وغیرہ۔

ساتویں جلد۔ غالبیات کے تمام لٹریچر کا تنقیدی جائزہ۔

آٹھویں جلد۔ غالب کے اسماء الرجال اور ان کے مصادر نیز ضمیمے کے طور پر جو امور درج کرنا ہوں۔

آج ہمیں یہ منصوبے شیخ چلی کا پلاؤ معلوم ہوں تو عجب نہیں۔ لیکن اس پر خندہ زنی سے پہلے چند باتیں ذہن میں رکھنا چاہئیں۔ ایک تو یہ کہ ابھی تک کوئی ادارہ غالب کے متعلق تحقیق و تنقید کا نہیں تھا۔ افراد کی کوششیں وہ نتائج پیش نہیں کرسکتیں جو ایک ادارے سے ممکن ہیں۔ اب جو ایسے ادارے وجود میں آئے ہیں جہاں یہ ساری سہولتیں فراہم ہوسکتی ہیں اور مالیات کا مسئلہ بھی حل ہوسکتا ہے تو ہمیں عالمی معیار نقد و تحقیق کو نظر میں رکھ کر ایسے ہی کام کرنے چاہئیں جو عمومی حالات میں انفرادی طور پر نہیں ہوسکتے۔ اگر ہم محض دیوان غالب کے سستے یا مہنگے ایڈیشن چھاپتے رہے، کتابچے، پمفلٹ یا سوونیر نکالتے رہے، جلسے، مشاعرے، سیمنار اور شام غالب وغیرہ کے پروگرام ہی کرتے رہے تو ہم اپنے مقصد سے دور ہوتے جائیں گے۔

دوسری بات یہ کہ آیندہ نسلیں ہماری بہ نسبت عالمی معیار تحقیق سے زیادہ مانوس ہوں گی اور اُن کی تشفی ایسے بے ربط اور تشنہ کاموں سے نہیں ہوسکتی جن سے ہم اب تک سرخرو ہوتے رہے ہیں۔ اور اس معیار پر کام کرنے کے لیے ہمیں زیادہ سائنٹی فک ہونا پڑے گا۔ اب Universal Methods سامنے رکھ کر ہی ہم بڑے اور اچھے کام کرسکیں گے۔

تیسری بات یہ کہ غالب کہنے کو ایک شاعر ہے مگر اُس کا گہرا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ کرنے والے کا چند صفات سے متصف ہونا ضروری ہے یعنی اُسے تاریخ کا شعور ہو، فارسی زبان سے عالمانہ واقفیت ہو، اُردو شاعری کی روایات اور عہد بہ عہد ارتقا پر نظر ہو، وہ علوم مغربی جن کا نفوذ عہد غالب سے شروع ہوچکا تھا ان سے باخبر ہو، لغات

بزرگوں کے ختم ہونے سے ہندوستانی شائستگی کے نمونے ختم ہو رہے۔ آئندہ نسلیں ان کی صفات سے
کے جوہر سے عاری ہوں گے۔ سچ یہ ہے کہ ان کا ذہن، مزاج، ضرورتیں اور تقاضے ہم سے
مختلف ہوں گے لہذا ان امور میں وہ نسل ہمارے عہد کے علما اور محققین پر انحصار
کرے گی یا ان سے روشنی حاصل کرے گی۔ مجھے امید نہیں کہ اکیسویں صدی میں قاضی
عبدالودود، غلام رسول مہر اور شیخ اکرام جیسے غالب شناس ہوں گے۔ اس کا یہ سبب نہیں کہ
میں آئندہ نسلوں سے مایوس ہوں بلکہ ایک تو ان کے پاس غالب کے سوا بھی بہت سے غم
ہوں گے دوسرے ان کے اپنے معیار اور اپنی اقدار ہوں گی۔ غالب کو وہ پڑھیں تو ہیں گے
مگر انھیں عربی، فارسی، اردو وغیرہ سے اتنی گہری وابستگی یا مناسبت نہیں ہوگی جو اس نسل
کو ہے جس نے اپنی تعلیم آزادیٔ ہند سے پہلے مکمل کر لی تھی اور جس نے اپنے بزرگوں سے
انیسویں اور بیسویں صدی کی روایات بھی ورثے میں پائی ہیں جو غالب کا عہد تھا۔ اس
لیے ہمیں اپنی ذمہ داریوں کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ آج قاضی عبدالودود صاحب لکھتے ہیں
کہ مولانا حالی اگر ادنیٰ سا اہتمام بھی کرتے تو انھیں سوانحِ غالب کے بہت سے پہلوؤں پر
زندہ اشخاص یا دستاویزوں سے استفادہ کرنے کے ہم سے بہتر مواقع حاصل تھے مگر انھوں
نے ایسا نہیں کیا۔ کیا آنے والی نسلیں ہم سے ایسا ہی مطالبہ نہیں کر سکتیں اگر ہم اپنے وسائل
سے کام لینے میں کوتاہی کریں؟

(ایوانِ غالب، نئی دہلی کے پہلے سمینار میں پڑھا گیا)

ڈاکٹر نیر مسعود

تحقیقِ غالبؔ: حالیؔ

(بہ حوالۂ "یادگارِ غالبؔ")

"یادگارِ غالبؔ" کے دیباچے میں کتاب کے سببِ تالیف کا ذکر کرتے ہوئے حالیؔ لکھتے ہیں:

"اگرچہ مرزا کی تمام لائف میں کوئی بڑا کام اُن کی شاعری اور انشا پردازی کے سوا نظر نہیں آتا، مگر صرف اسی ایک کام نے ان کی لائف کو دارالخلافہ کے اخیر دور کا ایک مہتم بالشّان واقعہ بنا دیا ہے اور میرا خیال ہے کہ اس ملک میں مرزا پر نظم و نثر کا خاتمہ ہوگیا، اور اردو نظم و نثر پر بھی اُن کا کچھ کم احسان نہیں ہے، اس لیے کبھی کبھی مجھ کو اس بات کا خیال آتا تھا کہ مرزا کی زندگی کے عام حالات جس قدر کہ معتبر ذریعوں سے معلوم ہو سکیں اور ان کی شاعری اور انشا پردازی کے متعلق جو امور کہ احاطۂ بیان میں آسکیں اور ابنائے زماں کی فہم سے بالاتر نہ ہوں، ان کو اپنے سلیقے کے موافق قلم بند کروں"

کچھ آگے چل کر لکھتے ہیں:

"مرزا کی لائف میں کوئی منوّہ بالشان واقعہ ان کی شاعری و انشا پردازی کے سوا نظر نہیں آتا۔ لہٰذا جس قدر واقعات اُن کی لائف کے متعلق اس کتاب میں مذکور ہیں، ان کو ضمنی اور استطرادی سمجھنا چاہیے۔ اصل مقصود اس کتاب کے لکھنے سے شاعری کے اس عجیب و غریب ملکے کا لوگوں پر ظاہر کرنا ہے جو خدا تعالیٰ نے مرزا کی فطرت میں ودیعت کیا تھا اور جو کبھی نظم و نثر کے پیرایے میں، کبھی ظرافت اور بذلہ سنجی کے روپ میں، کبھی عشق بازی اور رندمشربی کے لباس میں، اور کبھی تصوّف اور حبِ اہلِ بیت کی صورت میں ظہور کرتا تھا۔ پس جو ذکر ان پیرایوں باتوں سے علاقہ

نہیں رکھتا اس کو کتاب کے موضوع سے خارج سمجھنا چاہیے"

یعنی حالی کا اصل مقصد غالب کے ادبی کمالات سے دنیا کو روشناس کرانا تھا۔ غالب کے حالاتِ زندگی اُن کے نزدیک کوئی خاص اہمیت نہیں تھی اس لیے کہ غالب نے اپنی زندگی میں شاعری اور انشاپردازی کے سوا کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا تھا، لہٰذا حالی کے نقطۂ نظر سے مناسب طریق کار یہی تھا کہ غالب کے اس واحد کارنامے پر زیادہ سے زیادہ روشنی ڈالیں اور برسبیلِ تذکرہ ان کی زندگی اور شخصیت کا بھی ایک خاکہ پیش کر دیں۔ آج "یادگارِ غالب" میں سب سے زیادہ اہمیت غالب کی سوانح عمری کی ہے، اس کے بعد اُن کی اردو نظم و نثر پر تبصرے اور اس کے بعد اُن کی فارسی نظم و نثر پر تبصرے کا درجہ ہے، لیکن خود حالی کی نظر میں کتاب کے اہم عناصر کی یہ ترتیب معکوس تھی۔ اُن کا اصل مقصد فارسی میں غالب کی غیر معمولی استعداد کا لوگوں پر ظاہر کرنا تھا، اس لیے کہ ہندوستان میں اُن پر فارسی نظم و نثر کا خاتمہ ہو گیا اور یہاں فارسی کے کم ہوتے ہوئے رواج کے باعث ابنائے وطن اس ضمن میں غالب کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے تھے۔ دوسرے درجے پر غالب کے اردو آثار کا تعارف تھا اس لیے کہ "اردو نظم و نثر پر بھی اُن کا کچھ کم احسان نہیں" تھا۔ غالب کی سوانح عمری حالی کے یہاں تیسرے درجے پر تھی بلکہ گویا اصل مقاصدِ کتاب میں شامل ہی نہ تھی اس لیے کہ غالب کی زندگی ایسے کارناموں سے خالی تھی جن کی یادآوری اور تقلید اہلِ وطن کے مسائل کا حل بن سکے۔ اس لیے ہم یہ گمان کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ "یادگارِ غالب" کا سوانحی حصہ حالی نے بے دلی کے ساتھ سرسری اور سطحی لکھا ہوگا اور اس میں زیادہ تلاش و تحقیق سے کام نہ لیا ہوگا۔ لیکن دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ "یادگارِ غالب" مرزا غالب کی زندگی اور شخصیت کا پہلا بھرپور مرقع ہے بلکہ اس سے پہلے شاید اردو کے کسی بھی شاعر کی اتنی منظم روداد اور ایسی مکمل تصویر ہمارے سامنے نہیں آئی تھی، اور آج بھی، جب غالب پر تحقیق کا کام بہت آگے بڑھ چکا ہے "یادگارِ غالب" کا مطالعہ ہمارے لیے ناگزیر ہے۔

حالی نے غالب کے متعلق جو معلومات فراہم کی ہیں اُن کی اجمالی فہرست حسبِ ذیل ہے۔

تاریخِ ولادت۔ سلسلۂ خاندان۔ غالب کے باپ اور چچا۔ غالب کا ذریعۂ آمدنی۔ [illegible] کی زندگی۔ ابتدائی تعلیم۔ اساتذہ، شیخ معظم اور ملا عبدالصمد۔ غالب کی شادی اور [illegible]۔ جوانی اور بڑھاپے کا حلیہ۔ دہلی میں غالب کے مسکن۔ مطالعے کا شوق۔ کتب [illegible] کے [illegible] پر منگا کر پڑھنا۔ پنشن کا قضیہ اور لکھنؤ اور کلکتہ کا سفر۔ [illegible]

کلکتے میں مدّاحانِ قتیل سے معرکہ۔ دہلی کالج کی مدرسی سے انکار۔ غالب کی سماجی حیثیت۔ جوے کی علت میں گرفتاری۔ زنداں کے کچھ حالات۔ رہائی۔ قلعۂ معلّیٰ سے تعلق۔ بہادر شاہ کی طرف سے خطاب اور خلعت۔ تاریخ نویسی کی خدمت اور اس کا مشاہرہ۔ بادشاہ کے اشعار کی اصلاح بدیہہ گوئی (چکنی ڈلی والا قطعہ) غالب کی اولاد۔ بچوں کا زندہ نہ رہنا۔ عارف سے محبت اور اُن کے بچوں کی پرورش۔ غدر کے زمانے میں غالب کے حالات۔ چھوٹے بھائی مرزا یوسف کی موت۔ دستنبو کی تصنیف۔ معاش کی پریشانی۔ متعلقین اور متوسلین کا بار۔ ریاستِ رام پور کا وظیفہ۔ سرکاری پنشن کا اجرا۔ قاطعِ برہان کا معرکہ۔ غالب کا مصنف "قاطع القاطع" پر ہتکِ عزّت کا مقدمہ دائر کرنا۔ پھر راضی نامہ داخل کرنا۔ گم نام خطوں میں گالیاں۔ حالی اور غالب کے معاملات۔ غالب کی علمی استعداد۔ خوشخطی۔ طرزِ شعر خوانی۔ غالب کے اخلاق و عادات اور خیالات۔ دوست داری، خط و کتابت، مروّت، فراخ حوصلگی، سخاوت، قوّتِ حافظہ، شعر فہمی، سخن سنجی، کتاب فہمی، حسنِ گفتگو اور ظرافت، خودداری اور وضع داری، خوراک، شراب نوشی، آموں کا شوق، مذہبی عقائد، بہادر شاہ اور علم کا قضیہ اور اس میں غالب کا کردار، امتناع نظیر خاتم النبیین کا مسئلہ اور غالب کی مثنوی، دوسروں کے کلام کی داد کا طریقہ، محققانہ نظر، حق پسندی، راست گفتاری، ناقدری کا احساس، ہجو گوئی سے گریز، خانگی زندگی، بیوی سے تعلقات، آخر عمر کی حالت مرض الموت، وفات، نمازِ جنازہ اور تدفین، شاگردوں کی کثرت اور چند شاگرد۔

اس اجمالی فہرست ہی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ "یادگارِ غالب" میں غالب کی پوری زندگی اور شخصیت کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس میں حالی کو بہت سے اور مختلف النوع ماخذوں سے کام لینا پڑا ہوگا۔ خود حالی نے اپنے ماخذوں کی درجہ بندی اس طرح کی ہے۔

(الف) "مرزا کی تصنیفات" (جس قدر اس میں ان کے حالات اور اخلاق و عادات کا سراغ ملا اس کو قلم بند کیا")

(ب) "جو باتیں اپنے ذہن میں محفوظ تھیں"

(ج) "یاد دوستوں کی زبانی معلوم ہوئیں"۔

ان ذریعوں سے جمع کی ہوئی معلومات کو جب حالی نے مرتّب کرنے کا ارادہ کیا تو انھیں احساس ہوا کہ غالب کی تصنیفات پھر سے دیکھنا ہوں گی اور "د" اس کے سوا کچھ [illegible]

چنانچہ حالؔی نے دلّی کے بعض بزرگوں اور دوستوں کو لکھا اور انھوں نے "تمام مطلوبہ کتابیں اور جس قدر مرزا کے حالات ان کو معلوم ہو سکے لکھ کر بھیج دیے۔"

پوری "یادگارِ غالب" انھیں ماخذوں پر مبنی ہے اگرچہ حالؔی نے ہر جگہ اپنے بیان کے ماخذ کی نشانی دہی نہیں کی ہے۔ جن ماخذوں کا حوالہ دیا گیا ہے ان میں سے کچھ حسب ذیل ہیں۔

(الف) غالبؔ کی تحریریں

(۱) دیباچہ مہر نیم روز (غالبؔ کے دادا کا سمرقند سے دہلی آنا)
(۲) درفشِ کاویانی (ترسم خاں اور دادا کا ذکر)
(۳) خط (عبداللہ بیگ خاں اور نصراللہ بیگ خاں کا حال)
(۴) قصیدہ در مدحِ راجا الور (سرکارِ الور سے تعلق)
(۵) خط بہ نام مجروح (بے رزق جینے کا ڈھب)
(۶) قطعات و رباعی (سلسلۂ خاندان "غالبؔ از خاکِ پاکِ تورانیم")
(۷) خط (شادی کا ذکر)
(۸) خط بہ نام منشی شیو نرائن (آگرے میں اپنے بچپن اور ننھیالی خاندان کا تذکرہ)
(۹) خط (کلکتے جانے کا ذکر)
(۱۰) خط (خسرو اور فیضی کے بارے میں غالبؔ کی رائے)
(۱۱) مثنوی بادِ مخالف (معرکۂ کلکتہ کے سلسلے میں)
(۱۲) خط (جوے کی علت میں گرفتاری)
(۱۳) سبد چین (قید میں کہا جانے والا ترکیب بند)
(۱۴) خط (ماہِ نیم ماہ، پرتوستان، مہر نیم روز کا ذکر)
(۱۵) دستنبو (مرزا یوسف کی وفات وغیرہ)
(۱۶) قاطع برہان (معرکۂ قاطع برہان)
(۱۷) درفشِ کاویانی (معرکۂ قاطع برہان)
(۱۸) تیغِ تیز (معرکۂ قاطع برہان)

(۱۹) غزل " بہ مقصدے کہ مرآں رارہِ خدا گویند" (حالی کے ناصحانہ انداز کے بعد غالب نے انھیں یہ غزل لکھ کر بھیجی تھی اور یہ کہ "اس میں جو طعن و تعریض ہے وہ میرے ہی نسبت ہے"۔)

(۲۰) قطعہ " تو اے کہ شیفتہ و حسرتی لقب داری" (حالی سے غالب کی معذرت)

(۲۱) تحریرِ غالب بر قطعۂ حالی ("بس اب بیت بخشی موقوف")

(۲۲) خط (فنِ تاریخ سے بیگانگی کا اعتراف)

(۲۳) رقعہ بہ نام دیوان فضل اللہ (دیوان جی کا غالب کے مکان کے پاس سے گزرنا اور غالب سے نہ ملنا۔)

(۲۴) خط بہ نام متولی امام باڑہ ہگلی بندر (آموں کی طلب)

(۲۵) چھٹی فارسی مثنوی (بہ سلسلۂ مولانا فضلِ حق و مسئلۂ امتناعِ نظیرِ خاتم النبیینؐ)

(۲۶) تقریظِ آئینِ اکبری (سرسید کا تقریظ کو شامل کتاب نہ کرنا)

(۲۷) غیر مطبوعہ قطعہ لالہ بہاری لال مشتاق دہلوی سے حاصل ہوا۔ ایک امیر سے قصیدے کا صلہ نہ ملنے پر لکھا گیا)

(۲۸) گلِ رعنا (شاعری کی ابتدا اردو سے)

(۲۹) خط (تاریخ گوئی سے گریز)

(۳۰) غالب کا منسوخ کلام ("اس زمانے کا کلام خود ہمارے پاس موجود ہے"۔ حالی نے نمونے کے طور پر اس کلام میں سے سات شعر درج کیے ہیں جو سب ردیف الف کے ہیں۔ غالب کا یہ شعر بھی حالی نے درج کیا ہے۔

آئی اگر بلا تو جگر سے ٹلے نہیں
ایرا ہی دے کے ہم نے بچایا ہے کشت کو

مولانا امتیاز علی عرشی مرحوم نے اپنے مرتبہ دیوانِ غالب میں یہ شعر "یادگارِ غالب" کے حوالے سے درج کر کے اس پر یہ حاشیہ لکھا ہے:

"معلوم ہوتا ہے مولانا حالی کے پاس کوئی نسخۂ دیوان ایسا تھا جس میں یہ شعر شامل تھا"، (دیوانِ غالب نسخۂ عرشی، نقشِ ثانی، صہ ۴۲۲)

(ب) ذاتی معلومات

۱۔ غالب کا بڑھاپے کا حلیہ ("جب کہ راقم نے پہلی ہی بار اُن کو دیکھا ہے حسانت اور خوبصورتی کے آثار اُن کے چہرے اور قد و قامت اور ڈیل ڈول سے نمایاں طور پر نظر آتے تھے مگر آخر عمر میں قلتِ خوراک اور امراضِ دائمی کے سبب وہ نہایت نحیف و زار و نزار ہو گئے تھے، لیکن چونکہ ہاڑ بہت چکلا، قد کشیدہ اور بات پانوں زبردست تھے، اس حالت میں بھی وہ ایک نو وارد تورانی معلوم ہوتے تھے۔

۲۔ جاڑوں میں غالب کا لباس ("مرزا جاڑے میں روئی دار کپڑا نہیں پہنتے تھے۔ اکثر اوانی یا پشمینے کا چغہ کوٹ اور ٹوپی وغیرہ پہنتے تھے")

۳۔ دہلی میں غالب کی آخری قیام گاہ ("سب سے اخیر مکان جس میں اُن کا انتقال ہوا حکیم محمود خاں کے دیوان خانے کے متصل مسجد کے عقب میں تھا جس کی نسبت وہ کہتے ہیں۔

مسجد کے زیرِ سایہ اک گھر بنالیا ہے
یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے"

۴۔ غالب کی فراخ حوصلگی ("غدر کے بعد ایک بار میں نے خود دیکھا کہ نواب لفٹنٹ گورنر کے دربار میں ان کو حسبِ معمول سات پارچے کا خلعت مع تین رقوم جواہر کے ملا تھا۔ لفٹنٹ کے چپراسی او جمعدار قاعدے کے موافق انعام لینے کو آئے۔ مرزا صاحب کو پہلے ہی معلوم تھا کہ انعام دینا ہوگا اس لیے انھوں نے دربار سے آتے ہی خلعت اور رقومِ جواہر بازار میں فروخت کرنے کے لیے بھیج دی تھیں۔ چپراسیوں کو الگ مکان میں بٹھایا اور جب بازار سے خلعت کی قیمت آئی تب اُن کو انعام دے کر رخصت کیا۔"

۵۔ غالب کا اندازِ شعر خوانی ("شعر پڑھنے کا انداز بھی، خاص کر مشاعروں میں، حد سے زیادہ دل کش اور موثر تھا۔ میں نے غدر سے چند سال پہلے، جب کہ دیوانِ عام میں مشاعرہ ہوتا تھا صرف ایک دفعہ مرزا صاحب کو مشاعرے میں پڑھتے سنا ہے۔ چونکہ ان کے پڑھنے کی باری سب کے بعد میں آئی تھی اس لیے صبح ہوگئی تھی۔ مرزا نے کہا "صاحبو، میں بھی اپنی بھیرویں الاپتا ہوں۔" یہ کہہ کر اوّل اردو طرح کی غزل اور اس کے بعد فارسی کی غیر طرح نہایت پُر درد آواز سے پڑھی۔

یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا مجلس میں کسی کو اپنا قدردان نہیں پاتے، اور اس لیے غزل خوانی میں فریاد کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔)

۶۔ آزردہ اور غالب (یہ کہ آزردہ غالب کے طرزِ خاص کو پسند نہیں کرتے تھے) "مرزا کی وفات سے چھ سات سال پہلے کا ذکر ہے کہ ایک روز نواب حسرتی کے مکان پر جب کہ راقم بھی وہاں موجود تھا، آزردہ اور غالب اور بعض مہمان جمع تھے۔ کھانے میں دیر تھی۔ فارسی دیوانِ غالب کے کچھ اوراق پڑے ہوئے مرزا کی نظر پڑ گئے۔ ان میں ایک غزل تھی جس کے مقطع میں اپنے منکروں کی طرف خطاب کیا تھا۔ . . . مرزا نے اوراق اٹھا لیے اور مولانا آزردہ سے مزاح کے طور پر کہا" دیکھیے کسی ایرانی شاعر نے کیا زبردست غزل لکھی ہے"۔ یہ کہ کر پڑھنی شروع کی۔ اوّل کے دو تین شعروں کی مولانا نے تعریف کی، مگر پھر بعض قرائن سے سمجھ گئے کہ مرزا ہی کا کلام ہے۔ مسکرا کر، جیسی ان کی عادت تھی، کہنے لگے "کلام مربوط ہے، مگر نوآموز کا کلام معلوم ہوتا ہے" سب حاضرین ہنس پڑے۔ جب مقطعے کی نوبت آئی مرزا نے مولانا کی طرف خطاب کرکے دردناک آواز سے یہ مقطع پڑھا۔

تو اے کہ محوِ سخن گسترانِ پیشینی
مباش منکرِ غالب کہ در زمانۂ تست

اُس وقت سب لوگ بہت متاثر ہوئے اور مولانا آزردہ شرمندہ خاموش ہو رہے"۔

۷۔ لطیفہ ("ایک دن قبل غروبِ آفتاب کے مرزا صاحب شام کو کھانا کھا رہے تھے اور کھانے میں صرف شامی کباب تھے۔ میں بھی وہاں موجود تھا اور ان کے سامنے بیٹھا رومال سے مکھیاں جھل رہا تھا۔ مرزا نے کہا "آپ ناحق تکلیف فرماتے ہیں، میں ان کبابوں میں سے آپ کو کچھ نہ دوں گا"۔ اس کے بعد غالب نے نواب عبدالاحد خاں اور ان کے ڈوم مصاحب کا لطیفہ سنایا۔)

۸۔ غالب کی مذہبیت (مرزا باوجودے کہ احکام ظاہری کے بہت کم پابند تھے لیکن مسلمانوں کی ذلت کی کوئی بات سن پاتے تھے تو ان کو سخت رنج ہوتا تھا۔ ایک روز میرے سامنے اسی قسم کے ایک واقعے پر نہایت افسوس کرتے تھے اور کہتے تھے کہ مجھ میں کوئی بات مسلمان کی نہیں ہے، پھر میں نہیں جانتا کہ مسلمانوں کی ذلت پر مجھ کو کیوں اس قدر رنج اور تاسف

ہوتا ہے ۔")

۹ حالی کا غالب کو نماز کی تلقین کرنا اور غالب کا ردِ عمل (یہ بہت اہم، دلچسپ اور تفصیلی بیان ہے)

۱۰ ۔ ایک غلط فہمی کا ازالہ (میر مہدی مجروح کے نام غالب کے ایک خط کا فقرہ ہے "بطرزِ عبارت خاص میری دولت تھی، سو ایک ظالم پانی پت انصاریوں کے محلّے کا رہنے والا لوٹ لے گیا۔" حالی بتاتے ہیں کہ "اس عبارت میں 'ایک ظالم' سے مراد خود میر مہدی مجروح ہیں۔" پھر لکھتے ہیں "اکثر لوگوں کو اس خیال سے کہ راقم بھی پانی پت انصاری محلّے کا رہنے والا ہے ان الفاظ سے یہ دھوکا ہوا ہے کہ مرزا صاحب نے میری نسبت لکھا ہے، اور لطف یہ کہ میں نے جس قدر ان کو سمجھایا کہ یہ خود میر مہدی ہی کی نسبت لکھا ہے، میری نسبت نہیں لکھا ہے۔ اُسی قدر اُن کو اس بات کا زیادہ خیال ہوا کہ میں ازراہ کسرِ نفسی کے ایسا کہتا ہوں۔")

۱۱۔ غالب کا وقتِ آخر "مرنے سے چند روز پہلے بے ہوشی طاری ہو گئی تھی پہر پہر دو دو پہر کے بعد چند منٹ کے لیے افاقہ ہو جاتا تھا، پھر بے ہوش ہو جاتے تھے۔ جس روز انتقال ہوا اس سے شاید ایک دن پہلے میں ان کی عیادت کو گیا تھا۔ اس وقت کئی پہر کے بعد افاقہ ہوا تھا اور نواب علاء الدّین احمد خاں مرحوم کے خط کا جواب لکھوا رہے تھے۔ انہوں نے لوہارو سے حال پوچھا تھا۔ اس کے جواب میں ایک فقرہ اور ایک فارسی شعر، جو غالباً شیخ سعدی کا تھا، لکھوایا۔ فقرہ یہ تھا کہ 'میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ ایک آدھ روز میں ہمسایوں سے پوچھنا'، اور شعر کا مصرع مجھے یاد نہیں رہا، دوسرا مصرع یہ تھا 'کہ گر ہجر مدارا بہ من سرِ تو سلامت'۔")

(ج) دوسروں سے حاصل شدہ معلومات

(۱) غالب

ان دوسروں میں پہلا نام خود غالب کا آنا چاہیے۔ حالی نے کئی بیان غالب کے حوالے سے درج کیے ہیں مثلاً:

(۱) عبدالصمد کا قضیہ ("کبھی کبھی مرزا کی زبان سے یہ بھی سنا گیا ہے کہ مجھ کو مبدأ فیاض کے سوا کسی سے تلمّذ نہیں ہے، اور عبدالصمد محض ایک فرضی نام ہے۔ چونکہ مجھ کو لوگ بے استادا کہتے تھے، اُن کا منہ بند کرنے کو میں نے ایک فرضی استاد گھڑ لیا ہے۔")

۲۔ ناقدردانی کا احساس ("ایک روز قلعے سے سیدھے نواب مصطفیٰ خاں کے مکان پر آئے اور کہنے لگے کہ "آج حضور نے ہماری بڑی قدردانی فرمائی۔ عید کی مبارک باد میں قصیدہ لکھ کر لے گیا تھا، جب میں قصیدہ پڑھ چکا تو ارشاد ہوا کہ "مرزا، تم پڑھتے بہت خوب ہو" اس کے بعد نواب صاحب اور مرزا زمانے کی ناقدردانی پر دیر تک افسوس کرتے رہے")

۳۔ اصلاح کا قبول کرنا ("مرزا کے ایک فارسی قصیدے کی تشبیب کا یہ شعر ہے:

ہم چناں در تتقِ غیب ثبوتے دارند
بہ وجودے کہ ندارند زخارج اعیاں

مرزا صاحب خود مجھ سے کہتے تھے کہ میں نے ثبوتے کی جگہ نمودے لکھا تھا مولوی فضل حق کو جب یہ شعر سنایا تو انھوں نے کہا کہ اعیانِ ثابتہ کے لیے نمود کا لفظ نامناسب ہے، اس کی جگہ ثبوت بنادو۔ چنانچہ طبعِ ثانی میں انھوں نے بجائے نمود کے ثبوت بنادیا ہے")

۴۔ ایک شعر کی تشریح (شعر "قمری کفِ خاکستر..." الخ کے سلسلے میں "میں نے خود اس کے معنی مرزا سے پوچھے تھے۔ فرمایا کہ اے کی جگہ جز پڑھو، معنی خود سمجھ میں آجائیں گے")

۵۔ غالب کے بارے میں میر کی رائے ("خود مرزا کی زبانی سُنا گیا ہے کہ میر تقی نے جو مرزا کے ہم وطن تھے، اُن کے لڑکپن کے اشعار سن کر یہ کہا تھا کہ اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا اور اُس نے اس کو سیدھے رستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا ورنہ مہمل بکنے لگے گا۔")

(۳) مصطفیٰ خاں شیفتہ

۱۔ ملا عبدالصمد کا خط بہ نام غالب ("نواب مصطفیٰ خاں مرحوم کہتے تھے کہ ملا کے ایک خط میں جو اُس نے مرزا کو کسی دوسرے ملک سے بھیجا تھا یہ فقرہ لکھا تھا:

"اے عزیز، چہ کسی کہ با ایں ہمہ آزادی ہا گاہ گاہ بہ خاطر می گذری")

۲۔ غالب کی سخن سنجی ("نواب ممدوح نے مجھ سے ایک واقعہ بیان کیا جس سے مرزا کی سخن سنجی کا بہت بڑا ثبوت ملتا ہے" (آزردہ اور نظیری کے مطلعے کے ترجمے والا واقعہ)

۳۔ غالب کی کتاب فہمی ("نواب ممدوح فرماتے تھے کہ میں شاہ ولی اللہ کا ایک فارسی رسالہ، جو حقائق و معارف کے نہایت دقیق مسائل پر مشتمل تھا، مطالعہ کررہا تھا اور ایک مقام

بالکل سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اتفاقاً اسی وقت مرزا صاحب آنکلے۔ میں نے وہ مقام مرزا صاحب کو دکھایا انھوں نے کسی قدر غور کے بعد اس کا مطلب ایسی خوبی اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا کہ شاہ ولی اللہ صاحب بھی شاید اس سے زیادہ نہ بیان کر سکتے۔")

۴۔ غالب اور آم ("نواب مصطفیٰ خاں مرحوم ناقل تھے کہ ایک صحبت میں مولانا فضل حق اور مرزا اور دیگر احباب جمع تھے اور آم کی نسبت ہر شخص اپنی اپنی رائے بیان کر رہا تھا کہ اس میں کیا کیا خوبیاں ہونی چاہئیں۔ جب سب لوگ اپنی اپنی کہہ چکے تو مولانا فضل حق نے مرزا سے کہا کہ تم بھی اپنی رائے بیان کرو۔ مرزا نے کہا بھئی میرے نزدیک تو آم میں صرف دو باتیں ہونی چاہئیں، میٹھا ہو اور بہت ہو۔ سب حاضرین ہنس پڑے۔")

(۳) ناظر حسین میرزا

(یہ واقعہ کہ بہادر شاہ ظفر کے ایک ایک دو دو مصرعوں پر غالب نے پوری پوری غزلیں کہہ کر بھیج دیں)

(۴) مولوی محمد عالم (بہ حوالۂ نواب ضیاء الدین احمد)

(انھوں نے کلکتے میں نواب ضیاء الدین احمد سے چکنی ڈلی والے فی البدیہ اشعار کا واقعہ بیان کیا۔ خود غالب کی روایت صرف اتنی ہے کہ کلکتے میں مولوی کرم حسین نے ایک محفل میں اپنی ہتھیلی پر چکنی ڈلی رکھ کر غالب سے فرمائش کی کہ اس کی کچھ تشبیہیں نظم کر دیجیے! اور غالب نے "وہاں بیٹھے بیٹھے نو دس شعر کا قطعہ کہہ کر ان کو دیا اور صلے میں وہ ڈلی ان سے لی" خط بنام حاتم علی بیگ مہر بہ حوالۂ نسخۂ عرشی) مولوی محمد عالم کی روایت یہ ہے۔

"جس زمانے میں مرزا صاحب یہاں (کلکتے) آئے ہوئے تھے، ایک مجلس میں جہاں مرزا بھی موجود تھے اور میں بھی حاضر تھا، شعرا کا ذکر ہو رہا تھا۔ اثنائے گفتگو میں ایک صاحب نے فیضی کی بہت تعریف کی۔ مرزا نے کہا "فیضی کو لوگ جیسا سمجھتے ہیں ویسا نہیں ہے۔" اس پر بات بڑھی۔ اس شخص نے کہا کہ فیضی جب پہلی ہی بار اکبر کے روبرو گیا تھا اس نے ڈھائی سو شعر کا قصیدہ اسی وقت ارتجالاً کہہ کر پڑھا تھا۔ مرزا بولے "اب بھی اللہ کے بندے ایسے موجود ہیں کہ دو چار سو نہیں تو دو چار شعر تو برموقع پر بداہتہً کہہ سکتے ہیں مخاطب

جیب میں سے ایک چکنی ڈلی نکال کر ہتھیلی پر رکھی اور مرزا سے درخواست کی، کہ اس ڈلی پر کچھ ارشاد ہو۔ مرزا نے گیارہ شعر کا قطعہ اسی وقت موزوں کر کے پڑھ دیا۔")

(۵) سیّد اکبر مرزا (فرزندِ ناظر سیّد حسین میرزا)

(ان کا بیان کہ انھوں نے بندر گاہِ بصرہ کی ایک مجلسِ عزا میں غالب کے قصیدے "دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق" کے چند شعر پڑھے جن پر خوب رقّت ہوئی، اور یہ کہ اس قصیدے کے ایک شعر پر مرزا دبیر نے مصرعے لگائے تھے)

(۶) منشی غلام علی خاں

("شیخ ابراہیم ذوق، جن کی نسبت مشہور ہے کہ مرزا کو اُن سے چشمک تھی، ایک روز جب کہ مرزا شطرنج میں مصروف تھے، منشی غلام علی خاں مرحوم نے ان کا یہ شعر کسی دوسرے شخص کے سنانے کو پڑھا۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

خان مرحوم کہتے ہیں کہ مرزا کے کان میں بھی اس کی بھنک پڑ گئی۔ فوراً شطرنج چھوڑ دی۔ اور مجھ سے کہا "بھیّا تم نے کیا پڑھا؟" میں نے پھر وہ شعر پڑھا۔ پوچھا "کس کا شعر ہے؟" میں نے کہا "ذوق کا"۔ یہ سن کر نہایت متعجب ہوئے، اور مجھ سے بار بار پڑھواتے تھے اور سر دھنتے تھے۔")

(۷) منشی بہاری لال مشتاق

(یہ بیان کہ آگرے کے لالہ کنھیّا لال نے غالب کو اُن کی پتنگ والی مثنوی یاد دلائی۔ اور اس کی نقل دی تھی، اور یہ کہ بہ قول لالہ کنھیّا لالہ غالب نے یہ مثنوی آٹھ نو سال کی عمر میں کہی تھی)

(۸) دہلی کے بعض باشندے

غالب کی جوانی ("اہلِ دہلی میں سے جن لوگوں نے مرزا کو جوانی میں دیکھا تھا ان سے سُنا گیا ہے کہ عنفوانِ شباب میں وہ شہر کے نہایت حسین و خوش رو لوگوں میں شمار کیے جاتے تھے"

(۹) دوسروں کی تصنیفات

(۱) "گلشنِ بے خار": شیفتہ (غالب کی شعر فہمی کی تعریف)

(۲) "آبِ حیات": آزاد (دہلی کالج میں فارسی کی مدرسی سے غالب کا اس بنا پر انکار کہ اس سے ان کے اعزاز میں کمی آتی تھی)

(۳) "فرہنگِ ناصری": رضا قلی خاں ہدآیت (بہ سلسلۂ معرکۂ قاطعِ برہان)

(۴) "محرقِ قاطع": مولوی سعادت علی "

(۵) "قاطع القاطع": امین الدین آمین پٹیالوی "

(۶) "موئید برہان": آغا احمد علی "

(۷) "ساطعِ برہان": مرزا رحیم بیگ میرٹھی "

"یادگارِ غالب" کے مشتملات اور ماخذوں پر نظر کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حالی غالب کی زندگی، شخصیت اور ادبی کارناموں کا مکمل احاطہ کرنے پر قادر تھے اور اس کے لیے بہترین ماخذ ان کی دسترس میں تھے جن سے انھوں نے کام بھی لیا۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ ان ماخذوں سے جتنا اور جیسا کام لیا جا سکتا تھا، حالی نے نہیں لیا۔ خصوصاً غالب کی حیات اور شخصیت جس کے بارے میں اُن سے بہتر لکھنے والا شاید کوئی نہ تھا اسے حالی نے ضمنی اور استطرادی حیثیت دے کر اس کی طرف پوری توجہ نہیں کی۔

ڈاکٹر عبدالقیوم، غلام رسول مہر اور دوسرے محققوں نے "یادگارِ غالب کے تحقیقی سامحوں کی نشاندہی کی ہے، مثلاً حالی نے قمار بازی کے معاملے میں غالب کے جرم کو ہلکا دکھایا ہے، مرزا یوسف کی وفات کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے روایات اس سے اختلاف کرتی ہیں، غالب کا لکھنو جانا غازی الدین حیدر کے بجائے نصیر الدین حیدر کے عہد میں بتایا ہے، غالب کا سفرِ کلکتہ تیس کے بجائے چالیس سال کی عمر میں بتایا ہے، مثنوی "ابرِ گہربار" جو غالب کی وفات سے چوبیس سال پہلے چھپ چکی تھی، اُن کی آخر عمر کی تصنیف قرار دیا ہے اور غالب کے اخلاقی فضائل کی بابت جو کچھ لکھا ہے وہ حقیقت سے زیادہ عقیدت پر مبنی ہے، وغیرہ۔

"یادگارِ غالب" کی اشاعت کے بعد سے اب تک غالب پر جو خردبینی تحقیق ہوئی ہے اس کے نتیجے میں حالی کی کچھ تحقیقات کا غلط ثابت ہونا ناگزیر تھا۔ اس خردبینی تحقیق کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ اپنے بارے میں خود غالب کے بہت سے بیانات غلط ثابت ہو گئے۔ حالی کے بیانات میں بھی بیشتر غلطیاں وہیں ملتی ہیں جہاں انہوں نے غالب کے بیانات کو اپنا ماخذ بنایا ہے، مثلاً غالب کا خاندانی پس منظر، جوے کی علت میں گرفتاری، مرزا یوسف کی موت وغیرہ۔ اور جہاں خود غالب کے بیانات میں تضاد ملتا ہے وہاں بھی حالی انھیں غلط بیانی کا مرتکب ٹھہرانے کے بجاے ان کے بیان کا تضاد دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کوشش میں خود تضاد کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس کی سب سے نمایاں مثال ملّا عبدالصمد کا قضیہ[1] ہے اس سلسلے میں حالی کے بیانات حسبِ ذیل ہیں:

"ایک شخص پارسی نژاد جس کا نام آتش پرستی کے زمانے میں ہرمزد تھا اور بعد مسلمان ہونے کے عبدالصمد رکھا گیا، غالباً آگرے میں سیاحانہ وارد ہوا جو کہ دو برس تک مرزا کے پاس اول آگرے میں اور پھر دلّی میں مقیم رہا۔ مرزا نے اس سے فارسی زبان میں کسی قدر بصیرت پیدا کی۔ اگرچہ کبھی کبھی مرزا کی زبان سے یہ بھی سنا گیا ہے کہ "مجھ کو مبداٴ فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے اور عبدالصمد محض ایک فرضی نام ہے۔ چونکہ مجھ کو لوگ بے استادا کہتے تھے، ان کا منہ بند کرنے کو میں نے ایک فرضی اُستاد گھڑ لیا ہے"۔ مگر اس میں شک نہیں کہ عبدالصمد فی الواقع ایک پارسی نژاد آدمی تھا اور مرزا نے اس سے کم و بیش فارسی زبان سیکھی تھی۔ چنانچہ مرزا نے جا بجا اس کے تلمذ پر اپنی تحریروں میں فخر کیا ہے اور اس کو بہ لفظ 'تیمسار'، جو پارسیوں کے یہاں نہایت تعظیم کا لفظ ہے، یاد کیا ہے، لیکن جیسا کہ مرزا نے اپنی بعض تحریروں میں تصریح کی ہے، مرزا کی چودہ برس کی عمر تھی جب عبدالصمد ان کے مکان پر وارد ہوا ہے اور کل دو برس اس نے وہاں قیام کیا۔ پس جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مرزا کو کس عمر میں اس کی صحبت

---

[1] اس قضیے کی تفصیل کے لیے دیکھیے قاضی عبدالودود کا مقالہ "ہرمزد ثم عبدالصمد" مشمولہ "احوالِ غالب" مرتبہ [illegible] آرزو

میسر آئی اور کس قدر قلیل مدت اس کی صحبت میں گزری تو عبدالصمد اور اس
کی تعلیم کا عدم وجود برابر ہو جاتا ہے۔“

لیکن کچھ آگے بڑھ کر لکھتے ہیں :

جیسا کہ قاطع برہان اور درفش کاویانی کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے اس نے
تمام فارسی زبان کے مقدم اصول اور ژند اور پارسیوں کے مذہبی خیالات اور
اسرار جن کو فارسی زبان کے سمجھنے میں بہت بڑا دخل ہے، اور پارسی اور سنسکرت
کا متحد الاصل ہونا اور اسی قسم کی اور ضروری باتیں مرزا کے دل میں بوجہ احسن
تہ نشین کر دی تھیں۔“

عبدالصمد کے اتنے زبردست علمی افادات کے ذکر کے ساتھ ساتھ اس کے عدم اور وجود کو
برابر ٹھہرانے کا سبب یہی ہے کہ حالی غالب کے دونوں متضاد بیانوں میں سے کسی کو بھی صریحاً غلط
نہیں کہنا چاہتے۔ مگر اس قضیے میں ہمیں اس حقیقت کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ غالب
کا یہ زبانی اعتراف کہ انھوں نے عبدالصمد کے بارے میں غلط بیانی کی اور اس کا وجودِ حقیقی نہیں
تھا، ہم تک حالی ہی کی تحریر کے ذریعے پہنچا ہے۔

حالی کو غالب خود بھی احساس تھا کہ غالب نے اپنے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس میں
افراط و تفریط اور حقیقت پوشی سے بھی کام لیا ہے، اور بعض جگہ حالی نے کنایتہً اور بڑی شائستگی
سے اس کا اظہار بھی کیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں :

”مرزا نے اپنے علوِ خاندان پر جا بجا فارسی اشعار میں فخر کیا ہے۔ چونکہ ان
میں سے بعض اشعار لطف سے خالی نہیں اس لیے اس مقام پر نقل
کیے جاتے ہیں۔“

یعنی ان شعروں کے اندراج کا مقصد غالب کا علوِ خاندان ثابت کرنا نہیں بلکہ ان کا
لطف بیان ہے۔

غالب کو ریاستِ فیروز پور جھرکہ سے ملنے والی پنشن کے سلسلے میں حالی بتلاتے ہیں:

”اوّل مرزا کو غلط یا صحیح یہ خیال پیدا ہوا کہ فیروز پور سے جس قدر پنشن ہمارے
خاندان کے لیے گورنمنٹ نے مقرر کرائی تھی اس قدر ہم کو نہیں ملتی۔“

پھر استغاثے کے لیے غالبؔ کے کلکتے جانے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"گورنمنٹ نے سرجان میلکم گورنر بمبئی سے، جو لارڈ لیک کے سکریٹری رہ چکے تھے اور انہیں کے روبرو جاگیروں اور پنشنوں کی سندیں لوگوں کو ملی تھیں، مرزا کے معاملے کی بابت استفسار کیا۔ انہوں نے مرزا کے دعوے کو غلط بتایا اور جس طرح اور جس قدر پنشن فیروز پور سے ملنی قرار پائی تھی، اس کی مفصل کیفیت، جو مرزا کے دعوے کے بالکل برخلاف تھی، گورنمنٹ میں بھیج دی۔ جب یہاں سے مرزا کو مایوسی ہوئی تو انہوں نے ولایت میں اپیل کیا مگر وہاں بھی کچھ نہ ہوا۔"

سرجان میلکم کا حوالہ دے کر حالیؔ نے یہ بات ظاہر کردی ہے کہ پنشن کے معاملے میں غالبؔ کا خیال بھی غلط تھا اور دعویٰ بھی، لیکن اس بیان کی تمہید میں انہوں نے یہ لکھا کہ "مرزا کو غلط یا صحیح یہ خیال پیدا ہوا کہ انہیں پنشن کم مل رہی ہے"۔ اس تمہیدی بیان میں حالیؔ نے غالبؔ کے استغاثے کا جو پس منظر بیان کیا ہے وہ بھی علت سے خالی نہیں ہے۔ لکھتے ہیں:

"جو پنشن گورنمنٹ نے ریاستِ فیروز پور جھرکہ پر محوّل کردی تھی جب تک مرزا صغیر سن رہے جو کچھ وہاں سے ملتا رہا پاتے رہے۔ جب سنِ تمیز کو پہنچے اور شادی بھی ہوگئی، عالمِ شباب اور خانہ داری کی ضرورتیں بہت بڑھ گئیں۔ اور گھر میں جو کچھ اثاثہ تھا وہ بھی چند روز میں سب خرچ ہوگیا، و چار فکرِ معاش دامن گیر ہوئی۔ اوّل مرزا کو غلط یا صحیح یہ خیال پیدا ہوگیا کہ فیروز پور سے جس قدر پنشن ہمارے خاندان کے لیے گورنمنٹ نے مقرر کرائی تھی اس قدر ہم کو نہیں ملتی۔ ضرورتوں نے سخت تنگ کر رکھا تھا۔ ادھر قرض خواہوں کے تقاضے سے ناک میں دم آگیا تھا، اُدھر چھوٹے بھائی کو جنون ہوگیا۔ مرزا جیسے آزاد منش آدمی کے لیے یہ وقت نہایت سخت تھا۔ اس کشمکش میں ان کو اس کے سوا اور کچھ نہ سوجھا کہ کلکتے پہنچ کر سپریم گورنمنٹ میں پنشن کی بابت استغاثہ پیش کریں۔"

یہاں حالیؔ بالواسطہ یہ بتا رہے ہیں کہ غالبؔ کے استغاثے کا اصل سبب یہ نہیں تھا کہ اُن کو

پنشن کم مل رہی تھی، بلکہ یہ تھا کہ ان کے اخراجات اور ضرورتیں بڑھ گئی تھیں۔ حالی یہ بھی بتاتے ہیں کہ ان ضرورتوں میں خانہ داری کے علاوہ "عالمِ شباب" کی بھی ضرورتیں شامل تھیں۔ بالفاظ دیگر غالب کی عیاشیوں کے لیے ان کی پنشن کم پڑ رہی تھی۔ اس کی مزید وضاحت "یادگارِ غالب" کے خاتمے کے ان جملوں سے ہوتی ہے:

"مرزا کی طبیعت میں گرمی اور جودت کی ایک آگ بھری ہوئی جس کے بھڑکانے کے لیے تھوڑی سی اشتعالک کافی تھی۔ باپ اور چچا کا سایۂ تربیت بچپن میں سر سے اٹھ جانا، ننھیال کی مرفہ الحالی، نانا نانی کی نازبرداریاں اور خود مرزا کا ذکی الحس ہونا، یہ تمام اسباب ایسے تھے کہ عنفوانِ شباب میں اُن کا جادۂ مستقیم سے تجاوز نہ کرنا نہایت دشوار تھا۔ مرزا کی ابتدا بگڑی اور ایسی بگڑی کہ جب تک ننھیال کی تمام املاک اور دیہات کی صفائی نہ ہوئی، نشے ہرن نہ ہوئے"۔

"اگرچہ معاش کی طرف سے وہ کبھی زیادہ تنگ نہیں ہوئے مگر حوصلے اور ہمت کے موافق کبھی استطاعت نصیب نہیں ہوئی، بلکہ جن اللّے تللّوں میں بچپن اور جوانی گذری تھی اس کے لحاظ سے یہ کہنا چاہیے کہ وہ اخیر دم تک تورِ بعد الکور میں مبتلا رہے"۔

جوے کے الزام میں غالب کی گرفتاری کے حالات حالی نے غالب ہی کی تحریروں کے حوالے سے لکھے ہیں۔ غالب نے یہ ظاہر کرنا چاہا ہے کہ وہ اِس معاملے میں بے قصور تھے اور کوتوال کی دشمنی کا شکار ہوئے۔ حالی نے غالب کا یہ بیان دے دیا ہے لیکن اس بیان کی تمہید میں یہ فقرے لکھے ہیں:

"مرزا کو چوسر اور شطرنج کھیلنے کی بہت عادت تھی اور چوسر جب کبھی کھیلتے تھے برائے نام کچھ بازی بدکر کھیلا کرتے تھے۔ اسی چوسر کی بدولت ۱۲۶۴ھ میں مرزا پر ایک سخت ناگوار واقعہ گذرا۔"

"برائے نام" کی شق کے باوجود حالی نے یہ بات ظاہر کر دی ہے کہ غالب ہمیشہ بازی بدکر چوسر کھیلتے تھے اور بہت کھیلتے تھے، یعنی عادی جواری تھے۔

غالب کے خانگی تعلقات کے سلسلے میں حالی لکھتے ہیں:

"مرزا کی بی بی ... نہایت متقی، پرہیزگار اور نماز روزے کی سخت پابند تھیں۔
جس قدر مرزا مذہبی معاملات میں بے مبالات تھے اسی قدر ان کی بی بی احکامِ
مذہبی کی پابند تھیں۔ یہاں تک کے بی بی کے کھانے پینے کے باسن الگ اور
شوہر الگ رہتے تھے مگر بایں ہمہ بی بی شوہر کی خدمت گزاری اور خبر گیری میں
کوئی دقیقہ فرد گذاشت نہ کرتی تھیں۔ مرزا صاحب ہمیشہ مردانے مکان میں رہتے تھے
مگر ان کے کھانے اور دوائی ٹھنڈائی جڑاول وغیرہ کا انتظام سب گھر میں سے ہوتا تھا۔
مرزا میں جب تک چلنے پھرنے کی طاقت رہی ہمیشہ وقتِ متعین پر ایک بار وہ گھر میں
ضرور جاتے تھے، اور بی بی اور ان کے تمام رشتے داروں کے ساتھ نہایت عمدہ برتاو
رکھتے تھے، اور اپنی جان سے بڑھ کر ان کی ضروریات اور اخراجات کا خیال رہتا تھا۔
مگر چونکہ شوخی اور ظرافت اُن کی گھٹّی میں پڑی تھی، اُن کی زبان و قلم سے بی بی کی نسبت
اکثر ایسی باتیں نکل جاتی تھیں جن کو ناواقف آدمی نفرت یا بےتعلقی پر محمول کر سکتا ہے"۔
بیوی کا شوہر کی غذا دوا اور پہننے اوڑھنے کا انتظام کرنا، شوہر کا دن بھر میں ایک بار
زنان خانے میں جانا، بیوی اور سسرال والوں کے ساتھ اچھا برتاو کرنا اور صاحب خانہ کی
حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنا ایسی باتیں نہیں ہیں جنہیں زن و شو کے خوشگوار
تعلقات کی دلیل بنایا جا سکے۔ حالی یہ بھی بتاتے ہیں کہ غالب تحریر اور تقریر میں اکثر اپنی بیوی
سے بیزاری کا اظہار کرتے تھے جس کا سبب یہ تھا کہ اُن کے مزاج میں ظرافت بہت تھی۔ یہاں
تک وہ یہ کہتے معلوم ہوتے ہیں کہ غالب اپنے خانگی تعلقات سے مطمئن تھے اگرچہ وہ مزاحًا اس
کے برخلاف ظاہر کرتے تھے، لیکن چند ہی سطروں بعد لکھتے ہیں:

"وہ ہمیشہ تعلقاتِ خانگی کو جدًّا یا ہزلًا ایک سخت مصیبت بتایا کرتے تھے"۔

"ہزلًا" کے ساتھ "جدًّا" کا ٹکڑا بتا رہا ہے کہ حالی کے نزدیک بھی یہ بات خارج از امکان
نہیں ہے کہ غالب واقعی اپنی خانگی زندگی سے بہت بیزار تھے۔
غالب کی شراب نوشی کے بیان میں بھی حالی نے یہی پہلو دار انداز اختیار کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"مرزا کو مدّت سے رات کو سوتے وقت کسی قدر پینے کی عادت تھی۔ جو مقدار
انھوں نے مقرر کر لی تھی اس سے زیادہ کبھی نہیں پیتے تھے۔ جس بکس میں

بوتلیں رہتی تھیں اس کی کنجی داروغہ کے پاس رہتی تھی اور اس کو سخت تاکید
تھی کہ اگر رات کو سرخوشی کے عالم میں مجھ کو زیادہ پینے کا خیال ہو تو ہرگز میرا کہنا
نہ ماننا اور کنجی مجھ کو نہ دینا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ رات کو کنجی طلب کرتے تھے
اور نشے کی جھانجھ میں داروغہ کو بہت بُرا بھلا کہتے تھے۔ مگر داروغہ نہایت خیر
خواہ تھا ہرگز کنجی نہ دیتا تھا۔ اوّل تو وہ مقدار میں بہت کم پیتے تھے، دوسرے
اس میں دو تین حصے گلاب ملا لیتے تھے جس سے اس کی حدّت اور تیزی کم ہو جاتی
تھی، چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں:

آسودہ باد خاطرِ غالبؔ کہ خوے اوست
آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را

مگر باوجود اس قدر احتیاط اور اعتدال کے اس کا فرنشے کی عادت نے آخرکار مرزا کی
صحت کو سخت صدمہ پہنچایا جس کی شکایت سے ان کے تمام اردو رقعات بھرے ہوئے ہیں"۔

مزید پینے کی خواہش میں داروغہ سے کنجی طلب کرنا اور کنجی نہ ملنے پر نشے کی جھانجھ میں اُس کو
بُرا بھلا کہنے لگنا اور اس کے باوجود داروغہ کا کنجی نہ دینا محتاط اور معتدل شراب نوشی کے خلاف
یہ ظاہر کرتا ہے کہ ان موقعوں پر غالبؔ بہت پی چکے ہوتے تھے اور اپنے آپے میں نہیں رہتے
تھے، اسی لیے داروغہ اپنے آقا کے حکم کی تعمیل نہیں کرتا تھا۔ حالیؔ آخر میں یہ بھی بتاتے ہیں
کہ نشے کی عادت نے غالبؔ کی صحت کو غارت کر دیا تھا۔ یہ بات بھی پینے میں احتیاط اور اعتدال
کے نظریے کی نفی کرتی ہے۔

"یادگارِ غالبؔ" میں تضادِ بیان کی کچھ اور بھی مثالیں مل جائیں گی۔ مثلاً ایک جگہ غالبؔ
کی حق پسندی کا ذکر کرتے ہوئے حالیؔ لکھتے ہیں:

"مرزا کے کلام پر اگر کوئی ٹھیک اعتراض کرتا تھا یا کوئی عمدہ تصرف ان کے
شعر میں کرتا تھا، اس کو فوراً تسلیم کر لیتے تھے اور شعر کو بدل ڈالتے تھے"۔

لیکن کلکتے کے معرکے کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"مرزا اعتراض اور مخالفت سے بہت جز بز ہوتے تھے۔ اُن کے گھبرا دینے
کو ایک معترض کافی تھا"۔

"یادگارِ غالب" کے خاتمے میں حالی لکھتے ہیں:

"ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ یہ کتاب اُن تصنیفات میں شمار نہیں ہوسکتی جن کی آج کل ملک میں ضرورت سمجھی جاتی ہے اور جو اہلِ وطن کی موسمی بیماریوں کے لیے براہِ راست دوا اور علاج کا کام دے سکتی ہیں؛ چونکہ اس مضمون کے لکھنے پر ہم کو اس اندھی اور بہری دیوی نے مجبور کیا ہے جس کی زبردستی اور حکومت کے آگے مصلحت اندیشی کم پڑ جاتے ہیں؛"

مستانہ سخن می رسد از دل بہ لبِ ما
عشق است کہ بر بستہ زبانِ ادبِ ما

راقم کو مرزا کے کلام کے ساتھ جو تعلق بدوِ شعور سے آج تک برابر چلا آتا ہے اس کو چاہے اس معتقدانہ جوشِ عصبیت کا نتیجہ سمجھو جو انسان کو اندھا اور بہرا کر دیتا ہے اور چاہو اس یقین کا ثمرہ خیال کرو جو نہایت زبردست شہادتوں سے حاصل ہوتا ہے؛ بہر تقدیر یہی وہ چیز تھی جس نے ہم کو اس کتاب کے لکھنے پر آمادہ کیا۔ پس نہ ہم کو یہ دعویٰ ہے کہ ہم نے اس تالیف سے پبلک کی کسی بڑی ضرورت کو رفع کیا ہے اور نہ یہ خیال ہے کہ محض ملک کی خیر خواہی اس کے لکھنے کا باعث ہوئی ہے؛"

پھر لکھتے ہیں:

"اگرچہ مرزا کی لائف میں، جیسا کہ ہم بار بار لکھ چکے ہیں کوئی مہتم بالشان واقعہ ان کی شاعری وانشا پردازی کے سوا نہیں پایا جاتا، بایں ہمہ اس میں بہت سی مفید نصیحتیں بھی اہلِ وطن کے لیے موجود ہیں؛"

اس کے بعد وہ غالب کی سوانح عمری سے اخذ ہونے والے کچھ مفید نتائج پر کم زور سی روشنی ڈالتے ہیں۔ انھیں نتائج کے پیشِ نظر انھوں نے کتاب کے دیباچے میں لکھا تھا:

"اگرچہ مرزا کی لائف، جیسا کہ ہم آئندہ کسی موقعے پر بیان کریں گے، ان فائدوں سے خالی نہیں ہے جو ایک بائیوگرافی سے حاصل ہونے چاہئیں، لیکن اگر ان فائدوں سے قطعِ نظر کی جائے تو بھی ایک ایسی زندگی کا بیان جس میں ایک خاص قسم کی زندہ دلی اور شگفتگی کے سوا کچھ نہ ہو، ہماری پژمردہ اور دل مردہ

سوسائٹی کے لیے کچھ کم ضروری نہیں ہے۔"

غرض حالی غالب کے حالات کے ساتھ ساتھ اس تحقیق کے افادی پہلوؤں کی تلاش میں بھی سرگرداں نظر آتے ہیں۔ اُن کی یہ تلاش خالص تحقیق کی راہ میں حائل ہوئی ہے اور یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ غالب کے متعلق بے شمار جزئیات جو حالی کے علم میں تھے یا انہیں بہ آسانی معلوم ہو سکتے تھے محض اس لیے "یادگار" میں جگہ پانے سے رہ گئے کہ ان کے ذکر سے حالی کے نزدیک کوئی فائدہ نہ تھا۔

حالی کا ضابطۂ اخلاق اور غالب کے ساتھ ان کی عقیدت بھی ان کی راہ کی دو بڑی رکاوٹیں ہیں۔ کسی مرحوم شخصیت کے منفی پہلوؤں کو نمایاں کرنا اخلاق کی دنیا میں غیبت، عیب جوئی اور بدگوئی کہلائے گا، لیکن تحقیق کی دنیا میں محقق کا ان سے صرفِ نظر کرنا اس کی تحقیق کو نامکمل اور یک طرفہ ٹھہرائے گا۔ "یادگارِ غالب" میں غالب حالی کے موضوع سے زیادہ ممدوح کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس نے حالی کے کام کو اور بھی مشکل کر دیا۔ اس مشکل سے عہدہ برآ ہونے کی اُن کے پاس یہی ایک صورت تھی کہ بہت سی معلومات کو کاغذ پر منتقل کرنے کے بجائے اپنے سینے میں مستور رکھیں اور مختلف واقعات کی مختلف روایتوں میں سے اُن روایتوں کا انتخاب کریں جن سے غالب کا کردار مجروح نہ ہوتا ہو۔

یہ سب حیلولے ایک طرف اور حالی کی دیانتداری ایک طرف۔ حالی پر یہ الزام بہ آسانی لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے غالب کا حق تو ادا کیا، مگر غالب بہ تحقیق کا حق نہیں ادا کیا۔ اور غالباً اسی الزام سے بچنے کے لیے انہوں نے "یادگار" کے سوانحی حصے کو ضمنی اور استطرادی قرار دیا لیکن ان پر تحقیقی بددیانتی کا الزام عائد نہیں کیا جاسکتا۔ ہم نے گذشتہ صفحات میں کئی ایسی مثالیں دیکھیں جہاں ان کے بیان کے ظاہری مدعا کے ساتھ ساتھ حقیقت کسی اور روپ میں بھی جھلکتی نظر آتی ہے، اور اس طرح ان کے بیان میں ایک قسم کا اندرونی تضاد پیدا ہو گیا۔ واضح نظر اور واضح تر اندازِ بیان کے مالک حالی کے بارے میں یہ گمان نہیں کرنا چاہیے کہ اُن کی تحریر کے یہ تضاد نادانستہ اور بے خیالی کا نتیجہ ہیں۔ حقیقت شاید یہ ہے کہ ان تضادات کے بردے میں حالی نے تحقیق کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر

غالب کا حامی مقلّد۔ غلام رسول مہر

اگرچہ غالب کو عمر بھر بے مہریِ احباب کے ساتھ ساتھ ناقدری کا بھی گلہ رہا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ غالب کی زندگی ہی میں اس عمل کا آغاز ہو چکا تھا جسے بعد میں غالب شناسی، غالب فہمی اور غالبیات جیسی تنقیدی اصطلاحات سے موسوم کیا گیا۔

غالب شناسی کے دو پہلو قرار دیے جا سکتے ہیں: داخلی اور خارجی۔ داخلی پہلو غالب کی اپنی تحریروں، خطوط اور بعض اشعار سے تشکیل پاتا ہے۔ ایسی تحریریں جن میں اُس نے اپنی ذات اور شخصیت کے بارے میں اظہارِ خیال کیا۔ ایسے خطوط جن سے اگر ایک طرف تخلیقی شخصیت میں نرگسیت کی اساس اُجاگر ہوئی تو دوسری طرف فکر و فن اور زبان و بیان سے وابستہ امور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور ایسے اشعار اور مقطعے بھی ہیں جن میں اُس نے بہ اندازِ تعلّی اپنی غزل یا اسلوب کی کسی خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ غالب شناسی میں یہ ذاتی جہت اور باطنی انداز اس بنا پر تنقیدی اہمیت اختیار کر جاتا ہے کہ غالب شناسی کی خارجی جہت اس کے بغیر گہرائی سے عاری نظر آئے گی کیا غالب کی کسی ایسی سوانح عمری کا تصور کیا جا سکتا ہے جو خطوطِ غالب اور اشعار سے صرفِ نظر کر کے قلمبند کی گئی ہو؟

غالب شناسی کے خارجی پہلو نے اُن لاتعداد اہلِ قلم کی تحریروں سے جنم لیا جو ایک

صدی سے زائد عرصے سے غالب کی حیات اور فکر و فن کو موضوع بنائے ہوئے داد تحقیق دیتے رہے ہیں اور انھیں حضرات کی مساعی کے نتیجے میں غالبیات اور غالب شناسی نے اُردو تنقید میں اہم اصطلاح کی صورت اختیار کر لی ہے (اس کے بعد اقبالیات کا نام بھی لیا جاسکتا ہے)، یہ اعزاز صرف غالب کو حاصل ہے کہ اُردو دنیا کی بعض اہم ترین شخصیات نے غالب شناسی کے لیے اپنی بہترین ذہنی صلاحیتوں کو وقف کیے رکھا اور مولانا غلام رسول مہر (پیدائش : پھول پور ضلع جالندھر- ۱۳ اپریل ۱۸۹۵ء، انتقال : لاہور ۱۶ نومبر ۱۹۷۱ء) بھی بلا شبہ اُنھی اہلِ قلم میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے تحقیق، تنقید اور تشریح ہر لحاظ سے غالب سے محبت کا حق ادا کیا۔

مولانا مہر کے لیے غالب کی کیا حیثیت تھی، اس کا اندازہ اُن کے اُس شذرے سے لگایا جاسکتا ہے جو اُنھوں نے غالب صدی کے سلسلے میں عبدالشکور احسن اور سجاد باقر رضوی کی مرتبہ "غالب۔ ذاتی تاثرات کے آئینے میں" کے لیے قلم بند کیا تھا۔ سوانحی اور تنقیدی اہمیت کی بنا پر اسے مکمل طور پر درج کیا جا رہا ہے :

درعرضِ غمت پیکرِ اندیشہ لالم
پا تا سرم انداز بیان است و بیاں نیست

میں جب مشن ہائی سکول جالندھر کی نویں جماعت میں پڑھتا تھا تب شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا (۱۹۰۹ء)۔ ضامن علی ضامن کا دیوان کہیں سے ہاتھ آگیا تھا اس کی غزلوں پر طبع آزمائی کر کے شوق کی پیاس بجھاتا۔ یقین ہے کہ جو کچھ کہتا تھا وہ قابلِ توجہ تو کیا، غالباً صحیح بھی نہ ہوگا۔ تاہم خوب یاد ہے کہ اپنی ہر غزل کئی کئی مرتبہ صاف کاغذوں پر لکھ لکھ کر خوش ہوتا تھا گویا "طفلِ خود نما" کا معاملہ تھا :

یک حرف خواندہ ایم و بصد جا نوشتہ ایم

کچھ عرصے کے بعد خیال آیا کہ اس "تک بندی" کے متعلق کسی سے مشورہ ضرور کر لینا چاہیے۔ ایک ہم جماعت سے بات کی تو اس نے مولانا حکیم محمد سلیم کی بارگاہ میں حاضری کی صلاح دی جو بستی غزاں میں رہتے تھے اور بستی غزاں مشن ہائی سکول سے زیادہ دُور

نہ تھی۔

مولانا سلیم عربی، فارسی اور اُردو کے تو فاضل تھے ہی بھاشا بھی خوب جانتے تھے اور چاروں زبانوں میں شعر کہتے تھے میں نے انھیں تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ وغیرہ مختلف علوم پر بے تکلف فاضلانہ گفتگو کرتے ہوئے بار ہا سُنا۔ ہیئت و جفر میں بھی اُنہیں دست گاہ حاصل تھی۔ فنِ خطاطی میں بھی ماہر تھے۔ ایک روز میری نظر اچانک اُن کے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے پر پڑی تو معلوم ہوا ناخن ترشوانا بھول گئے۔ ان سے ذکر کیا تو چپ چاپ سفید کاغذ کا ایک تختہ اُٹھایا جو سامنے پڑا تھا اور چند لمحوں میں اس پر ابجد کے نہایت خوبصورت نقوش ناخن سے بنا دیے۔ طب کو تو انھوں نے پیشے کے طور پر اختیار کر لیا تھا اور مشہور تھا کہ تشخیص و تجویز میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔

میں اُن کی خدمت میں پہنچا تو عمر ستر کے قریب معلوم ہوتی تھی۔ بال بالکل سفید ہو چکے تھے اگرچہ صحت اچھی تھی تاہم اُٹھنے بیٹھنے میں خاصا تکلف محسوس کرتے تھے علم و فضل کے باوصف ان کی آمدنی بہ ظاہر بہت محدود تھی۔ مریض بھی کم ہی آتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اوائل شباب ہی میں وہ عرق نوشی کے عادی ہو گئے تھے۔ اس شغل میں انہماک کے باعث ان کے تمام کمالات پر پردہ سا پڑ گیا اور وہی صورت پیدا ہو گئی جس کا نقشہ مرزا غالب نے اپنی کیفیت بیان کرتے ہوئے کھینچا ہے:

جوہرِ طبعم درخشان است، لیک
روزم اندر ابر پنہاں می رود

مولانا سلیم مرحوم خود بھی بعض اوقات عالمِ سرور میں نہایت عمدہ علمی گفتگو کرتے ہوئے یکایک پیکرِ حسرت بن جاتے اور مرزا غالب کا یہ شعر پڑھتے:

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

ساتھ ہی آنکھیں نم آلود ہو جاتیں لیکن میری اور بعض دوسرے نیازمندوں کی انتہائی کوشش کے باوجود وہ عرق نوشی ترک کرنے پر آمادہ نہ ہوئے ان حالات میں خوشگوار

تغیر کی کیا امید ہو سکتی تھی۔ مولانا کے حالات بے حد دلچسپ بھی ہیں اور عبرت انگیز بھی۔ تاہم میں یہ داستان چھیڑ دوں تو اصل موضوع سے بہت دور چلا جاؤں گا۔ یہاں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ مولانا نے مجھے شرفِ تلمذ سے بھی نوازا۔ میرا یہ موجودہ تخلص بھی انھیں کا عطیہ ہے اگرچہ اس کی حیثیت مدت سے ایک تہمت کی سی رہ گئی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ چند ہی روز کے بعد "دیوانِ غالب" پڑھنے کی تاکید فرمائی بلکہ چند غزلیں خود پڑھائیں۔ افسوس کہ میں کم علمی کے باعث ان کی تشریحات سے زیادہ فائدہ نہ اٹھا سکا۔ پھر مولانا حسرت موہانی اور شوکت میرٹھی کی شرحیں پڑھیں لیکن شفیق استاد کے تاکیدی ارشاد کی تعمیل میں "دیوانِ غالب" کا مطالعہ برابر جاری رکھا۔ اگرچہ سوچتا ہوں تو آج بھی مجھ پر قطعاً واضح نہیں ہوتا کہ اس ارشاد کی بنیاد کیا تھی۔ رفتہ رفتہ طبیعت کو مرزا کے اسلوب بیان سے اک گونہ مناسبت پیدا ہونے لگی اور زیادہ تر اشعار کے معانی فہم کی دسترس میں آنے لگے۔ دسویں جماعت پاس کرنے کے بعد اسلامیہ کالج لاہور میں پہنچا تو مرزا کے فارسی کلام سے روشناس ہوا۔ پھر بیدل کا مطالعہ شروع کر دیا صرف اس خیال سے کہ مرزا غالب نے ابتدا میں بیدل بہت پڑھا تھا لیکن یہ دور جلد ختم ہو گیا:

در سلوک از ہر چہ پیش آمد گذشتن داشتم
کعبہ دیدم، نقشِ پائے رہرواں نامیدمش

مرزا ہی کی رہنمائی میں فارسی کے مشہور اساتذہ تک رسائی نصیب ہوئی جن میں سے بعض کا کلام عموماً میری زبان پر جاری رہتا ہے۔

مرزا غالب کے ساتھ اولین روشناسی پر نصف صدی سے زیادہ مدت گزر چکی ہے تاہم آج بھی دل میں یہی آرزو موجزن رہتی ہے کہ گوناگوں مشاغل سے کچھ مہلت میسر آجائے تو اسے مرزا کے فارسی اور اردو کلام یا اردو مکاتیب کے مطالعے میں گزار دوں۔ شاید اسی طرح معنی رسی اور حقائق شناسی کی صلاحیت

میں گزار دوں۔ شاید اسی طرح معنی رسی اور حقائق شناسی کی صلاحیت میں کسی قدر جِلا

پیدا ہو جائے۔

الحمد اللہ کہ میں اپنی فطری یا اکتسابی استعداد کے بارے میں غلط فہمی سے ہمیشہ محفوظ رہا۔ قدرت نے جو کچھ عطا کیا تھا اس کی حیثیت قرآنِ حکیم کے لفظوں میں "بضاعتہ مزجاۃ" کی سی ہوگی۔ باقی رہا تحصیل و اکتساب کا معاملہ تو میں ہر دور میں نارسائیوں، نامساعدتوں اور درماندگیوں کا شکوہ سنج رہا تاہم میرے کشکولِ فکر و نظر میں جو بھی حقیر سی پونجی موجود ہے اس میں شعر و ادب کی حد تک ہر شے کو میں اصلاً مرزا غالب ہی کا فیضان سمجھتا ہوں۔ میرے ذوق، میری صلاحیت فہم حقائق، میری قوت اخذ معارف، میرے معیار "خوب" و "ناخوب" نے مرزا ہی کے کلام کی آغوشِ ممارست میں تربیت پائی۔ غرض میں جو کچھ بھی بن سکا اس کی بنیادیں مرزا ہی کی بارگاہِ عظمت میں پُرخلوص عقیدت کی بدولت استوار ہوئیں۔ اس کے لیے اپنے شفیق و مکرم استاد مولانا حکیم محمد سلیم کے لیے نوافل سحرگاہی میں بالالتزام دعا کرتا ہوں مرزا کا یہ شعر بے شمار اصحاب نے پڑھا ہوگا بلکہ اسے جابجا استعمال بھی کیا ہوگا:

بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
لیکن عیارِ طبع خریدار دیکھ کر

میں فروماندگی کے دلی اعتراف کے ساتھ اپنے تصور کے مطابق اپنے آپ کو اس کی صداقت کی ایک شہادت سمجھتا ہوں۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ خدانخواستہ میں اپنے عیارِ طبع کے متعلق حسنِ ظن میں مبتلا ہوں یا مرزا غالب واقعی متاعِ سخن کے ساتھ بہ نفسِ نفیس میرے پاس آ گئے۔ حاشا و کلا۔ صرف یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے جو کچھ ملا مرزا ہی کے سرچشمۂ فیض سے ملا خواجہ شیراز کی حقیقت گوئی نظر انداز نہ ہونی چاہیے:

ہر چہ ہست از قامت ناساز و بے اندام ماست
ورنہ تشریف تو بر بالائے کس کوتاہ نیست

اس سلسلے میں ایک بدیہی نقصان کی طرف بھی اشارہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ

بالکل ابتدائی دور میں مرزا کے کلام سے شغف پیدا ہو جانے کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ میں اقبال کے سوا کسی بھی اُردو شاعر کا کلام آج تک بالاستیعاب نہ پڑھ سکا۔ مختلف شعرا کے دواوین صرف جستہ جستہ ہی دیکھ سکا کیونکہ اقبال کو مستثنیٰ کرتے ہوئے غالب کی آتشِ خیال کا سا کیف و سرور کسی دوسرے خم خانے میں نہ مِل سکا۔

اگرچہ یہ ذکر پیشِ نظر موضوع سے بے تعلق ہے تاہم میرے لیے ایسی ہی صورت اُردو نثر میں بھی پیش آئی میں نے بالکل ابتدائی دور میں "الہلال" پڑھا اور شعر سے نثر کی طرف توجہ "الہلال" ہی کے باعث منعطف ہوئی مولانا ابوالکلام مرحوم کے اندازِ بیان نے ذہن و دماغ پر اس طرح قبضہ کر لیا کہ میں اُردو نثر کے بھی بیشتر عمدہ ذخیروں سے جزواً ہی مستفید ہو سکا۔

میری مثال کوئی اچھی اور قابلِ تقلید مثال تو یقیناً نہیں مگر یہ ضرور کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اگر ذوقِ صحیح کے نشو و نما کی آرزو ہو، اگر حقائق و معارفِ عالیہ سے حقیقتاً لذت یاب ہونے یا اُنہیں دل پذیر طریق پر پیش کرنے کی صلاحیتوں میں فروغ و بالیدگی کی جستجو ہو تو مرزا کا کلام ضرور پڑھیے نظم بھی اور نثر بھی۔ اس طرح پڑھیے جو پڑھنے کا حق ہے اس عاجزانہ گزارش کو شرفِ قبول بخش کر آپ یقیناً پشیمان نہ ہوں گے مرزا کا یہ شعر شاعرانہ تعلّی کا کرشمہ نہیں حقیقت کا ترجمان ہے:

در تہِ ہر حرف غالب چیدہ ام میخانۂ
تا ز دیوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شدن "[۱]

(۲)

مولانا مہر جامع کمالات تھے مورخ، محقق، ادبی نقاد، صحافی اور مترجم ہونے کے علاوہ اُنھوں نے اقبال شناسی اور غالب شناسی میں بھی خصوصی شہرت حاصل کی انھوں نے عمر بھر قلم سے رشتہ اُستوار رکھا اور اپنی تحریروں ہی کو باعثِ عزت جانا۔ ان کی شخصیت

---

[۱] مطبوعہ جامعہ پنجاب، ۱۹۶۹ء ص، ۱۸۔ ۱۱

کا یہ پہلو قابلِ توجہ ہے کہ انھوں نے خود کو کمرشل بنانے کی کوشش نہ کی با اصول صحافی کی حیثیت سے نیک نامی کمائی اور "انقلاب" کے ذریعے سے تحریکِ آزادی میں فعال کردار ادا کیا۔

اپنے موضوع کی حدود میں رہتے ہوئے جب غالب پر ان کی کتابوں اور تحریروں کا جائزہ لیا جائے تو اس مد میں بھی وہ "کم عیار" نہیں اور انھوں نے ہر لحاظ سے اس محبت کو نبھایا جو اوائلِ عمر ہی میں انھوں نے غالب کے لیے محسوس کی تھی۔ ان کی ذاتی زندگی حسن و عشق کی حشر سامانیوں سے معریٰ نظر آتی ہے۔ ان کی پہلی محبت غالب ہے اور یہی بہت بڑی بات ہے۔ یہ ایک دلچسپ ادبی ظن بھی ہے کہ اگر انھوں نے غالب کی بجائے میر تقی میر سے عشق کیا ہوتا تو ان کی تنقیدی حس پر کیسے اثرات مرتب کیے ہوتے تاہم یہ امر بھی توجہ طلب ہے کہ غالب کے بعد انھیں مولانا ابوالکلام آزاد اور علامہ اقبال سے خصوصی شغف تھا۔

مولانا مہر تیز قلم مصنف تھے پیشہ ور صحافی ہونے کے باوجود متنوع موضوعات پر کثیر تعداد میں کتابیں لکھ لینا سہل نہیں، میرا مقصد ان کی کتابیات مرتب کرنا نہیں تاہم کتابوں کی تعداد کا اندازہ کرنے کے لیے اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ انھوں نے تاریخی اور مذہبی شخصیات (۶) تاریخی موضوعات (۳) برِصغیر کی سیاسی تاریخ سے وابستہ اہم موضوعات (۶) علامہ اقبال (۵) مولانا ابوالکلام آزاد (۴) مرزا غالب (۷) درسیات (۱۸) اور متنوع موضوعات پر علمی ادبی اور تحقیقی کتب کے تراجم (۴۲) کی صورت میں کل ۹۱ کتابیں تحریر، مدون یا مرتب کیں۔ اس پر مستزاد کثیر تعداد میں ایسے مقالات جو تحقیقی و تنقیدی اہمیت کی بنا پر آج کارآمد ہو سکتے ہیں۔

غالب پر مولانا مہر کی تصانیف کی تفصیل یہ ہے :

"غالب" : امرتسر ۱۹۳۶، لاہور، ۱۹۴۱، ۱۹۴۴، ۱۹۴۶ء

"خطوطِ غالب" : لاہور : حصہ اول، ۱۹۵۱ء، حصہ دوم : ۱۹۵۲، طبع دوم : طبع سوم ۱۹۶۲، طبع چہارم (دو حصے) ۱۹۶۹ء طبع پنجم (ایک جلد) ۱۹۸۲ء

"دیوانِ غالب": لاہور، ۱۹۶۷ء

"قصائد و مثنویات فارسی": لاہور ۱۹۶۹ء

"قطعات رباعیات، ترکیب بند، ترجیع بند، مخمس": لاہور، ۱۹۶۹ء

"نوائے سروش" (شرحِ اردو کلام غالب): لاہور ۱۹۶۹ء

"کلیاتِ غالب (فارسی)" لاہور: ۱۹۶۵ء

ان کتب کے ساتھ ساتھ مولانا مہر کے مقالات پر نظر ڈالنے سے ان کی غالب شناسی میں تحقیق و تنقید کے امتزاج کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے (مقالات بہ ترتیبِ زمانی۔)

۱۔ "غالب کا سفرِ کلکتہ" — اردو، دہلی اپریل ۱۹۳۶ء

۲۔ "غالب کی خاندانی پنشن" — علی گڑھ میگزین غالب نمبر ۴۹۔۱۹۴۸ء

با اضافہ و ترمیم احوال غالب مرتبہ مختار الدین آرزو ۱۹۵۳ء

۳۔ "مرزا غالب کا مقدمہ" — علی گڑھ میگزین غالب نمبر ۴۹۔۱۹۴۸ء

۴۔ "مرزا غالب اور میر تقی میر" — ماہِ نو کراچی۔ فروری ۱۹۴۹ء

۵۔ "جنگِ آزادی کی کہانی۔ مکاتیبِ غالب کی روشنی میں":

(i) ماہِ نو کراچی فروری ۱۹۵۳ء

(ii) تحریک دہلی فروری مارچ ۱۹۶۹ء

۶۔ "غالب بحیثیت نقاد": (i) نگار اپریل ۱۹۵۳ء

(ii) نگار کراچی، جنوری فروری ۱۹۶۹ء

(iii) المعارف لاہور فروری ۱۹۶۹ء

۷۔ "غالب کا تصورِ دوزخ و جنت" (i) نشریہ ریڈیو پاکستان لاہور ۱۹۵۶ء

(ii) ماہِ نو کراچی فروری ۱۹۵۶ء

(iii) روزنامہ مشرق لاہور: ۱۶ فروری ۱۹۶۹ء

(iv) ماہِ نو کراچی: جنوری فروری ۱۹۶۹ء

(۷) فروغِ اُردو لکھنؤ : نومبر دسمبر ۱۹۶۸ء

۸۔ "احوالِ غالب کی گمشدہ کڑیاں": (i) آج کل دہلی فروری ۱۹۵۷ء

(ii) آئینۂ غالب دہلی ۱۹۶۴ء

۹۔ "پنج آہنگ": آج کل دہلی فروری ۱۹۵۸ء

۱۰۔ "لطائفِ غیبی۔ قاطع برہان کے سلسلے کی ایک کتاب : اُردو معلی حصہ دوم فروری ۱۹۶۱ء

۱۱۔ "غالب — دو شعر دو ستارے" (i) ماہِ نو کراچی فروری ۱۹۶۳ء

(ii) شبستان نئی دہلی فروری ۱۹۶۹ء

۱۲۔ "غالب کی شاعری — غور و فکر کے نئے پہلو"، ماہِ نو کراچی فروری ۱۹۶۴/ جنوری فروری ۱۹۶۹ء

۱۳۔ "حیاتِ غالب چند گزارشیں": ماہِ نو کراچی جولائی ۶۴؛ ۱۰۱/ جنوری فروری ۱۹۶۹ء

۱۴۔ "غالب کے آٹھ شعر": ماہِ نو کراچی فروری ۱۹۶۵ء

۱۵۔ "مرزا غالب کی صد سالہ برسی": ماہِ نو کراچی فروری ۱۹۶۶ء/ جنوری فروری ۱۹۶۹ء

۱۶۔ "مرزا غالب کی شاعری کے بعض خاص پہلو": آج کل دہلی فروری ۱۹۶۷ء

۱۷۔ "مرزا غالب کے چند شعر (وضاحت و شرح)": ماہِ نو کراچی فروری ۱۹۶۷ء

۱۸۔ "پیش لفظ" احوال و نقدِ غالب مرتبہ محمد حیات سیال : لاہور : ۱۹۶۷ء

۱۹۔ "غالب کی عظمت": فولیو : لاہور غالب نمبر ۱۹۶۷ء

۲۰۔ "افکارِ غالب کے نئے زاویے": صحیفہ لاہور غالب نمبر ا جنوری ۱۹۶۹ء

۲۱۔ "غالب کی شاعری": نقوش غالب نمبر ا لاہور فروری ۱۹۶۹ء

۲۲۔ "غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے": سالنامہ مجلہ یادگارِ غالب کراچی ۱۹۶۹ء

۲۳۔ "غالب میری نظر میں": مشمولہ غالب ذاتی تاثرات کے آئینے میں : لاہور ۱۹۶۹ء

۲۴۔ غالب کے ہم معنی اُردو اور فارسی اشعار": اردو کراچی جنوری مارچ ۱۹۶۹ء

۲۵۔ ”فکرِ غالب کی معجز نمائیاں“ : افکار کراچی فروری مارچ ۱۹۶۹ء

۲۶۔ ”داستانِ فرہاد اور غالب کا تصورِ محبت“ : (i) العلم کراچی غالب نمبر ۱۹۶۹ء

(ii) اُردو زبان سرگودھا جنوری ۱۹۶۹ء

۲۷۔ ”مرزا غالب کا مقامِ شعر گوئی“ : اوراق لاہور اپریل ۱۹۶۹ء

۲۸۔ ”مرزا غالب کا فارسی کلام“ : مخزن لاہور مئی جون ۱۹۶۹ء

۲۹۔ ”دستنبو۔ واقعاتی پس منظر میں“ : تحریک دہلی مارچ ۱۹۶۹ء

۳۰۔ ”مرزا غالب کی والدہ ماجدہ“ : دبستان لاہور جولائی ۱۹۶۹ء

۳۱۔ ”غالب“ (تقریر) : شام ہمدرد لاہور ۶ فروری ۱۹۶۹ء

۳۲۔ ”نسخہ حمیدیہ، طباعت وتحقیق کی داستان“ : اقبال لاہور اپریل ۱۹۶۹ء

۳۳۔ ”اردو املا میں مرزا غالب کا اجتہاد“ : سب رس حیدرآباد دکن غالب نمبر ۲ دسمبر ۱۹۶۹ء

۳۴۔ ”مرزا غالب کی انسان دوستی“ : لیل و نہار لاہور ۱۵۔۲۱ فروری ۱۹۷۱ء

۳۵۔ ”بیاضِ غالب کی دریافت“ : نقوش لاہور غالب نمبر ۳، ۱۹۷۱ء[1]

اس نوع کی کتابیات کبھی مکمل نہیں ہو سکتی تاہم ان چند مقالات سے کسی حد تک یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مولانا مہر نے غالبیات میں کیا کچھ اضافے کیے۔ جہاں تک اُن کی کتب کا تعلق ہے تو ان میں سے غالب اور نوائے سروش سے قطع نظر بقیہ تمام مدون یا مرتب کی گئی ہیں۔

(۳)

جہاں تک مولانا مہر کی نوائے سروش کا تعلق ہے تو مولانا نے اپنے مقدمے میں اس کی نمایاں خصوصیات یوں بیان کی ہیں :

”۱۔ صحت کلام کا پورا اہتمام“

---

[1] نیر سلطانہ : مولانا غلام رسول مہر بطور غالب شناس (غیر مطبوعہ) ۱۹۷۴ء ص ۵۹۔۱۵۴

۲۔ "علاماتِ اوقاف صحیح مقامات پر لگانے کا اہتمام"

۳۔ "تمام الفاظ پر اعراب لگا دیے جائیں تاکہ تلفظ میں غلطی سرزد نہ ہو"

۴۔ "جتنے اشعار دیوان سے باہر رہے تھے اور وہ مختلف مقالات میں چھپ چکے تھے انھیں اکٹھا کر کے بطور ضمیمہ شاملِ دیوان کرنا۔

۵۔ "نسخہ حمیدیہ سے ایسے اشعار کا انتخاب جو کسی قدر سہل ہوں اور اُن میں فکر و بیان کی کوئی خوبی پائی جائے"۔

۶۔ "اس میں مختلف غزلیات و قصائد کی تاریخیں مستند ماخذ کی بنا پر متعین کر دی جائیں"۔[1]

تنقیدی اور تحقیقی نقطۂ نظر سے آخری بات اہم ہے اگرچہ اس دیوان سے پہلے محترم مالک رام اور مولانا امتیاز علی عرشی کے مرتبہ دیوان طبع ہو چکے تھے اور ان دونوں نے نسبتاً وسیع بنیادوں پر کام کیا تاہم مولانا مہر کے کام کی قدر و قیمت برقرار رہتی ہے کہ اس ضمن میں اُن کا نقطۂ نظر یہ تھا:

"میرے پیشِ نظر جامعیت کی بجائے یہ امر تھا کہ اُن اشعار کو با اہتمام خاص مرتب کر دیا جائے جن سے اُردو خواں اصحاب زیادہ سے زیادہ تعداد میں استفادہ کر سکیں"۔[2]

مولانا مہر نے غالب کو قدیم و جدید کے درمیان ایک "برزخ" قرار دیا تھا اور یہ شرح اُسی برزخ کی تخلیقی جہات کو سمجھنے کی کوشش ہے۔ اُردو میں دیوانِ غالب اور اب علامہ اقبال کے کلام کے حوالے سے شارحین کی خاصی طویل فہرست ملتی ہے جس میں حسرت موہانی، نظم طباطبائی، بیخود موہانی، عبدالباری آسی، احسان دانش، اثر لکھنوی، خلیفہ عبدالحکیم، جوش ملسیانی اور نیاز فتح پوری جیسے اسما ملتے ہیں۔ اگر نظم طباطبائی کی شرح کی اولیت تسلیم کر لی جائے جو ۱۹۰۱ء میں طبع ہوئی تو پھر مولانا مہر کی نوائے سروش تک شرح

---

[1] نوائے سروش لاہور ۱۹۶۹ء ص۱۲-۱۱

[2] نوائے سروش ص۱۲

کی روایت کی عمر ۲۰ برس قرار پاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس روایت میں مولانا مہر کی شرح کس مقام کی حامل ہے۔

یہ دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا کہ نوائے سروش عہد آفریں یا جہان ساز ہے لیکن اتنی گئی گزری بھی نہیں۔ اس کے مطالعے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ غالباً مولانا مہر کے ذہن میں اردو ادب کے اساتذہ اور طلبہ کی نصابی ضروریات رہی ہوں گی کیونکہ مشکل الفاظ کے معانی درج کرنے کے ساتھ ساتھ اندازِ تشریح ناقدانہ کے مقابلے میں مُعلّمانہ زیادہ ہے اسی لیے بعض اوقات ایسے الفاظ کے معنی بھی درج کر دیے گئے جو غالب فہم قاری کے لیے تو مشکل نہ ہوں گے مگر بی اے کا اوسط درجے کا طالب علم شاید اُن سے واقف نہ ہو جیسے دم (ص ۱۸) بس کر (ص ۱۹) قیس (۲۰) خمار، رسوم و قیود (۲۴) بےخودی (ص ۲۷) چراغاں، کارفرما (۳۰) افسردگی، تپاک (ص ۳۱) داد نہ دینا (ص ۳۲) نو آموز (ص ۳۳) بےدلی (ص ۳۸) ہوا (ص ۳۹) زمرد، حریف (ص ۴۱) — اس انداز کی متعدد مثالیں مل جاتی ہیں البتہ اپنے فارسی شاعری کے مطالعے اور تحقیقی مزاج کی بنا پر بعض اوقات مولانا مہر اشعار کی تشریح کے ضمن میں تحقیقی مواد کے ساتھ ساتھ فارسی اشعار کا تقابل بھی کرتے جاتے ہیں جس سے شعر کی خوبیاں نمایاں تر ہو جاتی ہیں۔

مولانا مہر کی تشریح بالعموم مختصر اور ٹو دی پوائنٹ ہوتی ہے جب وہ شعر کی توضیح کرتے ہیں تو وہ مشرقی انتقاد کی روایات سے آگے نہیں بڑھتے۔ اسی لیے اگر انھیں نفسیات یا دیگر جدید علوم سے استفادے کے مواقع ملے تو انھوں نے اس نقطۂ نظر سے شعر کی مزید جہات نمایاں نہ کیں مثلاً غالب کا نفسیاتی مطالعہ کریں تو اس کے ہاں محبوب کے پاؤں سے جنسی رغبت (FOOT FETISHISM) کے واضح آثار ملتے ہیں[1]، لیکن اس قسم کے اشعار کی تشریح میں مولانا مہر کا ذہن اس طرف نہیں جاتا مثال کے طور پر یہ

---

[1] مزید معلومات کے لیے ملاحظہ ہو راقم کا مقالہ "غالب کی شاعری میں جنس" اور "شعور اور لاشعور کا شاعر۔ غالب" لاہور : ۱۹۸۵ء

شعر ملاحظہ ہو :

لے تو لوں سوتے میں اس کے پانو کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

مولانا مہر نے اس شعر سے متعلق نفسیاتی نکات پر توجہ نہیں دی۔

غالب کے ہاں رشک کا جو رویّہ ملتا ہے اس کا نفسیاتی مطالعہ بہت دلچسپ ہے اور اس کی توضیح میں متعدد اہلِ قلم مقالات قلمبند کر چکے ہیں لیکن مولانا مہر رشک والے اشعار کی تشریح میں رشک کے مضمون کی تنقیدی اہمیت یا نفسیاتی مضمرات کی جستجو کی کوشش نہیں کرتے۔ مثلاً اس شعر کی تشریح انھوں نے یوں کی ہے :

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہمسفر غالبؔ
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

"اے غالب! قیامت ہے کہ ہمارا محبوب جسے ہم خدا ناترس ہونے کی بنا پر کافر کہتے ہیں غیر کا ہمسفر ہو جائے حالانکہ ہمیں یہ بھی منظور نہیں اُسے رخصت کرتے وقت "خدا کے حوالے" کہیں"۔ (ص ۶۵۸)

اس پُر معنی شعر کی یہ شرح سطحی سی محسوس ہوتی ہے۔ غالب کی بعض مسلسل غزلیں اس کی تخلیقی شخصیت کی تفہیم کے لیے اہم اشاریہ کی صورت اختیار کر جاتی ہیں یہ وہ غزلیں ہیں جن میں ردیف شعر کے الفاظ سے پیوست ہو کر درِ معنی کھولنے کی موجب بنتی ہے اس ضمن میں یہ غزل نمایاں مثال کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے :

بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

مولانا مہر نے ہر شعر کی دو اڑھائی سطروں میں تشریح کر کے ان اشعار سے وابستہ شخصی اور نفسی تلازمات نمایاں کرنے کی کوشش نہیں کی بالخصوص شعر ۱، ۲ اور ۴ میں جس طرح سے غالب کی شخصیت کا نرگسی رنگ چوکھا ہوتا نظر آتا ہے اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ ان اشعار کی تشریح کسی اور ہی طرح سے ہوتی لیکن مولانا محض اسی پر اکتفا کرتے ہیں :

"میری نگاہوں میں دنیا بچوں کا ایک کھیل ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ رات دن ایک تماشا میرے سامنے ہو رہا ہے۔"

غالب کا مندرجہ ذیل شعر OBSESSIONAL ILLUSION کی ٹیکسٹ بک مثال کی حیثیت رکھتا ہے :

باغ پا کر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے
سایۂ شاخِ گل افعی نظر آتا ہے مجھے

مولانا نے تشریح کی بجائے ایک طرح سے شعر کی نثر بنا کر رکھ دی اور وضاحت کے لیے ڈاکٹر بجنوری کا ایک اقتباس درج کر دیا جو واقعاتی کم اور تخیلی زیادہ ہے۔

اس انداز کی مثالیں پیش کرنے کا مقصد نوائے سروش پر اعتراضات کرنا نہیں بلکہ یہ مولانا مہر کی شرح کی حدود کا اندازہ کرانے کے لیے ہے۔

(۴)

مولانا مہر کی خطوطِ غالب تحقیقی نوعیت کا کام ہے لہذا اس کتاب کا محاکمہ کرنے کے لیے انسان کو مالک رام اور مولانا عرشی ہونا چاہیے خطوط پر تحقیقی کام ڈاکٹر خلیق انجم نے بھی کیا ہے میں محقق نہیں ہوں اس لیے اس بھاری پتھر کو چوم کر چھوڑتا ہوں تاہم غالب کے خطوط کی اہمیت کے بارے میں مولانا مہر کی ایک رائے درج کی جاتی ہے جس کا اظہار اُنھوں نے یومِ غالب (ملتان : ۱۰ فروری ۱۹۶۵ء) کے موقع پر اپنے پیغام میں کیا تھا : "مرزا کا ایک نہایت نادر ادبی کارنامہ اُن کے خطوط ہیں جن کی کوئی مثال کم از کم مجھے اُردو زبان میں نہیں مل سکی۔ یہ محض خط و کتابت ہی کے دائرے میں یگانہ نہیں بلکہ حسنِ تحریر سلاست، حلاوت، دل آویزی اور دقائقِ بیان کے ایسے بدیع مرقعے شاید ہی دوسری کتابوں میں مل سکیں اور ان میں بعد کے جلیل القدر ادیبوں کی تمام کتابیں بھی شامل ہیں کاش ان خطوط پر بھی ایسی ہی توجہ فرمائی جا سکے جس کے یہ بہر حال مستحق ہیں"۔[۱]

---

[۱] بحوالہ "آشوبِ آگہی" (۲) از قدرت نقوی : اُردو نامہ کراچی شمارہ ۳ - ۵

(۵)

مولانا مہر کی غالب شناسی میں "غالب" بلاشبہ ممتاز مقام کی حامل تالیف ہے پرنٹ لائن پر سنہ طباعت درج نہیں مگر مؤلف کی تمہید پر ۱۰ مئی ۱۹۳۶ء کی تاریخ درج ہے۔ آزاد بکڈپو، ہال بازار، امرتسر اس کے ناشر ہیں اور سرورق پر مولانا غلام رسول مہر جالندھری درج ہے کتاب کی تمہید میں مولانا مہر نے معتقدِ غالب ہونے کا یوں اعتراف کیا ہے :

"میں ہوش سنبھالتے ہی کسی دوسرے شاعر کی عقیدت کا حلقہ اپنی گردن میں ڈالے بغیر غالب کا معتقد بن گیا تھا"[1]

بہ الفاظِ دیگر محقق ہونے کے باوجود مولانا مہر غالب کو اس آنکھ سے نہیں دیکھ سکتے تھے جس سے کہ (مثلاً) قاضی عبدالودود دیکھتے تھے، اسی لیے کہتے ہیں :

"میری عقیدت اجتہاد و تحقیق کے جوہر سے معرّیٰ تھی میں نے صرف غالب کو دیکھا تھا اور کسی دوسرے سے شناسائی و معرفت حاصل نہیں کی تھی ..... شرعی اصطلاح میں میری حیثیت "حامی مقلد" کی تھی .....

تصوف کی زبان میں میں مجذوب تھا"[2]

دیکھا جائے تو "حامی مقلد" ہونے ہی میں مولانا مہر کی غالب شناسی کا جوہر سمٹ آتا ہے اسی لیے انھوں نے غالب پر جب بھی قلم اٹھایا اُسے حسنِ عقیدت کی روشنائی میں ڈبو کر لکھا۔ یہ قابلِ تعریف بھی ہو سکتا ہے اور برعکس بھی ـــ اس کا انحصار پڑھنے والے کے ذہنی رویے پر ہوگا۔

مولانا مہر کو احساس تھا کہ ان کی کتاب مولانا حالی کی "یادگارِ غالب" کے بعد آ رہی ہے۔ مولانا مہر کی مشکل یہ تھی کہ اگر وہ محض سوانح عمری ہی لکھتے تو زیادہ سے زیادہ "یادگارِ غالب" تک ہی پہنچ پاتے یا پھر تحقیقات سے حیات و کلام کے مخفی گوشے اجاگر کر کے اپنا رنگ جماتے لیکن

---

[1] غالب : امرتسر آزاد بکڈپو : ۱۹۳۶ء ص۱۱

[2] ایضاً " " " ص۱۱

تیسری زبانی تک تحقیقی مواد کی خاصی کمی تھی لہٰذا انھوں نے نیا انداز اپنایا یعنی غالب کے خطوط، نثری تحریروں اور اشعار کی امداد سے حیاتِ غالب کے نقوش ابھارے۔ یقیناً یہ محنت طلب کام تھا۔

خطوطِ غالب کے ضمن میں دو نکات اساسی حیثیت رکھتے ہیں ایک تو غالب کا یہ دعویٰ کہ میں نے مراسلے کو مکالمہ بنادیا اور دوسرے غالب کی شخصیت میں نرگسی محرکات کی کارفرمائی جس کے نتیجے میں خطوط ایسے آئینے میں تبدیل ہوجاتے ہیں جس میں غالب کی شخصیت بنتی سنورتی نظر آتی ہے۔ بحیثیت مجموعی "عودِ ہندی" اور "اردوئے معلیٰ" ایسا آئینہ خانہ ہیں جس میں غالب اور اس کے معاصرین کے ساتھ ساتھ اُس عصر کے نقوش بھی اُبھاگر ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ غالب کا سوانح نگار ان خطوط سے صرفِ نظر نہیں کرسکتا اور مولانا مہر نے تو ایک طرح سے "غالب" کی اساس ہی خطوط پر استوار کی ہے یوں کہ اُن کے بقول :

> "اس کتاب کو ایک لحاظ سے غالب کی تزک کہا جاسکتا ہے۔" (ص۱۵)

مگر مولانا مہر نے اس مقصد کے لیے محض قینچی اور گوند پر انحصار نہیں کیا بلکہ انھوں نے نئے مواد کی روشنی میں "یادگارِ غالب" کے بعض مباحث پر اضافہ بھی کیا، مرزا محمد عسکری کی "ادبی خطوطِ غالب" کی اغلاط کی نشاندہی کی اور تحقیقی اعتبار سے "جہاں جہاں غالب کے بیانات محلِ نظر معلوم ہوئے، اُن کے عدم وقبول کے وجوہ ظاہر کردیے"، اور اس کے ساتھ ہی انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے اسقام کی طرف بھی توجہ کی۔ الغرض اپنے حالات اور زمانے کے اعتبار سے اُنھوں نے "غالب" کو ایک مستند اور جامع سوانح عمری بنانے کی کوشش کی اور اس دعوے کے ساتھ :

> "میں ادیب نہیں ہوں شاعر نہیں ہوں سوانح نگار نہیں ہوں۔
> غالب کی ذات کے ساتھ دیرینہ عقیدت کے جذبۂ مخلصانہ کی سرخوشی
> میں قلم کے مسافر نے مہینوں کا غذات کے مراحل میں تگ و دو

کی ہے"۔ (ص۱۲)

لیکن غالب سے عقیدت اور محبت کے باوجود "غالب" کا مطالعہ کرتے وقت بعض اوقات تشنگی کا احساس ہوتا ہے اور اس تشنگی کی وجوہات کا بھی مولانا مہر کی تمہید سے علم ہو جاتا ہے جو یوں ہیں :

۱۔ "صحت اس قدر دیدہ ریزی کے لیے مساعد نہ تھی"۔

۲۔ "میں نے زیادہ تر حافظے اور استحضار پر اعتماد کیا اور حافظے ہی کی بنا پر مختلف اصحاب کے نام کے خطوں سے یا دوسری تصانیف سے مختلف مطالب جمع کرتا یا کراتا رہا"۔

۳۔ "بعض امور کے متعلق مجھے محض قیاسات سے کام لینا پڑا ہے جن میں سے ممکن ہے بعض غلط ہوں یا پورے کے پورے صحیح نہ ہوں"۔ (ص۱۷)

بالفاظِ دیگر "غالب" کی تحقیقی اساس خاصی کمزور ہے۔ تحقیق کا بنیادی اصول تو یہ ہے کہ ہر بات کو اس وقت تک ناقابلِ قبول سمجھنا چاہیے جب تک کہ صداقت کا قطعی ثبوت نہ مل جائے۔ حافظے اور قیاسات کی تحقیق میں گنجایش نہیں ہوتی۔ اسی لیے میں سوچتا ہوں کہ اگر مولانا مہر کی "غالب" پر میرے بجائے رشید حسن خاں صاحب نے قلم اُٹھایا ہوتا تو میرے اس بے ضرر اسلوب کے مقابلے میں اُن کا انداز کچھ اور ہی ہوتا۔ تاہم زیادہ گہرے پانی میں اُترے بغیر بعض نمایاں امور کی نشاندہی کی جاتی ہے، جن میں سرِفہرست یہ کہ مولانا مہر نے غالب کا "حامی مقلّد" ہونے کی بنا پر غالب کی شخصیت کی نفسیاتی اساس اُستوار کرنے کی کوشش نہیں کی۔ نفسیاتی اساس تو دور کی بات وہاں تو غالب ایک عام شخص کے طور پر بھی نظر نہیں آتا جس کے نتیجے میں غالب ایک گرم خون والے مرد کے برعکس محض ایک STUFFED PERSONALIT نظر آتا ہے۔ غالب کی شخصیت میں گرمجوشی پائی جاتی تھی ایسی گرمجوشی جس نے اُس کی تخلیقی شخصیت میں بھی رنگ آمیزی کی تھی مولانا مہر کا قلم اس کی تصویر کشی میں بے بس نظر آتا ہے اسی لیے جہاں اُنھوں نے اس کی شاعری پر

تبصرہ کیا وہاں وہ غالب کی شخصیت کے انسانی جوہر کی اس کی تخلیقی شخصیت پر اثر اندازی کو اُجاگر نہ کر پائے۔اس کا اندازہ ان کی شرح "نوائے سروش" سے بھی ہو جاتا ہے۔مولانا مہر سے یہ توقع تو نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ غالب کی فرائیڈین تحلیلِ نفسی کرتے۔ یہ کام تو بعد میں آنے والے بعض حضرات نے کرنا تھا جیسے ڈاکٹر اختر اورنیوی، سلیم احمد، ڈاکٹر سلام سندیلوی، سید شبیہ الحسن، دیوندر اسّر، ڈاکٹر ابنِ فرید اور ڈاکٹر شکیل الرحمن وغیرہ، لیکن کم از کم غالب کی شخصیت کے کچھ نہ کچھ انسانی پہلو تو نمایاں ہونے چاہیئے تھے حالانکہ" اخلاق و عادات اور متفرق حالات" کے لیے ایک باب بھی مخصوص کیا گیا لیکن اس میں محض ایثار و کرم، بے نواؤں سے ہمدردی، پیکرِ حسن و اخلاق، فراخ حوصلگی اور اسی انداز کی وہ صفات گنوائی گئی ہیں جن پر نام نہاد مشرقی وضع داری کی اساس اُستوار سمجھی جاتی ہے۔

اور تو اور اُنھوں نے تو حالی کی مانند غالب کو"حیوانِ ظریف" قرار دینے کی بھی کوشش نہ کی جس پر سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے یوں احتجاج کیا :

> " یادگارِ غالب پڑھنے کے بعد غالب کی جو دلآویز اور رعنا شخصیت اُبھری ہے وہ مولانا مہر کی" غالب" میں نظر نہیں آتی۔ یادگارِ غالب میں غالب کی زندگی ایک موجِ تبسم بن کر دکھائی دیتی ہے۔ اُن کے حالات میں اُن کی زندہ دلی اور شگفتگی چھائی رہتی ہے ...... لیکن مولانا مہر نے اپنی کتاب میں ان کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔"[۱]

ڈاکٹر شفیق احمد نے مولانا مہر پر اپنے پی ایچ ڈی کے مقالہ" مولانا غلام رسول مہر۔ حیات اور کارنامے" میں بعض نقائص کی نشاندہی کی ہے جو یہ ہیں :

۱۔" مرزا غالب بعض اوقات امراء و روٗسا کو خوش کرنے کے لیے ان کی بے جا تعریف کر دیتے تھے لیکن مولانا مہر نے شخصیت کے اس پہلو کا ذکر تک نہیں کیا بلکہ ابوالکلام آزاد کی طرف سے تحریری طور پر اس پہلو کی طرف توجہ مبذول کرانے

۱؎ "غالب مدح و قدح کی روشنی میں" اعظم گڑھ ۱۹۷۹ء صہ ۱۵

کے باوجود وہ مرزا کی شخصیت کا یہ رخ گول کر گئے حالانکہ یہ سب باتیں مرزا کی اپنی عبارات میں اندرونی شہادتوں کے طور پر موجود ہیں۔"

۲۔ "غالب" کا ایک نقص یہ بھی ہے کہ اس میں اکثر جگہ تکرار کا احساس ہوتا ہے" جس کے نتیجے میں بعض اوقات" مولانا مہر کے پیش کردہ نتائج کا استرداد ہو جاتا ہے۔ یہی وہ مقامات ہیں جہاں قاری چکرا جاتا ہے اس لیے کہ وہ کسی واضح اور متعین نتیجے تک نہیں پہنچ پاتا۔ اس قسم کی سب سے نمایاں مثال قمار بازی کے الزام میں گرفتاری اور اس پر بادشاہ سمیت روو سائے دہلی کے تاثرات ہیں"

۳۔ "غالب" کا ایک اور نمایاں نقص یہ ہے کہ اس میں سوانحی واقعات کو زمانی ترتیب سے پیش نہیں کیا گیا مثلاً "غالب" کے پانچویں اور چھٹے ابواب کے عناوین بالترتیب "سفر کلکتہ" اور "رام پور اور میرٹھ کا سفر ہیں"[1] لیکن خود مولانا کی تحقیق کے مطابق مرزا غالب کو پنشن کے مقدمے کے سلسلے میں کلکتہ کا سفر ۱۸۲۷ء میں پیش آیا تھا۔ جب کہ وہ میرٹھ اُس وقت گئے جب ۱۸۶۰ء میں نواب شیفتہ کو رہائی ملی تھی، ان دونوں سفروں میں تقریباً ۳۰ سال کا زمانی فاصلہ ہے۔ سوانحی تسلسل کے ٹوٹنے کا اندازہ اس سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ ۱۸۲۷ء میں پیش آنے والے سفر کا ذکر کرنے کے بعد اگلے باب میں پھر پنشن کے مقدمے کو موضوع بنایا گیا ہے۔"

۴۔ "یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ "غالب" میں مرزا کی زندگی کے بعض اہم ادوار کو سرے سے موضوع ہی نہیں بنایا گیا مثلاً ۱۸۳۱ء سے ۱۸۴۷ء تک کے طویل عرصے کے متعلق "غالب" میں مرزا کی زندگی کے بارے میں کوئی بیان نہیں ملتا۔ البتہ اُن چند درخواستوں کا ذکر ضرور ہے جو پنشن کے مقدمے کے سلسلے میں مختلف افسروں کو پیش کی گئیں۔"

---

[1] طبع اول میں یہ عنوانات نمبر ۴ اور ۵ پر ہے۔

۵۔ "غالب" کا ایک نقص یہ بھی ہے کہ اس میں تحقیقات کے نتائج حتمی طور پر اطمینان بخش نہیں۔ اس طرح دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مرزا غالب کی سوانح عمری کے طور پر غالب میں کچھ نقص بھی ہیں[1]

کوئی بھی علمی، ادبی اور تحقیقی کام اغلاط سے پاک نہیں ہو سکتا لہٰذا ان چند تسامحات کے باوجود مولانا مہر کی "غالب" غالبیات کے ذخیرے میں اہم اضافے کی حیثیت رکھتی ہے اور آنے والے غالب شناسوں کے لیے اگر رہنما نہ بھی بن سکی تو کم از کم غالب نما یقیناً ثابت ہوئی مولانا مہر کی تخلیقی شخصیت کے وسیع کل میں غالب شناسی ایک اہم جزو کی حیثیت رکھتی ہے ایسا جزو جس نے ان کی تنقیدی حس کو سنوارا تو ان کے تحقیقی شعور کو جلا بخشی، اسی لیے غالب فہمی میں مولانا مہر کو "غالب" اور "نوائے سروش" کو مستقل اضافہ قرار دیا جا سکتا ہے — جو بذاتِ خود ایک اعزاز ہے۔

---

[1] شفیق احمد ڈاکٹر: "مولانا غلام رسول مہر۔ حیات اور کارنامے"۔ لاہور مجلس ترقی ادب ۱۹۸۸ء
ص ۲۸۳۔۸۵

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

نسخۂ حمیدیہ سے نسخۂ شیرانی تک

جب تک انتخابِ کلامِ غالب کا وہ مخطوطہ منظرِ عام پر نہیں آیا تھا جو نسخۂ امروہہ کے نام سے مشہور ہے، اس وقت تک محققین کا خیال یہ تھا کہ دیوانِ غالب کا سب سے پرانا مخطوطہ نسخۂ بھوپال (حمیدیہ) ہے جو نواب غوث محمد خاں صاحب کے بیٹے نواب میاں فوجدار محمد خاں کا مملوکہ سمجھا جاتا ہے اور جس کی کتابت ۱۸۲۱ء میں ہوئی۔[1]

---

[1] یہ مجموعہ مفتی محمد انوار الحق نے مرتب کر کے ۱۹۲۱ء میں چھپوایا۔ اس کی تمہید میں وہ لکھتے ہیں: "... اس کے علاوہ اس کتاب میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب بجنوری مرحوم کا مبسوط مقدمہ شائع ہو رہا ہے جس میں غالب کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر فاضلانہ بحث کی گئی ہے۔" لیکن راقم التحریر کی تحویل میں نسخۂ حمیدیہ کا جو مطبوعہ ایڈیشن ہے اور جس پر تاریخِ اشاعت ۱۹۲۱ء ہے اس میں عبدالرحمٰن بجنوری کا دیباچہ شامل نہیں ہے۔

دراصل یہ دیباچہ بعض جلدوں میں ہے اور بعض میں نہیں ہے۔ بعد میں یہی دیباچہ "محاسنِ کلامِ غالب" کے نام سے بجنوری مرحوم کی الگ تصنیف کے طور پر انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ کی طرف سے شائع ہوا۔

ویسے بھی مفتی محمد انوار الحق کا مرتب کیا ہوا اور شائع کیا ہوا نسخۂ حمیدیہ اس مخطوطے پر کام کرنے والوں کی صحیح معنی میں رہنمائی نہیں کرتا۔ بقول مالک رام یہ بہت غلط طریقے پر مرتب ہوا۔ متن اور حواشی دونوں کا کلام گڈمڈ کر دیا گیا۔ متن کے کلام کی ترتیب بدل دی گئی۔ صحتِ کتابت کا معیار بھی بہت ناقص رہا۔ پھر مرتب نے مزید

اس اعتبار سے محققینِ غالب کے نزدیک نسخۂ شیرانی کلامِ غالب کا دوسرا اور اہم مستند نسخہ تھا جو حافظ محمود شیرانی کی ملکیت تھا اور اب پنجاب یونی ورسٹی لاہور کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اہلِ علم کا خیال ہے کہ نسخۂ شیرانی ۱۸۲۷ - ۱۸۲۶ کے قریب یعنی نسخۂ حمیدیہ کے پانچ چھے سال بعد مرتب ہوا تھا۔[1]

لیکن جب نسخۂ امروہہ منظرِ عام پر آیا (جس کے متعلق عام خیال یہ تھا کہ مخطوطہ بقلمِ غالب ہے) اور اس میں اہلِ علم حضرات کے سامنے یہ عبارت آگئی:

> بتاریخ چہاردہم رجب المرجب یوم سہ شنبہ سنہ ہجری وقت دو پہر روز باقیماندہ فقیر بیدل اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ متخلص بہ اسد عفی اللہ عنہ از تحریر دیوان حسرت عنوانِ خود فراغت یافتہ بفکر کاوش مضامینِ دیگر رجوع بخیال روح میرزا علیہ الرحمہ آورد۔ فقط

تو اس میں سنہ کی عدم موجودگی موضوعِ بحث بن گئی۔ سید قدرت اللہ نقوی نے اس موضوع پر اردو نامہ، کراچی کے شمارہ نمبر ۳۷ میں مفصل بحث کی اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اس مخطوطے کا سنہ کتابت ۱۲۳۱ھ ہے یعنی ۱۸۱۶ء عیسوی اور اس اعتبار سے اسے نسخۂ حمیدیہ پر فوقیت حاصل ہے کہ یہ اس سے پانچ یا چھے برس پہلے معرضِ وجود میں آیا۔

اِس لحاظ سے جب ہم اِن نسخوں کی ترتیب کا تعین کرتے ہیں تو نسخۂ شیرانی کو کلامِ غالب کا تیسرا اور اہم مستند نسخہ قرار دیتے ہیں۔ یہ مخطوطہ حافظ محمود شیرانی مرحوم کے اس ذخیرۂ کتب میں شامل ہے جو اس وقت پنجاب یونی ورسٹی لاہور کے پاس ہے۔ لیکن اس بات کا ابھی تک پتا نہ چل سکا کہ حافظ محمود شیرانی کو یہ نسخہ کہاں سے حاصل ہوا۔ مجلس ترقی ادب لاہور کے

ظلم یہ کیا کہ متداول دیوان کو اس کے ساتھ ملا دیا۔

[1] پیشِ لفظ نسخۂ شیرانی (مطبوعہ مجلسِ ترقیِ ادب ۲، کلب روڈ لاہور) اشاعتِ اول ۱۹۶۹ء۔ یہ پیشِ لفظ ناشر کا لکھا ہوا ہے اور ناشر اس کتاب کے سید امتیاز علی (ستارۂ امتیاز) ہیں جو اس وقت مجلسِ ترقی ادب لاہور کے ناظم بھی تھے۔ گویا یہ پیشِ لفظ سید امتیاز علی تاج ہی کا لکھا ہوا ہے۔

[2] ماہنامہ شاعر، بمبئی۔ غالب نمبر (ادارہ: اعجاز صدیقی۔ مہندر ناتھ) فروری مارچ ۱۹۶۹ء، مضمون بعنوان "کچھ نسخۂ حمیدیہ کے بارے میں"، صفحہ ۹۶۔

مذکورۂ بالا مطبوعہ نسخے کے پیش لفظ میں بھی اس بات پر کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی۔ دراصل پیش لفظ محض ایک شاعرانہ انداز کی تحریر ہے اور اس کے مطالعے سے تحقیق کا کوئی پہلو قاری کے سامنے نہیں آتا۔ ظاہر ہے کہ سید امتیاز علی تاج سے اس امر کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔

اس سلسلے میں ابو محمد سحر لکھتے ہیں: "دوسرا قلمی دیوان جو نسخۂ بھوپال کی اصلاح پذیر اور ترقی یافتہ شکل ہے۔ تقریباً ۱۲۴۲ھ (۱۸۲۶ء) میں مرتب ہوا۔ چونکہ یہ حافظ محمود شیرانی کے پاس رہ چکا ہے اس لیے نسخۂ شیرانی کہلاتا ہے۔" یہ بات ابو محمد سحر صاحب نے بغیر کسی دلیل کے کہی ہے۔ یہ تو خیر ظاہر ہی ہے کہ وہ مخطوطہ جس کا نام نسخۂ شیرانی ہے، پروفیسر محمود خاں شیرانی کو کہیں سے ملا ہوگا لیکن اس کا کیا ثبوت ہے کہ نسخۂ بھوپال (یعنی مذکورہ نسخۂ حمیدیہ) "اصلاح پذیر اور ترقی یافتہ شکل میں، پروفیسر محمود شیرانی کے پاس کچھ مدت کے لیے رہا۔ یہ "کچھ مدت" کی طرف میں اشارہ اس لیے کر رہا ہوں کہ "رہ چکا ہے" کے معنی یہی ہیں کہ کچھ مدت ان کے پاس رہا اور پھر کہیں اور چلا گیا۔

دوسری بات اس سلسلے میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ "اصلاح پذیر اور ترقی یافتہ شکل" کے معنی یہ ہیں کہ اس میں بعض غزلوں پر غالب نے نظر ثانی کی، بعض کو خارج کر دیا اور بعض میں سے انتخاب کیا۔ یہی بات ڈاکٹر گیان چند نے زیادہ واضح الفاظ میں لکھی ہے اور اپنی تحریر میں گنجلک پن یا ابہام نہیں رہنے دیا۔ ڈاکٹر گیان چند "تفسیر غالب" کے دیباچے میں غالب کے غیر متداول کلام کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "غیر متداول حصہ ذیل کے کلام پر مشتمل ہے۔

(۱) "نسخۂ حمیدیہ" کی اصل نسخۂ بھوپال کا بڑا حصہ۔ اس نسخے کا انتخاب "نسخۂ شیرانی" ہے اور اس کا انتخاب "گل رعنا"۔[۱]

گویا وہ صرف یہ نہیں کہتے "نسخۂ شیرانی"، "نسخۂ حمیدیہ" کا انتخاب ہے یعنی وہ نسخۂ حمیدیہ کی اصل یعنی نسخۂ بھوپال کے بڑے حصے کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس مخطوطے کی نشاندہی کبھی ہوئی جسے ابو محمد سحر صاحب "نسخۂ حمیدیہ" کی "اصلاح پذیر اور ترقی یافتہ شکل" کہہ رہے ہیں۔

---

[۱] تفسیر غالب: ڈاکٹر گیان چند۔ ناشر جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ اینڈ لینگویجز (۱۹۷۱ء) صفحہ ۹

اب آگے چلنے سے پہلے اس سلسلے میں ایک نظر مولانا امتیاز علی عرشی کی تحریر پر بھی ڈال لینا چاہیے۔ وہ "دیوانِ اردو نسخۂ بھوپال" کے زیرِ عنوان لکھتے ہیں: "میرزا صاحب نے اپنا ردیف وار اردو دیوان صفر ۱۲۳۷ھ (۱۸۲۱ء) میں صاف کرایا تھا۔ اس کی اصل کوئی مروف دیوان تھا یا وہ بیاض تھی جس میں بترتیبِ نظم اشعار لکھے گئے تھے۔ اس سوال کا جواب دینے کے لیے ابھی تک کوئی مسالا نہیں مل سکا لیکن یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ میرزا صاحب نے ۱۲۳۷ھ سے قبل کے کہے ہوئے متعدد شعر اس میں شامل نہیں کیے تھے ....

لیکن اس دیوان کے اشعار کا بڑا حصہ پیچیدہ، خیالی مضامین اور مغلق تشبیہ و استعارہ پر مشتمل تھا...... چنانچہ بہت سی غزلیں "غلط" قرار دیں۔ فقرے، مصرعے اور شعر بھی بدلے اور آسان اور دلنشیں انداز کی غزلیں بھی کہیں۔

تہذیب و تنقیح کا یہ کام صفر ۱۲۳۷ھ (اکتوبر ۱۸۲۱ء) کے بعد شروع ہوا اور سفرِ کلکتہ سے پہلے شوال ۱۲۴۲ھ (اپریل ۱۸۲۶ء) میں ختم ہو گیا۔ اس قیاس کی وجہ یہ ہے کہ نسخۂ بھوپال کے حاشیوں اور بین السطور میں ترمیمیں اور اصلاحیں بھی ہیں اور نئے شعر اور غزلیں بھی۔ نیز ردیف الیا کی متعدد غزلیں آخر میں بھی تحریر کر دی گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اصلاح و اضافہ کا یہ کام اس کی تاریخِ کتابت کے بعد ہی شروع کیا جا سکتا تھا ورنہ وہ سب کچھ بجائے حاشیہ کے متن ہی میں درج ہوتا۔

نیز مولانا محمود خاں شیرانی مرحوم کے پاس دیوان کا وہ مخطوطہ دستیاب ہو چکا ہے جو بھوپالی نسخے کا مبیضہ تھا۔ اس کے متن کے مندرجات بالکل بھوپالی نسخے کی زمینوں کے مطابق ہیں لیکن حاشیوں پر بعد کی کہی ہوئی غزلیں بھی درج ہیں۔ ان میں سے دو میرزا صاحب نے باندہ (بندیل کھنڈ) سے بھیجی تھیں جو سفرِ کلکتہ کی ایک منزل تھی۔ ظاہر ہے کہ نسخۂ شیرانی سفرِ کلکتہ سے پہلے ہی مرتب نہ ہو گیا ہوتا تو اس کے حاشیوں پر سفر کے دوران کہی گئی غزلیں کس طرح مندرج ہو سکتی تھیں[1]

---

[1] دیوانِ غالب اردو۔ نسخۂ عرشی (مرتبہ مولانا امتیاز علی عرشی) بمبئی۔ اشاعت ۱۹۵۸ء، ناشر انجمن ترقی اردو

ان تین محققین غالب کی تحریروں کی روشنی میں جو نکات سامنے آتے ہیں وہ یہ ہیں :

۱۔ نسخۂ شیرانی، نسخۂ بھوپال (حمیدیہ) کی اصلاح پذیر اور ترقی یافتہ شکل ہے ۔

(ابو محمد سحر)

۲۔ نسخۂ حمیدیہ کی اصل نسخۂ بھوپال کا انتخاب نسخۂ شیرانی ہے ۔ (ڈاکٹر گیان چند)

۳۔ نسخۂ بھوپال (یعنی حمیدیہ) میں غالب نے بہت سی غزلیں "غلط" قرار دیں ۔ ۔ ۔ ۔ بعض اور شعر بھی بدلے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نسخۂ شیرانی بھوپال نسخے کا مبیّضہ ہے ۔ اس کے متن کے مندرجات بالکل بھوپالی نسخے کی زمینوں کے مطابق ہیں ۔ (مولانا امتیاز علی خاں عرشی)

ان تینوں ماہر غالبیات کے بیانات سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ نسخۂ حمیدیہ کا مخطوطہ غالب کی نظر سے گزرا تھا اور انھوں نے اس پر نظر ثانی کی تھی بلکہ محمد انوار الحق، ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم بھوپال جن کی مساعی سے نسخۂ حمیدیہ ۱۹۲۱ء میں چھپ کے سامنے آیا ۔ یہاں تک لکھتے ہیں :

> یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوان کم سے کم ایک بار اور ممکن ہے چند مرتبہ ترمیم و تصحیح کی غرض سے غالب کے پاس بھی گیا ہے اور ان کی نظر سے گزرا ہے اور انھوں نے خود اس میں جابجا اصلاحیں کی ہیں ۔[۲]

مولانا امتیاز علی خاں عرشی مفتی انوار الحق کی اس تحریر کا حوالہ دیتے ہوئے کہ یہ نسخہ لکھا تو گیا تھا فوجدار محمد خاں بہادر بھوپال کے لیے لیکن کم سے کم ایک بار اور ممکن ہے کہ چند مرتبہ تصحیح و ترمیم کی غرض سے غالب کے پاس بھی گیا اور ان کی نظر سے گزرا، لکھتے ہیں :

> لیکن فی الحقیقت یہ مرزا صاحب ہی کے لیے لکھا گیا تھا اور نسخۂ شیرانی کی تیاری تک اُن ہی کے پاس رہا اس کے بعد عبدالعلی صاحب اور عبدالصمد مظہر کے پاس ہوتا ہوا فوجدار محمد خاں کے کتب خانے میں پہنچا ۔ بھوپال پہنچنے کا زمانہ کیا تھا اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن ۱۲۶۳ھ والی مہر بتاتی ہے کہ بہر حال اس سال کے بعد ہی اسے وہاں

(ہند) علی گڑھ ۔ صفحہ ۱۹، ۲۰ ۔

[۲] دیوان غالب جدید المعروف بہ نسخۂ حمیدیہ بہ تدوین احقر العباد ضیاء العلوم مفتی محمد انوار الحق ایم ۔ اے منشی فاضل ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم بھوپال (۱۹۲۱ء) ۔ طابع مفید عام اسٹیم پریس آگرہ صفحہ ۲

بار یابی حاصل ہوئی ہو گی۔[1]

گویا عرشی صاحب جہاں مفتی انوار الحق کی اس رائے کو تقویت پہنچا رہے ہے کہ "کم سے کم ایک بار اور ممکن ہے کہ چند مرتبہ تصحیح و ترمیم کی غرض سے غالب کے پاس بھی گیا اور ان کی نظر سے گزرا" وہاں یہ کہہ کر انوار الحق صاحب کی تحقیق کی تنقید بھی کر رہے ہیں کہ "فی الحقیقت یہ مرزا صاحب ہی کے لیے لکھا گیا تھا اور نسخۂ شیرانی کی تیاری تک ان ہی کے پاس رہا تھا" یعنی بقول عرشی صاحب یہ مخطوطہ غالب کی نظر سے محض گزرا ہی نہیں بلکہ یہ لکھا بھی گیا میرزا صاحب ہی کے لیے اور نسخۂ شیرانی کی تیاری تک اُن ہی کے پاس رہا (دوسرے لفظوں میں یہ مخطوطہ کوئی چھے سال تک غالب ہی کی تحویل میں رہا)

اب اس بات کے متعلق کہ یہ مخطوطہ غالب کی نظر سے گزرا یا نہیں، میں ذرا بعد میں اپنی ناقص رائے کا اظہار کروں گا لیکن عرشی صاحب کا یہ کہنا کہ یہ مخطوطہ مرزا صاحب ہی کے لیے لکھا گیا تھا قرین قیاس نہیں۔ کیونکہ عرشی صاحب نے بھوپال میں اپنے دو روزہ قیام میں اس نسخے کو دیکھنے کے بعد جو کچھ اس کے متعلق لکھا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے یہ اپنے لیے نہیں لکھوایا بلکہ کسی بڑے آدمی کو پیش کرنے کے لیے لکھوایا ہے۔ بقول عرشی صاحب مخطوطے کا "کاغذ عمدہ کشمیری ہے، جدولیں رنگین اور طلائی اور باریک لاجوردی ہے عنوانات شنجرفی ہیں . . . . . . دیوان کا آغاز رنگین اور طلائی لوح کے تحت ہوا ہے۔۔۔ ورق ۱۵ سے دوسری رنگین اور طلائی لوح کے تحت غزلیں شروع ہوئی ہیں۔۔۔۔ آخر میں کاتب نسخہ نے شنجرفی روشنائی سے لکھا ہے: دیوان من تصنیف میرزا صاحب وقبلہ التخلص بہ اسد و غالب، سلمہم و ربہم، علی ید العبد المذنب حافظ معین الدین بتاریخ پنجم شہر صفر المظفر ۱۲۳۷ من الہجرت النبویہ صورت اتمام یافت"[2] یہ اہتمام غالب نے اس مخطوطے کے لیے کیا ہو جو انھوں نے اپنے لیے لکھوایا ہو بعید از قیاس ہے۔

بقول جناب مالک رام نسخۂ حمیدیہ غالب کی نظر سے نہیں گزرا[3] اور یہی خیال

---

[1] دیوان غالب اردو (نسخۂ عرشی) پہلا ایڈیشن صفحہ ۸۷

[2] دیوان غالب اردو (نسخۂ عرشی) پہلا ایڈیشن صفحہ ۸۶

[3] مالک رام صاحب نے زبانی مجھ سے یہی فرمایا تھا۔ یہ کوئی ایک ڈیڑھ ماہ کی بات ہے لیکن انھوں

وسیع معلوم ہوتا ہے۔ بالخصوص محمد انوار الحق کے اس مکمل بیان کی روشنی میں جس کے ابتدائی جملے پہلے درج کیے جا چکے ہیں۔ اپنے اس دعوے کے بعد کہ غالب نے خود اس میں جا بجا اصلاحیں کی ہیں محمد انوار الحق اپنی عبارت کو یوں مکمل کرتے ہیں:

> کیونکہ اگرچہ ان اصلاحوں کا خط بہت خراب اور شکستہ لیکن پھر بھی اس میں اور غالب کی طرزِ تحریر کے موجودہ[1] نمونوں میں ایک گونہ مشابہت پائی جاتی ہے اور گو محض اس کی بنا پر ان کو غالب کا قلمی نسخہ قرار دینا شاید درست نہ ہو لیکن خود ان اصلاحوں کی نوعیت ایسی ہے کہ ان کو مصنف کے سوا اور کسی کے قلم کی طرف منسوب کرنا مشکل ہے کیونکہ ان میں سے اکثر ایسی ہیں کہ لفظ کو کاٹ کر اس کی جگہ دوسرا لفظ رکھ دیا ہے یا کسی مصرعے کی کچھ صورت بدل دی ہے۔ بہت سی غزلیں بھی اسی قلم سے حاشیہ پر بڑھائی گئی ہیں جن میں سے بیشتر مروجہ دیوان میں بھی بجنسہٖ موجود ہیں۔ البتہ بعض ایسی بھی ہیں کہ ان میں بھی دوبارہ کچھ انتخاب ہوا ہے اور مطبوعہ دیوان میں ان کے پورے شعر شائع نہیں ہوئے لیکن حقیقت میں اس امر کا ثبوت کہ یہ کتاب غالب کا گم شدہ دیوان ہی ہے خط کی مشابہت اور کاتب کی تحریر کا محتاج نہیں ہے بلکہ اس کی سب سے بڑی اور یقینی دلیل خود اس کے اشعار ہیں ع
>
> آفتاب آمد دلیل آفتاب

ظاہر ہے کہ یہ تحریر تحقیق کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتی۔ انوار الحق صاحب نے پہلے ایک فیصلہ کر لیا ہے اور پھر اس فیصلے کو صحیح ثابت کرنے کے لیے وہ محض اندازوں سے کام لیتے چلے گئے ہیں۔ اب مشکل یہ ہے کہ اصل مخطوطہ تو گم ہو چکا اور مطبوعہ کتاب میں اس

نے گفتارِ غالب میں یہ لکھا ہے کہ ترقیمے کا انداز ظاہر کرتا ہے کہ یہ خود غالب نے لکھوایا تھا۔ یہ نسخہ مدتوں ان کے پاس رہا۔ غالباً اب مالک رام صاحب کا خیال یہ ہے کہ نسخۂ بھوپال (حمیدیہ) غالب کی نگاہ سے نہیں گزرا تھا (آزاد)

[1] غالباً یہ لفظ "موجود" ہوگا۔

قسم کی تحریر قاری کے اس خیال کو پختہ تر کرتی ہے کہ یہ نسخۂ غالب کی نظر سے نہیں گزرا۔ اس صورت میں نسخۂ حمیدیہ کو نسخۂ شیرانی کے مانند مستند اور معتبر قرار دینا دونوں نسخوں کے گہرے اور بااحتیاط مطالعے پر مبنی نہیں ہے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے بقول مولانا عرشی "مولانا محمود خاں شیرانی کے پاس دیوان کا وہ مخطوطہ دستیاب ہو چکا ہے جو بھوپالی نسخے کا بیضہ تھا۔ نیز یہ کہ اس کے متن کے مندرجات بالکل بھوپالی نسخے کی ترمیموں کے مطابق ہیں۔ لیکن مطبوعہ نسخۂ حمیدیہ اور نسخۂ شیرانی کا تقابلی مطالعہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے اس بیان کی تائید نہیں کرتا اور نہ ہی ڈاکٹر گیان چند کے اس بیان کی تائید اس تقابلی مطالعے سے ہوتی ہے کہ نسخۂ حمیدیہ کا انتخاب نسخۂ شیرانی ہے۔ کیونکہ اگر نسخۂ شیرانی نسخۂ حمیدیہ کا بیضہ ہے یا نسخۂ شیرانی نسخۂ حمیدیہ کا انتخاب ہے تو نسخۂ شیرانی میں وہ چھ غزلیں کیسے شامل ہو گئیں جو نسخۂ حمیدیہ میں سرے سے موجود نہیں ہیں اور وہ چھ غزلیں یہ ہیں:

۱۔ بے اعتدالیوں سے سُبک سب میں ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہو گئے، اتنے ہی کم ہوئے

۲۔ عجب نشاط سے جلّاد کے چلے ہیں ہم آگے
کہ اپنے سایے سے سر پانوں سے ہے دو قدم آگے

۳۔ جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی
لکھ دیجیو یا رب اسے قسمت میں عدو کی

۴۔ فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ پابندِ نے نہیں ہے

۵۔ رونے سے اور عشق میں بے باک ہو گئے
دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے

۶۔ خود فروشی ہائے مستی بس کہ جائے خندہ ہے
ہر شکستِ قیمتِ دل میں صدائے خندہ ہے

ان غزلوں کی نشاندہی ڈاکٹر وحید قریشی نے کی ہے[1]۔ لیکن ڈاکٹر وحید قریشی بھی چونکہ اس خیال سے متفق ہیں کہ نسخۂ بھوپال (یعنی موجودہ مطبوعہ نسخۂ حمیدیہ کا اصل مخطوطہ) غالب کی تحویل میں رہا اس لیے وہ ان غزلوں کی نسخۂ شیرانی میں موجودگی اور نسخۂ بھوپال میں عدم موجودگی سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ

"جس وقت یہ غزلیں لکھی گئیں (جو نسخۂ شیرانی کے متن میں درج ہیں اور نسخۂ بھوپال کے متن اور حواشی اور آخر کے اضافات دونوں سے غیر حاضر ہیں) اُس وقت تک نسخۂ بھوپال غالب کے ہاتھ سے نکل چکا تھا اس لیے یہ غزلیں اس میں جگہ نہ پا سکیں" [2]

لیکن ڈاکٹر وحید قریشی اس بات کا کوئی ثبوت بہم نہیں پہنچاتے کہ نسخۂ بھوپال غالبؔ کی تحویل میں رہا۔ ہاں اتنا ضرور لکھتے ہیں کہ "نسخۂ بھوپال کب تک غالب کی دسترس میں رہا اسے "نسخۂ شیرانی" کی روشنی میں دیکھنے کی ضرورت ہے" [3]

اور جب ہم نسخۂ شیرانی کی روشنی میں دیکھتے ہیں تو یہی نظر آتا ہے کہ نسخۂ بھوپال غالب

---

[1] نذرِ غالب (ڈاکٹر وحید قریشی) سنگِ میل پبلیکیشنز لاہور۔ مطبع منصور پریس لاہور (۱۹۷۰) صفحہ ۱۲۳۔

[2] نذرِ غالب (ڈاکٹر وحید قریشی) سنگِ میل پبلیکیشنز لاہور۔ مطبع منصور پریس لاہور (۱۹۷۰) صفحہ ۱۲۴۔

[3] نذرِ غالب (ڈاکٹر وحید قریشی) سنگ میل پبلیکیشنز لاہور۔ مطبع منصور پریس لاہور (۱۹۷۰) صفحہ ۱۲۴۔

کی تحویل میں کبھی نہیں رہا اور عرشی صاحب کے اس دعوے کی بھی تائید نہیں ہوتی کہ نسخۂ شیرانی کے متن کے مندرجات بالکل بھوپالی نسخے کی ترمیموں کے مطابق ہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اکثر غزلوں میں اشعار کی ترتیب بھی مختلف ہے۔ غزلوں کی ترتیب بھی اکثر و بیشتر مختلف ہے۔ اس طرح کی مثالیں ایک نہیں بہت ہیں۔ پہلی غزل میں تو ایک عجیب بات یہ بھی نظر آتی ہے کہ غزل کا مقطع

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرپا
موے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

جو نسخۂ بھوپال میں موجود ہے نسخۂ شیرانی سے غائب ہے۔ ہاں حافظ محمود شیرانی نے حاشیے میں اپنے قلم سے اس کا اضافہ کیا ہے اور مطبوعہ نسخۂ بھوپال کے "آتش زیرپا" کو جو غلط ہے صحیح کر دیا ہے اور اسے "آتش زیرپا" لکھا ہے۔

ایک اور غزل دیکھیے ۔ جنوں گرم انتظار و نالہ بیتابی کمند آیا ۔ اس میں شعر کے مصرعِ اول میں غالب نے دو بار ترمیم کی ہے۔ پہلے اس مصرعے کی صورت یہ تھی

جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، نادیدنی دعوت

بعد میں انھوں نے اس میں ترمیم کر کے اسے یہ صورت دی۔

جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، خونِ جگر ہدیہ

دوسری بار جب غالب نے اس مصرعے میں ترمیم کی تو "خونِ جگر" کی جگہ "داغِ جگر" لکھا اور مصرع یوں ہو گیا۔

جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، داغِ جگر ہدیہ

مطبوعہ نسخۂ بھوپال (حمیدیہ) میں اس کی پہلی دونوں صورتیں ہیں لیکن نسخۂ شیرانی میں اس کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ بھی پہلی ۔ یعنی

جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، نادیدنی دعوت

اور شیرانی صاحب نے حاشیے میں اپنے ہاتھ سے نادیدنی دعوت کے سامنے "داغِ جگر ہدیہ" لکھ دیا ہے جو اس میں ترمیم کی دوسری اور مصرعے کی تیسری صورت ہے اور جو متداول دیوان میں ہے۔

نسخۂ حمیدیہ کے ترقیمے کا ذکر اس سے قبل ہو چکا ہے کہ اس ترقیمے سے مالک رام صاحب یہ اندازہ کرتے ہیں کہ "یہ نسخہ خود غالب نے لکھوایا تھا اور یہ مدتوں اُن کے پاس رہا" اس ضمن میں مالک رام صاحب یہ بھی لکھتے ہیں: "میرا اپنا خیال یہ ہے کہ جب اس نسخے کا مبیضہ (یعنی مسودۂ نسخۂ شیرانی) تیار ہو گیا تو یہ گویا تقویم پارینہ کی ذیل میں چلا گیا۔ اسی زمانے میں غالب کے شاگرد میاں یار محمد خاں شوکت بھوپالی نے اُسے اُن سے حاصل کر لیا اور لے جا کر اسے اپنے والد میاں فوجدار محمد خاں بہادر کی خدمت میں پیش کر دیا۔"[1]

لیکن ترقیمے کی عبارت سے تو اندازہ یہ ہوتا ہے کہ یہ نسخہ فوجدار محمد خاں کے لیے نہیں لکھوایا گیا۔ بلکہ قرین قیاس بات جو نظر آئی ہے وہ یہ ہے کہ اس نسخے کا کاتب حافظ معین الدین بہت پڑھا لکھا اور خوش ذوق آدمی ہے اور غالب سے بے پناہ عقیدت رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اُن کے نام کی جگہ بھی مرزا صاحب و قبلہ کے الفاظ لکھتا ہے۔ اور گمان یہ ہے کہ اس نے غالب سے عقیدت کی بنا پر اپنے لیے یہ نسخہ تیار کیا اور اسے ہر طرح سے سجایا۔ ترقیمے میں کسی ممدوح کا نام تو کیا اس کی طرف کوئی اشارہ بھی نہیں ملتا۔

اور پھر دوسری بات یہ ہے کہ عرشی صاحب کے الفاظ میں "معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوان عبد العلی نام کے کسی صاحبِ ذوق کے مطالعے میں بھی رہ چکا ہے۔ اُنھوں نے کئی جگہ اپنی پسندیدگیٔ اشعار کا اظہار حاشیوں پر صاد بنا کر کیا ہے اور اکثر جگہ اس صاد کے ساتھ اپنا نام بھی لکھ دیا ہے۔

ردیف "غ" کی پہلی غزل

عشاق اشکِ چشم سے دھوئیں ہزار داغ

کے متعدد شعروں کے مقابل "پسند عبد العلی، سنہ" لکھا ہے۔

اسی ردیف کی دوسری غزل کے مقابل لکھا ہے "پسندِ خاطرِ عبد العلی"، ورق ۲۸ ب کے اوپر کے حاشیے میں لکھا ہے "مقابلہ کردہ شد"،

"ردیف ۲۹ الف کے حاشیے میں بار یکے کے اندر لکھا ہے "محمد عبد الصمد مظلہٗ" اس

---

[1] گفتارِ غالب (مالک رام) ناشر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی۔ ۱۹۸۵ء۔ صفحہ ۱۰۱

[2] نسخۂ عرشی۔ پہلا ایڈیشن صفحہ --

صورت حال کے پیش نظر قیاس یہی کہتا ہے کہ یہ فوجدار محمد خاں کے کتب خانے میں عبدالعلی اور محمد عبدالصمد مظہر نامی دو اشخاص کے ہاتھوں سے گزر کر پہنچا ہے

غالباً یہ مخطوطہ جس کی کتابت حافظ معین الدین ایسے پڑھے لکھے اور خوش مذاق کاتب نے کی تھی، عبدالعلی اور محمد عبدالصمد مظہر تک پہنچنے کے بعد فوجدار محمد خاں کے کتب خانے کے لیے خرید اگیا۔ اگرچہ فوجدار محمد خاں کی مہر کے ساتھ اس قسم کا کوئی اندراج نہیں ہے لیکن اصل مخطوطہ چونکہ گم ہو چکا ہے اس لیے اس طرح کے قطعی ثبوت کی تلاش لاحاصل ہے۔

اب اس سلسلے میں نسخۂ عرشی کا ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔ محترم عرشی صاحب لکھتے ہیں: یہ مخطوطہ میں جو اضافے یا اصلاحیں ہیں ان میں املے کی غلطیاں بھی نظر آتی ہیں مثلاً ...... تقاضا کو تقضہ لکھا ہے ...... بہانہ کو بہانیے لکھا ہے ...... مضائقہ نہ کرے میں مضاعقہ ...... رنگ ہے سنگ محک دعوائے مینائی عبث۔ میں سنگ بمک یا خانہ زادِ زلف میں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں، میں بھاگے نگے ...... اس قسم کی غلطیاں غالب جیسے شخص سے ۵۰ سال کی عمر میں سخت حیرت انگیز ہیں۔[۱] تو اس سلسلے میں کہنا یہ ہے کہ غالب سے املا کی ان غلطیوں کی توقع نہیں لیکن جب غالب کی تحویل میں یہ نسخہ رہا ہی نہیں تو وہ ان اغلاط کی اصلاح کیسے کرتے۔ گویا عرشی صاحب کی یہ تحریر اسی جانب اشارہ کرتی ہے کہ غالب نے نسخۂ بھوپال (یعنی حمیدیہ) نہیں دیکھا۔

اس موضوع پر جب ڈاکٹر عابدہ پیشاوری سے بات ہوئی تو انھوں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ جب ابو محمد سحر کہتے ہیں کہ نسخۂ شیرانی نسخۂ بھوپال (یعنی نسخۂ حمیدیہ) کی اصلاح پذیر اور ترقی یافتہ شکل ہے تو کیا وہ یہ فرض تو نہیں کر رہے ہیں کہ مذکورہ نسخۂ حمیدیہ کے علاوہ بھی اس کا کوئی مبیضہ ہوگا اور عرشی صاحب بھی جب نسخۂ حمیدیہ کے مبیضہ کی بات کرتے ہیں تو کیا وہ بھی اسی امر کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ مذکورہ نسخۂ بھوپال نہیں بلکہ اس کا ایک مبیضہ اور بھی ہو سکتا ہے اور وہ

---

[۱] نسخۂ عرشی، پہلا ایڈیشن، صفحہ ۵۰

[۲] اس مقالے کی تکمیل کے دوران ڈاکٹر عابدہ پیشاوری نے اپنے گراں قدر مشوروں سے نوازا جن سے میں مستفید ہوا۔

بیاضِ شیرانی صاحب کے پاس رہا۔ ہاں یہ مفروضہ کہ نسخۂ حمیدیہ اور نسخۂ شیرانی کے درمیان ایک اور نسخے کی موجودگی کا امکان ہے یہ گتھی کھول سکتا ہے۔ اگرچہ یہ مفروضہ بھی اس سوال کے جواب کی طرف رہنمائی نہیں کرتا کہ یہ بیاض حافظ محمود شیرانی تک کس طرح پہنچا۔

ساتھ ہی ان کا خیال یہ بھی ہے کہ عرشی صاحب یہ لکھتے ہیں کہ

فی الحقیقت یہ مرزا صاحب ہی کے لیے لکھا گیا تھا اور نسخۂ شیرانی کی تیاری تک انھیں کے پاس رہا تھا اور اس کے بعد عبدالعلی صاحب اور عبدالصمد مظہر کے پاس سے ہوتا ہوا فوجدار محمد خاں کے کتاب خانے میں پہنچا[1]

تو وہ گویا اس مخطوطے کی موجودگی کو ایک طرح سے خارج کر دیتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر عابد پیشاوری کی رائے کو نظر انداز کرنا بھی آسان نہیں کیونکہ جب ہم نسخۂ شیرانی میں ایسے اشعار موجود پاتے ہیں جو نسخۂ بھوپال میں نہیں ہیں تو عرشی صاحب کا یہ کہنا قرینِ قیاس نہیں رہتا کہ نسخۂ شیرانی کے متن کے مندرجات بالکل بھوپالی نسخے کی زمینوں کے مطابق ہیں۔ مثلاً یہ غزل دیکھیے:

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا

نسخۂ بھوپال میں یہ غزل مندرجہ ذیل اشعار پر مشتمل ہے۔

اُف نہ کی، سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا
آتشِ خاموش کے مانند گویا جل گیا

دود میرا سنبلستاں سے کرے ہے ہمسری
بسکہ شوقِ آتشِ گل سے سراپا جل گیا

شمع رویاں کی سرِ انگشتِ حنائی دیکھ کر
غنچۂ گل پرفشاں پروانہ آسا جل گیا

خانمانِ عاشقاں دکانِ آتش باز ہے
شعلہ رویاں جب ہوئے گرمِ تماشا جل گیا

تا کجا افسوس گرمیہائے صحبت اے خیال
دل ز آتش خیزیِ داغِ تمنا جل گیا

---

[1] نسخۂ عرشی، مولانا امتیاز علی خاں عرشی، پہلا ایڈیشن صفحہ ۶۷

ہے اسد بے گانۂ افسردگی اے بے کسی
دل سے اندازِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

لیکن نسخۂ شیرانی میں ان کے علاوہ وہ پانچ اشعار بھی ہیں جو بعد میں مطبوعہ متداول دیوان میں شامل ہیں اور وہ پانچ اشعار الگ نہیں ہیں بلکہ غزل ہی میں مختلف ترتیب سے شامل ہیں۔[1]

حضرات، ابھی اس بحث کو ختم کرنے کے بعد جو ان دو نتیجوں پر پہنچی ہے کہ (۱) نسخۂ شیرانی نہ تو نسخۂ بھوپال (حمیدیہ) کا انتخاب ہے اور نہ ہی یہ نسخۂ بھوپال کا بیضہ ہے (۲) جہاں تک نسخۂ بھوپال کا تعلق ہے مذکورہ نسخۂ حمیدیہ کے علاوہ بھی اس کا کوئی نسخہ ہوگا (نسخۂ حمیدیہ اور نسخۂ شیرانی کے درمیان) جس نے نسخۂ شیرانی کی بنیاد کا کام دیا ہوگا۔ قدرت اللہ نقوی کی مذکورہ کتاب "نسخۂ شیرانی کی یہ عبارت پیش کرنا مناسب خیال کرتا ہوں:

۱۔ نسخۂ شیرانی نسخۂ حمیدیہ کی نقل نہیں ہے۔

۲۔ نسخۂ حمیدیہ کے حواشی اور آخر میں غزلیات کا مختلف القلم اندراج اس بات کا ثبوت ہے کہ غالب کے کسی اور دیوان سے وقتاً فوقتاً نقل کا عمل ہوتا رہا اور اس بات کا قوی امکان ہے کہ یہ کلام شیرانی کے مسودے سے نقل ہوا اور نسخۂ شیرانی کی تبئیض سے کافی مدت قبل یہ عمل ختم ہو چکا تھا۔

"گلِ رعنا مع آشتی نامۂ غالب" میں بھی قدرت اللہ نقوی نے اس موضوع کو چھیڑا ہے۔ اس میں نسخۂ حمیدیہ کے زیرِ عنوان وہ لکھتے ہیں:- "جا بجا اصلاحات و ترامیم مختلف حضرات کے ہاتھ کی لکھی ہوئی بتائی گئی ہیں۔ بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ اولاً متن کسی مخطوطے سے نقل کیا گیا اور بعد

---

[1] دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں — آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا
میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا — میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا
عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں — کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا
دل نہیں تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار — اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا
میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل — دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

[2] نسخۂ شیرانی اور دوسرے مقالات (قدرت اللہ نقوی) صفحہ ۵۰۔

میں اضافے اور اصلاحیں بھی کسی ایسے مخطوطے سے نقل ہوئیں جس میں غالب نے یہ تمام درج کر رکھی ہوں گی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نسخۂ حمیدیہ نو دریافت مخطوطے کی نقل نہیں بلکہ کسی اور دیوان کی ہے۔ میرے خیال میں غیر مروف دیوان سے کوئی نسخہ تیار کیا گیا جس کی یہ نقل ہے۔ اسی عہد کے لگ بھگ تیار ہونے والے ایک نسخے کے متعلق غالب نے کلکتہ سے محمد علی خاں کو ایک خط میں لکھا ہے :

> دیوان ریختہ کہ گرد آوردنِ آں را بیش از ہفت سال گزشتہ و معہذا بہرے از مو ابر ایں روسیاہ کہ اسد اللہ خان' عرف میرزا نوشہ نقش نگین و جلوۂ سال یک ہزار و دو صد و سی و یک ہجری طراز دامن و آستینش بود بہ خاتمۂ اوراق سفینہ رقم ۱۱ (نامہ ہائے فارسی غالب صفحہ ۱۰۲)

یہ ۱۸۲۸ء کا واقعہ ہے اس میں سے سات سال کی مدت گھٹائی جائے تو یہ ۱۸۲۱ء کے لگ بھگ کا زمانہ ہوگا۔ لہٰذا وہ دیوان وہی ہوگا جس کی نقل نسخۂ حمیدیہ ہے لیکن گُلِ رعنا کا انتخاب دلالت کرتا ہے کہ مذکورہ نسخے کے علاوہ ایک نسخہ اور بھی غالب کے ساتھ تھا جو نسخۂ شیرانی کے مطابق تھا۔[1] اور نسخۂ شیرانی کے زیرِ عنوان ان کا یہ اقتباس قابلِ توجہ ہے :

> ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حاشیے کی ایک غزل بقلمِ غالب ہے۔ متعدد مقامات پر ترامیم ملتی ہیں اور اصلاح کا عمل ہوا ہے۔ بعض اصلاحیں بہ قلم غالب ہی تسلیم کی گئی ہیں۔ رسم الخط خوش خط نستعلیق ہے۔ حاشیہ بھی اسی قلم سے ہے مگر باریک۔ نسخۂ حمیدیہ سے اس نسخے کی غزلیات اور اشعار کی ترتیب کا اختلاف اتنا زیادہ ہے کہ کسی طرح بھی اس نسخے کو نسخۂ حمیدیہ کی نقل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ نیز یہ کہ وہ نسخہ جو غالب نے کلکتہ میں نام و تخلص کے ثبوت کے لیے پیش کیا تھا وہ اگر وہی نسخہ تھا جس سے گلِ رعنا کا انتخاب عمل میں آیا تو وہ ۲۱-۱۸۲۰ء کا مکتوبہ نہیں ہو سکتا کیونکہ اس میں وہ کلام بھی منتخب ہوا ہے جو بعد میں لکھا گیا ہے اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ترامیم اور اضافے اس میں کر لیے گئے تھے تو ترتیب غزلیات و اشعار کا اختلاف اس کی تائید نہیں کرتا۔ میرا احساس یہ ہے کہ سفرِ کلکتہ میں غالب کے

---

[1] گُلِ رعنا مع اشتی نامۂ غالب' مرتبہ سید قدرت نقوی۔ انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی ۱۹۷۵ء صفحہ ۱۰۴

ساتھ دو نسخے تھے ایک وہ جس سے نسخۂ حمیدیہ نقل ہوا، دوسرا وہ جس سے نسخۂ شیرانی تیار ہوا۔۔۔[1]

محترم صاحبِ صدر! جب غالب انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے مجھے یہ فرمایش موصول ہوئی کہ میرے لیے مقالے کا جو موضوع طے کیا گیا ہے وہ ہے "نسخۂ شیرانی"، تو میں نے مقالہ لکھنے سے پہلے یہ سوچا تھا کہ اپنے اس مقالے میں مندرجہ ذیل امور زیرِ بحث لاؤں گا۔

۱۔ نسخۂ حمیدیہ اور نسخۂ شیرانی میں کیا ربط باہم ہے۔

۲۔ نسخۂ شیرانی کی افادیت اور اہمیت، مثلاً یہ کہ نسخۂ حمیدیہ کی یہ حیثیت مشکوک ہے کہ اسے غالب نے دیکھا یا نہیں اور اس لحاظ سے نسخۂ شیرانی کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے کہ یہ غالب کا دیکھا ہوا ہے۔ غالب کے دیوان کو تاریخی ترتیب سے مرتب کرنے کے لیے اس کا مطالعہ ضروری ہے ورنہ GAP پڑ جاتا ہے۔

اس نسخے کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ حمیدیہ کے بعد کلام میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں۔ یہ نسخہ غالب کے ذہنی ارتقا کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ مثلاً یہ غزل دیکھیے۔

واں پہنچ کر جو غش آتا پیہم ہے ہم کو

جو نسخۂ شیرانی کے صفحہ ۶۵۔ ل کے حاشیے میں درج ہے۔ اس کے آخر میں ایک قطعہ ہے جو متداول دیوان میں یوں ہے۔

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی
ہوسِ سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو

مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر
عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو

لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب
جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

---

[1] گلِ رعنا مع آشتی نامۂ غالب، مرتبہ سید قدرت نقوی، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی ۱۹۷۵ء، صفحہ ۱۵۔۱۶

نسخۂ شیرانی کے حاشیے میں پہلے شعر کا مصرع اول یوں ہے۔

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا غالب

اور دوسرا اور تیسرا شعر یہ ہیں :

طاقتِ رنجِ سفر بھی نہیں پاتے اتنی
ہجرِ یارانِ وطن کا بھی الم ہے ہم کو

لائی ہے معتمد الدولہ بہادر کی امید
جادۂ رہ کشش کافِ کرم ہے ہم کو

یہ غزل انھوں نے کلکتے جاتے ہوئے کہی۔ لکھنؤ میں ان کے پروگرام میں نواب معتمد الدولہ بہادر سے ملاقات شامل تھی لیکن ملاقات نہ ہو سکی۔ غالب نے ملاقات کے لیے چند شرطیں عائد کر دیں۔ مثلاً نواب صاحب معانقہ کریں گے مجھے نذر پیش کرنے سے مستثنیٰ قرار دیا جائے وغیرہ وغیرہ۔ یہ شرطیں نواب صاحب کو قابلِ قبول نہ تھیں۔ ملاقات نہ ہو سکی اور غالب ملاقات کیے بغیر لکھنؤ سے باندہ روانہ ہو گئے۔ لکھنؤ ہی میں (جب امیدِ ملاقات ختم ہو گئی) یا لکھنؤ سے روانہ ہونے کے بعد انھوں نے قطعے میں سے "طاقتِ رنجِ سفر" اور "معتمد الدولہ بہادر" والے دونوں شعر خارج کر دیے۔ پہلے مصرعے سے اپنا تخلص نکال دیا اور قطعے کو وہ صورت دی جو متداول دیوان میں درج ہے۔ اور جو اوپر بھی نقل کیا گیا ہے۔ یہ غزل بھی انھوں نے لکھنؤ یا باندہ سے لکھ کے اپنے اس قریبی عزیز یا دوست کو بھیجی جس کے پاس وہ نسخہ تھا جس کو ہم نسخۂ شیرانی کہتے ہیں۔

مذکورہ قطعے سے غالب کی اس مزاجی کیفیت پر روشنی پڑتی ہے جسے خود داری یا انا کہا جاتا ہے۔ اور جس کا ذکر ہم دہلی کالج والے واقعے کے تعلق سے کرتے ہیں۔ یہ قطعہ بھی اسی مزاجی کیفیت کا آئینہ دار ہے۔

۳۔ نسخۂ شیرانی کا کاتب غیر محتاط ہے نقطوں کے معاملے میں (نقطوں کو خود غالب نے درست کیا ہے)

۴۔ یہ نسخہ کسی بڑے آدمی کے لیے تیار کیا گیا ہوگا ؟ (کیونکہ اس کی تیاری میں خاص اہتمام سے کام لیا گیا ہے) کلکتہ روانہ ہونے سے پہلے یہ مکمل ہو چکا تھا۔

۵۔ غالب نے اپنے اشعار میں جو ترمیم یا اصلاح کی ہے، اس کی قدر و قیمت کیا ہے یعنی کیا اس تبدیلی سے شعر بہتر ہو گیا ہے یا ویسا ہی رہا ہے یا اس کا مرتبہ پہلے سے کم ہو گیا ہے۔

(میں نے خود شاعر کے قلم سے ترمیم و اصلاح کے پیشِ نظر علامہ اقبال کے کلام کو غائر نظر سے دیکھا ہے۔ اور "اقبال کے اپنے کلام پر نظرِ ثانی" کے عنوان سے ایک طویل مقالہ لکھا ہے۔ اس میں اپنے اندازے سے میں نے یہ بھی واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ اقبال نے یہ تبدیلی کس خیال سے کی ہوگی۔ اسی طرح کا ایک حصّہ اس مضمون میں ان تمام ترامیم اور اصلاحوں کے لیے بھی میرے پیشِ نظر تھا جس کی شمولیت اس مقالے میں ضروری تھی۔)

۶۔ اس مقالے میں ان تمام اشعار کا حوالہ دینا بھی ضروری تھا جن کے اشعار کا متن حمیدیہ (اصل) کے متن سے مختلف ہے۔ ان اہم ترامیم کا تفصیلی ذکر بھی ضروری تھا جو شیرانی میں ہیں مگر حمیدیہ میں نہیں ہیں۔

لیکن بحث کا پہلا حصّہ ہی یعنی نسخۂ حمیدیہ اور نسخۂ شیرانی کا ربط باہم ہی اتنا طویل ہو گیا کہ اگر دوسرے مذکورہ ابعاد پر لکھنے کی میں کوشش کرتا تو بربنائے طوالت مکمل مقالہ یہاں پیش کرنا دشوار ہو جاتا۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ اہلِ علم کی نظر سے یہ تمام ابعاد مخفی نہیں ہوں گے اور نسخۂ شیرانی کے سلسلے میں ان ابعاد پر ضرور لکھا جائے گا ـــ اور چونکہ مقالہ صرف ایک ہی بُعد تک محدود ہو کر رہ گیا ہے اس لیے میں نے اس کے عنوان میں ذرا سا اضافہ کر کے اُسے محدود کر دیا ہے یعنی "نسخۂ حمیدیہ سے نسخۂ شیرانی تک"۔

مظہر امام

یکے از شارحینِ غالبؔ: مولانا سُہا

غالبؔ کے قابلِ ذکر شارحین کی تعداد دو درجن سے کم نہیں۔ ان میں سے اکثر نے دوسرے شارحین سے استفادہ کرنے، مدد لینے اور اس کا اعتراف کرنے میں کسی تکلّف سے کام نہیں لیا ہے۔ چند بیانات ملاحظہ ہوں:

"مولانا طباطبائی، مولانا حسرت موہانی، مولانا سہا، مولانا آسی، مولانا نظامی بدایونی و مولانا شوکت میرٹھی صاحبان کی شرحوں سے بہت کچھ مدد لی گئی ہے۔"

سعید الدین احمد

"میں اس بات میں فخر محسوس کرتا ہوں کہ میں نے دیوانِ غالبؔ کے بعض مشکل اور پیچیدہ اشعار کے سمجھنے کے لیے یادگارِ غالبؔ حالیؔ اور شرح مولانا آسی و مولانا حسرت موہانی و حضرت بیخود دہلوی و مولانا حیدر علی طباطبائی سے استفادہ کیا۔"

پروفیسر ملک محمد عنایت اللہ

"کلامِ غالبؔ کے نکات سے لطف اندوز ہونے کے لیے میں نے

یادگارِ غالب مصنفہ مولانا حالی، شرح حسرت موہانی، طباطبائی، سہا،
مقدمۂ دیوانِ غالب مصنفہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، بیخود، آسی،
شوکت میرٹھی اور سعید وغیرہ کی شرحوں کو سامنے رکھ کر دقتِ نظر
کے ساتھ مطالعہ کیا۔"

آغا محمد باقر

"مولانا حسرت موہانی، مولانا سہا، مولانا طباطبائی اور مولانا سعیدالدین
احمد کی قابلِ قدر شرحوں اور "نگار" کے غالب نمبر نے رہبر کا کام
دیا ہے۔"

احسان ابن دانش

ان میں سے پروفیسر ملک محمد عنایت اللہ کے علاوہ ہر ایک نے مولانا سہا (مجددی) سے
استفادہ کرنے کا اعتراف کیا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی بھی اپنی "تفہیمِ غالب" کے دیباچے
میں طباطبائی اور بیخود موہانی کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں،

"بے خود دہلوی اور سہا مجددی بھی انتہائی قابلِ قدر شارح ہیں۔"

شرح دیوانِ غالب اردو، جو مولانا سہا کی تصنیف ہے، اس کا نام انھوں نے "مطالب الغالب"
رکھا ہے۔ میرے سامنے اس کا تیسرا اڈیشن ہے جسے شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور
نے ۱۹۳۱ء میں شائع کیا تھا۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے پیش نظر بھی یہی اڈیشن رہا
ہے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس کے پہلے اور دوسرے اڈیشن کب اشاعت پذیر ہوئے۔
"مطالب الغالب" پر مصنف کی حیثیت سے مولانا سہا کا نام ہے۔ غالباً وہ
اُس وقت تک سہا مجددی کے نام سے معروف نہیں ہوئے تھے۔ اس شرح کی ابتدا
"مقدمہ" سے ہوتی ہے، جو ۲۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ مولانا سہا نے غالب کے کلام
کی خصوصیات پر تفصیلی لیکن غلو آمیز تبصرہ کیا ہے۔ وہ غالب کو تمام اردو شعرا پر
ترجیح دیتے ہیں۔ اور اس کے اسباب بھی بیان کرتے ہیں۔ اُن کے الفاظ ہیں،

"غالب سے پہلے میر، سودا اور خواجہ میر درد اردو شاعری کے

تین نامور اساتذہ گزرے ہیں۔ لیکن غالب کا مرتبہ باعتبار جامعیتِ مضامین کے ان تینوں سے بلند تر ہے۔

میر کے یہاں مضامین اور مضامین کی رفعت محدود ہے۔ ان کی شاعری کی خصوصیتِ امتیازی، سادگیِ الفاظ اور عام درد آمیز اندازِ بیان میں جلوہ گر ہوتی ہے اور بس۔

سودا کے یہاں بجز قدرتِ سخن طرازی کے کوئی خاص بات نہیں۔ رہے خواجہ میر درد، تو اُن کے اسلوبِ ادا میں خفیف سی شوخی (جو میر کے یہاں مفقود ہے) کے ساتھ متصوفانہ خیالات کا اظہار بھی پایا جاتا ہے۔

اب معاصرینِ غالب پر نظر ڈالو تو اُن میں صرف مومن اور ذوق قابلِ ذکر ہیں جن میں سے مومن کی خصوصیتِ شعر محض رنگین نوائی ہے۔ اور ذوق کی خصوصیت محض محاورہ نگاری۔ یہ تمام خصوصیتیں جب غالب کے مضامینِ عالیہ کے سامنے آتی ہیں، تو خصوصیتیں نہیں رہتیں۔"

مولانا سہا غالب کو فردوسی اور عمر خیام پر بھی ترجیح نہیں دیتے، بلکہ ان کے درمیان "زمین و آسمان کا فرق" بتاتے ہیں۔ ان کے نزدیک فردوسی محض رزم نگار یا زیادہ سے زیادہ واقعات نگار" ہے اور "اس کے کمال کا راز صرف اس کی زبان کی شوکت میں پنہاں ہے۔" عمر خیام کی شاعری میں سہا کو صرف دو مضامین نظر آتے ہیں، یعنی "تحصیلِ عیش" اور "بے ثباتیِ عالم"۔

مولانا سہا نے اپنی "لکیر" کو دراز قامت ثابت کرنے کے لیے دوسری لکیروں کو مٹا کر ان کا قد چھوٹا کرنے کی کوشش کی ہے۔ غالب کے کمالات اپنی جگہ لیکن میر کی خصوصیتِ امتیازی کو صرف "سادگیِ الفاظ" اور "عام درد آمیز اندازِ بیان" پر محمول کرنا، سودا کے یہاں "قدرتِ سخن طرازی" کے سوا اور کچھ نہ دیکھنا، مومن کی

خصوصیتِ شعر کو محض "رنگین نوائی" سے تعبیر کرنا نہ قرینِ حقیقت ہے، نہ قرینِ انصاف۔ اسی طرح فردوسی کو محض "رزم نگار یا زیادہ سے زیادہ واقعات نگار" کہنا اور عمر خیام کی شاعری کو صرف دو مضامین تک محدود کر دینا سراسر زیادتی ہے۔ اس سے مولانا سہا کی تنقیدی بصیرت کے بارے میں کوئی اچھی رائے قائم نہیں ہوتی۔

شرحِ کلامِ غالب کی بنیاد حالی نے "یادگارِ غالب" میں ڈالی تھی، لیکن یہ غالب کی سوانح حیات ہے، اُن کے کلام کی باقاعدہ شرح نہیں۔ ہماری اب تک کی معلومات کے مطابق غالب کی پہلی باقاعدہ شرح احمد حسن شوکت میرٹھی کی ہے جو "حلِ کلیات اردو مرزا غالب دہلوی" کے نام سے ۱۸۹۹ء میں شائع ہوئی۔ اس کے دوسرے ہی سال یعنی ۱۹۰۰ء میں حیدرآباد سے علی حیدر نظم طباطبائی کی "شرح دیوانِ اردوے غالب" منظرِ عام پر آئی۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ شرح بہت محنت سے لکھی گئی ہے اور اسے اتنی پذیرائی حاصل ہوئی کہ بہت سے لوگ اسے اب تک لکھی ہوئی کلامِ غالب کی سب سے اچھی شرح قرار دیتے ہیں۔ حسرت موہانی کی "شرحِ دیوانِ غالب" پہلی بار ۱۹۱۱ء میں چھپی۔ یہ اُن کے بالیدہ ذوقِ سخن کی غماز ہے۔ اس کے بعد ایک باقاعدہ شرح مولانا سہا مجددی کی ہے۔ سید وحیدالدین احمد بیخود دہلوی کی شرح جسے انھوں نے "مرآۃ الغالب" کے نام سے ۱۹۳۴ء میں شائع کرایا، اس کے بعد کی ہے۔ حسرت موہانی کے بعد اور سہا مجددی سے پہلے عبدالرحمٰن بجنوری کا "مقدمہ دیوانِ غالب" بھی ملتا ہے جو نسخۂ حمیدیہ کے ساتھ ۱۹۲۲ء میں بھوپال سے شائع ہوا تھا اور مولوی عبدالحق نے بھی اپنے رسالے "اردو" میں اسے چھاپا تھا۔ عبدالرحمٰن بجنوری نے غالب کی تعینِ قدر کے لیے اکثر اشعار کے مفہوم بیان کیے ہیں، لیکن یہ "مقدمہ" باقاعدہ شرح کے ذیل میں نہیں آتا۔

مختصر یہ کہ مولانا سہا مجددی کی "مطالب الغالب" غالب کی معدودے چند ابتدائی شرحوں میں سے ہے۔ یہ امر بذاتِ خود اس شرح کے لیے وجہِ امتیاز ہے، لیکن اس سے قطع نظر بھی سہا نے اکثر اشعار کی افہام و تفہیم میں نہ صرف دقتِ نظر سے کام لیا ہے، بلکہ اپنی نکتہ سنجی کا ثبوت بھی دیا ہے۔ یہ وہی مولانا سہا ہیں جن کا شمار نیاز فتحپوری اور

جوشؔ ملیح آبادی کے عزیز دوستوں میں ہوتا ہے۔ جوشؔ نے اپنی "یادوں کی برات" میں سہاؔ کا ذکر لطف لے لے کر کیا ہے۔

"مطالب الغالب" کے تیسرے اڈیشن کے مجموعی صفحات ۰۰بم ہیں۔ اُس میں اُس وقت تک کا غالبؔ کا تقریباً سارا متداول کلام شامل ہے۔ غالبؔ کی غزلوں کے اشعار کی فرداً فرداً تشریح کی گئی ہے۔ بعض تشریحیں تفصیلاً ہیں، بعض بہت اجمالی۔ بہت سے اشعار کے مفہوم بیان کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ غزلیات کے بعد چار قصائد ہیں۔ پھر ایک مثنوی "آموں کی تعریف میں"۔ اُن کے اشعار میں مستعمل مشکل الفاظ کے لغوی معنی دیے گئے ہیں اور استعارہ، تشبیہہ اور کنایہ کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے۔ ایک قطعہ عرض بحضور شاہ (اے شہنشاہِ فلک پایہ و بے مثل و نظیر) بھی ہے۔ اس کے لیے بھی یہی صورت اختیار کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ ایک قصیدہ، ایک سلام، ایک سہرا، کچھ قطعات، چند رباعیات اور کچھ متفرق اشعار بھی ہیں، ان کی نہ تشریح کی گئی ہے اور نہ مشکل الفاظ و تراکیب کے معانی و مطالب دیے گئے ہیں۔ میرا خیال ہے مقصد غزلوں کے اشعار کی تشریح کرنا تھا اور اسے اردو کلامِ غالبؔ نہیں، بلکہ اردو غزلیاتِ غالبؔ کی تشریح کے طور پر دیکھنا چاہیے۔

میں اکثر سوچتا ہوں، کیا شاعری کا مطالعہ شرحوں کی مدد سے کرنا چاہیے؟ نہ صرف یہ کہ بعض تشریحات مضحکہ خیز ہوتی ہیں، بلکہ عموماً کثرتِ تعبیر سے ایک اچھا خاصا شعر دیوانے کا خواب بن جاتا ہے!

غالبؔ کی مشکل پسندی کا ذکر عام طور پر کیا گیا ہے، لیکن ایسے لوگ بھی ہیں، جو اُسے مشکل پسند تسلیم نہیں کرتے۔ سہاؔ مجددی نے "مطالب الغالب" کے مقدمہ میں لکھا ہے:

> "غالبؔ کے کلام کو مشکل قرار دیے جانے کا ذمہ دار غالبؔ کا کلام نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ اس میں مشکل کو دخل ہی نہیں ہے۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ غالبؔ کے دور کی عام اردو اُس اعتلائے خیال، اُس رفعتِ فکر، اُس وسعتِ مطالب، اُس کمالِ مطابقتِ تشبیہات،

اُس بلاغتِ استعارات اور اُس خاص اسلوبِ ادا و شیوہ بیانی
سے نابلد تھی جس کو پہلے پہل غالب نے بکمالِ قدرتِ شاعرانہ
اردو میں روشناس کرایا۔ اور اجنبیت سے اگر "مشکل نگاری" کی
غلط فہمی ابتدا ہی میں پیدا نہ ہوئی ہوتی تو اب سے بہت پہلے وہ
اعترافِ صحیح پیدا ہو چکا تھا، جس کا ابھی اور چند سال انتظار کرنا
چاہیے اور یہ وہی اعترافِ عام ہوگا، جو غالب کو بلا استثنا تمام
شعرائے اردو سے فائق تسلیم کرا دے گا۔"

احسان دانش بھی ان کے ہمنوا ہیں۔ وہ اپنی "شرح غالب" کے دیباچے میں
کہتے ہیں کہ "مرزا میں جدت پسندی ضرور تھی، مگر مشکل پسندی نہیں۔" البتہ وہ اس کا
اقرار کرتے ہیں کہ "جس قدر مشکل اشعار ہیں وہ مرزا کا ابتدائی کلام ہے۔" اور اس کی
وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ غالب نے عبدالصمد جیسے استاد سے تعلیم حاصل کی تھی، اور
انھیں بیدل اور ظہوری جیسے شعرا کے دواوین گویا حفظ تھے۔

یہ خیال بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ غالب کی کئی غزلیں سہلِ ممتنع کے ذیل میں آتی ہیں،
مثلاً "آخر اس درد کی دوا کیا ہے" "یا "ابنِ مریم ہوا کرے کوئی" والی غزلیں۔ اسی قبیلے
کا ایک شعر ہے، جسے میں نے آج کی گفتگو کے لیے بطورِ خاص منتخب کیا ہے:

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے
غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

اس شعر میں کوئی فارسی ترکیب نہیں، جسے بیدل یا ظہوری کے اثر سے منسوب کیا
جا سکے۔ اس میں کوئی ایسا لفظ بھی نہیں جس کے لیے لغت سے رجوع کرنے کی ضرورت
محسوس ہو۔ لیکن کیا اسے سہلِ ممتنع کی ایک مثال کہ کر ٹالا جا سکتا ہے؟ اس شعر پر شاید آج
کے مشاعروں کی چھتیں اڑ جاتیں، اگر یہ شعر اس طرح ہوتا اور اسے اداکارانہ ترنم سے پڑھا جاتا:

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں تیرے
غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ غالب کا شعر ہے اور اس میں "تیرے" کی جگہ "اپنے" استعمال ہوا ہے۔ اس "مشکل" کو "سہل" کرنے کی کوششیں ہمارے شارحین نے کی ہیں، اور کچھ نے شاید اسے مشاعرے کے شعر کے طور پر ہی پڑھا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

(۱) "یعنی جب کہ تجھ کو غیر کی محبت کا یقین ہو گیا تو ہم تجھ سے محبت کر کے فضول اپنے آپ کو تکلیف کیوں پہنچائیں۔"

سعید الدین احمد

(۲) "اگر غیر سے تمھیں محبت ہے تو یوں ہی سہی، ہم اپنے دشمن نہیں ہیں کہ یہ بات جانتے ہوئے ہم تمھارے عشق کے دکھ اور رشک کی تکلیف برداشت کریں۔"

آغا محمد باقر

(۳) "تم جو کہتے ہو کہ "غیر کو مجھ سے محبت ہے" یعنی جب تم کو رقیب کی محبت کا یقین ہے تو اب تم سے محبت کرنا گویا اپنے سے دشمنی کرنا ہے۔"

احسان دانش

ان تینوں شارحین کا مفہوم ایک سا ہے۔ البتہ آغا محمد باقر نے غالب کے "غیر کو" کو "غیر سے" سے بدل دیا ہے۔ یعنی غالب کہتے ہیں ــــ غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی ــــ آغا باقر کہتے ہیں کہ "اگر غیر سے تمھیں محبت ہے تو یوں ہی سہی۔" یہ ایک طرح سے تحریف ہے، اور شاعر پر جبر!

دو اور شارحین، جو یکساں خیالات رکھتے ہیں، ان کی مثالیں دیکھیے:

(۱) "بھی" اور "سہی" اس بات کے شاہد ہیں کہ ہم بھی تو دشمن نہیں، ہم بھی تو اپنے ہی ہیں۔ ہم کو بھی تجھ سے محبت ہے، پھر ہم کو اس کے مقابلے پر ذلیل کیوں سمجھا جاتا ہے۔"

عبد الباری آسی

(۲) " مطلب یہ ہے کہ ہم نے مانا کہ تم غیر سے محبت کرتے ہو اور غیر تم سے محبت کرتا ہے، لیکن ہم بھی آپ کے دشمن نہیں ہیں، ہم بھی تو آپ سے محبت ہی کرتے ہیں۔

محبت تم سے کرتا ہوں عداوت تو نہیں کرتا
کرے جو عاجزی اس کو ستانا کس سے سیکھا ہے "

پروفیسر ملک محمد عنایت اللہ

میں نے عرض کیا ہے کہ شارحین وہ مفہوم بھی نکال لیتے ہیں، جو شاعر کے بیان سے کسی طرح برآمد نہیں ہوتا۔ غالب نے یہ تو کہا کہ غیر کو یا رقیب کو، تجھ سے (یعنی میرے محبوب سے) محبت ہے، لیکن انھوں نے یہ نہیں کہا کہ تجھ کو (یعنی میرے محبوب کو) غیر سے یا رقیب سے محبت ہے۔ ممکن ہے محبت ہو، ممکن ہے نہ ہو۔ غالب نے اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے۔ ہم غالب کے منہ سے وہ بات کیوں کہلائیں جو انھوں نے نہیں کہی ہے یا جسے وہ کہنا نہیں چاہتے! پھر آغا محمد باقر اور پروفیسر ملک محمد عنایت اللہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ علاوہ ازیں عبدالباری آسی اور پروفیسر عنایت اللہ دونوں نے "اپنے" کو "تیرے" کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ عبدالباری آسی کا آخری جملہ بھی محلِ نظر ہے ــ "پھر ہم کو اس کے مقابلے پر ذلیل کیوں سمجھا جاتا ہے؟" اگر ایک لمحے کے لیے "اپنے" کو "تیرے" مان لیا جائے، پھر بھی عاشق کو "ذلیل سمجھنے" والی بات کہاں سے آگئی؟ زیادہ سے زیادہ اسے محبوب کی "بے نیازی"، "بے توجہی" اور "غیریت" پر محمول کیا جا سکتا ہے۔

ان سب کے مقابلے میں مولانا سہا کی تشریح دیکھیے، جو میرے نزدیک سب سے افضل اور درست ہے اور "اپنے" کا مفہوم اسی طرح ادا کیا گیا ہے، جیسا کہ روزمرہ کا تقاضا ہے۔ کسی شرح کی مدد کے بغیر، میرے ذہن میں غالب کے اس شعر کا مفہوم یہی رہا ہے:

"یعنی خیر آپ ہی سچے ہیں کہ غیر کو آپ سے محبت ہے مگر یہ

کہیے کہ ہمیں اپنے ساتھ دشمنی ہے کہ تم سے محبت نہیں رکھتے،
کیوں کہ زندگی تو تم سے وابستہ ہے۔ پھر بھی اگر تم سے محبت
نہ ہو تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہمیں اپنی جان اور اپنے
آپ سے دشمنی ہے۔ اس سے قبل تقریبًا اسی مفہوم کا شعر گزر
چکا ہے :

کیوں کر اُس بُت سے رکھوں جان عزیز
کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز،،

غالب کے بعض شارحین نے کبھی کبھی ایسا بھی کیا ہے کہ اپنی جانب سے نہ کوئی وضاحت کی ہے اور نہ کوئی اضافہ کیا ہے، بلکہ دوسرے شارحین کو ہو بہو نقل کر دیا ہے۔ غالب کا ایک مشہور شعر ہے :

ترے سرو قامت سے اک قدِ آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

سعید الدین احمد اور پروفیسر ملک محمد عنایت اللہ دونوں نے اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا۔ صرف وہی تشریح حوالے کے ساتھ لفظ بہ لفظ نقل کر دی ہے، جو یادگارِ غالب میں ہے۔ یعنی :

"اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ تیرے سرو قامت سے فتنۂ قیامت
کم تر ہے اور دوسرے یہ معنی ہیں کہ تیرا قد اسی میں سے بنایا گیا
ہے، اس لیے وہ فتنۂ قیامت ایک قدِ آدم کم ہو گیا۔"

احسان دانش نے اسی مفہوم کو معمولی تبدیلی کے ساتھ لکھا ہے :

"قیامت کے فتنے میں تیرے قد کے برابر کمی ہے۔ شاید تیرا
قد اسی میں سے بنا ہے اور یہی اس کی کمی کا باعث ہے۔ یا یوں
کہو کہ فتنۂ قیامت سے تیری سرو قامتی قدِ آدم بڑھی
ہوئی ہے۔"

مولانا سہا بھی اس مفہوم سے الگ نہیں ہوتے، لیکن ایک چھوٹی سی بات کہہ کر شعر کا لطف بڑھا دیتے ہیں۔ دیکھیے :

"ایک قدِ آدم کم ہونا۔ گویا فتنۂ قیامت تیرے قدموں میں پڑا ہوا ہے"۔

لیکن مولانا سہا کی "مطالب الغالب" میں بھی ایسے مقامات بہت ہیں جب شرح اتنی مختصر ہو گئی ہے کہ اس سے ذہن کسی طرح آسودہ نہیں ہوتا۔ اس طرح کی مثالوں سے مضمون کو بوجھل کرنا مقصود نہیں، محض ایک دو مثالیں دیکھیے۔ غالب کا شعر ہے :

پی جس قدر ملے شبِ مہتاب میں شراب
اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے

سہا نے صرف اس قدر لکھا ہے :

"شبِ ماہ کو بلغمی مزاج سے تعبیر کیا ہے۔ "راس" موافق"۔

اس کی تشریح نہیں کی کہ بلغمی مزاج کسے کہتے ہیں اور "شبِ ماہ" کو بلغمی مزاج سے کیوں تعبیر کیا ہے۔

ایک اور شعر دیکھیے :

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی
اے وہ مجلس نہیں، خلوت ہی سہی

سہا نے بس یہ لکھا ہے :

"رسوائی بہ معنی افشائے راز"۔

اگر "رسوائی" کے معنی "بدنامی" نہ لے کر "افشائے راز" بھی لیے جائیں تو کیا شعر کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ میری دانست میں اس شعر میں کلیدی لفظ "خلوت" ہے۔ حسرت موہانی نے اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ اگر تم مجلس میں ملنا اپنے لیے باعثِ رسوائی سمجھتے ہو تو خلوت میں ہی مل لو، کیوں کہ ہم پاک دامن ہیں۔ میں سمجھتا ہوں غالب اپنے آپ کو "پاک دامن" کسی "مصلحت" کی بنا پر ہی کہہ سکتے تھے۔

اس طرح کی تشریحات سے ہماری کوئی رہ نمائی نہیں ہوتی۔

عبدالرحمٰن بجنوری کا یہ فقرہ زبان زد ہے کہ ہندوستان میں الہامی کتابیں دو ہیں۔ ایک "وید مقدس" اور دوسری "دیوانِ غالب"۔ "وید مقدس" کا مجھے پتا نہیں، لیکن "دیوانِ غالب" جیسی "الہامی" کتاب میں یہ شعر بھی ملتا ہے:

دھول دھپّا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

اس طرح کے دیگر اشعار سے بھی آپ واقف ہیں۔ یہ سخن گسترانہ بات ضمناً آگئی۔ عرض صرف اس قدر کرنا ہے کہ مولانا سُہا نے اس شعر کا کوئی مفہوم بیان نہیں کیا۔ شاید انھوں نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی، یا شاید شرم و حیا مانع ہوئی۔ اگر ایسا ہے تو یہ اخلاقی رویہ ایک شارح کو زیب نہیں دیتا۔ بہرحال، عبرت حاصل کرنے کے لیے اس مقطع کی "تشریح" آغا محمد باقر کی زبان سے سنیے:

"اُس سراپا ناز کا شیوہ دھول دھپّا نہ تھا۔ ہمیں نے ایک دن پہل کی تھی۔ اُس دن سے ان کو دست درازی کی عادت پڑ گئی ہے۔ اب برداشت کیجیے، شکایت کیسی؟"

آخر میں اپنا سوال پھر دُہراتا ہوں، جو میں اپنے آپ سے کرتا ہوں:
کیا کسی شاعر کے کلام سے لُطف اندوز ہونے یا اُس تک رسائی حاصل کرنے کے لیے شارحین کی دست گیری ضروری ہے؟ — خواہ وہ غالب کا کلام ہی کیوں نہ ہو!

پروفیسر گیان چند جین

"بیاضِ غالب، تحقیقی جائزہ" کا تحقیقی جائزہ

۱۹۶۹ء میں دریافت شدہ مخطوطہ دیوانِ غالب کو عام طور سے بخطِ غالب تسلیم کیا گیا۔ صرف ڈاکٹر انصار اللہ نظر، ڈاکٹر سید حامد حسین اور ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی نے اسے بخطِ غیر ٹھہرایا۔ ڈاکٹر انصار اللہ نظر اور اس کے مندرجات کو کلامِ غالب ہی تسلیم کرتے ہیں لیکن کمال احمد صدیقی صاحب اپنے دعوے میں منفرد ہیں کہ اس مخطوطے میں جو مزید کلام ہے اور بعد کے نسخوں سے جو جو اختلافاتِ نسخ ہیں وہ زمانۂ حال میں کسی جعل ساز نے گڑھ دیے ہیں۔ کمال احمد صاحب نے کتاب کا پہلا نسخہ شمیم احمد صاحب شمیم ایم پی کو پیش کیا اور شمیم صاحب نے کمالِ لطف سے مجھے اس جلد کے بالاستیعاب مطالعے کا موقع دیا۔

اس کتاب میں نسخۂ عرشی کے سائز کے ۴۲۲ صفحات ہیں۔ اطلاع ہے کہ اشاعتی جلدوں میں مخطوطہ دیوان کا فوٹوسٹیٹ بھی شامل ہوگا۔ کتاب کا ناشر ادارۂ مطالعات غالب، پرتاپ پارک، ریزیڈنس روڈ سری نگر ہے۔ اندرونِ سرورق پر ایک سطر میں یہ درج ہے۔

پہلا ایڈیشن : ایک سو۔ قیمت : ۵۰۰ روپے

نسخۂ عرشی زادہ کی تین سو روپے قیمت پر بھی اعتراض کیا گیا تھا لیکن اس کے

نرخِ بالا کی کچھ وجوہ تھیں ۔ ۱۔ یہ غالبؔ کے اس پہلے دیوان کا عکس پیش کرتا تھا ۔ جو مرتب اور دیگر ماہرین کی رائے میں بخطّ غالبؔ تھا ۔ ۲ ۔ اس نسخے کو پہلی بار شائع کیا جا رہا تھا ۔ ۳ ۔ کتاب کا کاغذ، کتابت اور طباعت اعلیٰ سے اعلیٰ تھیں ۔

'تحقیقی جائزہ' ان سب اوصاف سے عاری ہے کیونکہ

(۱) مصنف کی رائے میں یہ مخطوطہ غالبؔ کا کلام پیش نہیں کرتا بلکہ کسی کم سواد کی جعل سازی کا نتیجہ ہے ۔ ظاہر ہے کہ سکۂ کاسد کی کوئی قیمت نہیں ہوتی ۔

(۲) اس کتاب میں نو دریافت نسخہ تیسری بار پیش کیا جا رہا ہے ۔ نقوش کی بدولت یہ پہلے ہی گھر گھر پہنچ چکا ہے ۔

(۳) کتاب کا کاغذ اخباری کاغذ کی طرح زردی مائل اور کھردرا سا ہے ۔ طباعت اچھی نہیں ۔ جگہ جگہ الفاظ مٹے ہوئے ہیں ۔

کتاب کے شروع میں غالبؔ کی لال قلعے والی رنگین تصویر ہے اور اس کے بعد پانچ صفحات پر غالبؔ کے قلم کی مختلف تحریروں کے عکس ہیں ۔ تمہید کے طور پر کوئی فہرست یا دیباچہ نہیں ۔ صفحہ ۹ سے یکایک متن شروع ہو جاتا ہے ۔ ابواب کی تقسیم نہیں ۔ پوری کتاب ایک سلسلے میں لکھ دی گئی ہے ۔ ابھی تک کمال صاحب محض شاعر کی حیثیت سے مشہور تھے ۔ اس کتاب میں پہلی بار محقق کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب کا انداز سکہ بند تحقیق نوعیت کا نہیں مثلاً کسی موضوع پر وہ کوئی اقتباس دیتے ہیں تو جلی عنوان قائم کرتے ہیں ۔

"اقتباس شروع" (مثلاً ص ،، یا ۱۹۲ پر) اور بعد میں لکھتے ہیں اقتباس ختم (ص) پر پس نوشت کے عنوان سے کچھ لکھتے ہیں ۔ پس نوشت خطوں میں ہوتی ہے ۔ کتاب میں عموماً استدراک کے عنوان سے اضافہ کیا جاتا ہے ۔ بہر حال یہ کتاب کے آخر میں ہونا چاہیے درمیان میں 'پس نوشت' کے عنوان کی ضرورت نہیں ۔ اس کے علاوہ مصنف محمد حسین آزاد کی طرح ہر دوسرے تیسرے صفحے پر اپنی ذات کو اس طرح پیش کرتے ہیں ۔ 'حقیر کمال یہ عرض کرتا ہے'، 'یہ حقیر عرض کرتا ہے'، 'یہ کم سواد عرض کرتا ہے'

متن کے ابتدائی آٹھ صفحات میں مصنف نے کتاب کے مرکزی موضوع کا نام بھی نہیں لیا بلکہ مالک رام کے مرتبہ دیوانِ غالب کے املے کی غلطیوں یا حذفِ اضافت وغیرہ کی تفصیل دی ہے جس میں خاص شکوہ یہ ہے کہ مالک رام صاحب نے اُن موقعوں پر یہاں 'وہاں' چھاپا ہے جہاں شعر کا وزن یہاں وہاں کا متقاضی تھا۔ شکوہ بجا ہے۔

اطلاع دیتے ہیں کہ چونکہ عرشی صاحب اور مالک رام صاحب کے مرتبہ نسخے غلطیوں سے خالی نہیں اس لیے انھوں نے غالب کا دیوان یوں مرتب کرنا شروع کیا کہ اس میں کوئی غلطی جگہ نہ پائے لیکن تقریباً بیس شعروں کے صحیح متن کے بارے میں شبہ رہا۔ مصنف نے یہ صراحت نہیں کی کہ ان شعروں کے جو متبادل متون درج کیے ہیں۔ وہ کہاں سے لیے ہیں۔ غالباً یہ اختلافاتِ نسخ مصنف کے شکوک ہی کی تخلیق ہیں کیونکہ ان میں سے بیشتر مستند ایڈیشن میں دیکھنے میں نہیں آئے۔ جنابِ مصنف نے کتاب کے متن میں بارہا غالب کے متن کو غلط فرض کرکے اس پر قیاسی اصلاح دی ہے۔ اندیشہ ہے کہ ان کا مرتبہ دیوان اس قسم کی تصحیحات یا اصلاحات سے پر نہ ہو۔

متداول دیوان کے متن میں اپنے شکوک قلم بند کرنے کے بعد وہ نو دریافت نسخے کی غزلوں کے اشعار کو ایک ایک کرکے لکھتے ہیں اور ان پر اپنے شبہات واعتراضات رقم کرتے جاتے ہیں۔ غزل تقریباً ہر ایک لے لی ہے لیکن اس کے تمام اشعار پر تبصرہ نہیں کرتے۔ اس طرح دیوان کے آخر تک پہنچ جاتے ہیں اور وہیں کتاب مکمل ہو جاتی ہے۔ میری رائے میں کتاب کی بہتر ترتیب یہ ہوتی کہ وہ خاص اعتراضات کو عنوان قائم کرکے درج کرتے اور ہر اعتراض کے تحت تمام تائیدی مثالیں لکھ دیتے۔ اس گروہ بندی سے قاری کو بآسانی اندازہ ہو جاتا کہ فاضل مصنف کن کن وجوہ سے نسخے کو جعلی قرار دیتے ہیں۔ بہ صورتِ موجودہ قاری کو پوری کتاب کھنگال کر ہی مصنف کی شکایات کا اندازہ ہوتا ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں بعض مخففات درج کرتا ہوں جو اس مضمون میں استعمال کیے جائیں گے۔ ان میں سے پہلے دو کمال صاحب کے وضع کردہ ہیں اور بعد کے دو عرشی

صاحب کے۔

الف (نسخۂ امروہہ) بیاضِ غالب۔ نقوش اکتوبر ۱۹۶۹ء

عین نسخۂ عرشی زادہ

ق نسخۂ بھوپال جو نسخہ حمیدیہ کی اصل ہے۔

تا نسخۂ شیرانی

خ خودنوشت مخطوطۂ دیوانِ غالب

جائزہ کمال احمد صدیقی کی زیرِ بحث کتاب

مصنف کمال احمد صدیقی

مصنف نے جا بجا طنز سے کام لیا ہے لیکن بعض اوقات یہ طعن و تشنیع بن کر رہ جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ وہ صدقِ دل سے مخطوطے کو جعلی مانتے ہیں اس لیے باربار اس کی خامیاں دیکھ کر جھلّا جاتے ہیں اور شدّتِ جذبات میں دوسروں کو سخت سست کہہ جاتے ہیں۔ انھیں شبہ سب سے زیادہ عرشی زادہ پر ہے لیکن طنز سب سے زیادہ نثار احمد فاروقی کا مقسوم ہے۔ نثار صاحب نے مقدمہ الف میں لکھا ہے کہ تذکرہ عمدۂ منتخبہ شائع شدہ دلّی یونیورسٹی میں غالب کا ایک مصرع یوں درج ہے۔

ع جگر سے ٹوٹے ہوئے موگی ہے سناں پیدا

کہتے ہیں" میں نے مطبوعہ تذکرہ سرور کے نسخے پر غلطیوں کی نشاں دہی کرتے ہوئے اس کی قیاسی تصحیح یوں کی تھی۔

جگر سے ٹوٹی ہوئی ہوگئی سناں پیدا

اب یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ نسخۂ امروہہ کا متن میرے قیاس کی پوری تائید کر رہا ہے۔[۱]

حقیقت یہ ہے کہ دلّی یونیورسٹی کے مرتبہ عمدۂ منتخبہ میں مصرع کی آخرالذکر شکل ہی ہے اس پر کمال صاحب یوں برس پڑتے ہیں:۔

[۱] نقوش اکتوبر ۱۹۶۹ء مقدمہ ص ۲۵

"اس چھوٹی سی بات سے نثار احمد فاروقی صاحب کی محققانہ صلاحیتوں ان کی نیت اور ان کی دیانت کے بارے میں مناسب نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے۔ جو اتنی چھوٹی سی بات میں اور معمولی سی بات میں اتنی بڑی غلط بیانی کرسکتا ہے وہ ایک مجہول نسخے کو بخطِ غالب ثابت کرنے کے لیے کیا کچھ گواہی نہیں دے سکتا۔ ان کی کوئی بات درخورِ اعتنا نہیں ہوسکتی"
(ص ۱۹۷۔)

ص ۳۸۸ اور ۳۹۶ پر الف کے فاضل مرتب کی ظاہرا معصومیت کا ذکر کیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ بیاضِ غالب کی تصریحات لکھتے وقت انھیں معلوم تھا کہ مخطوطے کا متن بعد والے نسخۂ شیرانی کا ہے لیکن اسے چھپا گئے۔ مرتبِ الف نے تصریحات سے لکھتے وقت بعض اشعار کو نہ معلوم کس طرح نودریافت قرار دے دیا اس پر مصنف چٹکیاں لیتے ہیں۔ اشعار یہ ہیں :

لکھتا ہوں اسد سوزشِ دل سے سخن گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پر انگشت

"مقطع وہی ہے جو متداول دیوان میں ہے لیکن الف میں تصریحات کے یہ 'انکشاف' کیا گیا ہے کہ دیوان کے کسی نسخے میں نہیں ملتا۔"
جائزہ ص ۳۷۹

لبِ عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی
قیامت کشتۂ لعلِ جہاں کی خوابِ سنگیں ہے

یہ شعر قِ اور تا بلکہ متداول دیوان میں بھی ہے لیکن مرتبِ الف نے سہواً تصریحات میں لکھ دیا "حمیدیہ اور شیرانی میں یہ شعر نہیں ہے"۔ اس پر چٹکی لیتے ہیں۔
"ظاہر ہے نثار احمد فاروقی نے حمیدیہ اور شیرانی کا صرف نام سنا ہے۔"
(جائزہ ص ۴۰۰)

ہے وصل ہجر عالمِ تمکین و ضبط میں معشوقِ شوخ و عاشقِ دیوانہ چاہیے

" الف کے فاضل مرتب نے اس شعر کو نو دریافت قرار دیا ہے"۔

یہ تینوں شعر متداول دیوان کے ہیں۔ کم از کم آخری تو اتنا مشہور ہے کہ مرتب الف کو جاننا چاہیے تھا۔ ان تینوں اشعار کی زمین کے کچھ اشعار نسخۂ عرشی میں غیر متداول حصے گنجینۂ معنی میں درج ہیں کچھ متداول حصے نوائے سروش میں۔ مرتبِ الف نے غالب ق اور ق کو دیکھے بغیر صرف گنجینۂ معنی کو دیکھا۔ وہ یہ قیاس نہ کر سکے کہ مندرجہ بالا اشعار متداول ہو سکتے ہیں اس لیے انھوں نے گنجینۂ معنی کی بنیاد پر لکھ دیا کہ یہ اشعار کسی نسخے میں نہیں ملتے۔

آصفیہ لائبریری حیدر آباد میں ایک نسخے پر غالب کا خط بہ نام محمد حسین خاں غالب کی تحریر میں درج ہے۔ نسخۂ عرشی اور دیوانِ غالب مرتبۂ مالک رام کے دیباچوں میں اس کا اقتباس ہے لیکن اصل سے کہیں کچھ کمی بیشی ہو گئی ہے۔ مصنف نے جائزہ ص ۵ پر اس خط کا عکس دیا ہے اور نیچے نوٹ لکھتے ہیں :۔

"جناب امتیاز علی خاں عرشی اور جناب مالک رام دونوں نے غالب کی تحریر دیکھے بغیر مجہول ماخذوں سے عبارت نقل کروا دی اور حوالہ اصل نسخے کا دے دیا"۔

مالک رام صاحب نے ضرور اصل کا حوالہ دیا ہے لیکن عرشی صاحب نے غلام رسول مہر کی کتاب غالب کے حوالے سے لکھا ہے اس لیے ان پر الزام عائد نہیں ہوتا۔ مہر کی کتاب مجہول ماخذ بھی نہیں۔

مالک رام کے دیوانِ غالب میں ص ۱۰۵ پر شعر ہے۔

غم اس کو حسرتِ پروانہ کا ہے اے شعلہ
ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانیِ شمع

اور فٹ نوٹ میں ہے۔ "غش پروانے"

یعنی نسخۂ شو نراین میں 'حسرتِ پروانے' ہے۔ اس پر کمال صاحب بگڑ کر لکھتے ہیں :۔

"فٹ نوٹ لگانے کی ضرورت نہیں تھی۔ فٹ نوٹ اختلافِ نسخ دکھانے کے لیے ہے غلطیاں دکھانے کے لیے نہیں۔ حسرتِ پروانہ کو حسرتِ پروانے میں نہیں لکھا جاسکتا۔ اس لیے یہ فٹ نوٹ گمراہ کن ہے۔ ایسا فٹ نوٹ کسی غالب شناس کے شایانِ شان بھی نہیں۔" (ص ۱۳)

مجھے اس اصول سے اتفاق نہیں کہ فٹ نوٹ صرف اختلافِ نسخ دکھانے کے لیے ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اختلافِ نسخ میں کچھ نسخے صحیح ہوتے تو کچھ غلطِ محض بھی ہوسکتے ہیں۔ غلط متن سے چشم پوشی کر کے نہیں گزرا جاسکتا۔ اگر اسے اختلافِ نسخ میں نہ دکھایا جائے تو کہاں دکھایا جائے۔

مالک رام صاحب کے بارے میں یہ ارشادات بھی ہیں۔

"شاید موصوف کو غالب کی تحریریں توجہ سے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔" ص ۶۹

"یہ بات شک و شبہ سے بالاتر نہیں ہے کہ جناب مالک رام غالب کے طرزِ تحریر یا ان کے اندازِ قلم سے واقف ہیں۔"

اس قسم کے تحقیقی کام میں ضروری تھا کہ مصنف کلامِ غالب کے تمام اہم ایڈیشنوں کو پیشِ نظر رکھتے لیکن ان کے سامنے ذیل کے مجموعے نہ تھے جو 'جائزہ' کی اشاعت سے کافی پہلے بازار میں آچکے تھے۔

نسخۂ حمیدیہ مرتبۂ مفتی انوار الحق۔ نسخۂ حمیدیہ مرتبۂ حمید احمد خاں۔ نسخۂ شیرانی مطبوعۂ لاہور۔ گلِ رعنا مرتبۂ مالک رام۔

اس لیے جب وہ نسخۂ حمیدیہ جیسی عام کتاب کے متن کے بارے میں تذبذب میں مبتلا نظر آتے ہیں تو رحم آتا ہے مثلاً

"نسخۂ عرشی میں قافیہ 'زنداں' چھپا ہے لیکن غلط نامے میں اس کو 'زنداں' پڑھنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اختلافِ نسخ کے باب میں 'زنداں'، نسخۂ شیرانی کی قراءت دکھائی گئی ہے۔ یا تو غلط نامہ غلط ہے یا اختلافِ نسخ کے تحت اندراجِ غلط ہے

کیونکہ ان دونوں کی وجہ سے پوزیشن واضح نہیں ہوتی کہ 'زنداں' غلط ہے یا نسخۂ بھوپال کا قافیہ'۔ (ص ۳۵۵)

جتوں میں یہ سب نسخے موجود ہیں۔ اس تذبذب بیان سے بہتر تھا کہ مجھے لکھ کر پوچھ لیتے۔ میں بتا دیتا کہ ق میں 'زنداں' ہے اور قا میں 'رنداں'

ایک اور قابلِ رحم مثال دیکھیے۔

ص ۲۵۲ پر خ کا مصرع "وصل ہر رنگ تپش کسوتِ رسوائی ہے" دے کر لکھتے ہیں کہ نسخۂ عرشی کے اختلافِ نسخ کے مطابق نسخۂ بھوپال میں مصرع یہ ہے۔

وصل رنگِ تپش کسوت رسوائی ہے

یہ اظہار بھی کیا گیا ہے کہ نسخۂ شیرانی میں مصرع یوں ہے۔

وصل ہر رنگ تپشِ کسوت رسوائی ہے

...... یہاں پر جو بات توجہ چاہتی ہے وہ یہ ہے کہ "مخطوطے" میں مصرع نسخۂ بھوپال سے نہیں نسخۂ شیرانی سے مطابقت رکھتا ہے'۔

مصنف نسخۂ عرشی کے اختلافِ نسخ کو صحیح طور پر حل نہ کر سکے اور حمیدیہ اور قا کی عدم موجودگی میں صحیح نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ ق میں مصرع ہے۔

وصل ہر رنگ تپشِ کسوتِ رسوائی ہے

اور قا میں ہے: وصل ہر رنگ جنوں کسوتِ رسوائی ہے

یعنی مخطوطے کا مصرع ق کی بجائے قا سے نزدیک تر ہے لیکن مطابق نہیں۔

ایسی معترضانہ تحقیق میں ثانوی ماخذ پر بھروسہ کرنا اسی قسم کی گمراہیوں کا موجب ہوتا ہے چاہیے تھا کہ خ کے اختلافاتِ نسخ کی بحث میں ق، قا اور گلِ رعنا کے متون سے مقابلہ کرتے لیکن وہ سب سے پہلے نسخۂ عرشی کے گنجینۂ معنی کے متن کو پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ حیاتِ غالب کے کلام کی کوئی معینہ منزل نہیں۔ اس میں دیے ہوئے اشعار میں ہر مقام پر یہ واضح نہیں کہ یہ ق کا متن ہے یا قا کا یا گلِ رعنا کا۔ دیباچۂ نسخۂ عرشی میں ص ۸۴ پر یہ اطلاع ہے کہ گنجینۂ معنی کا اکثر متن نسخۂ شیرانی کے مطابق کر دیا گیا ہے لیکن متعدد

جگہوں پر ایسا نہیں ہو سکا کیونکہ شیرانی کی تفصیلات دیر سے ملی تھیں۔ اس طرح اصل نسخے دیکھے بغیر پوری تشفی نہیں ہوئی کہ گنجینۂ معنی میں کس مصرع کا متن کس نسخے کا ہے۔ خوش قسمتی سے ۱۹۶۹ء میں نسخۂ شیرانی اور ۱۹۷۰ء میں گل رعنا (مرتبہ مالک رام) چھپ گیا اور یہ تمام نسخے قریب کی جموں یونیورسٹی میں مہیا تھے۔ ان سے مقابلہ کیے بغیر 'تحقیق جائزہ' کو آخری شکل نہ دینی چاہیے تھی۔ اب تو جناب مصنف پر وہی اعتراض صادق آتا ہے جو انھوں نے نثار احمد فاروقی پر کیا تھا کہ "انھوں نے حمیدیہ اور شیرانی کا صرف نام سنا ہے"۔

مخطوطے کے جعلی ہونے کی جو دلیلیں مصنف نے درج کی ہیں ان کا خلاصہ شاید یوں کیا جا سکے۔

(۱) اس میں سیکڑوں صورتوں میں نسخۂ بھوپال سے اگلی منزل نسخۂ شیرانی کا متن ہے۔ بعض مثالوں میں دیوانِ غالب طبعِ اوّل، لطیف ایڈیشن نسخۂ مالک رام اور نسخۂ عرشی کا متن نقل کر دیا گیا ہے۔

(۲) الف اور عین کے عکسوں میں کئی جگہ فرق ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عین میں یا دونوں عکسوں میں تحریف ہوئی ہے۔ اگر ان کے مرتب تحریف کر کے عکس شائع کر سکتے ہیں تو پورا مخطوطہ بھی بنوا سکتے ہیں۔

(۳) اس میں املا ہر جگہ یکساں نہیں نیز غالب کے املے کی خلاف ورزی ہے

(۴) اس میں ایسے اغلاطِ کتابت ہیں، جو غالب نہیں کر سکتے تھے۔

(۵) مخطوطے کے نو دریافت اشعار اور متعدد اشعار کی قدیم ترقرأتیں (مصنف کی اصلاح میں اصلاحِ معکوس) ایسی مہمل، بھونڈی یا غیر موزوں ہیں کہ وہ غالب سے ممکن نہیں۔

جستہ جستہ کچھ اور اعتراضات بھی ہیں جن پر حسبِ موقع غور کیا جائے گا۔ پہلے اعتراضات نمبر ا کو دیکھیے۔

اس کتاب کی اشاعت سے قبل بھی ہمیں چند مثالیں معلوم تھیں کہ غالب نے

بعد کے نسخے میں ایک متن میں ترمیم کی لیکن اس سے بھی بعد کی منزل میں پھر سب سے پہلے متن پر رجوع کر گئے مثلاً

خ ق قا گلِ رعنا

(۱) یہ رہنِ شرم ہے یا وصفِ شوخی اہتمام اس کا با وصفِ شہرت باوصفِ شوخی باوصفِ شہرت۔

(۲) یہ حلقۂ خمِ گیسو ہے راستی آموز ... صبا کھلتی ہے گیسوئے گیسو ہے گیسوئے

اگر خ کو غیر معتبر بھی قرار دے دیا جائے تو بھی بعد کے تین نسخے یقیناً معتبر ہیں۔ ان سے غالب کا ایک رجحان، 'مزاج کا تلوّن' ثابت ہو جاتا ہے۔ اب اگر اس قسم کی اور بہت سی مثالیں بھی مل جائیں تو ان کی وجہ سے مخطوطے کو جعلی قرار نہیں دیا جائے گا۔ مصنّف نے شاید سو سے بھی زیادہ ایسی مثالیں تلاش کی ہیں۔ جہاں خ کا متن قے کی بجائے قا کے مطابق ہے اور ان کی وجہ سے وہ خ کو قطعی طور پر قا کے بعد کا بلکہ مصنوعی قرار دیتے ہیں جسے تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

ایک نکتہ یہ بھی مدِّ نظر رہنا چاہیے کہ نسخۂ بھوپال میں اغلاطِ کتابت تھے مفتی انوارالحق نے اسے بڑی بد احتیاطی سے ترتیب دیا جس سے متعدد اغلاطِ قرأت بھی اضافہ ہوگئے۔ عرشی صاحب نے دو دن کے مختصر قیام بھوپال میں نسخۂ حمیدیہ کا اصل نسخے سے مقابلہ کیا جو ظاہر ہے کہ بہت سرسری ہی ہو سکتا ہے۔

حمید احمد خاں نے بھی ایسا کیا لیکن انھوں نے اپنا وقت غزلوں کی صحیح ترتیب نوٹ کرنے پر صرف کیا متون کا مقابلہ نہیں کیا۔ اس لیے نسخۂ حمیدیہ کے دونوں ایڈیشنوں اور نسخۂ عرشی کے باوجود اس کے صحیح متن کے بارے میں ہر جگہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا۔ کمال صاحب خود اسی بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ مفتی انوارالحق، ڈاکٹر عبداللطیف، شیخ محمد اکرام (مرتب ارمغانِ غالب) اور مولانا عرشی کی عرق ریزی کے باوجود "کئی مقامات پر نسخۂ بھوپال کی کتابت کی غلطیاں باقی رہ گئی ہیں" (ص ۳۲۹)

مصنّف نے خ کے ق سے اختلاف اور قا سے مطابقت کی جو متعدد مثالیں

دی ہیں ان میں سے بہت سی صریحاً ق کے سہوِ کتابت یا سہوِ قرأت کی وجہ سے ہیں مثلاً

جائزہ کا صفحہ	خ کا متن	حمیدیہ	شیرانی
۲۰	خرامِ نازِ برقِ حاصلِ سعیِ پسند آیا	پسند	سپند
۲۴	داغِ بہرِ ضبطِ بے جا ستی سعیِ سپند	پسند	سپند
۳۰۰	جنبشِ تارِ قلم جوشِ پرافشانی مجھے	پریشانی	پرافشانی
۳۰۶	ناخنِ انگشتِ خوباں نعلِ لرزوں ہے مجھے	لعل	نعل
۳۱۹	مال و جاہ و دست و پا بے زر خریدہ ہیں اسد پائے زر خریدہ	پابے زر خریدہ	

معنی پر نظر کی جائے تو صاف ظاہر ہے کہ ق میں سہوِ کتابت تھا یا پھر نسخۂ حمیدیہ میں سہوِ قرأت یا سہوِ طباعت نے ستم ڈھایا۔ اب ایک صحیح نسخے سے یہ توقع کیوں کی جائے کہ وہ بعد کے نسخے کے اغلاط کی عکاسی کرے۔ ایسے موقعوں پر خ کی ق سے مطابقت بالکل فطری ہے۔ مصنّف کی تلاش کردہ مثالوں میں بڑی تعداد اسی قسم کی ہے۔ ان کے علاوہ جو مثالیں ہیں انھیں غالب کے تلونِ ذہنی پر محمول کرنا ہوگا کیونکہ خ سے قطعِ نظر بھی وہ اس رجحان کی غمازی کرتے ہیں۔

حاشیۂ ق کے اشعار۔ مصنّف نے چند ایسے اشعار کی نشان دہی کی ہے جو نسخۂ بھوپال کے حاشیے پر درج ہیں لیکن خ کے متن میں ہیں حاشیۂ ق کے اشعار ۱۲۳۷ھ کے بعد کی تصنیف قرار دیے جاتے ہیں۔ خ میں ان کا ہونا بڑا معنی خیز ہے ان پر فرداً فرداً غور کیا جاتا ہے۔

جائزہ ص ۲۵

تکلف عافیت میں ہے دلا بندِ قبا وا کر
نفس ہا بعدِ وصلِ دوست تاوانِ گسستن ہا

یہ شعر بہ تبدیلیِ ردیف دو غزلوں میں آتا ہے۔ مصنّف کا خیال ہے کہ یہ ق میں 'کا' کی ردیف والی غزل کے حاشیے پر ہے لیکن 'ہا' کی ردیف والی غزل میں نہیں۔

حمید احمد خاں نے بالخصوص غزلوں کی ترتیب اور حاشیے کے اندراجات کا مطالعہ کیا اس لئے اشعار رد
غزلیات کے محل کتابت کے بارے میں ان کی رائے کو نسخۂ عرشی پر ترجیح دی جائے گی لیکن اس شعر کے بارے
میں حمید احمد خاں اور مولانا عرشی دونوں متفق ہیں کہ یہ "ق" کے متن میں "ہا"، کی ردیف میں موجود ہے۔ دیکھئے
نسخۂ حمیدیہ مرتبہ حمید احمد خاں ص ۳۸ اور نسخۂ عرشی ص ۵۰۴۔ اس سے پیشتر شعر کا نوٹ۔ جب
مندرجۂ بالا شعر حاشیۂ "ق"، کے علاوہ متنِ "ق"، میں بھی موجود ہے تو اعتراض ختم ہو جاتا ہے۔

جائزہ ص ۳۴

اسدؔ ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سروپا ہیں
کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو پشتِ خار اپنا

نسخۂ عرشی ص ۳۰۴ کالم ا میں لکھا ہے کہ یہ شعر حاشیۂ "ق"، کا ہے لیکن حمیدیہ اور لطیف ایڈیشن
میں اس کا اظہار نہیں کیا گیا۔ کمال صاحب لکھتے ہیں کہ ان دونوں ایڈیشنوں میں "درج نہ ہونے کی وجہ سے
مخطوطے" کا بلیو پرنٹ بنانے والوں نے ٹھوکر کھائی" اور اسے متنِ خ میں لکھ دیا۔

ٹھوکر عرشی صاحب نے اور کمال صاحب نے کھائی۔ حمید احمد خاں نے اپنے نسخۂ حمیدیہ کے ص ۲۸ پر
واضح کر دیا ہے کہ نہ صرف ایک شعر بلکہ اس غزل کے پورے سات شعر ق کے متن میں بھی ہیں اور کسی غلط فہمی
کے سبب دوبارہ حاشیے پر بھی درج کر دیے گئے ہیں۔

جائزہ ص ۳۹

گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیمِ ضبط
شعلہ خس میں، مثلِ خوں در رگ، نہاں ہو جائے گا

نسخۂ عرشی اختلافِ نسخ ص ۲۸۴ پر اسے واقعی حاشیۂ ق کا قرار دیا ہے جس سے کمال صاحب نے
خ پر اعتراض جڑ دیا۔ لیکن حمید احمد خاں کے نسخۂ حمیدیہ کے مطابق (ص ۷) اس غزل کے صرف تین شعر
حاشیے پر درج ہیں اور مندرجہ بالا شعر ان میں سے نہیں۔ حمید احمد خاں کا بیان نسخۂ عرشی پر مرجح ہے۔

جائزہ ص ۳۹

نہ لائی شوخیِ اندیشہ تابِ رنجِ نومیدی
کفِ افسوس سودن عہدِ تجدیدِ تمنا ہے

نسخۂ عرشی کے مطابق یہ شعر حاشیۂ ق کا ہے جس کی وجہ سے کمال صاحب خ میں اس کے شمول پر کھٹکتے ہیں لیکن حمید احمد خاں نے صراحت کر دی ہے کہ یہ شعر متن کی غزل میں موجود ہے ساتھ ہی کسی نے حاشیے پر دوبارہ لکھ دیا ہے۔ (نسخۂ حمیدیہ، لاہور ایڈیشن ص ۲۴۰، ۲۴۱)

جائزہ ۳۶۴

ذوقِ سرشار سے بے پردہ ہے طوفاں میرا
موجِ خمیازہ ہے ہر زخم نمایاں میرا

نسخۂ حمیدیہ کے دونوں ایڈیشنوں اور نسخۂ عرشی میں صراحت ہے کہ یہ شعر حاشیۂ ق کا ہے۔ صرف لطیف ایڈیشن میں یہ بات ظاہر ہونے سے رہ گئی تھی۔ اس سے مصنف نے یہ نتیجہ نکالا کہ مخطوطہ سازوں نے لطیف ایڈیشن میں اطلاع کے نہ ہونے سے دھوکا کھایا۔ سوال یہ ہے کہ انھوں نے لطیف ایڈیشن پر کیوں تکیہ کیا۔ حمیدیہ اور نسخۂ عرشی سے ان کی غلط فہمی کیوں دور نہ ہوئی۔

مصنف کو جاننا چاہیے کہ لطیف ایڈیشن کبھی شائع نہیں ہوا بلکہ پورا چھپا بھی نہیں۔ اس کا ایک حصہ عرشی صاحب کو ملا کیا کسی دوسرے کی دسترس میں بالکل نہیں۔ اگر معاذ اللہ عرشی صاحب یا عرشی زادہ نے یہ جعلی نسخہ تیار کیا ہو تو وہ اتنے ناواقف نہ تھے کہ اس شعر کے حاشیۂ ق پر اندراج سے واقف نہ ہوں۔

حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ غالب نے یہ شعر غزل کے دوران ہی تصنیف کیا۔ ق کے متن میں شامل نہیں کیا یا شامل ہونے سے رہ گیا۔ بعد میں فیصلہ کیا گیا کہ اسے شامل کرنا چاہیے اس لئے حاشیۂ ق پر اضافہ کر دیا گیا۔ نسخۂ عرشی زادہ مقدمہ ص ۳۰ پر اطلاع دی گئی ہے کہ غالب نہ صرف شعروں کے متن میں بلکہ شعروں اور غزلوں کو برقرار رکھنے نہ رکھنے کے بارے میں بھی بار بار اپنی رائے بدلا کرتے تھے۔

مصنف نے مخطوطے کے بعض مصرعوں کو جن دوسرے مصادر سے ماخوذ کیا ہے وہ یہ ہیں۔

(جائزہ ص ۳۶۵)

عیش بے تابی خرام کلفتِ افسردگی
ورنہ دنداں در دل افشردن بنائے خندہ ہے

خ میں خرام ہے جب کہ بعد کے نسخوں میں حرام الف کی نستعلیق قرأت میں بھی حرام درج ہے، لیکن دیوانِ غالب طبع اوّل میں اس کے اصلاحی مصرع میں "خرام" چھپ گیا تھا: کلفتِ افسردگی کو

عیشِ بے تابی خرام۔ یہ سہوِ کتابت ہے۔ مصنف نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مخطوطہ تیار کرنے والوں نے یہ مصرع دیوان کی طبعِ اوّل سے لیا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ 'حرام' صحیح اور 'خرام' غلط ہے۔ اب دیوان کی طبعِ اوّل اتنی شاذ ہے کہ ملک میں دو ایک نسخے ہی ہوں گے۔ کمال صاحب کا مبیّنہ جعل ساز ایک طرف تو ایسا محقّق تھا کہ مشہور نسخوں کو چھوڑ کر کن کن غریب نسخوں کی چھان بین کرتا تھا۔ دوسری طرف ایسا بے بصر تھا کہ یہ بھی نہ دیکھ سکتا تھا کہ یہاں 'خرام' کا موقع نہیں 'حرام' کا مقام ہے۔ مخطوطے میں خرام کی ح سے خاصہ اُوپر جو نقطہ لگا ہے وہ یا تو سہوِ کتابت ہے یا ان متعدد فاضل نقطوں اور دھبّوں میں سے ہے جو اس نسخے میں جا بجا موجود ہیں۔

جائزہ ص ۳۸۹

دیکھ اے اسدؔ بدیدۂ باطن کہ ظاہرا
ہر ایک ذرہ غیرتِ صد آفتاب ہے

ارشادِ مصنف ہے کہ مصرعِ ثانی جگر کے مصرع :

ع جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے

سے ماخوذ کیا گیا ہے۔ اس اتہام کا جواب ممکن نہیں۔ گویا جگر سے پہلے اشعار میں ذرہ اور آفتاب کا تلازمہ یا ذرہ کا آفتاب بننا نہ باندھا جاتا تھا۔

جائزہ ص ۱۴۹

جوں اعتمادنامہ و خط کا ہو مہر خط سے
یوں عاشقوں میں ہے سببِ اختیار داغ

ظاہر ہے کہ پہلے مصرع میں دوسرا 'خط' محض سہوِ قلم کا حشو ہے لیکن مصنف کو بدگمانی ہے کہ نسخۂ عرشی کے مصرع 'جوں اعتمادنامہ و خط کا ہو مہر سے' میں پنسل سے مہر سے مہر کے بعد خط کا لفظ بڑھایا گیا تھا کہ اصلاحِ معکوس سے مصرع

ع جوں اعتمادنامہ و خط کا ہو مہرِ خط ، حاصل ہو جائے لیکن جعل ساز 'سے' کاٹنا بھول گیا اور ناقل نے وہی نقل کر دیا۔

معلوم نہیں نسخۂ عرشی اور پنسل کی تخصیص کیوں کی گئی۔ یہ شعر حمیدیہ اور شیرانی میں بھی موجود ہے اور 'جاعل' کی دسترس میں یہ ایڈیشن بھی رہے ہوں گے۔ پھر پنسل ہی سے کیوں، روشنائی سے اضافہ

کیوں نہیں کیا گیا۔ دراصل مخطوطے میں ایک سیدھا سادہ تسامحِ قلم ہے جس کی توجیہ کے لئے دُور دراز کا افسانہ تراش دیا ہے۔

حاشیۂ رخ کے اضافے۔ مخطوطے کے حاشیے پر جو غزلیں اضافہ ہیں انھیں عام طور سے بخطِ غیر مانا جاتا ہے۔ املے کی بہت سی غلطیوں کے باوجود کمال صاحب انھیں کاتبِ متن کے قلم سے منسوب کرنے پر مصر ہیں۔

حاشیے پر متن کی ایک غزل دہرادی گئی ہے لیکن نظرِ ثانی کے بعد۔ اگر کاتبِ متن و کاتبِ حاشیہ ایک شخص ہوتا تو وہ اس غزل کو حاشیے پر دوبارہ کیوں لکھ دیتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ حاشیے پر لکھنے والے نے یہ توجہ ہی نہیں کی کہ یہ غزل پہلے سے متن میں موجود ہے۔ حاشیے کے لئے یہ غزل اس نے متن سے نہیں لی بلکہ کہیں اور سے لی ہے۔ تبھی تو دونوں میں اختلافِ نسخ ہیں۔ متن میں شعر ہے:

خوش اوفتادگی کہ بہ صحرائے انتظار
جوں جادہ گردِ رہ سے نگہ سرمہ سا کر دل

حاشیے میں مصرعِ اُولیٰ میں "صحرائے آشکار" لکھا ہے اور اس پر اعتراض ہے۔ (ص ۱۷۶) ظاہر ہے کہ کاتبِ حاشیہ نے کہیں اور صحرائے انتظار لکھا دیکھا لیکن کم سوادی کی وجہ سے اسے "آشکار" پڑھ لیا۔ شکستہ لکھتے وقت الف پر مد لگانا ضروری نہیں ہوتا۔ انتظار اور آشکار دونوں میں تین نقطے ہیں اور درمیانی ظ اور درمیانی ک کی قرأت میں التباس کی کافی گنجائش ہے۔ سہوِ قرأت نے سہوِ کتابت کو جنم دیا۔

(جائزہ ص ۱۷۸)

حاشیۂ رخ پر بعض غزلیں حاشیۂ ق اور آخرِ ق کی بھی درج ہیں۔ مصنف کو اعتراض ہے کہ اتنے بعد کے زمانے کی غزلیں رخ پر کیسے لکھی گئیں اور حاشیۂ رخ پر ان کا متن حاشیۂ ق اور آخرِ ق کے متن سے کیوں مختلف ہے۔ جواب یہ ہے کہ حاشیۂ رخ پر اندراجات کے لئے زمانے کی کوئی قید نہیں۔ کاتبِ حاشیۂ رخ نے ان غزلوں کو براہِ راست حاشیۂ ق و آخرِ ق سے نہیں لیا بلکہ کسی اور ماخذ سے جو مؤخر الذکر دونوں ماخذ سے فرسودہ تر روایت کا ترجمان تھا۔

اعتراض ہے کہ حاشیے اور آخر کی چند غزلیں رخ پر بڑھائی گئیں تو سب کیوں نہیں بڑھائی گئیں۔

یہ ضروری نہ تھا۔ کاتبِ حاشیۂ خ کو یا تو سب ملی نہیں یا اس نے صرف انھیں کو نقل کرنا پسند کیا۔

جائزہ ص ۱۷۹

ع غنچۂ ناشگفتہ کو دُور سے مت دکھا کہ یوں

اس غزل کے چھ شعر متنِ ق میں موجود ہیں اور چار شعر حاشیۂ ق پر اضافہ ہیں۔ تا ہم دس کے دس شعر متن میں موجود ہیں۔ حاشیۂ خ پر متن ق والے چھ شعر درج ہیں لیکن حاشیۂ خ والے چار غیر حاضر ہیں۔ ان کے فقدان پر مصنّف کو اعتراض ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ اس غزل کے چھ شعر ایک بار کہے گئے اور متنِ ق اور حاشیۂ خ پر جگہ پا گئے۔ بقیہ چار شعر بعد میں کہے گئے، حاشیۂ ق میں لکھے گئے حاشیۂ خ میں نہیں لکھے گئے یعنی حاشیۂ خ پر اس غزل کے اشعار کا اندراج حاشیۂ ق کے چار شعری اضافے سے پہلے کا ہے۔

جائزہ ص ۱۸۱

اعتراض ہے کہ حاشیۂ خ پر آخر ق کی غزل ع چاہئے خوباں کو جتنا چاہیے۔ کے دو شعر کیوں حذف کر دیے گئے۔ وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ حاشیۂ خ بیشتر کی منزل ہے جیسا کہ اس کے فرسودہ تر متن سے ظاہر ہے۔ اس وقت تک دونوں محذوف شعر تصنیف نہ کئے گئے ہوں گے۔ بعد میں اضافہ ہوئے ہوں گے۔

جائزہ ص ۲۱۰

عمدۂ منتخبہ کی تاریخ تکمیل ۱۲۲۴ھ ہے لیکن اس میں بعد میں بھی اضافے ہوتے رہے۔ قاضی عبدالودود نے اس قسم کے چند حوالے دیئے ہیں۔

۱۔ پیر بخش سرور کے ترجمے میں لکھا ہے کہ وہ ذکا کی طرح حسنِ اتفاق سے ۲۳ جلوسِ اکبری ثانی میں دلّی آئے۔ اکبر ثانی کا جلوس ۱۲۲۱ھ میں ہوا۔ ۲۳ جلوس ۱۲۴۳ھ سے قبل نہیں ہو سکتا۔

۲۔ پنج آہنگ کے ایک خط بنام شیفتہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تپاں نے کلکتہ میں غالب کو اپنا کلام تذکرۂ سرور میں شمول کے لئے دیا۔ غالب نے دلّی جا کر سرور کو دے دیا لیکن کسی وجہ سے وہ شامل نہ

۱؎ اشتر و سوزن از قاضی عبدالودود ۱۹۶۳ء ص ۱۶-۱۷

ہو سکا۔ غالب ۱۸۲۹ء کے اخیر میں دلی پہنچے[1]

۱۳۔ ذوق نے معروف کی تسبیح زمرد کی تاریخ کہی جس سے ۱۲۳۶ھ نکلتا ہے اور یہ تذکرے میں موجود ہے[2]

۱۴۔ غالب کی آخر ق کی بعض غزلیں عمدہ منتخبہ میں ہیں جن سے عرشی زادہ نے بجا نتیجہ نکالا ہے کہ عمدہ میں ان کا اندراج کتابت متن ق یعنی ۱۲۳۷ھ کے بعد ہوا ہوگا۔ اور عمدۂ منتخبہ میں ایک شعر کی گل رعنا سے فرسودہ تر روایت کی بنا پر انھوں نے دوسری حد ۱۲۴۴ھ مقرر کی۔ کمال صاحب کو اصرار ہے کہ عمدہ میں ۱۲۴۴ھ کے بعد کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ لکھتے ہیں:

"۱۲۱۲ھ میرزا کی ولادت کا سال ہے۔ شاعری کا آغاز ۱۲۲۱ھ۔ ۱۲۲۳ھ اور بیدلی رنگ کا غلبہ ۱۲۲۴ھ سے پہلے ہی ختم ہو جاتا ہے کیونکہ عمدۂ منتخبہ میں ایسی غزلیں موجود ہیں:

ع عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

اور ع کب سنتے ہے وہ کہانی میری"

کتنا افسوسناک بیان ہے کہ آخرِ ق کی غزلوں کو غالب کی ۱۲ سال کی عمر اور متن ق کی کتابت سے ۱۳ سال قبل سے منسوب کر دیا۔ قاضی صاحب نے صحیح کہا ہے کہ کیا صاحبِ عمدہ بارہ سال کے لڑکے لئے لکھتا "درخاطر متمکن غم ہائے عشقِ مجاز"۔

جائزہ ص ۲۱۲

حاشیہ رخ میں بعض غزلیں ایسی ہیں جو ق میں نہیں ہیں لیکن متن ق میں ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ۱۲۳۷ء اور ۱۲۴۳ھ کے حاشیۂ رخ پر لکھی گئیں۔ رخ میں ان کا متن ق سے کسی قدر مختلف ہے جس کے معنی رخ میں قدیم تر متن ہے۔ مصنف دو سوال کرتے ہیں کہ حاشیۂ رخ پر اختلافِ نسخ کیوں؟ کیا اس کے کاتب کی رسائی غالب کی کسی ذاتی بیاض تک تھی۔ اگر اسے ۱۲۴۲ھ کے آس پاس تک کا کلام مہیا تھا تو

[1] اشتر و سوزن از قاضی عبدالودود ۱۹۶۴ء ص ۱۹، ۱۷

[2] " " " " " "

اس نے ق کا پورا کلام خ میں کیوں درج نہیں کیا۔

وجوہ دو ہو سکتی ہیں۔ خ کتابت متن کے بعد غالب سے جدا ہو گیا۔ پھر معلوم نہیں کہ کس کے پاس رہا۔ کاتب حاشیہ کو یا تو بعد کا سارا کلام نہیں ملا یا اس نے اپنی پسند کے مطابق چند غزلوں کو اضافہ کیا۔ اس وقت تک غالب کا کلام شائع تو ہو ہی گیا تھا۔ کیا ضروری ہے کہ وہ کاتب حاشیہ تک پورے کا پورا پہنچ جائے۔ ہاں اکا دکا غزلیں پہنچ سکتی ہیں۔

جائزہ ص ۲۱۳

ع مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے

یہ غزل حاشیۂ خ پر درج ہے۔ اعتراض ہے کہ مطلع اور دوسرے تین شعر کیوں غائب ہیں۔

جموں یونیورسٹی میں نسخۂ عرشی زادہ کا جو نسخہ ہے اس میں مرتب نے اپنے قلم سے مقدمہ اور حواشی میں بہت سے مفید اضافے کئے ہیں۔ انھیں میں ایک جگہ اطلاع دیتے ہیں کہ ذیل کے تین شعر جلد بندی میں کٹ گئے تھے۔

۱ مطلع ۲ کرتا ہوں جمع . . . مژگاں کئے ہوئے۔ ۳ پھر وضع . . . گریباں کئے ہوئے

الف یا عین کو دیکھنے سے حاشیہ کٹ جانے کی بات واضح ہو جاتی ہے۔ جہاں تک چوتھے شعر:

پھر گرم نالہ ہائے شرر بار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیر چراغاں کئے ہوئے

کا تعلق ہے یہ آخر ق میں نہیں بلکہ پہلی بار ق میں ظاہر ہوتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حاشیۂ خ پر اس غزل کا اضافہ متن ق اور متن قا کی کتابت کے درمیان ہوا۔

بیاض غالب نقوش ایڈیشن اور نسخۂ عرشی زادہ کے اختلافات:

ہمیں زیادہ اہم اور دلچسپ وہ تقابلی مطالعہ ہے جو جناب کمال احمد صدیقی نے الف اور عین کے جزئیاتی اختلافات کا کیا ہے۔ ان اختلافات کی کھوج ان کا کارنامہ ہے۔ انھوں نے ایک خیال کو بار بار دہرایا ہے۔

" خیال ہے کہ عین کے لئے آفسیٹ نگیٹیو براہ راست مخطوطے سے اور الف کے لئے اس مائکرو فلم کے پرنٹ سے بنے ہوں گے جو پاکستان بھیجا گیا تھا۔" (ص ۲۲)

مائکروفلم کا ذکر وہ جائزہ، میں بار بار کرتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا انھیں یہ کہاں سے معلوم ہوا۔ «نقوش» بابت جولائی ۱۹۷۰ء میں بیاضِ غالب کی دریافت اور «نقوش» میں اشاعت سے متعلق بہت سی خبروں کو ڈائجسٹ کیا گیا ہے۔ ان میں سے کئی میں بتایا گیا ہے کہ مدیرِ «نقوش» نے مخطوطے کی فوٹوسٹیٹ کاپی حاصل کی تھی:

« وہ کہتے ہیں کہ میں نے اس ہنگامہ بازی سے بہت پہلے بھوپالی بزرگ سے بات کرلی تھی اور مخطوطہ کی فوٹوسٹیٹ کاپی حاصل کرلی تھی[1]»

« ادارۂ نقوش » کے محمد طفیل صاحب نے اپنے ذاتی ذرائع استعمال کئے اور کسی طور اس نسخے کی فوٹوسٹیٹ کاپی ہندوستان سے حاصل کرکے شائع کر دیا[2]»

« محمد طفیل کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اس کی فوٹوسٹیٹ کاپی حاصل کی[3]»

ایک زمانے میں مجھے مُ.ح کے ایک عکس کے مطالعے کا موقع ملا تھا جو غالباً اسی ماخذ سے تیار کیا گیا تھا جس سے نقوش والا فوٹوسٹیٹ۔ میں نے اس عکس (جسے میں آئندہ صفحات میں، اصل عکس کہوں گا) اور الف اور عین کے عکسوں کے باریک سے باریک اختلافات کا مطالعہ کرکے نوٹ لے لئے تھے جن کی مدد سے مصنف کے اعتراضات کا جائزہ لیتا ہوں۔

مصنف نے الف کے صفحات کا حوالہ دینے میں ورق فلاں الف اور ورق فلاں ب لکھا ہے جب کہ نقوش میں مقدمہ اور تستعلیق قرأت کی وجہ سے صفحات کا نمبر بالکل مختلف ہے اور مصنف کے دیئے حوالے سے تلاش کرنا دشوار ہے۔ میں نے چھان بین کرکے ہر مقام پر الف میں مطبوعہ نمبر صفحہ کا پتہ چلایا اور بقیہ مضمون میں اسی سے حوالہ دوں گا۔ الف اور عین کے ہر اختلاف میں مصنف نے صرف عین کو الزام دیا ہے۔ اگر الف میں ایک مصرع یا غزل قلم زدہ ہے اور عین میں نہیں تو نتیجہ اخذ کیا کہ عین میں قلم زدہ ہے تو طے کیا گیا کہ عین بعد میں خطِ تنسیخ کھینچا گیا ہے۔ اصل عکس کے مقابلے سے معلوم ہوا کہ بعض

[1] اخباری کالم۔ لاہور نامہ از انتظار حسین نقوش، جولائی ۷۰ء ص ۳۱

[2] دیوانِ غالب کا نسخۂ لاہور، ایک تشریح، از اعجاز حسین بٹالوی نقوش۔ جولائی ۷۰ء ص ۳۳

[3] اخباری کالم، لاہور نامہ۔ مشرق ۹ دسمبر ۱۹۶۹ء بحوالۂ نقوش جولائی ۷۰ء ص ۳۶

اوقات عین درست ہے اور الف غلط۔

اب ایک اور فرق کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

(جائزہ ص ۲۲)

اعتراض ہے کہ الف ص ۴۵ پر مصرع ہے۔

ع اسد ہر جا سخن نے طرحِ باغِ تازہ ڈالی ہے

لیکن عین ص ۴ پر اسی مصرع کے "اسد" کا الف غائب ہے اور محض "سد" چھپا ہے۔ ایسا کیوں؟
مجھے اس اعتراض پر بڑی حیرت ہے کیونکہ میرے سامنے عین کا جو نسخہ ہے اس میں صاف صاف "اسد" چھپا ہے۔ کیا کمال صاحب کے نسخے میں "اسد" کا الف چھیل دیا گیا ہے۔

(جائزہ ص ۲۶)

اعتراض کا خلاصہ اپنے الفاظ میں درج کرتا ہوں۔ الف میں ص ۵۶ پر ایک جگہ اور ص ۶۰ پر دو جگہ صحیح کے وہ نشان (✓) ہیں جنھیں انگریزی میں ٹک مارک کہتے ہیں۔ لیکن یہ عین کے مقابل ص ۵ اور ص ۷ پر نہیں چونکہ غالب نے کبھی اس طرح کے انگریزی نشان نہیں لگائے اس لیے مخطوطہ جعلی ہے۔
اعتراض باوزن ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ نشانات مخطوطے میں بھی موجود رہے ہوں گے۔ چونکہ الف کے علاوہ اصل عکس میں بھی پائے جاتے ہیں۔ عین میں غالباً انھیں ہٹوا دیا گیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ غالب کے زمانے میں اُردو میں ان کا رواج نہ تھا۔ ہوسکتا ہے کہ مخطوطہ غالب سے جدا ہونے کے بہت بعد کسی نے انھیں لگا دیا ہو۔ الف ص ۶۰ کے نشانات تو مریحاً متن سے مختلف قسم کے ہیں۔ لیکن ص ۵۶ کے نشان کے بارے میں کمال صاحب کا دعویٰ ہے کہ یہ متن ہی کے قلم سے ہے ممکن ہے ان کی بات صحیح ہو لیکن اس نشان کے بیچ سوئی کے نوک کے برابر ایک باریک سفید نقطہ ہے معلوم نہیں کہ یہ کرم خوردگی کا سوراخ تو نہیں؟ اصل مخطوطے کو دیکھ کر ہی کوئی فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔ بہرحال فی الحال ص ۵۶ کا نشان شک ضرور پیدا کرتا ہے۔

(جائزہ ص ۳۲)

ع گرفتارانِ اُلفت بے زباں ہیں کاش صیادے

اس مصرع میں عین ص ۹ پر صیادے لکھا ہے جب کہ الف ص ۴۶ پر "صیاد سے"، عین میں مصرع پر خطِ تنسیخ کھینچا ہے جب کہ الف میں غائب ہے عین پر تحریف کا الزام رکھا گیا ہے۔

اصل عکس میں 'صیاد' یوں لکھا ہے کہ 'ے' میں ک کے دندانوں کی جگہ دو گہرے رنگ کے نقطے ہیں جیسے کسی نے شروع میں 'ے' لکھا ہو اور بعد میں اسے 'ے' بنا دیا ہو۔ اصل عکس میں یہ مصرع ہلکے سے خط سے قلم زد ہے۔ یہ خط مصرع کے ابتدائی اور آخری حصے کو قلم زد کرتا ہے۔ بیچ میں غائب ہے۔ الف میں غالباً رگی وجہ کرا کے محو کر دیا گیا ہے اور عین میں شاید اس کے دونوں سرے ملا کر اور گہرا خط کھینچ دیا گیا ہے۔

اصل عکس سے مزید معلوم ہوا کہ نقوش میں حاشیے کا اصلاحی مصرع: ع اسیرِ بے زبانی ہوں مگر صیاد بے پروا۔ کاتب نے لکھایا ہوا ہے۔ 'پر' کے تین نقطوں کا انداز اور مقام ممتاز ہے۔ عین میں مصرع جس طرح لکھا ہے وہ اصل کی صحیح نمائندگی کرتا ہے۔

اسی صفحے پر آخری سے پہلا مصرع ہے:

ع ہوا ہے نقشبندِ آئینہ سنگِ مزار اپنا

عین میں 'ہے' بالکل صاف ہے جب کہ الف میں 'ہے' کا لکن نہیں جس سے کمال صاحب نے اسے 'ہوا ہے' پڑھا اور عین کو تحریف کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ حقیقت یہ ہے کہ اصل میں بھی 'ہے' عین کی طرح صاف صاف لکھا ہے۔ نقوش میں طباعت کے وقت 'ہے' کا لکن حذف ہو گیا۔ یہاں بھی نقوش ہی ناقص ہے۔

جائزہ ۴۴

عین ص ۱۲ کے نیچے ترک کے طور پر 'ہوا' لکھا ہے۔ لیکن الف ص ۷ پر موجود نہیں جس سے کمال صاحب نے نتیجہ نکالا کہ مرتب عین نے مرزا کی وفات کے سو برس بعد میرزا کے قلم سے کم از کم ایک لفظ تو لکھوا ہی لیا۔

واقعہ یہ ہے کہ اصل عکس میں بھی ترک کا لفظ 'ہوا' موجود ہے۔ نقوش میں حذف ہو گیا ہے۔

جائزہ ۴۷

الف ص ۹۲ اور عین ص ۲۳ پر مصرع ہے:

ع نقشِ پائے خضر، یہاں[1] سدِ سکندر ہو گیا

[1] یہاں، کا تلفظ 'یہاں' ہے لیکن کاتب نے 'یہاں' لکھا ہے۔

اعتراض ہے کہ الف میں 'یہاں' پر روشنائی کا دھبہ پڑا ہے جب کہ عین میں نسبتاً صاف ہے۔ میری رائے میں یہ الف کے فوٹو کا بھونڈا پن ہے کیونکہ اصل عکس میں بھی روشنائی کا نشان عین جیسا ہے یعنی دونوں 'ہ' کا شکن نمایاں ہے۔ الف کے عکس کسی ماہر فوٹوگرافر نے نہیں بنائے۔

اسی صفحہ پر ایک مصرع ہے، ع پیمانہ ہوا ہے مشتِ غبارِ صحرا۔ نقوش میں صحرا کے 'ا' پر روشنائی گری ہے جب کہ عین میں نہیں۔ عین میں صاف 'ری ٹچ' کرایا گیا ہے۔ میں نے اپنے کسی مضمون میں عین میں "ری ٹچنگ" کی دو ایک مثالیں دی تھیں۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اکبر علی خاں نے اپنی کسی تحریر میں یا مجھے کسی خط میں لکھا تھا کہ انھوں نے نسخے میں بعض مقامات سے روشنائی کے دھبے ہٹوا دیے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ اصل عکس میں صحرا کا روشنائی کا دھبہ الف سے کسی قدر مختلف ہے۔ اصل عکس میں صحرا صاف پڑھا جاتا ہے لیکن الف میں نہیں۔

(جائزہ ص ۹۹)

الف ص ۱۰۲، اور عین میں ص ۲۸ پر مصرع ہے:

ع برقِ خرمن ہائے گوہر ہے نگاہِ تیز یہاں[1]

الف اور اصل عکس میں پہلے 'وہیں' تھا جس کے اوپر 'یہاں' لکھا ہے اور جس کے نقوش بادی النظر میں واضح نہیں۔ عین میں کوئی کاٹ چھانٹ نہیں۔ صاف 'یہاں' لکھا ہے۔ مصنف کو اعتراض ہے:

"یہ بات کسی شک و شبہ کے شائبے کے بغیر ثابت ہے کہ ۱۹۶۹ء میں 'یہاں' اس مصرع میں بخطِ غالب لکھا گیا ہے جس نے ۱۹۶۹ء میں اس مصرع میں یہاں لکھا ہے اسی نے ۱۹۶۹ء میں یا ایک آدھ برس پہلے 'مخطوطہ' بخطِ غالب لکھا ہے۔"

میں اس سے متفق نہیں کہ 'یہاں' لکھوایا گیا ہے۔ کٹے ہوئے نقوش کی فالتو لکیریں ہٹا دینے سے 'یہاں' اُبھر آئے گا۔ یہاں بھی صرف 'ری ٹچ' کیا گیا ہے۔ یہ مسلّم ہے کہ مرتبِ عین کو اس کا حق نہ تھا۔

اسی صفحے پر ایک مصرع ہے:

[1] 'یہاں' کا تلفظ 'یہاں' ہے لیکن کاتب نے 'یہاں' لکھا ہے۔

ع اے عدوئے مصلحت چندے بہ ضبط افسردہ رہ

الف میں مصلحت کی ت پر روشنائی کا بڑا سا دھبہ ہے عین میں نہیں جس سے معترض جائزہ عین پر شبہ کرتے ہیں۔ اصل عکس میں بھی مصلحت بالکل صاف ہے جس سے معلوم ہوا کہ نقوش ہی میں پھوہڑپن سے روشنائی گرائی گئی ہے۔

جائزہ ص۱۴۷

الف ص ۱۳۴، عین ص ۴۴ پر قلم زد مصرع ہے :

ع پتنگ سمجھے ہے طرزِ فسانہ خوانیِ شمع

الف میں پتنگ پر روشنائی کا دھبہ مختصر ہے جیسے پانی یا سوختہ سے ہلکا کیا گیا ہو۔ عین میں بڑا مثلث نما ہے۔ کمال صاحب یہاں بھی عین پر حرف گیر ہیں۔ اصل دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اس میں بھی روشنائی کا دھبہ بالکل عین جیسا ہے۔ اس کے معنی اسے صاف کرنے کی کوشش الف میں کی گئی ہے۔

جائزہ ص۱۷۰

الف میں ۱۵۰ میں متن کے مصرع :

غیروں سے اے گرم سخن دیکھ کے اس کو

پر خطِ تنسیخ کھینچا ہے۔ عین ص ۵۲ سے غائب ہے چونکہ اصل عکس میں یہ خطِ تنسیخ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عین میں اسے "ری ٹچ" کر کے غائب کیا گیا ہے۔

حاشیے کا اصلاحی مصرع : ع غیروں سے اے گرم سخن دیکھ کے غالب، دونوں نسخوں کے عکس میں مختلف زاویوں سے چھپا ہے۔ عین میں اصل عکس کے مطابق ہے۔ نقوش میں جگہ کی قلت کی وجہ اسے فوٹو سے علیحدہ کاٹ کر دوبارہ نزدیک تر بٹھایا گیا ہے جو نقل مطابق اصل نہیں۔

جائزہ ص۲۲۷

عین ص ۴۵ میں :

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں

کے آگے ایک کھڑی لکیر ہے جب کہ نقوش ص ۱۵۴ پر یہاں سے غائب ہے۔ کمال صاحب کے شبہ کے

برعکس یہ لکیر الف میں بنائی گئی ہے کیونکہ اصل عکس میں موجود ہے۔ اس لکیر کا مقابل کے صفحے کے لفظ "خود آرا" کو کاٹنے والی لکیر سے کوئی تعلق نہیں۔ کمال صاحب نے خواہ مخواہ ان کا تعلق فرض کر کے شکوک کھڑے کئے ہیں۔

جائزہ ص ۲۴۹

الف ص ۱۰۷ اور عین ص ۶۵ پر دو غزلیں کٹی ہوئی ہیں لیکن عین میں خط تنسیخ دونوں غزلوں میں صاف اور گہرا ہے جب کہ الف میں پہلی غزل میں یہ ٹوٹا ہوا اور دوسری غزل میں صرف اوپری حصے میں ہے۔ بقیہ اشعار میں تقریباً معدوم ہے۔ اصل عکس میں خطوطِ تنسیخ الف سے کسی قدر نمایاں تر لیکن عین کے مقابلے میں بہت کم ہیں۔ معلوم ہوتا ہے عین میں ان خطوطِ تنسیخ پر خصوصاً دوسری غزل کے خط پر قلم پھیر کر انھیں نمایاں کیا گیا۔

جائزہ ص ۲۷۳

عین ص ۴۷ پر حاشیے میں الفاظ "مجمر بزم فسردن" لکھے ہیں جب کہ الف ص ۱۹۴ کے حاشیے میں نہیں۔ چونکہ کمال صاحب عین سے زیادہ بدگمان ہیں اس لئے انھیں شبہ ہوا کہ عین میں بعد میں لکھائے گئے ہیں۔ اصل عکس سے مقابلے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بھی موجود ہیں لیکن عین کی نسبت کافی دھندلے۔ نقوش میں فوٹو سے بالکل ہی حذف ہو گئے۔

جائزہ ص ۱۵ ام

نقوش ص ۲۱۸، اور عین ص ۸۶ پر مصرع ہے:

اے حسن مگر حسرتِ پیماں شکنی ہے

نقوش میں "حسرے" جیسا لکھا ہے لیکن عین میں صاف "حسرت" ہے۔ عین پر تحریف کا الزام رکھا گیا جو صحیح معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اصل عکس میں بھی نقوش جیسا لکھا ہے۔ عین میں صاف کیا گیا ہے۔ چونکہ یہاں حسرت کا موقع نہیں اس لئے اعتراض ہے کہ یہ مصرع غالب کے قلم سے نہیں ہو سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ کاتب نے "ے" نہیں لکھی۔ اصل عکس میں "ت" کی افقی کشش آخر تک نمایاں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ نقطے کسی طرح پونچھے گئے اور ترچھے خط کی شکل نمایاں اختیار کر گئے۔

اسی صفحے پر مصرع ہے "جائے کہ اسد رنگِ چمن باختنی ہے"۔ یہ اصلاحی قرأت ہے۔ "جائے کہ"

سے بیشتر کی قلم زاد قرأت بقولِ مرتب الف 'ہرجا کہ' اور بقول مرتب عین 'ہرچند' تھی۔ عین کا قیاس صحیح معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے مصنف کا کہنا ہے کہ الف میں 'ہر' پورا لکھا ہے جب کہ عین میں بہت چھوٹا ہے۔ یعنی اس کی 'ر' نیچے سے چھیل دی گئی ہے۔ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اصل عکس الف کے مطابق ہے۔ عین میں 'ر' کا نچلا حصہ کسی طرح محو ہو گیا۔

جائزہ ص۳۲۶

الف ص ۲۲۴ پر مصرع ہے:

لبِ قدح پہ کفِ بادہ جوشِ تشنہ لبی ہے

کمال صاحب کا کہنا ہے کہ عین ص ۸۹ پر اس مصرع میں 'پہ' کی جگہ 'بہ' ہے جس کا کوئی موقع نہیں اور جسے غالب نہیں لکھ سکتے۔ ان کی رائے میں الف میں 'بہ' کو 'پہ' بنا کر تحریف کی گئی ہے۔

کمال صاحب عجلت میں الزام عائد کر دیتے ہیں۔ اصل عکس میں بھی الف کی طرح 'پہ' ہے۔ صرف یہ ہے کہ 'پہ' کا تیسرا یعنی سب سے نیچے کا نقطہ بہت خفیف ہے۔ عین کے فوٹو میں رہ گیا اور بداحتیاطی سے فوٹوؤں میں ایسا ہو ہی جاتا ہے۔ عین میں اس لفظ پر دو نقطے ہیں یعنی 'یہ' لکھا ہے 'بہ' نہیں۔

جائزہ ص۳۵۲

الف ص ۲۴۲، اور عین ص ۹۸ کے حاشیے پر شعر ہے:

آتش افروزیِ یک شعلۂ ایماں تجھ سے
چشمک آرائیِ یک شہرِ چراغاں مجھ سے

مصنف کا یہ کہنا صحیح ہے کہ دونوں نسخوں میں شعر کا رخ ایک دوسرے کے برعکس ہے۔ میں نے بھی اپنے مضامین میں اس عجیب صورتِ حال کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اصل عکس سے معلوم ہوا کہ عین میں شعر صحیح چھپا ہے الف میں اس کو دوبارہ سیٹ کیا اور الٹا سیٹ کر دیا۔

لیکن دونوں نسخوں میں قافیہ 'چراغاں' درج ہے معلوم نہیں کمال صاحب کس بے خیالی میں اسے 'خموشاں' پڑھ گئے اور اعتراض کر بیٹھے کہ یہ 'چراغاں' کا موقع ہے۔ 'خموشاں' کا نہیں۔

ہوا یہ کہ الف کی نستعلیق قرأت میں سہواً "خوشاں" چھپ گیا ہے۔ نقوش بابت جولائی ۱۹۷۰ء میں بیاضِ غالب کی تصحیح درج کی گئی ہے اور وہاں ص ۲۹ پر اشارہ کر دیا ہے کہ خوشاں کو جراغاں بنالیا جائے۔

جائزہ ص ۳۲۶

نقوش ص ۲۵۲، اور عین ص ۱۰۳ پر پہلا مصرع ہے۔

ع دو جہاں وسعت بقدرِ فضائے خندہ ہے

اعتراض ہے کہ نقوش میں "دو جہاں وسعت" پر بہت روشنائی گری ہے جب کہ عین میں بالکل صاف ہے۔ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ عین میں تحریف ہوئی۔ اصل عکس میں صورت یہ ہے کہ "دو جہاں وسعت" لکھا گیا ہے لیکن ہاتھ یا کپڑا وغیرہ لگنے سے گیلا ہی پنچھ گیا ہے جس سے روشنائی کسی قدر پھیل گئی۔ اس سے بڑا نقصان نہیں ہوا۔ ہر حرف کا خط اور کشش نمایاں ہے۔ عین میں اس معمولی سی پھیلی ہوئی روشنائی کو "ری ٹچ" کر کے صاف کر دیا گیا ہے۔ الف میں کسی اناڑی فوٹو گرافر نے نہ معلوم کس طرح روشنائی کو پھیلا کر ایسا چوپٹ کر دیا ہے کہ لفظ پڑھے ہی نہیں جا سکتے۔ عین اصل کی بہتر ترجمانی کر رہا ہے بہ نسبت الف کے۔

جائزہ ص ۳۷۴

عین ص ۱۰۶ کے حاشیے پر ذیل کا شعر ہے:

اے پرتوِ خورشید جہاں تاب ادھر بھی
سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

لیکن الف ص ۲۰۶ پر نہیں۔ لطف یہ ہے کہ نستعلیق کتابت میں ص ۳۵۷ پر دیا ہے۔ حقیقت وہی ہے جو عین میں ہے کہ پہلا مصرع پورا موجود ہے۔ دوسرا مصرع جلد بندی میں کٹ گیا ہے۔ اصل عکس میں پہلے مصرع کے صرف دو چار نقطے آ گئے ہیں جب کہ الف میں وہ بھی نہیں۔

دونوں نسخوں کے ایک فرق کی میں نشاندہی کرتا ہوں جو مصنف نے نہیں کی۔ الف ص ۲۶۲ پر بہت سے لفظ پھیلے ہوئے ہیں اصل عکس میں اس سے کم ہیں جب کہ عین ص ۱۰۹ پر پورا صفحہ صاف ستھرا ہے۔ دو خاص فرق یہ ہیں۔

ع نغمہ ہا وابستۂ یک عقدۂ تارِ نفس

اصل عکس اور الف دونوں میں ایسا لگتا ہے کہ نفس کے س کے نیچے ایک یا دو نقطے لگا گئے تھے جنھیں کاٹا گیا ہے۔ عین میں صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام کو چھیلا گیا ہے۔ صفحے کے آخری دو مصرعے ہیں:

ع نوحۂ ماتم بہ آوازِ پرِ عنقا کرے

ع ہو تنورستاں طلسم حلقۂ گرداب ہا

پہلے مصرع میں 'ماتم بہ' اور دوسرے مصرع میں 'طلسم' اصل عکس میں کسی قدر مٹے ہوئے ہیں۔ الف میں اتنے مٹے ہیں کہ بآسانی نظر نہیں پڑھے جا سکتے۔ عین میں بالکل صاف ہیں۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ وہاں صاف کیے گئے ہیں۔

تکلف برطرف ذوقِ زلیخا جمع کر ورنہ

الف میں 'زلیخا جمع' پر روشنائی پھیلی ہوئی ہے جب کہ عین میں صاف ہے۔ اصل عکس میں حقیقت دونوں ایڈیشنوں کے بین بین ہے یعنی 'زلیخا جمع' کی روشنائی برائے نام پھیلی ہوئی ہے جس کی وجہ سے 'خا جمع' کے الفاظ زیادہ جلی (موٹے) لکھے ہوئے ہیں۔ عین میں انھیں رِی ٹچ کرکے قدرے صاف کر دیا ہے اور الف میں پھوہڑ پن سے روشنائی قدرے اور پھیلا دی ہے۔

جائزہ مثال

عین ص ۱۱۹ پر غزل؛ ع "تماشائے جہاں مفتِ نظر ہے" قلم زد ہے جب کہ الف ص[۲۸۴] پر نہیں۔ اصل عکس میں دیکھنے سے معلوم ہوا کہ بہت ہلکے سے خط سے قلم زد ہے۔ عین میں یہ خط زیادہ گہرا ہے۔ الف میں معلوم نہیں کس طرح یہ خط بالکل محو ہو گیا ہے۔ معلوم نہیں رخ سے کئی منزل دور ہونے کی وجہ سے ہلکا خط فوٹو میں اوجھل ہو گیا ہے یا مٹایا گیا ہے۔

مصنف نے بار بار گرفت کی ہے کہ مخطوطے کا املا غالب کے مقرر کردہ املے سے مختلف ہے یا مخطوطے میں ایک لفظ کو دو جگہ مختلف انداز سے لکھا ہے اور ان کی بنا پر وہ مخطوطے کو وضعی قرار دیتے ہیں لیکن وہ یہ نظر انداز کر گئے ہیں کہ غالب نے املے کے اصول بہت بعد میں متعین کیے تھے۔ عمر کی جس ابتدائی منزل میں یہ مخطوط لکھا گیا اس میں وہ یکسانی متوقع نہیں۔ پھر مجھے یہ بھی اصرار ہے کہ ہر شخص ہر موقع

ہر ایک لفظ کو ایک ہی طریقے سے نہیں لکھتا۔ میں کیجئے، چاہئے کو کبھی ہمزہ سے، کیجئے، چاہئے، کبھی یے سے کیجیے، چاہیے لکھتا ہوں۔ کبھی حرج تو کبھی ہرج، کبھی قطعہ کا، کبھی قطعے کا، لکھتا ہوں۔ شاید ابتدائے عمر میں غالب میں بھی یہ عدم استحکام ہو۔ پھر جنابِ مصنف نے سہو قلم کے لئے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی ہلکی سے ہلکی لغزشِ قلم کو بھی کاتب کی کم علمی کی دلیل قرار دیا ہے۔ میں نے اپنے ایک مضمون[1] کے مسودے کی قلمی لغزشوں کی فہرست مرتب کی تو آنکھیں کھل گئیں۔

جہاں تک اضافت کے لگانے یا نہ لگانے کا تعلق ہے اس میں دونوں امکانوں کی اجازت ہے اور یہ بخوبی ممکن ہے کہ مصنف یا کاتب ایک ہی تحریر میں کہیں اضافت لگائے کہیں نہ لگائے۔ لیکن کمال احمد صدیقی صاحب نے ہائے مختفی پر ختم ہونے والے الفاظ پر بھی اضافت کی صورت میں بڑے التزام سے ہمزہ کا مطالبہ کیا ہے۔ ی پر ختم ہونے والے کسی لفظ میں اگر شاعر نے اضافت باندھی ہے اور مخطوطے یا نسخۂ عرشی میں درج نہیں تو شعر کو بڑے بے دھڑک انداز میں غیر موزوں قرار دے دیا ہے۔ یہ آڈیٹروں کی سی خردہ گیری برائے خردہ گیری ہے۔ اضافت تو اضافت واؤ عطف کو لکھنے کے معاملے میں بھی قدیم مخطوطات میں التزام نہیں برتا جاتا۔

غالب ابتدا سے کامل نہ تھے (میری رائے میں آخر میں بھی کامل نہ تھے) لیکن مصنف نے جہاں کسی شعر میں کوئی لفظی یا معنوی سقم دیکھا تو حکم لگا دیا کہ یہ غالب سے ممکن نہ تھا۔ غالب خدا نہ تھے۔ ان کے متداول دیوان میں کئی جگہ اور ان کے مستند قدیم مجموعوں ق اور قا میں جگہ جگہ ہر قسم کے مبہم اور سقیم اشعار ملتے ہیں ان کو پیشِ نظر رکھا جائے تو خ کے اشعار کو ان کے معنوی سقم کی بنا پر غالب کی ردسے خارج نہ کیا جائے گا مصنف مخطوطے کے اشعار کو مہمل قرار دینے میں بہت فراخ دل ہیں۔ میں غالب کی تخلیقات میں صرف دو شعروں کے معنی میں الجھتا ہوں۔ پہلا خ میں نو دریافت ہے اور ایک قطعہ

[1] دیوانِ غالب کے مخطوطے کی بحث۔ مشمولہ کتاب بابت اپریل، مئی ۱۹۷۱ء موجودہ مضمون کے مسودے میں نہ جانے کس بے خیالی میں مَیں نے مشہور مصرع یوں لکھ دیا: ع
صید زدام جستہ ہے نزدیک پژمردن۔ مضمون کو صاف کرتے ہوئے تصحیح کی: ع
صید زدام جستہ ہے اس دام گاہ کا

کا جزو ہے :

کہ ہم بیضۂ طوطیِ ہند خائل
تہِ بالِ شمعِ حرم دیکھتے ہیں

دوسرا نسخۂ بھوپال اور نسخۂ شیرانی میں ہے :

اس عمل میں عیش کی لذت نہیں ملتی اسدؔ
زور نسبت مے سے رکھتا ہے نصارا کا نمک

میرا دعویٰ ہے کہ مندرجہ بالا پہلے شعر کے علاوہ مخطوطے کا ایک بھی شعر موجودہ قرأت میں یا قلم زد قرأت میں نہ مہمل ہے نہ غیر موزوں۔ مصنف تو دریافت اشعار پر بڑی شیر دلی کے ساتھ مہملیت کا لگا دیتے ہیں۔ اس طریقے سے غالبؔ کے متداول دیوان کے بھی آدھے حصے کو مہمل گردانا جاسکتا ہے۔ میں نے غالبؔ کے غیر متداول کلام کی شرح لکھی جو 'تفسیرِ غالب' کے نام سے شائع ہو گئی ہے۔ اس کے مطالب سے اختلاف ممکن ہے لیکن اسے دیکھنے سے مصنف کو اندازہ ہو جائے گا کہ مخطوطے کا کوئی شعر مہمل نہیں ہے۔ یہ خاطر نشیں رہے کہ غالبؔ کے دقیق کلام میں معنی کی اس صفائی کی توقع نہیں رکھنی چاہیے جو دوسروں کے یہاں عام ہے۔

بعض جگہ مصنف غالبؔ کی مخصوص کج فکری سے ناآشنا ہونے کی وجہ سے کسی ترکیب یا محاورے یا شعر کو بالکل غلط سمجھ بیٹھے ہیں۔ اس مضمون میں طوالت کے خوف سے میں عموماً مصنف کے اعتراضِ اہمال سے بحث نہیں کروں گا۔ ان مبینہ مہمل اشعار کے کوئی معنی میری شرح میں مل جائیں گے۔ ہاں جہاں مصنف کو کوئی بڑی غلط فہمی ہوئی ہے وہاں میں اشارہ کر دوں گا۔

مصنف کے تمام اعتراضات کا اگر ایک ایک کرکے جائزہ لیا جائے تو ڈر ہے کہ تقریباً اتنی ہی بڑی کتاب تیار ہو جائے۔ اس لیے میں خاص خاص اعتراض کو دیکھوں گا۔ ان میں ملے کے اعتراضات کو عام طور پر نہیں لیا جائے گا۔ نیچے کے بیان میں شروع میں "تحقیقی جائزہ" کا صفحہ درج ہے اور مخطوطے کے شعر یا مصرعے کے لیے اوپر نقوش کے صفحے کا اور اس کے نیچے نسخۂ عرشی زادہ کے صفحے کا نمبر درج کروں گا۔ اس کے بعد اپنے الفاظ میں مصنف کے اعتراض کا خلاصہ درج کروں گا۔ آخر میں ت (تبصرہ) لکھ کر میں اپنی رائے پیش کروں گا۔

ص ۱۰ : دیوانِ غالب مرتبۂ مالک رام اور نسخۂ عرشی نوائے سروش میں ذیل کے مصرعوں میں قافیہ

تقویٰ، عیسیٰ چھپا ہے۔

ع گر نفسِ جادۂ سر منزلِ تقویٰ نہ ہوا

ع ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی کے بقول عربی عروض کے قاعدے سے تسلی اور افعی کے ساتھ تقویٰ اور عیسیٰ کو الف سے پڑھ کر بھی قافیہ کیا جا سکتا ہے۔" میرزا یقیناً اس اصول سے واقف تھے لیکن ان کا دیوان مرتب کرنے والے بہت سے اہلِ علم حضرات اس سے ناواقف معلوم ہوتے ہیں۔ "تقویٰ لکھنا غلطی ہے۔

ت : عربی عروض (علمِ قافیہ) کا جو بھی قاعدہ ہو اردو میں افعی کا قافیہ تقویٰ اور عیسیٰ غلط ہے اور تقوی اور عیسی صحیح۔ اعتراض میں نسخۂ عرشی کے ص ۴۴۲ کا حوالہ دیا ہے ۴۴۱ ہونا چاہیے۔

ص ۲۳ : ع سرشک آگیں مژہ سے دست از جاں شستہ بر رو تھا۔ ۵۴/۴

شروع کے قلم زد الفاظ پڑھنا ممکن نہیں لیکن دونوں مرتبین نے یکساں الفاظ پڑھے۔ "مژگانِ غم آگیں دست ... یہ اتفاقِ قرأت شبہ پیدا کرتا ہے۔

ت : مرتب عین نے قیاساً پڑھے مرتب ملف نے ان کی بات دہرادی۔

ص ۴۲ : شرارِ فرصتے سرمایۂ چندیں چراغاں ہے

بقدرِ رنگ یہاں گردش میں ہے پیمانہ محفل کا ۷/۱۲

اوپر پہلے مصرع کا قلم زد متن دیا ہے جسے بعد میں بدل دیا گیا۔ قلم زد قرأت پر اعتراض ہے کہ یہاں فرصتے غلط ہے "فرصتِ" باضافت چاہیے۔ دوسرا اعتراض ہے کہ چندیں یعنی چنداں چراغاں جیسی ترتیب غالب نہ لکھتے۔

ت : "فرصتِ" بے معنی ہوتا۔ فرصتے بامعنی ہے۔ قلم زد شعر کے معنی یہ ہیں۔ زندگی کی ذرا سی فرصت کے شرارے دنیا میں اتنا چراغاں ہے۔ محفل میں جتنا رنگِ مے میسر ہے اسی کے بقدر پیمانہ گھوم رہا ہے۔ یعنی زندگی کے آنی و فانی ہونے کے باوجود دنیا میں اتنی رونق ہے۔

"چندیں" کسی معمولی فارسی لغت میں دیکھ لیجیے "اتنا" کے معنی دیتا ہے۔

ص ۴۵ : خطوطِ روئے قالیں نقش ہے پشتِ کبوتر کا ۔ ۴۲/۱۲

کیا غالب خطوط کے ساتھ واحد فعل "ہے" باندھتے!

ت : آپ نے مبتدا کی تعیین صحیح نہیں کی۔ مصرع کی نثر ہے :
پشتِ کبوتر کا نقش خطوطِ روئے قالیں (کی طرح) ہے۔

ص ۵۳ : الف ۸۲، اور چین ص ۱۸۰ پر ایک غزل سے پہلے ایک نشان عالب ہے جسے مرتب چین نے غالب کی دستخطی شکل قیاس کیا ہے۔ اس سے مصنف نے نتیجہ نکالا کہ اگر متنِ خ کی کتابت کے دوران شاعر نے غالب تخلص اختیار کر لیا تھا تو متن میں اسد تخلص کا التزام کیوں؟

ت : اعتراض بجا ہے۔ کون جانے اس نقش کے کیا معنی ہیں۔ کم از کم غالب کی کسی تحریر میں اس طرح کے دستخط دیکھنے میں نہیں آئے۔

ص ۵۵ : بوسۂ لب سے ملی طبع کو کیفیتِ خال۔ $\frac{۸۲}{۱۸}$
لب حشو ہے۔ کیونکہ بوسے کے معنی ہونٹوں کا بوسہ ہی ہوتے ہیں۔

ت : میرے لئے یہ اطلاع نئی ہے کہ بوسے کے مفہوم میں لب کی تخصیص ہے۔ لغت کے مطابق بوسہ کے معنی مطلق چومنا، پیار کے ہیں۔

ص ۶۶ : بوئے یوسف مجھے گلزار سے آتی تھی اسد $\frac{۹۰}{۲۲}$
دَے نے برباد کیا پیرہنستاں میرا

یہی شعر نسخۂ عرشی میں ص ۲۱ پر ہے۔ دَی یا دے یہاں بے معنی ہے سہو ہے۔ حیرت ہے کہ نسخۂ عرشی کے غلط نامے میں اسے صحیح کیوں نہیں کیا گیا۔ یہ دَے (اس جیسا، اس جیسے) ہونا چاہئے۔

ت : یہاں دے ہی ہے۔ دَے کے معنی دسویں شمسی مہینے کے علاوہ مجازاً خزاں کے بھی ہوتے ہیں۔ شعر کے معنی تفسیرِ غالب میں دیکھ لیجئے۔ مجوزہ لفظ دَوے، بالکل بے محل اور اجنبی ہے۔ الف کی نستعلیق کتابت میں ص ۹۱ پر 'پیرہنستاں' میں اضافت محض سہوِ کاتب ہے۔ ممکن ہے 'ہنستاں' کے ن کے نیچے زیر لگانا مقصود ہو۔ الف کا مرتب اتنا کم علم نہیں۔ مصنف نے خواہ مخواہ ایک داستان تلاش دی۔ بہرحال نقوش بابت جولائی ۱۹۷۰ء بیاضِ غالب کا صحت نامہ چھپا ہے اور وہاں اشارہ کر دیا ہے کہ 'پیرہنستاں' میں اضافت غلط لکھی گئی ہے۔

ص ۸۷ : نسخۂ حمیدیہ کی ترتیب طباعت کا سال ۱۳۴۷ھ (۱۹۲۸ء) ہے۔

ت : طباعت کا سال ۱۹۲۱ء ہے۔

ص ۴۷ تا ۴۸۔ مصنف کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے از خود دریافت کیا کہ دم چند رہا۔۔۔ والی غزل میر امانی اسد کی ہے جو تذکرہ ہمیشہ بہار میں اسد کے نام سے درج ہے چنانچہ اخبار آئینہ سری نگر کی ۳۰ اکتوبر ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں ان کی اس دریافت کی اطلاع دے دی گئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ڈاکٹر انصار اللہ نظر بھی اسی نتیجے پر پہنچے لیکن ان کی تحریر یکم نومبر ۱۹۷۰ء کے 'ہماری زبان' میں چھپی۔

ت: ڈاکٹر انصار اللہ نظر نے اس غزل کی دریافت کی اطلاع سب سے پہلے ۱۵ ستمبر ۱۹۷۰ء کے 'ہماری زبان' میں دی۔ بعد میں یکم نومبر ۱۹۷۰ء کے 'ہماری زبان' میں ایک مفصل مضمون کے ضمن میں وہی بات دہرائی گئی ہے چونکہ ڈاکٹر نظر نے پہلے اعلان کیا اس لیے غزل کی دریافت کا سہرا انھیں کے سر رہے گا۔ ویسے مجھے یہ ماننے میں کوئی تکلف نہیں کہ کمال صاحب نے انصار اللہ نظر سے الگ اپنے طور پر ہمیشہ بہار میں یہ غزل تلاش کی۔

لیکن 'ہماری زبان' بابت یکم نومبر ۱۹۷۰ء میں بیگم حمیدہ سلطان کا مراسلہ بھی دیکھنا چاہیے جس میں انھوں نے قاضی عبدالودود کی یہ رائے نقل کی ہے کہ گلشنِ ہمیشہ بہار کا مؤلف نہایت غیر محتاط ہے اور ایک شاعر کا کلام دوسرے کی طرف منسوب کرنا اس کے لیے معمولی بات ہے۔ چنانچہ اس نے سودا اور شاہ نصیر کے اشعار دوسروں کی طرف منسوب کیے۔ کیا ایسے تذکرے کو سند مانا جائے۔

ص ۷۹۔ مسعود حسن رضوی صاحب کے قول کے مطابق 'دمِ چند'، 'غمِ چند' والی غزل میں کسرۂ اضافت کی جگہ یائے تنکیر چاہیے۔ غالب ایسی غلطی نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے مخطوطہ غالب کے ہاتھ کا لکھا نہیں ہو سکتا۔

ت: اس سلسلے میں یکم نومبر ۱۹۷۰ء کے 'ہماری زبان' میں ڈاکٹر انصار اللہ نظر کا یہ بیان بھی پیشِ نظر رکھا جائے کہ میر علی اوسط رشک کے دیوان میں اس زمین میں دو غزلے ہے اور قافیے ہیں 'صنمِ چند'، 'دمِ چند' وغیرہ ہیں۔ "میر رشک صاحبِ علم شخص تھے اور کم از کم اردو میں ان کی حیثیت مسلم الثبوت کی ہے۔ انھوں نے دمے چند، غمے چند نہیں لکھا۔"

واضح ہو کہ رشک ایک فارسی لغت کے مرتب بھی ہیں۔

دمِ چند والی غزل سے قطع نظر مصنف نے پوری کتاب میں درجنوں جگہ یہ اصول بنا لیا ہے کہ

جہاں مضاف الیہ حرفِ جار کا فقرہ ہو وہاں یائے تنکیر ہی صحیح ہے، اضافت غلط۔ چنانچہ انھوں نے کتاب کے حسب ذیل صفحات پر اس قسم کی ترکیبوں پر اعتراض کیا ہے۔

۲۹ صید زدام جستہ ہے اس دام گاہ کا

۱۳۸ رنگِ زنظر رفتہ حنائے کفِ افسوس

۲۲۴ برقِ بجانِ حوصلہ آتش فگن اسدؔ

۲۳۵ تنِ بہ بندِ ہوس در نہ دادہ رکھتے ہیں
دلِ زکارِ جہاں اوفتادہ رکھتے ہیں

۲۴۹ گُل از شاخ دور افتادہ ہے نزدیک پژمُردن

۳۰۲ دیکھتے ہیں چشمِ از خوابِ عدم نکشادہ ہے

۳۵۶ گریہ سرشاریِ شوق بہ بیاباں زدہ ہے

۳۸۳ یک درِ روئے رحمت بستہ دورِ شش جہت

۴۰۸ نظر دانہ سرشکِ بزمیں افتادہ آتا ہے

مصنّف کے نزدیک ان سب مثالوں میں کسرۂ اضافت ایسی فاحش غلطی ہے کہ غالب ہرگز نہ کر سکتے تھے۔ ان کے نزدیک سب میں یائے تنکیر چاہئے۔ مجھے تسلیم ہے کہ یائے تنکیر بھی صحیح ہوگی، لیکن کسرۂ اضافت بھی کسی طرح غلط نہیں۔ ان سب ترکیبوں میں اضافتِ توصیفی ہے۔ یہ فقرے مضاف مضاف الیہ کی بجائے موصوف وصفت ہیں۔ ان توصیفی فقروں کی جگہ اگر ایک لفظی ہم معنی صفت لانا غلط نہیں تو فقروی صفت کیوں غلط ہوگی۔ اگر گلِ شکستہ (یا گلِ پژمُردہ) چشمِ خوابیدہ اور سرشکِ افتادہ میں کوئی قباحت نہیں تو گلِ از شاخ دور افتادہ، چشمِ از خوابِ عدم نکشادہ، سرشکِ بزمیں افتادہ میں کیا بُرائی ہے۔

ع دیکھتے ہیں چشمے از خوابِ عدم نکشادہ ہے، میں چشمے کی یے گرتی ہے اور عربی فارسی الفاظ کی یے گرانا جائز نہیں۔ اس لئے اس مصرع میں یائے تنکیر نہیں آسکتی۔ 'یک درے' میں یک اور یائے تنکیر دونوں کا میل نہیں ہو سکتا۔ 'درے' کے معنی ہیں 'ایک در' یا کوئی در۔ اس کے ساتھ مزید 'یک' کا اضافہ نہیں ہو سکتا۔ اگر شاعر نے چشمِ از خوابِ عدم نکشادہ 'یک درِ بر روئے رحمت

بستہ، جیسی ترکیبیں استعمال کی ہیں تو مندرجہ بالا مصرعوں کی ترکیبیں بھی اسی کے حسبِ منشا آئی ہوں گی۔ کسرۂ اضافت کی یہ ترکیبیں ان مستند مخطوطوں اور ایڈیشنوں میں ملتی ہیں جو غالب کی نظر سے گزر چکے ہیں نیز بیسویں صدی کے ان ایڈیشنوں میں بھی ملتی ہیں جنھیں مالک رام اور عرشی صاحب جیسے عالم مرتب کر چکے ہیں۔ غالب کے متداول دیوان کو حسرت موہانی اور نظامی بدایونی جیسے عالموں نے مرتب کیا اور اس کی نہ معلوم کن کن جید علما نے شرح لکھی اور سب نے 'صیدِ زدامِ جستہ' جیسی ترکیب کو کسرۂ اضافت کے ساتھ قبول کر لیا۔ لیکن حیرت ہے کہ مصنف ص ۸۴ پر مخطوطے کے اس مصرع پر اعتراض کرتے ہیں۔

ع اسد کے واسطے رنگِ بروئے کار ہو پیدا۔ کہتے ہیں کہ یہاں رنگ بروئے کار ہونا چاہئے۔ یا تے نکیر کی غلطی غالب نہ کر سکتے تھے۔

سمجھ میں نہیں آتا مصنف یہاں اپنی پیش کردہ نظیروں سے انحراف کیوں کر گئے۔ روئے کار یا رو کار ایک لفظ ہے، ریشم یا کسی دوسرے کپڑے کے سیدھے رُخ کو کہتے ہیں۔ اس لئے یہاں نہ مضاف مضاف الیہ کا رشتہ ہے نہ موصوف صفت کا۔ اگر 'بر' نہ ہوتا تب 'رنگِ روئے کار' ہو سکتا تھا۔ اب 'رنگے بر روئے کار' ہے یعنی روئے کار پر رنگ۔

ص ۸۵ ہے اسد بیگانہ کو افسردگی کو بے کسی
دل زگرمی تپاکِ اہلِ دنیا بھی گیا $\frac{96}{25}$

مصرع اوّل جیسا مصرع میرزا کا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ دو حدد 'کو' سخت تنافر پیدا کرتے ہیں۔
ت: مصرع میں 'کو' اردو کا حرفِ جار نہیں فارسی کا استفہامیہ ہے بمعنی کہاں۔ مصرع یوں پڑھئے ع اسد بیگانہ، کو افسردگی؟ کو بیکسی؟ معنی ہیں اسد بے گانہ، بے نیاز اور رواقی ہے کہاں کی افسردگی اور کیسی بیکسی۔ غالب نے اس 'کو' کا استعمال دوسری جگہوں پر بھی کیا ہے مثلاً نسخۂ عرشی ص ۶:

کو تیزیِ رفتار؟ کہ صحرا سے زمیں کو جوں قمریِ بسمل، تپش آہنگ نکالوں

ص ۹۰ سحر گر باغ میں وہ حیرتِ گلزار ہو پیدا
اڑے رنگِ گل اور آئینۂ دیوار ہو پیدا $\frac{99}{26}$

نسخۂ عرشی میں سحر گہ ہے۔ شعر پر دو اعتراض ہیں۔ اوّل تو یہ کہ ح، ق، فا، نسخۂ عرشی سب میں قافیہ دیوار غلط ہے کیونکہ اس کے ساتھ شعر مہمل ہے۔ صحیح لفظ 'دبوار' (با کے ساتھ) ہونا چاہئے۔

دیوار یا دیور مغربی ہوا کو کہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ 'دیوار' قافیہ تسلیم کرنے کے معنی 'حیرتِ گلزار' سے معشوق مراد لیا جائے گا۔ 'در باغ' ہیں صبح کے وقت معشوق کے پیدا ہونے کی تمنا نہایت لغو ہے۔ نومولود کبھی معشوق نہیں ہو سکتا۔"

ت: مصنف کے نزدیک پیدا ہونے کے معنی محض ولادت کے ہیں لیکن اس لفظ کے ایک دوسرے معنی ظاہر ہونا بھی ہیں۔ آئینۂ دیوار، اس آئینے کو کہتے ہیں جو دیوار پر نصب ہو۔ شعر کے معنی تفسیرِ غالب میں دیکھ لیجئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس شعر کی شرح کرتے وقت میں نے الف یا عین کو دیکھے بغیر لکھا ہے کہ "پہلے مصرع میں گہ کی ضرورت تھی، ممکن ہے 'گہ' دراصل 'گر' رہا ہو۔"

دیوار ایسا اجنبی لفظ ہے کہ اردو ادب میں کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔

ص ۹۵۔ ہے عرق افشاں مشی سے ادہمِ مشکینِ یار
وقتِ شب اخترشمر ہے چشمِ بیدارِ رکاب

شعر کے معنی پر اعتراض کرتے ہوئے کہا ہے کہ پیدل چلنے سے یار کی زلفیں کیوں عرق افشاں ہیں۔

ت: ادہم کے معنی مشکی گھوڑا ہے معلوم نہیں مصنف نے زلفیں کیوں کر سمجھ لیں۔ محبوبِ حقیقی کا سیاہ گھوڑا رات بھر چلتا رہتا ہے۔ اس کے پسینے کی بوندیں تارے ہیں جنھیں رکاب کی چشمِ بیدار رات بھر گنتی رہتی ہے۔

ص ۹۷ دودِ شمعِ کشتہ تھا شاید خطِ رخسارِ دوست $\frac{102}{28}$

متداول دیوان میں اس کا پہلا مصرع ہے ع آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست
عرشی صاحب نے اختلافِ نسخ میں اس مصرع کے سلسلے میں یہ بھی تحریر فرمایا ہے۔

"اس غزل میں صرف یہی ایک مصرع نسخۂ بھوپال کا باقی رہ گیا ہے"

اگر ان سے سہو نہیں ہوا تو دوسرا مصرع ع دودِ شمعِ کشتہ تھا شاید خطِ رخسارِ دوست، نسخۂ بھوپال کا نہیں یعنی ۱۲۳۷ھ کے بعد کا ہے۔ پھر رخ میں کیوں کر آیا۔

ت: نسخۂ عرشی کا نوٹ بہت واضح نہیں۔ نسخۂ حمیدیہ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ مندرجہ بالا نوٹ ع 'دودِ شمعِ کشتہ ۔۔۔ دوست' کے بارے میں ہے کیونکہ متداول دیوان میں نسخۂ بھوپال کی اس غزل کا یہی مصرع باقی رہ گیا ہے۔

ص ۱۱۸ اے اسد ہے ہنوز دہلی دور $\frac{۱۶۱}{۳۵}$

نسخۂ بھوپال میں محاورے کے مطابق 'دلی' ہے، یہاں 'دہلی' کیوں۔ یہ غالب کی تحریر نہیں ہو سکتی۔

ت: واقعی کہاوت میں دلی ہی ہے اور مصرع میں دہلی حیران کن ہے لیکن غالب عمر کے ہر دَور میں دلی کے علاوہ دہلی بھی لکھتے تھے۔ ق میں شعر ہے:

دہلی کے رہنے والو اسد کو ستاؤ مت بے چارہ چند روز کا یہاں مہمان ہے

قا میں دہلی کو بدل کر دلی کیا۔ اور آپ کی کتاب جائزہ میں صفحہ ۵ پر جو فارسی خط کا عکس ہے اس میں بھی چوتھی سطر میں "و در نہاد مردم دہلی نیست" لکھا ہے۔ مرقع غالب مرتبہ پرتو ی چندر میں آخری خط پر غالب کے قلم سے دہلی ۲۱ رجون ۱۸۶۸ء درج ہے نیز نواب کلب علی خاں کے نام ۲۲ رشعبان ۱۲۸۲ھ کا مشہور خط ہے جس میں رام پور سے دہلی لوٹتے وقت اپنے مراد آباد میں بیمار پڑنے کا ذکر ہے۔ اس خط میں ایک فارسی شعر میں دہلی باندھا ہے:

از رام پور زندہ بہ دہلی رسیدہ ست مارا بدیں گیاہِ ضعیف ایں گماں نبود

ص ۱۳۸ ع اے اسد گل تختۂ مشق شگفتہا ہو گئے $\frac{۱۳۰}{۴۲}$

مصرع ساقط الوزن ہے۔ میرزا یا کیا کسی کا مصرع ناموزوں نہیں لکھ سکتے تھے۔

ت: یہ زبردستی کا اعتراض ہے۔ پہلی قرأت تھی ع اے اسد گل تختۂ مشق شگفتن ہا ہوئے بعد میں اسے 'شگفتن ہو گئے' بنا دیا۔ صاف دکھائی دیتا ہے کہ 'ہوئے' کی ے کو گئے بنا دیا ہے۔ الف کی تصریحات میں اشارہ ہے لیکن وہاں ہوئے کو سہواً 'ہوائے' چھاپ دیا ہے۔

ص ۱۳۸ کرتا ہے بیادِ بُتِ رنگیں دلِ مایوس
رنگِ ز نظر رفتہ خنائے کفِ افسوس $\frac{۱۳۰}{۴۲}$

پہلا اعتراض ہے کہ 'رنگے' ہونا چاہیے۔ پھر کہا ہے کہ میرزا لکھتے تو یوں لکھتے:

ع رنگ از نظرِ رفتہ خنائے کفِ افسوس

ت: رنگِ ز نظر رفتہ سے معنی بہت چست ہیں۔ لیکن نظرِ رفتہ سے تعقید ہو جائے گی۔ معنی ہیں "وہ رنگینیاں جو ماضی میں صحبتِ بُتِ رنگیں میں تھیں اب یاد کے کفِ افسوس

ملتے وقت خاکی کا یعنی حافظے کی رونق کا کام دے رہی ہیں۔

ص ۱۳۹ حیرت سے رخِ دوست کی ہیں از بس بیکار ۱۳۲/۴۲

کہا گیا ہے کہ یہ 'از بسکہ' ہیں 'بیکار' کی تحزیب ہے۔ لیکن لغزشِ قلم میں لفظ چھوٹ سکتا ہے ادل بدل نہیں ہو سکتا۔

ت: لغزشِ قلم کی بات بجا ہے لیکن فارسی داں غور کریں کہ اصلاً مصرع 'از بس بیکار' تو نہیں تھا؛ 'از بس' کے معنی ہیں 'بہت'، کیا اسے اضافت کے ساتھ لایا جا سکتا ہے۔ اگر لایا جا سکتا ہے تو وزن اور معنی دونوں محفوظ رہ جائیں گے۔ لیکن ظاہراً اس اضافتِ مقلوب کی اجازت نہیں۔

ص ۱۴۳ کرے ہے لطفِ اندازِ برہنہ گوئی خوباں

زور بالیدنِ مضمونِ سطرِ شعلہ یاد، آتش ۱۳۴/۴۴

اعتراض ہے کہ مخطوطے میں مفہوم 'ستر' کا ہے لیکن املا سطر لکھا ہے۔ دوسرے یہ کہ مخطوطے نیز نسخۂ عرشی وغیرہ میں برہنہ گوئی غلط معلوم ہوتا ہے۔ صحیح 'برہنہ پائی' ہو گا۔

ت: برہنہ گوئی فارسی محاورہ ہے جس کے معنی ہیں، کھری کھری باتیں سنانا۔ شعر میں سطر ہی مراد ہے ستر نہیں۔ مصنف 'برہنہ' کا لفظ دیکھ 'ستر' سمجھ بیٹھے۔ معنی ہیں 'آتش مضمونِ سطرِ شعلہ کو بالیدہ کرتے وقت خوبوں کے اندازِ برہنہ گوئی کی یاد کرتی ہے':

ص ۱۴۴ اسد قدرت سے حیدر کی پڑی ہر گبر و ترسا کے

شرارِ سنگ بُت سے در بنائے اعتقاد آتش حوالہ ایضاً

اعتراض ہے کہ 'ہر' کی جگہ 'ہے' ہونا چاہئے۔ ق کا مصرع مصنف نے یوں لکھا ہے:

ع شرارِ سنگِ بُت ہے در بنائے اعتقاد آتش

ت: 'ہر' کی جگہ 'ہے' کیوں ہونا چاہئے، یہ اعتراض میری سمجھ میں نہیں آیا۔ ق کے مصرعِ ثانی میں 'بُت' کے بعد 'ہی' ہے یعنی:

ق شرارِ سنگِ بُت ہی در بنائے اعتقاد آتش

اور قا شرارِ سنگِ بُت بہر بنائے اعتقاد آتش

ص ۱۴۹: در حالتِ تصورِ روئے بتاں اسدؔ، دکھلائے ہے مجھے چمنِ لالہ زار داغ ۱۳۶/۴۵

غالبؔ کا املا 'دکھاوے'، 'بتا'، 'دکھلائے' نہیں۔ کمال احمد صاحب نے اسی مخطوطے سے اس قسم کی کئی مثالیں دی ہیں جن میں 'جاوے' وغیرہ لکھا ہے۔

ت : عرض یہ ہے کہ اسی مخطوطے یا دوسرے نسخوں میں آئے، جائے وغیرہ جہاں فعلن (بسکونِ عین) کے وزن پر ہیں وہاں غالبؔ نے آوے، جاوے لکھا ہے۔ لیکن جہاں فاع کے وزن پر ہیں وہاں آئے جائے ہی لکھا ہے۔ کسی بھی نسخے یا ایڈیشن کو دیکھ لیجئے۔

آئے ہے بیکسیِ عشق پہ رونا غالبؔ کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

یا ع دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے' والی غزل کی ردیف زیرِ اعتراض مصرع میں نسخۂ عرشی میں بھی 'دکھلائے ہے' لکھا ہے۔

ص ۱۵۱۔ گھر پہ پڑا ایغز کے نہ کوئی شرار حیف ۱۳۸/۴۶

کسی مجہول نے شعر پر اصلاح دی ہے۔

ت : محض لغزشِ قلم ہے۔

ص ۱۵۲۔ پائی جگہ کے بھی تو دل میں ہو کر غبار حیف ایضاً

کیا غالبؔ سے یہ سہو ہوتے!

ت : یہ بھی محض لغزشِ قلم ہے۔ اگر غالبؔ ایسے مصرعے نہیں سکتا تو وہ مبینہ جعل ساز بھی نہیں کہہ سکتا جس نے ایسے عالمانہ اشعار کہے ہیں۔ مصنف کی کتاب میں بھی اغلاطِ کتابت ہیں۔ مثلاً ص ۱۲۶، ۱۳۱، ۳۹۳ پر مالک رام کی بجائے 'سالک رام' چھپا ہے۔ ص ۱۵۹ پر ہے۔

" یہ تو غیر مردف اور بین ردیف وار بیاض بنائی جا رہی تھی "

غیر مردّف بھی، اور ردیف وار بھی۔ ان اغلاط کی وجہ سے ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ کمال احمد صدیقی ایسی غلطیاں نہیں کر سکتے اس لئے یہ کتاب کسی مجہول کی تصنیف ہوگی۔

ص ۱۵۲۔ دیتا اسد میں سرمہ چشمِ رکابِ یار حوالہ ایضاً

سر پر ٹوپی دی جاتی ہے۔ منہ میں لگام دی جاتی ہے، آنکھوں میں سرمہ نہیں دیا جاتا۔ سرمہ دینا کوئی زبان نہیں۔ میرزا، 'دیتا' نہیں لکھ سکتے تھے۔

ت : متقدمین کی طرح غالبؔ نے متعدد فارسی محاوروں کا لفظی ترجمہ کر لیا ہے۔ فرہنگِ

آنندراج میں دیکھیے۔ "سُرمہ بچشم دادن" محاورہ ہے جس پر یہ نوٹ ہے کہ یہ ہندوستانی فارسی نویسوں سے مخصوص ہے۔ اہلِ ایران کے یہاں نہیں ملتا۔

ص ۱۵۴۔ یک بختِ اوج ، نذرِ سبک باری اسد ۱۴۲/۴۸ نسخۂ عرشی ص ۵۱

سبک باری پر اضافت نہ لگانے سے مصرع غیر موزوں ہو گیا ہے اور ناموزوں مصرع غالب سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ "سبک باری اے اسد" ہو اعتراض خواہ مخواہ کی سخت گیری ہے۔ "اے" کی کوئی ضرورت نہیں مصنف نے بخت پر جو کسرۂ اضافت لگا ہے وہ بھی غلط ہے۔ "یک بخت اوج" غالب کی مخصوص مقداری ترکیب ہے۔ "یک شہر آرزو" ، "یک بیاباں ماندگی" ، "یک جہاں زانو تامل" جیسی۔

ص ۱۵۹۔ ناسازیِ نصیب و درشتیِ غم ہے ہے امید ، ناامیدی و تمنا شکستہ دل ۱۴۴/۴۹

نسخۂ عرشی میں نصیب اور درشتی کے بیچ واؤ عطف نہیں۔ مخطوطے میں یہ حرف الحاقی ہے۔

ت : یہ غزل رخ اور ق کے بعد نہیں ملتی۔ ق کے دونوں ایڈیشنوں یعنی نسخۂ حمیدیہ بھوپال اور نسخۂ حمیدیہ لاہور میں واؤ عطف موجود ہے معلوم نہیں عرشی صاحب نے کیوں کر حذف کر دیا لیکن اختلافِ نسخ میں نہیں دیا۔ افسوس کہ میں نے اپنی شرح میں بدونِ واؤ عطف ہی معنی لکھے ہیں حالانکہ واؤ عطف کے ساتھ شعر بہت صاف ہو جاتا ہے۔

ص ۱۶۰ گر بہ بزمِ باغ کھینچا چاہے نقشِ روئے یار

شمع ساں ہو جائے زنگِ خامۂ بہزاد گل ۱۴۶/۵۰

بہزاد تو بہزاد مرزا کے زمانے میں بھی لوہے کے قلم کا عام رواج نہ تھا۔ بہزاد تو برش استعمال کرتا تھا۔ زنگ کہاں سے آ گیا۔ شعر الحاقی ہے۔ نسخۂ عرشی میں قطِ خامہ ہے۔

ت : اعتراض بہت باوزن ہے۔ ذرا سا شبہ ہوتا ہے کہ کہیں "زنگ" کی بجائے "رنگ" تو نہیں۔ ر پر نقطہ وہ فاضل دھبہ نہ ہو جیسے اس نسخے میں عام ہیں۔ ویسے معنی کے لحاظ سے گل اور زنگ میں یک گونہ مناسبت ہے۔

اسی کے ساتھ لیجیے ذیل کا شعر :

ص ۴۰۴ سخن تاریک طبعوں کا ہے اظہارِ کثافت

کہ زنگِ خامۂ فولاد مانائے سیاہی ہے ۲۸۰/۱۱۷

غالب کے زمانے تک لوہے کے قلم کا رواج عام نہ تھا۔ خود غالب نے لوہے کا قلم کبھی استعمال نہیں کیا۔

ت: اعتراض یہاں بھی باوزن ہے۔ اس کی یہی تاویل ہو سکتی ہے کہ گو غالب نے خود لوہے کا قلم استعمال نہیں کیا لیکن انگریزی لکھنے والوں کے پاس دیکھا ضرور ہوگا اور اسے محض دیکھ کر بھی شعر کہہ سکتے تھے۔ چونکہ لوہے کا قلم اس زمانے میں غیر معمولی چیز تھی اس لئے صراحت کے ساتھ 'خارہ فولاد' کہا۔ آج کل قلم کہنے سے دھات کی نب والا قلم ہی مراد لیا جاتا ہے۔ کوئی واسطی یا سرکنڈے کے قلم کا ذکر کرے تو آج کل محض قلم نہیں کہے گا بلکہ واسطی یا نرکل کا قلم کہے گا۔

ص ۱۶۳ ہے گرہ بر کیسۂ درہم خیالِ تنگ دل ۱۴۶/ب ج

کیسہ جیب کو کہتے ہیں۔ اس میں گرہ کیسے لگائی جا سکتی ہے۔

ت: کیسہ کے بنیادی معنی تھیلی کے ہیں جس میں گرہ لگائی جا سکتی ہے۔

ص ۱۶۴ ہے بخواب سبزہ از جوشِ خمارِ بنگ دل

'بخواب سبزہ' بے معنی ترکیب ہے۔

ت: معنی ہیں 'جس طرح سبزے کا خواب ہوتا ہے میں بھی بھنگ کے نشے میں اسی طرح خوابیدہ سا ہوں۔

ص ۱۶۵۔ بہار در گرہِ غنچہ، شہر جولاں ہے طلسمِ ناز بجز تنگیِ قبا معلوم ۱۴۸/۵۱

ق، قا میں، گرد، ہے۔ گرہ اصلاح معکوس ہے یا کتابت کی غلطی۔

ت: معنی کے لحاظ سے گرہ 'گرد' سے بہتر ہے۔

ص ۲۱۴ نظارۂ وخیال کا ساماں کئے ہوئے ۲۱۸/۸۹

ص ۲۵۱ نغمۂ وچنگ میں جوں تیر وکماں فہمیدن ۱۷۶/۶۶

ص ۳۴۲ بہارِ نالۂ ورنگینیِ فغاں تجھ سے ۲۳۶/۹۵

نظارہ، نغمہ، نالہ پر ہمزۂ اضافت بھی ہے اور واؤ عطف بھی غالب یہ غلطی نہیں کر سکتے تھے۔

ت: نسخۂ حمیدیہ مرتبۂ انوار الحق میں بھی 'نالہ ورنگینی' میں نالہ پر ہمزہ ہے۔ فارسی قواعد کی روسے یہ غلطی ہے لیکن اردو تلفظ کی رُو سے صحیح۔ ہائے مختفی اردو میں عموماً الف ساکن کی آواز دیتی ہے۔

اضافت کی طرح عطف میں بھی اسے الف متحرک کے برابر کر دیا جاتا ہے اور اس تحریک کے اظہار کے لئے ہمزہ کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ آخر اُردو میں وصلی ہمزہ کرہ و پیش الف متحرک کی آواز دیتا ہے۔ 'شعلہ گل' میں پہلے لفظ کا تلفظ ہے [شُع لَ اِ ے] یعنی کسرۂ آخر یائے مجہول کا کام دیتی ہے اور اس سے پہلے الف کے لئے ہمزہ کا استعمال ہوا ہے۔ یہی صورت واؤ عطف کے ساتھ ہے۔ وہاں ہائے مختفی کی تحریک کے لئے میری رائے میں اُردو میں ہمزہ لگانا چاہیے تاکہ املا تلفظ کی بہتر ترجمانی کر سکے۔ ہمزہ کے بغیر نغمہ و چنگ کا تلفظ 'نغما و چنگ' ہو جائے گا۔ کیا عجب ہے کہ غالب اضافت کی طرح عطف سے پہلے بھی ہمزہ لگانا پسند کرتے ہوں۔

ص ۲۲۳ ترے سرورِ رعنا نے ایک قدِ آدم $\frac{156}{55}$

رعنا میں نون غنہ شامل کر کے لکھا ہے جس کے معنی مخطوطہ بخطِ غالب نہیں نقوش اکتوبر ۱۹۶۹ء میں غالب کے قلم کی 'گلِ رعنا' کے کچھ صفحات چھپے ہیں ان میں رعنا کے صحیح ہجے لکھے ہیں۔

ت: رعنا کی کافی بحث رسائل میں ہو چکی ہے۔ عرشی زادہ کی یہ تاویل صحیح معلوم ہوتی ہے کہ رے پر دو فاضل نقطے لگ گئے ہیں جو اس مخطوطے میں جابجا ہیں۔ 'گلِ رعنا' میں جانے کی ضرورت نہیں۔ اس مخطوطے کے کاتب کو بھی گل رعنا کے صحیح ہجے آتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

اس قامتِ رعنا کی جہاں جلوہ گری ہے $\frac{258}{107}$

جموں یونیورسٹی کو نسخہ عرشی زادہ کی جو کاپی فراہم کی گئی ہے اس میں رعنا کے فاضل نقطے چھلے ہوئے ہیں۔ یعنی املا صحیح کر دیا گیا ہے۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔

ص ۲۳۹ بہ رطوطی ہے قفلِ زنگ بستہ آئینہ خانے میں $\frac{168}{61}$

اس قلم زد مصرع میں الف کی نستعلیق کتابت میں 'بستہ' ہی چھپا ہے لیکن تصریحات میں 'بست' پڑھنے کی مضحکہ خیز کوشش کی گئی ہے۔

ت: نستعلیق کتابت میں 'کر طوطی قفلِ زنگ بستہ' بالکل غلط لکھا ہے۔ تصریحات کی قرأت صحیح ہے۔ ع بہ رطوطی ہے قفلِ زنگ بست ــــ

زنگ بستہ کی جگہ 'زنگ بست' لانا عجز ہے اس لئے اصلاح کی گئی لیکن رنگ بست کی طرح زنگ بست بھی غلط نہیں ہونا چاہئے۔ بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ اصلاً 'بست' لکھا تھا 'بستہ' نہیں۔

ص ۲۴۰ اسد اے عجز ابروے مہ نو حیرت ایماں ہے حوالہ ایضاً

یہ مصرع نامعقولیت کی اچھی مثال ہے۔ الف میں اسے "آں" پڑھنے کی مضحکہ خیز کوشش کی گئی ہے۔

ت: یہ سہوِ قلم ہے۔ کوئی شاعر خواہ وہ جعل ساز ہی کیوں نہ ہو یہاں لے نہیں کہہ سکتا۔ "آں" نہیں تو "وایں" کہا ہوگا۔ بے خیالی میں "لے" لکھا گیا۔

ص ۲۴۲ تماشا کردنی ہے لطفِ زخمِ انتظارِ دل $\frac{17}{62}$

سوادِ داغِ مرہم، مردمک ہے چشمِ سوزن میں

زخمِ انتظارِ دل کیا؟ دل کے تشریف لانے کا انتظار؟

ت: آپ اضافتوں کے توڑنے میں سہو کر گئے۔ "لطفِ زخمِ انتظارِ دل" نہیں ہے بلکہ "لطفِ زخمِ انتظار، دل" ہے یعنی زخمِ انتظار کا وہ لطف جو دل کو حاصل ہے یا جو دل کا تجربہ ہے۔

ص ۲۵۰ جوں صدف پُر در ہیں دنداں در جگر افسردگاں $\frac{179}{66}$

اختلافِ نسخ کے تحت نسخۂ عرشی میں ص ۱۷۸ پر یہ اظہار کیا گیا ہے کہ نسخۂ بھوپال میں مصرعِ ثانی میں افسردگاں ہے۔ اگر واقعی ایسا ہے تو کتابت کی غلطی ہے۔

ت: آپ کو نسخۂ حمیدیہ کا متن تحقیق کرنا چاہئے تھا۔ نسخۂ حمیدیہ کے دونوں ایڈیشنوں میں "افسردگاں" ہی ہے۔ نسخۂ عرشی میں جو اختلافِ نسخ کے طور پر "افسردگاں" درج ہے وہ اس شعر کے بارے میں نہیں اس کے تیسرے شعر کے لئے ہے۔

ص ۲۵۸ مخطوطے میں مصرع تھا "وے جوں شمع بہر دعوتِ نظارہ لا" یعنی $\frac{182}{68}$ ابتدائی لفظ قلم زد کرکے اصلاح کی گئی "وہ دل جوں شمع . . . " لیکن نسخۂ بھوپال میں "دل جوں شمع" ہے۔ نسخۂ بھوپال میں دراصل "دلے جوں شمع" رہا ہوگا۔ مخطوطے کی قلم زد قرأت نسخۂ بھوپال میں کیسے پہنچی۔

ت: خ کے متن کی تاریخ کتابت طے کی گئی ہے۔ اصلاحوں کی تاریخ کسی نے متعین نہیں کی۔ خ میں اس مصرع کی اصلاح کتابتِ متنِ ق کے بعد کی گئی ہوگی یوں خ کی اصلاح شکل اور ق کا متن بالکل یکساں ہے۔

ص ۲۶۰ کفِ ہر خاکِ گلشن شکلِ قمری نالہ فرسا ہو $\frac{182}{68}$

یہ مصرع مخطوطے میں بھی ہے اور متداول دیوان میں بھی۔ کفِ ہر ذرہ یا کفِ ہر ذرۂ خاک درست لیکن کفِ ہر خاک سمجھ میں نہیں آتا۔ معلوم ہوتا ہے یہاں خاک کی بجائے "چاک" رہا ہوگا جس کے معنی پھولوں کے ٹوکرے کے ہیں۔

ت : دراصل غالبؔ 'ہر کفِ خاک' کہنا چاہتے تھے۔ عجز کے سبب کفِ ہر خاک کہہ گئے۔ معنی اس کے بھی صحیح ہیں۔ چاک کے کوئی اجنبی معنی "پھولوں کا ٹوکرا" ہو سکتے ہیں۔ دراصل غالبؔ کے کلام میں معنی کی زیادہ صفائی اور برجستگی کی تلاش نہیں کرنی چاہئے ورنہ کہاں کہاں اصلاحیں کریں گے۔

ص ۲۶۱ خوشا عالم کہ در طوفانِ مے موجِ صبا گم ہو ۱۸۴/۶۹

"خوشا عالم کہ در طوفانِ مے" کو کاٹ کر "مگر طوفانِ مے میں بپیچش" کر دیا لیکن مصرع کے صرف قلم زد الفاظ باریک قلم سے لکھے ہیں۔ کیا مصرع لکھتے وقت معلوم تھا کہ بعد کو یہ الفاظ کاٹ دیئے جائیں گے۔

ت : اعتراض دلچسپ ہے۔ دراصل صرف "خوشا عالم کہ" یہ تین الفاظ چھوٹے لکھے ہیں۔ 'در طوفاں' یہ دو لفظ معمول کے مطابق ہیں۔ ابتدائی لفظوں کو چھوٹا لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ شیرازۂ جلد کی طرف جگہ کی قلت تھی۔ کاتب نے شروع میں لفظوں کو چھوٹا لکھنا شروع کیا کہ مصرع چوکھٹے سے باہر نہ نکلے جب تین چار الفاظ لکھ چکا تو اس نے دیکھا کہ ابھی کافی جگہ ہے اس لئے بقیہ الفاظ بڑے بڑے لکھ دیئے۔ حقیقت صرف اتنی ہے۔

ص ۲۶۲ نہیں جز در دِ تسکینِ نکوہش ہائے بے درداں
بموجِ گریۂ صد خندۂ دنداں نما گم ہو حوالہ ایضاً

دوسرے مصرع کے ابتدائی الفاظ کو قلم زد کر کے اصلاح کی گئی "کہ موجِ گریہ میں ..." پہلی قرأت میں "بموجِ گریہ" بے معنی ہے۔ شاید 'بموجِ گریہا' اصلاح معکوس کی ہو گی۔

ت : "بہ موجِ گریۂ" بالکل بامعنی ہے۔ یہاں ہمزۂ اضافت نہیں بلکہ یائے تنکیر کے مساوی ہمزہ تنکیر یا ہمزۂ وحدت ہے۔ 'بموجِ گریۂ' کے معنی ہیں 'ایک گریہ کی موج میں' (صد خندۂ دنداں نما گم ہو)

ص ۲۶۷ اسد اندیشۂ ششدر شدن ہے نہ پھیرے مہرہ شاں خانہ بخانہ ۱۸۸/۷۱

اس شعر میں فقیری کی بات ہے جو مرزا کے اس عہد کا مزاج نہیں ہے۔

ت : نسخۂ بھوپال کے حاشیے پر یعنی نسخۂ شیرانی سے قبل شعر ہے :

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ اب عناصر میں اعتدال کہاں

اور حاشیۂ نسخۂ شیرانی پر وہ مشہور قطعہ :

ع ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے

اور ذیل کا مصرع۔ ع تنگ بیری ہے جوانی میری

ہے، جو جوانی میں اس قسم کے اشعار کہہ سکتے تھے وہ چند سال قبل خ میں بھی فقیری کے مضمون باندھ سکتے تھے۔

ص ۲۷۴ لخت لختِ دلِ نگینِ خانۂ زنجیر ہے $\frac{194}{74}$

ق اور ق ا میں 'مکین' ہے اس لئے 'نگین' غلط ہے۔ کیا مرزا اپنا کلام خود غلط لکھتے؟

ت: یہ درست ہے کہ ق اور ق ا میں مکین ہے لیکن معنی کے لحاظ سے 'نگین' بہتر ہے۔ نگین اور مکین میں محض ایک نقطے کا فرق ہے۔ بہر حال معنی دونوں الفاظ دیتے ہیں۔

ص ۲۷۹ کھلتا کسوں پہ کیوں مرے دل کے معاملے $\frac{191}{77}$

نسخۂ عرشی کے مطابق ق میں یہ مصرع "کھلتے کسوں پہ کیوں مرے دل کے معاملے" تھا۔ خ کے اتنے اچھے مصرع کو ق میں کیوں بدلا گیا اور بعد میں اسی کو کیوں بحال کیا گیا۔

ت: مندرجہ بالا شعر خ میں بعد کا اضافہ ہے۔ اضافہ کا زمانہ کون جانے۔ کیا معلوم کہ یہ ق کے بعد کا اضافہ ہو۔

ص ۲۷۹ ع ہر نیستاں قلم روِ اعجاز ہے مجھے $\frac{198}{76}$

پہلے یک لکھا تھا اسے 'ہر' بنا دیا لیکن ق میں یک ہی ہے۔

ت: الف اور عین کے مرتبوں کا یہ کہنا صحیح کہ یک کو 'ہر' بنایا ہے۔ 'ہر' کسی طرح ہے ہی نہیں۔ قلم زد قرأت واضح نہیں۔ بعد میں یقیناً 'یک' بنایا گیا ہے۔

ص ۲۸۷ آنکھوں میں انتظار سے جاں پُر شتاب ہے $\frac{200}{77}$

آنا ہے آؤ ورنہ یہ پا در رکاب ہے

پہلے مصرع میں پر پڑھیے خواہ پُر۔ دونوں صورتوں میں مطلب ادا نہیں ہوتا حالانکہ ذرا سی کوشش سے پہلا مصرع یوں ہو سکتا تھا:

اٹکی ہوئی ہے آنکھوں میں جاں اضطراب ہے

یا اٹکا ہوا ہے آنکھوں میں دمِ اضطراب ہے

ت: "جاں پُر شتاب" کے معنی ہیں جاں بہت جلدی کر رہی ہے۔ اصلاح کی کوئی ضرورت

نہ تھی۔

ص ۲۸۸ حیراں ہوں دامنِ مژہ کیوں جھاڑتا نہیں

خط صفحۂ عذار پہ گردِ کتاب ہے ۲۰۲/۷۸

"دامنِ مژہ" بالکل لغو ترکیب ہے۔ مژہ کو برش یا جھاڑو سے تشبیہ دی جا سکتی ہے لیکن برش اس وقت ہوتے نہیں تھے اور جھاڑو سے کتاب نہیں جھاڑتے۔

ت: ایک چیز بالوں کی چوری (یا چنور) ہوتی ہے جس سے مکھیاں اُڑاتے ہیں۔ اس سے گرد بھی جھاڑی جاتی ہے اور مژہ اس سے مشابہ ہوتی ہے۔

ص ۲۹۲ وہ گل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالبؔ

چٹکنا غنچۂ گُل کا صدائے خندۂ دل ہے ۲۰۴/۷۹

پہلا اعتراض یہ ہے کہ اگر حمیدیہ میں 'غنچۂ دل' تھا تو رخ میں متداول دیوان کی قرأت کیونکر درآئی۔

ت: نسخۂ حمیدیہ مرتبۂ حمید احمد خاں میں 'غنچۂ گُل' لکھ کر نوٹ دیا ہے کہ مفتی انوار الحق کے نسخے میں 'غنچۂ دل' بداہتہً سہوِ کاتب ہے۔

مصنف کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ پہلے مصرعے میں اسدؔ تخلص کو بدل کر غالبؔ کیا گیا یہ بڑی مصنوعی بات ہے۔ پھر اگر اسدؔ کے مقطعوں کو بدلنا ہی مرزا کا منشا ہوتا تو بہت سے مقطعے کیوں چھوڑ دیئے جاتے۔

ت: غالبؔ نے اس مخطوطے کے علاوہ بھی بارہا اسدؔ کے مقطعے بدلے ہیں۔ نسخۂ حمیدیہ مرتبۂ انوار الحق میں دیکھ لیجئے جگہ جگہ اسد والا شعر قلم زد ہو کر غالبؔ تخلص کے ساتھ نیا شعر آ گیا۔ سرسری دیکھنے ہی پر نسخۂ حمیدیہ میں دو مقطعوں میں تخلص کی تبدیلی دکھائی دی۔

لوں وام بختِ خفتہ سے یک خوابِ خوش اسدؔ لیکن یہ بیم ہے کہ کہاں سے ادا کروں

لوں وام بختِ خفتہ سے یک خواب خوش ولے غالبؔ یہ بیم ہے کہ کہاں سے ادا کروں } ص ۱۰۸

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی شعرِ اسدؔ کے ایک دو پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

گفتۂ غالبؔ ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں } ص ۱۰۱

ص ۲۹۹ اسدؔ کو حسرتِ عرضِ نیاز تھی دمِ قتل

ہنوز یک سخن بے صدا، نکلتی ہے ۲۰۷/۸۰

مخطوطے کے علاوہ ق، قا، نسخۂ عرشی میں بھی یہ شعر اسی طرح ہے۔ غالب سخن کو مونث نہیں باندھ سکتے تھے۔ اس کے معنی مخطوطے کا ماخذ نسخۂ عرشی یا دوسرے نسخے ہیں۔

اس کے بعد مصنف نے قیاسی صورتیں تجویز کی ہیں۔

ت : واقعی سخن کی تانیث بڑا سقم ہے لیکن دوسرے مستند نسخوں میں اس کے موجود ہونے سے ثابت ہوتا ہے کہ غالب نے واقعی مونث باندھا۔ اُس دَور میں شاید تذکیر و تانیث کی صحت پر اتنا زور نہ ہوگا۔ مثلاً متداول کا یہ شعر دیکھیے :

نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا   دی ہے جائے دہن اس کو دمِ ایجاد نہیں

اس میں 'اثبات' کو سہواً مونث باندھا ہے۔ حالانکہ دوسری جگہ صحیح باندھا ہے۔

ع ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

ص ۲۰۳   حسرتے اے ضبط سوزش، حیرتِ اظہارِ حال

داغ ہے مہرِ دہن جوں چشمِ قربانی مجھے $\frac{۲۰۸}{۸۱}$

لکھتے ہیں کہ 'حسرتے' ہے تو 'حیرتے' بھی ہونا چاہیے۔ بات پھر بھی نہ بنتی یہ حسرتا اے ضبطِ سوزش' حیرتا اظہارِ حال'، ہوتا تو مصرع کی صورت نکھرتی۔

ت : 'حیرتِ اظہارِ حال' صحیح ہے 'حیرتے' سے یہاں ترکیب بے معنی ہو جاتی۔ مصنف اعتراض تک قانع رہیں تو ٹھیک ہے اپنی اصلاحیں پیش نہ کیا کریں۔ 'حیرتا' کتنا بھونڈا معلوم ہوتا ہے۔

ص ۳۰۵   باعثِ واماندگی ہے عمرِ فرصت جو مجھے

پائے وحشت میں ہے زنجیرِ رم آہو مجھے $\frac{۲۰۸}{۸۱}$

دوسرے مصرعے کے ابتدائی الفاظ کو کاٹ کر اصلاحی صورت لکھی گئی ہے۔ مندرجہ بالا قلم زد قرأت ہے جو مولفِ عین نے قیاس کی ہے۔ یہ ایسا بیہودہ مصرع ہے کہ کوئی ہوشمند اسے میرزا سے منسوب نہیں کر سکتا۔

ت : مصرع بیہودہ نہیں لیکن ردیف 'مجھے' ضرور کمزور پڑ گئی ہے۔ شاعر کہتا ہے 'مجھے پائے وحشت میں زنجیرِ آہو ہے'، یعنی میرے پائے وحشت میں رم آہو کا سلسلہ پڑا ہے۔ دوسرے الفاظ میں 'میرا پائے وحشت ہر وقت آہو کی طرح رم کرتا رہتا ہے'۔

م ۳۰۹ حسن کا خط پر نہاں خندیدنی انداز ہے ۲۱۴/۸۴

د خط نہاں، کوئی زبان نہیں۔ د خط میں نہاں، چاہیئے۔ شعر الحاقی ہے۔

ت: شعر کے معنی میری کتاب 'تفسیر غالب' میں دیکھیے۔ 'پر' صحیح ہے 'میں' غلط ہوتا۔ 'پر' سے مراد ہے کہ حسن خط پر در پردہ خندہ و استہزا کر رہا ہے۔

م ۳۱۳ بہر تاراج تمنا فتنہ در کار ہے ۲۱۶/۸۵

فتنہ، در کار، مہمل ترکیب ہے۔ مصرع الحاقی ہے۔

ت: فتنہ، میں ہمزہ یائے تنکیر یا یائے وحدت کا قائم مقام ہے۔ اسے در کار سے اضافت کا رشتہ نہیں۔ 'فتنہ' در کار ہے کے معنی ہوئے کوئی فتنہ یا ایک فتنہ در کار ہے!

م ۳۱۴ بیضہ آسا تنگِ بال و پر (پر) ہے کنج قفس

دونوں مرتبوں نے لے حمیدیہ کی تقلید میں 'بیضہ آسا تنگِ بال و پر ہے (پر) کنج قفس' پڑھا ہے حالانکہ تنگ میں ت کے دو نقطے صاف ہیں۔

ت: نقوش جولائی ۱۹۷۰ء میں بیاضِ غالب کے غلط نامہ م ۲۸ پر تصحیح کر دی گئی ہے کہ مصرع کی قرأت یوں ہونی چاہیئے۔

بیضہ آسا تنگ بال و پر (پر ہے) کنج قفس

م ۳۲۴ تمثالِ تماشا ہائے، اقبالِ تمنا ہا عجزے عرقِ شرمے لے آئینہ حیرانی ۲۲۲/۸۸

عجزے پر یائے تنکیر درست نہیں نسخہ عرشی میں 'عجز' ہے لیکن مصنف کی رائے میں 'عجز اے عرقِ شرمے . . . ہونا چاہیئے۔

ت: معنی 'عجزے' اور 'عجز' دونوں سے نکلتے ہیں لیکن اصلاحی شکل 'عجز' بہتر معنی دیتی ہے۔ دونوں متنوں کے بامعنی ہونے کی وجہ سے ایک اور ترمیم 'عجز اے' غیر ضروری ہے۔

میری رائے میں تمثال اور اقبال میں اضافت نہیں ہونی چاہیئے۔

م ۳۲۵ گلزار تمنا ہوں گلچین تماشا کو حد نالہ اسد بلبل در بند زباں دانی ۲۲۴/۸۹

پہلے مصرع میں ایک جگہ 'ہوں'، دوسری جگہ 'کو' صحیح نہیں۔ دونوں جگہ 'ہوں' ہی چاہیئے تھا یا

ت: بہ صورتِ موجودہ بھی صحیح ہے۔ دوسرا 'کو'، فارسی حرفِ استفہام ہے۔

گلزارِ تمنا ہوں، گلچینِ تماشا کو؟

م ۳۲۶ خوشاخیالِ کسانے کہ محوِ بیخبری ہیں
حصولِ یاس والم رزقِ مدعا طلبی ہے ایضاً

'کسانے' پڑھیے 'کسانی' دونوں بے محل ہیں کیونکہ کسان ہندی لفظ ہے۔

ت: کیا لطیفہ ہے! یہ ہندی لفظ نہیں، فارسی لفظ کس کی جمع 'کساں' (مثلِ بے کساں) ہے۔ اس پر یائے تنکیر یا یائے زائد لگا کر کسانے بنایا۔

م ۳۲۸۔ طلسمِ آئینہ زانوئے فکرِ خود بینی ہنوز حسن کو ہے سعیِ جلوہ افروزی ایضاً

نسخۂ عرشی میں یہ مصرع ہے 'طلسمِ آئینہ زانوے فکر ہے غافل'

مصنف کی رائے میں زانوئے فکر کی ترکیب غلط ہے۔ یہ 'زالوئے فکر' ہونا چاہیئے۔ زالو کے معنی 'جونک' ہیں۔

ت: مصنف شاید زانوئے فکر کی ترکیب سے واقف نہیں۔ زانو پر سر رکھ کر فکر کیا جاتا ہے۔ یہاں جونک کا کوئی موقع نہیں۔ غالب کے یہاں زانو فکر کی علامت ہے۔ یہ اس نسخے کے ایک اور شعر میں دیکھیے:

بہ ہنگامِ تصور ساغرِ زانو سے پیتا ہوں مئے کیفیتِ خمیازہ ہائے صبحِ آغوشاں

م ۳۲۹۔ بہ پرفشانیِ پروانۂ چراغِ مزار کہ بعدِ مرگ بھی ہے لذتِ جگر سوزی ایضاً

'بہ' غلط 'یہ' ہونا چاہیئے۔ یہی غلطی نسخۂ عرشی میں ہے۔ مخطوطہ بخطِ غالب ہونے کی ایک اور شہادت۔

ت: 'بہ' قسم کے لئے ہے۔ پرفشانیِ پروانہ کی قسم۔ 'یہ' ہو تو دوسرے مصرع میں 'کہ' بے کار رہ جاتا ہے۔

م ۳۳۳ ع چراغانِ نگاہ و شوخیِ اشکِ جگر گوں ہے $\frac{۲۲۸}{۹۱}$

مخطوطے اور نسخۂ عرشی میں 'گوں' غلط ہے 'خوں' ہونا چاہیئے۔ ۱

ت: جگر گوں کے معنی ہوئے جگر کے رنگ کا۔ 'خوں' کی کوئی ضرورت نہیں 'اشکِ خونِ جگر' ہو سکتا تھا۔ 'اشکِ جگر خوں' صحیح ترکیب نہیں۔

چھا گیا فرطِ صفا سے زلف کا اعضا میں عکس
ہے نزاکت جلوہ اے ظالم سیہ نامی تری ۲۳۲/۹۳

اس میں فرطِ صفا کو زلف کی صفت قرار دینے کی طرف ذہن نہیں جاتا۔ اس یہ مصرع الحاق ہے۔
(یہ بں کالی زلفوں کا عکس پڑا تو جلد سیہ فام دکھائی دینے لگی۔ حسنِ تعلیل ہے۔)

ص ۳۳۸ کچھ نہیں حاصل تعلق میں بغیر از سوز و ساز
اے خوشا رندے کہ شمعِ محفلِ تجرید ہے ایضاً

چونکہ شمعِ تجرید سے آزادی کا نہیں بلکہ گھلنے اور جلنے کا تصور وابستہ ہے اس لئے 'خوشا' سے اس کی مطابقت نہیں۔

ت: فرطِ صفا محفلِ تجرید میں شمع کے روشن ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ بغیر جلی ہوگی اس لئے خوشا کہا۔

ص ۳۴۵ بے دماغِ تپش و عجز دو عالم فریاد
ہوں میں وہ خاک کہ ماتم میں اڑایا ہے مجھے ۳۳۸/۹۶

'عجز' بے محل ہے۔ شاید اسے نسخۂ عرشی کے اس مصرع سے لیا ہے۔

بے دماغِ تپش و عرضِ دو عالم فریاد

'عرض' کے معنی یہاں اس وصف کے ہیں جو عجز کے ساتھ ہوتا ہے۔ جبل سانے عرض بمعنی درخواست سمجھ کر 'عرض' کی جگہ 'عجز' کر دیا۔

ت: مصنف سے افسوسناک سہو ہوا۔ وصف کے معنی میں 'عرض' یہ تحریک را ہوتا ہے۔ نسخۂ عرشی کے شعر میں عرض کے معنی پیش کرنا ہی ہیں مجھے تپش نے بے دماغ کر دیا ہے اور میں دنیا بھر کی فریاد پیش کرنا چاہتا ہوں۔ مخطوطے کے مصرع میں 'عجز۔ دو عالم فریاد' کے معنی ہیں میں بہت سی فریاد کا عجز ہوں بالفاظِ دیگر فریاد کرتے کرتے جو عجز و پریشانی کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ میں سراپا وہی ہوں۔

ص ۳۴۸ رنگ سے گل نے دمِ عرضِ پریشانیِ بزم
برگِ گل ریزۂ مینا کی نشانی مانگے

مخطوطے میں نیز نسخۂ عرشی میں اس شعر کی ردیف "مانگے" غلط ہے۔ یہاں "مانگی" کا مقام ہے اس لئے یہ شعر اس غزل کا نہیں۔

ت: مانگے صحیح، مانگی غلط۔ (برگِ گل جو ریزۂ مینا کی نشانی ہیں) مانگے شعر کے معنی تفسیرِ غالب میں دیکھئے۔

۳۵۷/۱ فرصتِ آئینہ و پرداز عدم تا ہستی یک شرر بال دل و دیدہ چراغاں زدہ ہے ۲۴۲/۹۹

خ میں پرواز، ق میں پرداز، قا میں پرواز۔ خ اور قا میں پرداز سہوِ کاتب ہے۔ قا کی غلطی طے میں کیونکر در آئی ہے۔

ت: پرواز یقیناً پرداز سے بہتر ہے۔ اردو تحریر میں دال اور واؤ میں تمیز کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اگر مصرع یوں ہوتا تو معنی "پرداز" سے واضح تر ہوتے۔

فرصتِ آئینہ پردازِ عدم تا ہستی

"آئینہ پرداز" غالب کی مخصوص ترکیب ہے مثلاً ملاحظہ ہو اسی نسخے میں:

تپشِ آئینہ پردازِ تمنا معلوم نامۂ شوق ببالِ پرِ بسمل باندھا ۸۶/۲۰

فی الحال "فرصت" کو اضافت کے بغیر پڑھئے۔ آئینہ کے بعد واؤ عطف اور پرواز کو واؤ سے بمعنی اڑان ماننا ہوگا۔

۳۵۸ شام سایہ میں نہ تاراجِ سحر پنہاں ہے

مرزا لکھتے تو "بہ" کی جگہ "نہ" نہیں لکھتے۔

ت: یہ مصنف کی زبردستی ہے۔ بہ ہی لکھا ہے نہ نہیں۔ بہ کی ب کا نقطہ "میں" کے پیٹ کی کشش میں چپکا ہوا ہے۔ "میں" کے اوپر جو نقطہ ہے وہ دراصل بالائی مصرع کے لفظ "خواب" کی ب کا ہے۔ اس کے آگے جو نقطہ ہے وہ مبینہ "نہ" کا نہیں بلکہ "میں" کے نون کا ہے۔ مرزا نون غنہ میں ہمیشہ نقطہ لگاتے تھے۔

م ۱/۳۷۔ نمک بر داغِ مشک آلودہ وحشت تماشا ہے، سوادِ دیدۂ آہوشبِ مہتاب مطلع ۲۵۸/۱۰۵

میرزا ایسا شعر نہیں کہہ سکتے تھے اور شورکی رودووالا

معاملہ میرزا کے زمانے میں نہیں تھا۔

ت : بڑا بار یک شعر ہے جس کے معنی بالکل چوکھے ہیں۔ میری شرح میں ملاحظہ ہوں۔

۳۷۶۔ مصنف کہتے ہیں اسی زمین میں (سفری ہے) چار شعر ایک ماخذ سے راقم کو حاصل ہوئے ہیں۔
یہ بھی میرزا کے شعر بتائے جاتے ہیں۔ شعر حاضر ہیں۔

ص ۳۹۳، ۳۹۴ پر پھر کہتے ہیں کہ ایک ماخذ سے اسی زمین میں (گل کے تلے) کچھ شعر دستیاب
ہوئے ہیں۔ یہ بھی میرزا کے بتائے جاتے ہیں۔ شاید مولانا عرشی اور جناب مالک رام ان کے بارے میں کچھ کہہ سکیں۔

ت : تحقیق مذاق کی چیز نہیں۔ مخطوطہ جعلی ہو کہ نہ ہو مصنف نے غیر سنجیدگی سے ان اشعار کو پیش کر کے
یقیناً نادانستہ جعل کیا ہے کیونکہ ظاہراً یہ شعر انھیں کی تصنیف ہیں۔

ص ۳۸۰۔ بیابانِ فنا ہے بعدِ صحرائے طلب تازی ‏ ‏ ‏ پسینہ توسن ہمت کا سیل خانہ زیں ہے ‏ $\frac{۲۶۲}{۱۰۹}$
نسخۂ عرشی میں "تازی" کی جگہ "غالب" ہے۔ یہاں تازی تخلص معلوم ہوتا ہے کیونکہ تازی کے معنی
ہیں عربی زبان میں "عربی گھوڑا، شکاری کتا"۔ تازی کے یہاں کوئی معنی نہیں۔

ت : ایک فارسی مصدر تاختن ہے جس کے معنی دوڑنا، جھپٹنا ہیں۔ طلب تازی کے معنی طلب پورا
کرنے کے لئے بھاگ دوڑ۔

ص ۳۸۴ صفائے اشک میں داغِ جگر آئینہ پرتو ہیں ‏ ‏ ‏ پرِ طاؤس برقِ ابرِ چشم اشکِ باراں ہے ‏ $\frac{۲۶۶}{۱۱۰}$
قافیہ بیک وقت "ناداں" بھی پڑھا جا سکتا ہے اور "باراں" بھی۔

ت : معلوم ہوتا ہے کہ پہلے سہواً "ناداں" لکھ گئے تھے بعد میں "د" کا اوپری بایاں سرا پھیل کر "ر"
بنائی لیکن ناداں کی "نا" کا نقطہ باقی رہ گیا۔ فی الحال "اشک باراں" بدونِ اضافت پڑھئے۔

ص ۳۸۷ اسد بندِ قبا ہے غنچۂ گلزار سامانی ‏ ‏ ‏ اگر ہووے شگفتن جوش یک عالم گلستاں ہے ‏ $\frac{۲۶۸}{۱۱۱}$
شگفتن محلِ نظر ہے۔ اوّل تو مصدر مناسب نہیں۔ پھر بندِ قبا کھلتا ہے، کھلتا نہیں۔

ت شگفتن غنچہ کی رعایت سے آیا ہے۔ جوش پر اضافت نہ لگائیے "شگفتن جوش" ایک ترکیب ہے۔
شعر کی قرأت یوں بہتر رہے گی۔

اسد بندِ قبا ہے غنچۂ گلزار سامانے ‏ ‏ ‏ اگر ہووے شگفتن جوش یک عالم گلستاں ہے

ص ۳۹۳۔ کثرتِ جوشِ سویدا سے نہیں تل کی جگہ ‏ ‏ ‏ خال کب مشاطے سکتی ہے کاکل کے تلے ‏ $\frac{۲۷۲}{۱۱۳}$
"کثرتِ جوشِ سویدا" مہمل ترکیب ہے۔

ت : مہمل نہیں ۔سویدا دل کا مرکز ہوتا ہے ۔ یہاں مراد ہے عاشقوں کے دلوں کی کثرت ۔ یہ دل یار کے بالوں میں بھرے ہیں ۔سویدا خال کی رعایت سے آیا ہے ۔

ص ۳۹۷ ۔ زباں بکامِ خموشاں ز فرطِ تلخیِ ضبط ۔ برنگ پستہ بزہراب دادہ پیکاں ہے $\frac{۲۷۴}{۱۱۴}$

پستہ سہو کاتب ہے ۔ صحیح بستہ ہے ۔ غالب کے ہاتھ کے نسخے میں 'پستہ' کیونکر لکھا ہوتا ۔

ت : واقعی 'پستہ' لکھنے کا جواز مجھ میں نہیں آتا ۔ شعر کا متن بالکل نسخۂ بھوپال کے مطابق ہے ۔ پستہ ، بھی سبز ہوتا ہے لیکن بستہ مراد لینے سے دوسرے جزو کے کوئی معنی نہیں رہتے ۔ اب تو صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ ذہنی غیر حاضری کی وجہ سے بستہ کی جگہ پستہ لکھ گئے ۔

ص ۳۹۸ ۔ لبِ گزیدۂ معشوق ہے دلِ افگار ۔ نشانِ جوہرِ شمشیر زخمِ دنداں ہے ۔ ایضاً

جوہر کاٹ کے لئے استعمال نہیں ہوتا ۔ وصف اور جوہر میں فرق ہے ۔ نسخۂ بھوپال میں برشِ شمشیر ہے ۔

ت : جوہر کے ایک معنی اچھے فولاد کے ان ذرہ نما نقطوں یا دھاریوں کے بھی ہیں ، جو فولاد کے کھرے ہونے کی شہادت دیتے ہیں ۔ یہاں وہی مراد ہیں ۔

ص ۳۹۹ ۔ بر خاک اوفتادگیِ کشتگانِ عشق ۔ ہے سجدۂ سپاس بمنزل رسیدگی $\frac{۲۷۶}{۱۱۵}$

'خاکِ اوفتادہ' کی جگہ خاکِ اوفتادگی یا خاکِ افتادگی مرزا نہیں لکھ سکتے تھے ۔

ت : خاک پر اضافت نہیں ، پہلے مصرعے کے معنی ہیں ۔ کشتگانِ عشق کا خاک پر گرنا

ص ۴۰۴ ۔ سخن تاریک طبعوں کا ہے اظہارِ کسافت ہا $\frac{۲۸۰}{۱۱۷}$

جن حضرت نے یہ غزل از رہِ غالب ترسی موزوں کی ان کو کثافت کے ہجے نہیں آتے تھے ۔

ت : لیکن الف کے ص ۴۷ ، اور حسین کے ص ۱۴۷ پر :

ع لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی

میں تو کثافت کے ہجے ٹھیک لکھے ہیں ۔ اب میری ایک عرض سنئے قدیم مخطوطوں میں یہ نہایت عام ہے کہ مثنوی کو مسنوی لکھا ہوتا ہے ۔ میں نے ایک بزرگ عالم سے پوچھا کہ اس کی کیا وجہ ہے ۔ انھوں نے تاویل کی کہ س کی طرح درمیانی ث کو بھی شوشے کے علاوہ طویل کشش سے (س) کی طرح لکھ سکتے ہیں اور لکھتے ہیں اور چونکہ پرانے زمانے میں نقطے لگانے کی پابندی نہیں کی جاتی تھی اس لئے لمبی کشش کے ساتھ ث کے نقطے حذف کر دیتے تھے جس سے بالکل س جیسا معلوم ہونے لگتا تھا ۔

اس نسخے میں 'کسا فتھا' ہیں بالکل وہی بات ہے۔ ث کوسنوی کے ث کی طرح لکھا ہے۔

ص ۱۳م، م۱۴ کا فٹ نوٹ۔ حقیر کمال تبخالہ لب کو درست نہیں سمجھتا کیونکہ میرزا نے یہ ترکیب استعمال کی ہے اس لیے عین کے ص ۱۸، اور الف کے ورق ۹ ب پر مصرع 'تبخالۂ لب ہونہ سکا آبلہ پا' پر جو اعتراض کیا گیا تھا واپس لیا جاتا ہے۔

ت: مندرجہ مصرع کتابچے ص ۵۳ پر ہے۔ وہاں اس مصرع پر یا 'تبخالہ' پر کوئی اعتراض ہی نہیں۔ واپس کسے لیا۔

ص ۱۶م گفتم کہ اسد؟ گفت دل آشفتۂ من ۲۹۲/۱۳۲

میرزا فارسی میں ابتدا ہی سے غالب تخلص کرتے تھے۔ اس رباعی میں اسد تخلص ہونا ثابت کرتا ہے کہ یہ الحاقی کلام ہے۔

ت: ڈاکٹر محمد سحر بہت پہلے توجہ دلا چکے ہیں کہ نسخۂ بھوپال میں جو فاتحۂ فارسی (قصیدہ) شامل ہے اس میں اسد تخلص ہے جس سے معلوم ہوا کہ مرزا نے شروع میں فارسی میں اسد تخلص استعمال کیا تھا۔

ص ۱۸م آپہنچے ہیں تا سوادِ اقلیم عدم اے عمر گذشتہ یک قدم استقبال ۲۹۴/۱۲۴

کیا ۱۹ برس کی عمر میں وہ "تا سوادِ اقلیم عدم" آگئے تھے۔ یہ رباعی یقیناً بہت بعد کی ہے۔

ت: یہ نسخۂ بھوپال میں بھی پائی جاتی ہے۔ اگر ۲۵ برس کی عمر میں "تا سوادِ اقلیم عدم" پہنچنے کا مضمون باندھا جا سکتا ہے تو ۱۹ برس کی عمر میں روایتی خیال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

آخر میں جعل کے امکانات پر غور کیا جائے تو بات عقل کی کسوٹی پر نہیں ٹھہرتی۔ ان کے الزامات میں بھی کسی قدر تضاد بیانی ہے۔ مثلاً م۵، م۷، ۱۵۲، اور دوسری کئی جگہوں پر کہتے ہیں کہ مخطوط بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں لکھا گیا۔ دوسری طرف بعض جگہ اسے ۱۹۶۹ء کا کارنامہ قرار دیتے ہیں۔

شلاً: ع " برقِ خرمن ہائے گوہر ہے نگاہِ تیز یہاں

عین میں یہاں بخطِ غالب الف کے لئے مائکروفلم تیار ہونے کے بعد لکھا گیا ہے۔ یہ بات کسی شک وشبہ کے شائبے کے بغیر ثابت ہے کہ سنہ ۱۹۶۹ء میں یہاں اس مصرع میں بخطِ غالب لکھا گیا ہے۔ نتیجہ، جس نے سنہ ۱۹۶۹ء میں اس مصرع میں یہاں لکھا ہے۔ اسی نے سنہ ۱۹۶۹ء میں یا ایک آدھ برس پہلے

مخطوطہ بخطِ غالب لکھا ہے (ص ۹۹ -)

اور عین میں تین لفظوں کی مبینہ تحریف پر کہتے ہیں۔

"یہ وسط سنہ ۱۹۶۹ء کا واقعہ ہے یعنی بخطِ غالب تصحیح کرنے والا موجود تھا۔ مخطوطہ لکھنے والا سنہ ۱۹۶۹ء میں موجود تھا۔" (ص ۳۶۶)

"یہ نسخہ غالب کی صد سالہ برسی سے کچھ ہی پہلے لکھا گیا ہے۔" (ص ۳۶۶)

بیسویں صدی کی چھٹی دہائی سنہ ۱۹۵۱ء سے سنہ ۱۹۶۰ء تک ہے۔ سنہ ۱۹۶۹ء ساتویں دہائی میں آتا ہے۔ کوئی نسخہ بہ یک وقت بیسویں صدی کی چھٹی دہائی اور سنہ ۱۹۶۹ء میں نہیں لکھا جا سکتا۔ شاید مصنف نے "چھٹی دہائی"، انگریزی کے لفظ Sixties کا ترجمہ ہے۔ اس کا احاطہ سنہ ۱۹۶۰ء سے سنہ ۱۹۶۹ء تک ہے۔ ظاہر ہے کہ ترجمہ صحیح نہیں ہے وہ مرتب نسخۂ عرشی زادہ سے بہت کھٹکے ہوئے ہیں۔ بارباران کے مادی اور روحانی وسائل کی طرف معنی خیز اشارہ کرتے ہیں۔

"یہ لکیریں بعد میں پھیری گئی ہیں۔ جین بھی اس غزل کو نیزے کے قلم سے نہیں کسی روشنائی والی جدید قسم کی پنسل[1] سے کاٹا گیا ہے اور اس سے اگلی غزل پر رم بنایا گیا ہے۔" ص ۴۱۱

لیکن مرتب الف کو بھی بری کرنے کو تیار نہیں۔ دونوں مرتبوں کے بارے میں لکھتے ہیں: "یہ تحریفیں اس بات کی طرف اشارہ ہیں کہ الف اور عین کے مؤلف بھی اس مخطوطے کے جعلی ہونے کے بارے میں مطمئن تھے۔" (ص ۱۴۷، ۱۴۸)

"علمی کام میں نیتوں پر شک کرنا معیوب بات ہے لیکن اس 'مخطوطے' کے سلسلے میں نیتوں کا کھوٹا ہونا بھی ثابت ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جان بوجھ کر یہ مخطوطہ منوایا گیا۔ . . . الف میں جو مصرع قلم زد نہیں ہے اس کو قلم زد بنایا گیا ہے۔ شاید الف کے مؤلف بھی اس مصرع کو قلم زد کرنا چاہتے تھے لیکن بھول گئے۔" (ص ۳۲)

"نثار احمد فاروقی۔۔۔ 'مخطوطے' سے زیادہ واقف ہیں اور اس کو منظرِ عام پر لانے میں انھوں نے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔"

"اس تحریف سے الف اور عین کے مرتبین کے کام کے بارے میں بھی مناسب نتائج اخذ

---

[1] بال پوائنٹ پین کی طرف اشارہ ہے۔

کیے جا سکتے ہیں۔

مخطوطہ شفیق احمد بھوپالی کے پاس سے دستیاب ہوا جس نے ایک کباڑی سے خریدا تھا شفیق سے توفیق امروہوی نے لیا۔ اس کے بعد یوپی آرکائوز کے ایک افسر جلال الدین نے اس کا معائنہ کیا۔ اگر اس کا کاغذ حال کا ہوتا تو آرکائوز والا کم از کم یہ تو شناخت کر سکتا تھا۔ مرتب الف اور جیم تو بعد میں سامنے آتے ہیں۔ عرشی زادہ نسخے کی دریافت کے تقریباً ایک مہینہ بعد اسے رامپور لاتے ہیں۔ اگر مخطوطے کی تیاری ان کا[1] کارنامہ ہوتی تو وہ شفیق بھوپالی جیسے مجہول شخص کو کیوں آلۂ کار بناتے۔ پھر شفیق اور توفیق میں مقدمہ بازی ہوئی ہے۔ توفیق نثار احمد فاروقی اور اکبر علی خان کے تعلقات بھی خوش گوار نہیں۔ اگر ملی بھگت ہوتی تو کہیں کسی موقع پر کوئی تو بھانڈا پھوڑ دیتا۔ میرے لئے سب سے بڑی داخلی شہادت یہ ہے کہ مخطوطے میں جس رنگ کے تقریباً پونے دو سو نئے اردو اشعار اور کئی فارسی رباعیات ہیں نیز جس طرح کئی شعروں کی قدیم تر قرأت دی ہے وہ آج کل کسی عالم سے ممکن نہیں۔ اگر مصنف کے بقول جعل ساز نے منجملہ دوسرے نسخوں کے نسخۂ شیرانی، لطیف ایڈیشن اور دیوانِ غالب طبع اول سے استفادہ کیا تو وہ بہت بڑا محقق ہوگا کیونکہ نسخۂ شیرانی لاہور میں اگست ۱۹۶۹ء میں چھپا۔ خود نوشت مخطوطے کی دریافت سے پہلے اس کا عکس محض عرشی صاحب کے پاس تھا۔ اسی طرح لطیف ایڈیشن جو کبھی شائع نہیں ہوا جزوی حیثیت سے محض عرشی صاحب کے پاس تھا۔ کوئی عالم اس قسم کے مفت کرم داشتن کام میں کیوں اپنا وقت ضائع کرے گا۔

اگر یہ جعل ہے تو اس کے لئے غیر معمولی علم کی ضرورت رہی ہوگی۔ لیکن مصنف کے نزدیک یہ بچوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ وہ واضح کی کم سوادی میں کیا کیا مبالغہ کرتے ہیں۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جن نسخوں کو سامنے رکھ کر اس مخطوطے کا بلیو پرنٹ تیار کیا گیا تھا ان میں نسخۂ بھوپال اور نسخۂ شیرانی کے اختلافات کے بارے میں ضروری معلومات درج نہیں" (ص ۱۲۵)

مصنف نے دسیوں بار لکھا ہے کہ مخطوطہ نسخۂ عرشی سے تیار کیا گیا اور اس میں ان اختلافات کی تفصیل دی۔

---

[1] میں ایسی بحث کے لئے عرشی زادہ اور نثار احمد فاروقی صاحب سے معذرت چاہتا ہوں۔ میں ان کا ذکر کر ہی اس لئے رہا ہوں کہ میرے نزدیک وہ کسی طرح ملوث نہیں۔

"یہ شعر گڑھنے والا بہت پست ذہن سطح کا متشاعر تھا جو نہ صرف غالب کے مزاجِ شاعری سے نابلد تھا بلکہ معمولی شعر بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔"

"مخطوطے کا بلیو پرنٹ تیار کرنے (والے) اس مخطوطے کو بخطِ غالب تسلیم کرنے والوں کی طرح غالب کی تصنیف کے طور غالب کے متعلق تصنیفوں سے نابلد محض تھے۔"

"مخطوطہ اصلاحاتِ معکوس کے بعد نسخۂ عرشی سے نقل کیا گیا ہے۔ یہ نسخہ ٹائپ سے چھپا ہے اور ٹائپ کا حرف پڑھنے کی مشق نہ ہو تو اکثر ایسا ہو جاتا ہے۔" ص ۲۵۵

"جن حضرات نے یہ غزل (بدست آوردن دل گوہرِ دریائے شاہی سے) از رہِ غالب ترسی موزوں کی ان کو کثافت کے ہجے نہیں آتے تھے۔ غالب کے نام پر دریافت کلام تصنیف کرنے والے یہ صاحب کچھ واجبی ہی سے پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ غالب کے مزاج سے بھی نا آشنا معلوم ہوتے ہیں۔" ص ۴۰۴

اور ناقل کی مدح میں ارشاد ہے:

"مخطوطے کے ناقل نے غلط اور غیر معتبر مصدر سے عقل کا کم سے کم استعمال کرتے ہوئے مخطوطے کی کتابت کی۔" ص ۱۲۲

اگر مخطوطہ نسخۂ عرشی سے تیار کیا گیا ہے تو یہ غلط اور غیر معتبر مصدر نہیں۔ مصنف کہیں مرتبِ الف اور مرتبِ عین جیسے ماہرینِ غالبیات پر شک کرتے ہیں تو کہیں واضح کو کم سوادِ محض قرار دیتے ہیں اور جس ناقل نے اس چابک دستی کے ساتھ غالب کی تحریر سے تحریر ملائی وہ عقل کا کم استعمال کرنے والا نہیں بلکہ اپنی جگہ پر اول درجے کا ماہرِ غالبیات ہونا چاہیے۔ ہم تو یہ جانتے ہیں:

ضمانِ جادہ رویا ندن ہے خطِ جامِ مے نوشاں — دگرنہ منزلِ حیرت سے کیا واقف ہیں مدہوشاں
بہ ہنگامِ تصور، ساغرِ زانو سے پیتا ہوں — مئے کیفیتِ خمیازہ ہائے صبحِ آغوشاں

جیسے دقیق اشعار اور:

ع شرارِ فرصتے سرمایۂ چندیں چراغاں ہے

جیسی مشکل لیکن بامعنی فرسودہ تر قرأتیں ہی زمانہ کسی اردو والے سے ممکن نہیں۔ مصنف کی غیر معمولی محنت اور کوشش کے باوجود میں قائل نہ ہو سکا کہ نسخۂ غالب کی تصنیف نہیں۔ اس کے اشعار پکار پکار کر اپنے خالق کا اعلان کر رہے ہیں۔ اردو میں اور کون ایسا کج فکر و ژولیدہ بیان ہو سکتا ہے ••

ڈاکٹر اسلم پرویز

متنی تنقید اور دیوانِ غالب

نسخۂ عرشی

اُردو میں اگرچہ متنی تنقید کے موضوع پر بس گنتی کی ایک دو کتابیں ہی ہیں لیکن پچھلے برسوں میں تدوینِ متن کے بعض بہترین نمونے ضرور سامنے آئے ہیں اس سلسلے میں حافظ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، مولانا امتیاز علی عرشی اور ان سے تھوڑا آگے چل کر رشید حسن خاں اور خلیق انجم وغیرہ کے نام خاص طور پر لیے جا سکتے ہیں۔ تاہم تدوینِ متن کے اعتبار سے ان تمام ناموں میں جو نام بلاشبہ سب سے ممتاز اور افضل ہے وہ مولانا امتیاز علی عرشی کا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ عرشی صاحب کو عربی، فارسی اور اُردو پر مکمل عبور حاصل تھا اور وہ دینی علوم سے بھی بھرپور واقفیت رکھتے تھے۔ اور جہاں تک اردو کے کلاسیکی متون کی تدوین کا معاملہ ہے شاید ایسی ہی صلاحیتوں کا اسکالر اس کام کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہے لہٰذا اُردو میں تدوینِ متن کے بے نظیر نمونوں کی جو بھی تعداد ہے ان میں نصف سے زیادہ مولانا امتیاز علی عرشی کے کارنامے ہیں۔ اگر ہم اپنی بات کو صرف اُردو کے کلاسیکی متون تک محدود رکھیں تو عرشی صاحب کے تدوین کے کارناموں میں 'مکاتیبِ غالب'، 'شعرائے اُردو کا فارسی تذکرہ دستور الفصاحت' اور 'دیوانِ غالب نسخۂ عرشی' نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔ عرشی صاحب کی تالیفات کی فہرست پر نظر ڈالیے تو جس ایک موضوع پر انھوں نے سب سے زیادہ کام کیا ہے

وہ ہے غالب۔ انھوں نے غالب میں اپنی دلچسپی کا سب سے پہلا ثبوت ۱۹۳۷ء میں مُکاتیب غالبؔ کی شکل میں بہم پہنچایا۔ اور غالب میں ان کی اس دلچسپی کا نقطۂ عروج ہے دیوانِ غالب نسخۂ عرشی جو مکاتیب غالبؔ کی اشاعت کے اکیس برس بعد ۱۹۵۸ء میں منظرِ عام پر آیا۔ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۵۸ء کے درمیان عرشیؔ صاحب نے غالبؔ کی سماجی اور ادبی شخصیت کے کِن کِن گوشوں کی کیسی کیسی سیر کی ہے اس کا اندازہ دیوان غالب نسخۂ عرشی میں شامل ان کے حواشی سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

ایک ذمّے دار متنی نقاد جب کسی کلاسیکی متن کی تدوین کا کام اپنے ہاتھ میں لیتا ہے تو وہ تدوین متن کی تمام ضروریات کو اپنے پیشِ نظر رکھتا ہے جن میں بنیادی کام مستند متن کی تیاری کا ہے جو ان تمام مخطوطات اور مطبوعہ نسخوں کی بنیاد پر کیا جاتا ہے جو تدوین متن کے وقت تک دستیاب ہوں۔ مستند یا بنیادی متن کی تیاری کے بعد وضاحت طلب امور کی جانب توجہ کی جاتی ہے یہاں متن کا مرتب اس متن سے متعلق اپنی ترجیحات کو کام میں لاتا ہے۔ تاہم وضاحت طلب امور کا کوئی مقررہ پیمانہ بھی نہیں ہے بلکہ اس بات کا دارومدار مرتب کی صلاحیت اور اس کی وسعت نظر پر ہے۔ اس کی نظر جتنی گہری ہوگی وضاحتی معاملات بھی اتنے ہی بسیط ہوتے چلے جائیں گے۔ اس کے علاوہ تدوین متن کا ایک سائنٹفک طریقہ یہ بھی ہے کہ زیرِ تدوین متن کے مصنف کی شخصیت کو بھی متن ہی کا ایک ضروری جز تصور کیا جائے۔ کوئی بھی متن اور اس کا مصنف دو ایسی گتھیاں ہیں جو اپنے اپنے طور پر تو اُلجھی ہوئی ہیں ہی اسی کے ساتھ ساتھ وہ ایک دوسرے میں بھی بے طرح گتھی ہوئی ہوتی ہیں اس لیے جب تک دونوں ہی پوری طرح نہ سلجھ جائیں مسئلہ صحیح معنوں میں حل نہیں ہوسکتا۔ اگرچہ متنی تنقید بھی تحقیق ہی کا ایک شعبہ ہے لیکن تحقیق اور متنی تنقید کا بنیادی فرق یہ ہے کہ تحقیق، تدوین سے ہٹ کر بھی کی جاسکتی ہے لیکن تدوین کے لیے تحقیق لازمی ہے متنی تنقید کے بارے میں یہ بات تو اکثر کہی گئی ہے کہ وہ ادبی تنقید کو مستند مواد فراہم کرتی ہے لیکن متنی تنقید خود تحقیق کے لیے جو نئے باب کھولتی ہے اس کے ثبوت کے طور پر دیوان غالب نسخۂ عرشی کے حواشی اور تعلیقات کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس اعتبار سے متنی تنقید کا فن تحقیق کے مقابلے میں زیادہ

ریاض اور دقتِ نظر کا طالب ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اردو میں اعلا تعلیم کے فروغ کے ساتھ جس تیز رفتاری سے محققین کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے اس کے مقابلے میں متنی نقادوں کی تعداد نہیں کے برابر ہے۔

پچھلے دنوں ایک صاحب سے دیوانِ غالب نسخۂ عرشی پر گفتگو ہو رہی تھی۔ یہ صاحب اگرچہ ادب کا اعلا مذاق رکھتے تھے اور عرشی صاحب کی علمیت کے بھی معترف تھے لیکن تحقیق سے شاید انھیں کوئی علاقہ نہیں تھا۔ انھوں نے بظاہر ایک بڑی معقول بات کہی اور وہ یہ کہ اگر کسی تخلیقی فن کار نے بذات خود اپنی تخلیقات کو چھان پھٹک کر ان کا ایک ایسا انتخاب قاری کے سامنے پیش کر دیا ہے جو فن کار کے نزدیک اس کی بہترین نمائندگی کرتا ہے تو پھر کسی محقق کو چاہے وہ کتنے ہی اعلا پائے کا کیوں نہ ہو یہ کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ گڑے مُردے اکھاڑے اور وہ تمام چیزیں جنھیں فن کار نے رطب و یابس سمجھ کر خارج کر دیا تھا انھیں پھر سے اس کی تخلیقات میں شامل کر کے ان کی دھار کند کرے۔ اس بات میں اگرچہ وزن معلوم دیتا ہے تاہم اس کا معقول جواب دیا جا سکتا ہے تخلیقی ادب سے متعلق کسی متن کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں۔ ایک حیثیت اس متن کی ادبی شہ پارے کی ہے جس کا براہِ راست تعلق ادب کے قاری سے ہے۔ اس حیثیت سے یقیناً دیوانِ غالب مرتبہ اسد اللہ خاں غالب ہی اصل دیوانِ غالب ہے متن کی دوسری حیثیت ادبی ماخذ کی ہے یہ متن کی وہ حیثیت ہے جہاں اس کے حدود و اطراف کا کوئی تعین نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ یہاں اس متن کے حدود و اطراف میں خود اس متن پر کام کرنے والے محقق یا مرتب کے حدود و اطراف بھی شامل ہیں۔ غالب یا کسی بھی ادیب کی کوئی تحریر اس کی اپنی ادبی اور سماجی شخصیت کا ماخذ تو ہے ہی اس کے ساتھ ساتھ وہ اس کے عہد کے ادبی اور سماجی رویوں کا بھی اہم ماخذ ہے اصل سوال یہ ہے کہ ان حدود و امکانات کی بازیافت کا کسی محقق یا متنی نقاد کے پاس کتنا سامان موجود ہے۔ ادب کے قاری کے لیے غالب یا کسی بھی شاعر کا کلام ایک شعری مجموعے یا دیوان کی حیثیت رکھتا ہے جو ہمارے ذوق کی تسکین کا سامان ہونے کے ساتھ ساتھ اس وقت تک نقدِ ادب کا بھی موضوع رہتا ہے جب تک کوئی متنی نقاد اس کے گم شدہ یا نئے سیاق سباق کو سامنے نہ لے آئے۔ اس اعتبار

ہے ایک سنجیدہ متنی نقاد کا کام رگِ سنگ سے لہو ٹپکانا ہے۔ دیوانِ غالب نسخۂ عرشی اسی رگِ سنگ سے لہو ٹپکانے کا دوسرا نام ہے۔

اس نہج کی تدوین سے جہاں غالؔب کے کم و بیش تمام اشعار زمانی ترتیب سے یکجا کر دیے گئے ہیں بہت سے نئے نکات بھی سامنے آتے ہیں مثلاً جن اشعار کو غالب نے رد کیا یا جنھیں اپنے دیوان میں برقرار رکھا ان کے غائر مطالعے سے اس بات کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ غالؔب کے ہاں ردّ و قبول کا کیا معیار تھا اس ردّ و قبول کے ضمن میں الفاظ کے املا اور تلفظ سے لے کر شعری موضوعات اور طریقۂ اظہار تک کے مسائل زیرِ بحث آ سکتے ہیں۔

دیوانِ غالؔب نسخۂ عرشی کے تمام ہی حواشی غالؔب کی شخصیت اور شاعری پر غور و فکر کرنے کے نقطۂ نظر سے انتہائی اہم ہیں تاہم یہاں مختصر سا تذکرہ اس مضمون کا کیا جا سکتا ہے جو نسخۂ عرشی کے تعلیقات میں 'شرحِ غالؔب' کے عنوان سے شامل ہے۔ اس گفتگو میں 'شرحِ غالؔب' ہی کو خاص طور پر معرضِ بحث میں لانے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ 'شرحِ غالؔب' تحقیق و تدوین ہی نہیں مطالعۂ شاعری کے نقطۂ نظر سے بھی کافی اہم ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر کر دینا بھی ضروری ہے کہ دیوانِ غالؔب نسخۂ عرشی کی تکمیل کے آٹھ سال بعد ۱۹۶۶ء میں پرتھوی چند نے 'مرقعِ غالب' شائع کی تھی 'مرقعِ غالب' کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی تحریک کو شاید نسخۂ عرشی کے اسی مضمون سے ہوئی ہے جس کا عنوان 'شرحِ غالب' ہے۔ تاہم میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ 'مرقعِ غالب' کا دائرہ، باوجود اس کے کہ وہ شرحِ غالؔب کے بعد کی تالیف ہے 'شرحِ غالب' کے مقابلے میں تنگ ہے۔

'شرحِ غالب' سے تنقیدی سطح پر تحریک حاصل کرنے والوں میں شاید سب سے پہلا نام ڈاکٹر سید عبداللہ کا ہے۔ نذرِ عرشی مرتبہ مالک رام و مختار الدین احمد میں 'غالب ـــــ دو زبان شاعر' کے عنوان سے ڈاکٹر سید عبداللہ کا جو مضمون شامل ہے اس میں غالب کی فارسی دانی سے متعلق دل چسپ انکشافات ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ غالب کو اپنی فارسی دانی پر بے پناہ ناز تھا یہاں تک کہ وہ اپنے ریختے کو بھی اپنے فارسی کلام سے کم تر درجے کا سمجھتے تھے یہ اور بات ہے ان کا یہی ریختہ ان کی فارسی کو چھوڑ کر بقیہ فارسی کے لیے رشکِ فارسی تھا۔ غالب اپنی فارسی دانی کا کتنا ہی دعوا کیوں نہ

کریں لیکن یہ حقیقت ہے کہ فارسی ان کی اکتسابی اور اردو مادری زبان تھی۔ فارسی کی مثال غالب کے ہاں برسات کی ان بوندوں کی سی ہے جن میں وہ شرابور رہتے لیکن برسات کی وہ تو قاتل ہوا جو تیر سی سینے کے پار گزر رہے ہے وہ تو اردو ہی ہو سکتی ہے دراصل مدنیت کا طرۂ امتیاز وہ مہذب ریا کاری بھی ہے جسے کلاہِ پاپاخ کی طرح لوگ امتیازی شان کے ساتھ سر پر اٹھائے پھرتے ہیں۔ اسی پر سٹیج سمبل کا شکار اپنے زمانے میں غالب بھی تھے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے شرح غالب کے مطالعے کی روشنی میں فارسی دانی سے متعلق غالب کی اسی سائیکی کو بروئے کار لانے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ انھوں نے غالب کے بارے میں یہ بات بالکل صحیح کہی ہے کہ فارسی غالب کے لیے اکتساب اور اظہارِ حقیقت کی اور اردو جذبوں کی زبان تھی۔ 'شرح غالب' میں عرشی صاحب نے غالب کے بعض اردو اشعار کے مقابلے میں لگ بھگ اسی مضمون کے غالب کے فارسی شعر بھی دیے ہیں۔ ایک اردو شعر اور اس سے ملتا جلتا فارسی شعر اس طرح ہیں:

مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا
کس قدر یارب ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا (اُردو)

لالہ وگل دمد از طرفِ مزارش پسِ مرگ
تا چہا در دلِ غالب ہوسِ روئے تو بود (فارسی)

ڈاکٹر سید عبداللہ نے ان دونوں اشعار سے بحث کرتے ہوئے فارسی شعر پر اردو شعر کی فضیلت ثابت کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"دونوں شعروں کا مضمون تقریباً یکساں ہے لیکن لفظوں کا انتخاب، اظہار کا پیرایہ، اور فضا مختلف ہیں۔ فارسی شعر میں محض اظہار ہے۔ اس کے مقابلے میں اُردو شعر میں اظہار مؤثر اور بلیغ بھی ہے مضمون کا مرکزی لفظ فارسی شعر میں لالہ وگل ہے اور اُردو میں حنا۔ "لالہ وگل" بھی خوب ہے، مگر اس میں عمومیت ہے "حنا" سے ایک خاص اور معین تصور وابستہ ہے۔ لالہ وگل سے صرف یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ چہرہ خوبصورت ہوگا۔ مگر حنا سے پاؤں پر لگی ہوئی حنا کی تصویر واضح اور معین ہو جاتی ہے اور یہ تخیل کو واضح راستہ

پر چلنے کی تحریک کرتی ہے، اس کے بالعکس گل ولالہ مبہم تصور پیدا کرتے ہیں۔

اس کے بعد "طرفِ مزار" اور "مشہدِ عاشق" کا فرق آتا ہے۔ "مزار" میں محض مرنے کا تخیل ہے "مشہد" میں کسی کے ہاتھ سے شہید ہونے کا تصور اور اس کے جملہ متعلقات (خون، شمشیر اور طشت و تیغ وغیرہ) سامنے آتے ہیں اور تخیل کو بڑے جذباتی راستوں کی طرف راجع کر دیتے ہیں "مشہد سے کوسوں تک" کے مقابلے میں "طرفِ مزار" میں تنگی کا بھی احساس ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مزار کہنے کے بعد پسِ مرگ کی ضرورت نہ تھی شعری مجبوری نے یہ اضافہ کرایا ہے۔

دوسرے مصرعے میں ہوسِ روے تو، کے مقابلے میں ہلاکِ حسرتِ پابوس کی ترکیب کتنی شدید تمنا اور گہرے جذبے کا اظہار کرتی ہے۔ ہوس اور حسرت کا فرق ظاہر ہے۔ اسی طرح یہ کہنا کہ، مجھے "تیرے چہرے کی ہوس" تھی۔ ایک بے کیف طریقۂ اظہار ہے۔ اس کے مقابلے میں "ہلاکِ حسرتِ پابوس" (پابوسی کی حسرت میں مرتا ہوں) مؤثر تر پیرایۂ بیان ہے۔

اُردو شعر یہ بھی سمجھاتا ہے کہ عاشق کی شہادت کا خون جہاں جہاں بہ کر گیا، وہاں ہر طرف دور دُور تک حسرتِ پابوس جاگ اٹھی۔ اس حسرتِ پابوس نے حنا کی صورت اختیار کر لی۔ چنانچہ عاشق کی شہادت گاہ سے کوسوں دور تک حنا اُگ آئی ہے۔ اس سے عاشق کی حسرتِ دل ظاہر ہوتی ہے اور یہ بھی کہ محبوب کے حنائی پاؤں کا نقش عاشق کے دل میں کس طرح کھبا ہوا تھا کہ مرنے پر بھی اس کے آثار نہ صرف اُبھر آئے بلکہ دُور دُور تک پھیل گئے۔

پابوس کی جسارت کے ساتھ مشہد کا لفظ بے حد مناسب ہے۔ بیان کے انداز نے بھی تاثیر پیدا کی ہے، "کس قدر" کے بعد "یارب" کا کلمۂ دعائیہ (جو یہاں کلمۂ استعجاب و حیرت ہے) فراوانی، وسعت، شدت کا اظہار کر رہا ہے۔ "یارب" کے استعمال سے بلاغت پیدا ہو گئی ہے (جو فارسی کے "دِ چہا" میں نہیں اگرچہ اپنی جگہ وہ بھی خوب ہے)۔

یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ فارسی کا شعر، شاعرانہ مفروضے کی کمزور سی صورت ہے۔ اس میں واقعے یا معاملے کا موضوع خود غالب ہے، جس نے اپنی زبان سے اپنے مزار کا ذکر کر کے اس پر لالہ و گل اُگائے ہیں۔ یہ فرضی صورت کوشش کے باوجود، باور نہیں کی جا سکتی۔ یہ محض خواب ہے یا آئندہ کا تصور کہ شاعر جیتے جی اپنی قبر کو خود دیکھ رہا ہے۔ اس سے ہمارے واقعاتی اعتماد کو ذرا سا دھکا لگتا ہے

بخلاف اس کے اُردو شعر میں، کسی شہید عاشق کا واقعہ بیان ہوا ہے اور اس کے مشہد کے چاروں طرف جنا کی موجودگی، ایک چشم دید صورتِ حال کا بیان ہے، جسے ایک راوی بیان کر رہا ہے۔ اس سے ہمارے اعتماد کو کوئی صدمہ نہیں پہنچا۔ فارسی شعر میں صیغۂ متکلم نے شعر کی فضا بگاڑ دی ہے، اُردو شعر میں راوی کے بیان نے یقین پیدا کر دیا ہے۔"

گویا یہاں جذبے کے اظہار میں غالب کا اردو شعر غالب کے فارسی شعر پر سبقت لے گیا۔ شرحِ غالب کے مطالعے سے ایک دوسری صورت یہ بھی دیکھنے کو ملتی ہے کہ اساتذۂ فارسی کے خیال کو غالب نے جہاں اُردو کا جامہ پہنانے کی کوشش ہے وہاں اُردو میں باوجود خوب صورت شعر کہہ لینے کے وہ اس کے ہم پلّہ فارسی شعر کی بلندیوں کو چھو لینے سے اکثر قاصر رہے ہیں۔ غالب کا شعر ہے:

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

حافظ کا شعر ہے:

آفریں بر دلِ نرمِ تو کہ از بہرِ ثواب
کشتۂ غمزۂ خود را بنماز آمدۂ

اُردو شعر میں "زود پشیماں کا پشیماں ہونا" یقیناً غالب ہی کا حصّہ ہے جسے حافظ کے "کشتۂ غمزۂ خود را بنماز آمدۂ" کے عین مساوی قرار دیا جا سکتا ہے لیکن حافظ کے پہلے مصرعے کے "آفریں بر دلِ نرمِ تو" کے مقابلے میں غالب کا "کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ" سبک رہ جاتا ہے۔ غالب کا ایک اور شعر ہے:

مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں
شایانِ دست و خنجرِ قاتل نہیں رہا

غالب کے اس شعر میں نظیری کے اِس فارسی شعر کا عکس دکھائی دیتا ہے:

آں شکارِ من کہ لایق ہم بکُشتن نیستم
شرم می آید مرا زاں کس کہ صیّادِ منست

سوال پھر وہی ہے کہ کیا غالب کا اُردو شعر نظیری کے فارسی شعر کی بلندیوں کو چھو سکا ہے ـــــ ڈرتے ڈرتے کہنا پڑتا ہے شاید نہیں۔ غالب کے شعر میں سارا زور صرف مرنے پر ہے دستِ قاتل سے نہ سہی کسی اور طرح سہی۔ فارسی شعر میں اصل المیہ یہ ہے کہ عاشق یا شاعر مرنے کے لائق ہی نہیں رہا اور اس کے ہاں قاتل کی جانب غالب کی سی لاتعلقی بھی نہیں بلکہ وہ اپنے صیاد سے شرمندہ ہے کہ وہ اس کے ہاتھوں مارے جانے کا اہل نہیں رہا۔ اسی کے ساتھ کہیں کہیں ایسی مثالیں بھی جہاں غالب کا ریختہ رشکِ فارسی دکھائی دیتا ہے۔ عرفی کا فارسی شعر ہے :

از من بگیر عبرت و کسبِ ہُنر مکن
با بختِ خود عداوتِ ہفت آسماں مخواہ

عرفی کے اس شعر کا عکس غالب کے جس اُردو شعر میں نظر آتا ہے وہ عرفی کے شعر سے روشن تر ہے۔ غالب کا شعر ہے :

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہُنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب دُشمن آسماں اپنا

عرفی کے دونوں مصرعے سپاٹ ہیں جن میں تہ داری یا گہرائی نہیں جب کہ غالب کا پہلا مصرع ہی آسمان کی بلندیوں کو چھوتا ہوا دکھائی دیتا ہے اسی طرح عرفی کے دوسرے مصرعے میں آسماں کی دشمنی کا خدشہ ہی ظاہر کیا گیا ہے جب کہ غالب کے ہاں آسمان دُشمن ہو بھی چکا۔

غرض اس گفتگو کو یہ کہہ کر ختم کیا جا سکتا ہے کہ ضروری نہیں کہ اعلا پایے کی تدوین آپ کے سامنے صرف خشک اور بے مزہ موضوعات کا انبار ہی لگاتی ہو۔ وہ مذاقِ ادب کے نئے دبستان بھی کھولتی ہے۔

منیر احمد شیخ

کلام غالب کے پنجابی تراجم

(پاکستان میں)

ترجمہ کیوں ؟

اس موضوع پر قلم اُٹھاتے وقت میرے ذہن میں چار سوالات اُٹھے : پہلا سوال یہ کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنے کی کیا ضرورت ہوتی ہے ؟ دوم یہ کہ شاعری کا ترجمہ کیوں ضروری ہے ؟ تیسرے یہ کہ اُردو زبان کے شعرا میں غالب کا ترجمہ کیوں ضروری ہے ؟ اور چوتھے یہ کہ کلام غالب کا پنجابی میں ترجمہ کرنے کی اہمیت کیا ہے ؟

پہلا سوال کہ ترجمے کی کیوں ضرورت ہوتی ہے، تو اس کے بارے میں مَیں یہ کہوں گا کہ زبانوں پہ انسان کی قدرت بہت محدود ہوتی ہے ۔ یہ ممکن نہیں کہ وہ دنیا بھر کی زبانیں بول یا سمجھ سکے ۔ اس مختصر سی عمر میں یہ ایک ناممکن عمل ہے ۔ انسان کوشش کے باوجود مادری زبان کے علاوہ صرف چند زبانیں سیکھ سکتا ہے ۔ اس معاملے میں اس کی صلاحیتیں بہت محدود ہیں ۔ لہٰذا اپنی زبان کے علاوہ دنیا کی دوسری زبانوں کے علم و ادب اور ان کی فکر تک رسائی کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ترجمہ ہے ۔

یہ ذریعہ کامیاب ہے یا کمزور، اچھا ہے یا بُرا جو بھی ہے، دنیا تک پہنچنے اور اسے سمجھنے کا اس

سے بہتر اور کوئی ذریعہ ایجاد نہیں ہو پایا۔ اگر ہم اس ذریعے کو ناکافی جانتے ہوئے اسے مسترد کرتے ہیں تو پھر ہمارے پاس بے خبری اور آگاہی کے درمیان اور کوئی راستہ نہیں۔ اگر ایک لسانی قومیت اپنی زبان کے اندر دوسری زبانوں کے خیالات کے در آنے کے راستے نہیں کھولتی تو وہ نہ صرف جہالت کا شکار ہو کے رہ جاتی ہے بلکہ وہ باقی تمام دُنیا سے کٹ کر کنوئیں کا مینڈک بن جاتی ہے اور فکری ترقی کے تمام راستے اُس پہ مسدود ہو جاتے ہیں۔ جہالت اور آگاہی کے درمیانی فاصلے کو پاٹنے کے لیے ترجمے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ ترجمہ لسانی قومیتوں کے درمیان رابطے کے پُل کا کام ہی نہیں کرتا بلکہ اُس زبان کو بھی وسعت بخشتا ہے جس میں ترجمے کے راستے دوسری زبان کے خیالات اور افکار سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ یورپ کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ یورپ کی لسانی قومیتوں نے اپنے لسانی تفوق کے جذبے کو تعصب میں تبدیل نہیں ہونے دیا۔ اور ایک یورپی زبان میں دوسری زبانوں کے مشاہیر علم وفن کے تراجم اس کثرت سے ہوئے کہ یورپ کے فکر وفن کے دُنیا بھر میں چرچے ہوئے اور یوں یورپ نے دنیا میں ایک اعلا تہذیبی مقام حاصل کر لیا۔

شاعری کا ترجمہ کیوں؟

دوسرا سوال یہ کہ شاعری کا ترجمہ آخر کیوں ضروری ہے جبکہ ناقدینِ ادب کی اکثریت کم وبیش اس بات پہ متفق ہے کہ شاعری کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ زیادہ سے زیادہ ایک زبان کی شاعری کا مفہوم دوسری زبان تک پہنچایا جا سکتا ہے مگر شاعری جیسے نازک فن کی نزاکتیں، اُس کے لہجے، اُس کے انداز اُس کی چاشنی ترجمے میں منتقل نہیں ہو سکتی شاعری انسان کے نازک جذبوں کا اظہار ہے اور ان جذبوں کے حسن کو پہچاننے کے لیے اُس زبان کا جاننا ضروری ہے جس میں وہ شاعری کی گئی ہے۔ ناقدینِ ادب کی اس رائے میں بہت حد تک صداقت موجود ہے۔ فنِ ترجمہ اُس معراج پہ تو نہیں پہنچ سکا کہ ایک زبان کی شاعری کو زبان وبیان کے تمام حسن اور باریکیوں کے ساتھ دوسری زبان میں منتقل کر دے اور

اور ایسا ممکن بھی نہیں کہ ترجمہ محض الفاظ کو بدل دینے کا نام نہیں ہوتا۔ یہ ایک مخصوص تہذیب کو ایک دوسری تہذیب میں منتقل کرنے کا کام ہے ہر تہذیب کے اپنے مخصوص سانچے ہوتے ہیں جو ایک قوم کے اندر صدیوں کی باہمی معاشرت سے وجود میں آتے ہیں۔ ان سانچوں کو جب دوسرے مختلف سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش کی جاتی ہے تو اس کوشش میں صرف بیان ہی نہیں، ہیئت بھی بدل جاتی ہے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ جس قدر اختلاف دو قوموں کی تہذیب میں ہوتا ہے اسی قدر بیان و ہیئت کے سانچے مختلف ہوتے ہیں اور بعض اوقات تو ترجمہ اصل سے اس قدر مختلف ہوتا ہے کہ اس میں اصل کی کوئی صورت بھی نظر نہیں آپاتی۔ ان مشکلات کے باوجود شاعری کا ترجمہ اہلِ فن اس لیے کرتے آرہے ہیں کہ فنِ ادب کی اصناف میں سے شاعری ایک ایسی صنف ہے جو کسی زبان کے لسانی ہنر و کمال کے امکانات کا سب سے اعلا فارم ہے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ کسی زبان کی شاعری مکمل طور پر لطف اندوز ہونے اور اس کے کمالِ فن کو پہچاننے کے لیے اس زبان کو جاننا اور سیکھنا ضروری ہے جس میں شاعری کی گئی ہے، مگر جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ یہ ممکن نہیں۔ دنیا کے کسی بڑے شاعر کو لے لیجیے اس کی شاعری کے محاسنِ فن اور ان کی تہوں میں اترنے کے لیے پوری عمر درکار ہے۔ یہ صرف ترجمے سے ممکن ہوا کہ ہومر، دانتے، ملٹن اور گوئٹے جیسے عظیم شعرا کا فن اور ان کے فکر کی بلندی دوسروں تک پہنچی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ جن زبانوں میں ان دیو قامت شعرا نے شاعری کی، اس زبان کی وسعتوں کا، اس کے استعمال اور اس کے فنی امکانات کا اندازہ بھی پہلی مرتبہ ہوا کہ جس میں اتنی بڑی شاعری ممکن ہو سکی۔ لہٰذا نثر کے ترجمے کی نسبت شاعری ہی کے ترجمے سے دوسری زبان کے ہنر اور فنی کمالات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ یوں بھی زبان کے ادب کو اس کی شاعری پڑھے بغیر جاننے کا دعوا ایسا ہی ہے جیسے محبوبہ کے بغیر عورت ذات کو جاننے کا دعوا۔ اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو یہاں سے فرانس گیا اور وہیں ایک فرانسیسی عورت سے شادی کر لی۔ بیوی نہایت خدمتگار اور خوبیوں والی تھی۔ بیس برس کی رفاقت کے بعد جب اس شخص سے اس کی بیوی کی تعریف کی گئی تو اس نے جواب میں کہا کہ بس یوں لگتا ہے کہ بیس برس سے میں محبت نہیں، نجت کا فرانسیسی زبان میں

ترجمہ کر رہا ہوں۔ تو شاعری کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے کہ یہ نازک جذبوں کی زبان ہے اور نازک جذبوں کے اظہار کا بہترین سانچا صرف شاعری ہے۔

غالب کا ترجمہ کیوں؟

تیسرا سوال جو میرے ذہن میں اٹھا، یہ تھا کہ اُردو شعرا میں غالب کا ترجمہ کیوں ضروری ہے؟ اس سوال کا جواب خاصا تفصیل طلب ہے مگر یہاں اختصار کے پیشِ نظر میں یہ کہوں گا کہ اُردو زبان اور اس کی شاعری کے تخلیقی کمال کو جاننے کے لیے غالب کی شاعری کا جاننا از بسکہ لازم ہے۔ غالب دنیا کے اُن دس بارہ عظیم شعرا کی صف کا رکن ہے کہ دنیا کا کوئی ادب اسے جانے بغیر شعری فکر کی بلندیوں اور عظمتوں کا ادراک حاصل نہیں کر سکتا۔ اگرچہ غالب کا اُردو کلام اور اس کے فارسی کلام کے مقابلے میں غالب کی اپنی نظر میں "بے رنگِ من است" تھا مگر غالب اُردو شاعری کی معراج ہے اور اُردو زبان کی تہذیب کی اعلاترین صورت۔ اُردو زبان کے استعمال میں جو SOPHISTICATION غالب کے یہاں ہے وہ اس کے ہم عصر اور شاہ کے اُستاد ذوق کی زبان میں نہیں ملتی۔ غالب اُردو زبان کی تہذیب کی سب سے عمدہ مثال ہے اور اس کے استعمال پہ اُسے ایسی قدرت تھی کہ وہ اس زبان کے کسی اور شاعر کے حصے میں نہیں آئی۔ لہٰذا غالب سے آشنائی اُردو زبان کی تہذیب کی اعلاترین صورت سے آشنائی ہے اور غالب سے محرومی نہ صرف اُردو شاعری سے محرومی ہے بلکہ دنیا کی اعلاترین شاعری سے محرومی ہے اور شاید اسی لیے غالب ترجمہ کرنے والوں کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج ہے اور اس چیلنج سے نبرد آزما ہونا جان جوکھوں کا کام ہے۔ اُس کے ہم عصر اور ہم زبان شعرا اور سخن شناس شاکی تھے کہ وہ ایک مشکل پسند شاعر ہے اور سمجھ میں آنے والا نہیں ہے۔ اہلِ فن جانتے ہیں کہ یہ شکایت ادب، فلسفہ اور علوم کی تاریخ میں ہر اُس شخص کے بارے میں کی گئی جس نے کسی میدان میں اجتہاد کی نئی راہیں نکالیں۔ غالب صاحبِ ایجاد شاعر تھا اور فکر کی بلندیوں کے ساتھ ساتھ زبان کے فنی استعمال پہ اسے خالقانہ قدرت حاصل تھی۔ پس غالب کی

شاعری کو دُنیا کی دوسری زبانوں میں منتقل کرنا دراصل شاعری کے کمالات کے ساتھ ساتھ اُردو زبان کی امکانی وسعتوں اور عظمتوں سے دنیا والوں کو روشناس کرانا ہے۔

غالب کا پنجابی میں ترجمہ کیوں ؟

چوتھا اور آخری سوال یہ ہے کہ کلام غالب کا پنجابی زبان میں ترجمہ کرنے کی کیا اہمیت ہے ؟ پہلی بات تو یہ ہے کہ اُردو شاعری یا نثر کا پنجابی میں ترجمہ کرنا، مترجمین کے نزدیک اس لیے اہم ہے کہ اُردو زبان بہ نسبت دوسری زبانوں کے پنجابی زبان کے بہت قریب ہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی "ترجمے کا فن اور پنجابی شکوہ" کے عنوان کے تحت اس نکتے کو یوں بیان کرتے ہیں: "اردو زبان کا وجود جن عناصر اربعہ سے تیار ہوا، پنجابی زبان ان میں سے ایک ہے۔ پنجابی زبان کا مزاج، لب و لہجہ اور گھن گرج سب اُردو زبان میں موجود ہے اور اُردو زبان کی تمام باریکیاں اور اظہار و بیان کے تمام اسلوب پنجابی زبان کی دسترس میں ہیں[1]۔" اُردو اور پنجابی شاعری کے باہمی رشتے کی شہادت اُردو زبان کے قدیم تذکروں میں سید انشاء اللہ خاں انشاؔ کے اس شعر سے بھی ملتی ہے۔

سُنا یارات کو قصّہ جو ہیر رانجھے کا   تو اہلِ درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا

حافظ محمود شیرانی کا تحقیقی مقالہ "پنجاب میں اُردو" اُردو اور پنجابی کے باہمی رشتے پر علمی سطح پہ روشنی ڈالتا ہے۔ جسے علامہ شیرانی نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان دونوں زبانوں کی یہی باہمی قربت ہی پہلی سطح پہ مترجمین کی تحریک کا سبب بنی ہے اور وہ اُردو سے پنجابی اور پنجابی سے اُردو میں تراجم کا بیڑا اُٹھا لیتے ہیں۔ کلام غالب کا پنجابی زبان میں ترجمہ کرنے کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ غالب جیسا قدآور شاعر پنجابی بولنے اور پڑھنے والے ایسے طبقے میں، جو اُردو زبان و ادب سے ناآشنا ہے، متعارف ہوگا اور غالب کی شاعری جب پنجابی زبان کی دسترس میں آئے گی تو اس سے خود پنجابی زبان الفاظ و بیان

---

[1] پنجابی شکوہ مرحوم پیرزادہ فضل احمد فاروقی۔ مرتب ڈاکٹر گوہر نوشاہی، پنجابی اکیڈمی لاہور ۱۹۶۴ء

کے ساتھ ساتھ نئے لہجوں اور مزاج سے روشناس ہوگی بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ غالب کے پنجابی ترجمے سے پنجابی زبان، اظہار و بیان کی ایک نئی جہت سے مالا مال ہوگی دوسری جانب پنجابی زبان کے ادب میں دنیا کے ایک عظیم شاعر کی فکر بھی شامل ہوجائے گی اور یوں پنجابی ادب کے سرمایے میں بے بہا اضافہ ہوگا۔

ہمارے ہاں تو پنجابیوں کی دو زبانیں ہیں۔ ان کی بول چال کی زبان تو پنجابی ہے مگر ان کی تہذیبی اور قومی زبان اُردو ہے۔ دیہات کے رہنے والے جو زیادہ تر پنجابی لوک ادب کے قصّے سنتے اور پڑھتے تھے، وہاں اب نسیم حجازی پہنچ گیا ہے۔ لہٰذا ایسے کثیر آبادی والے طبقے کے لوگوں کے لیے غالب کو ان کی زبان میں پیش کرنا، پنجابی زبان ہی پر احسان نہیں بلکہ دیہات کے رہنے والوں میں اعلیٰ اور معیاری ادب سے روشناس کرانے کے مترادف ہے۔

اچھا ترجمہ کسے کہتے ہیں؟

اس بحث کے بعد ذہن قدرتی طور پہ چند اور سوالوں کی طرف جاتا ہے کہ اچھے ترجمے کا معیار کیا ہے اور اسے کیسے پرکھا جا سکتا ہے؟ کیا ترجمہ ایک تخلیقی عمل ہے یا خالصتاً تکنیکی؟ اچھے ترجمے اور اچھے مترجم میں کس قسم کی خصوصیات کا ہونا ضروری ہے؟ کیا ترجمہ، استفادہ اور تشریح میں کوئی حد قائم کی جا سکتی ہے؟ یہ اور اس قسم کے سوالات پر ناقدینِ ادب کی طویل بحثیں ہو چکی ہیں بعض ناقدین کی رائے میں ترجمہ اصل کے الفاظ کی بجائے مفہوم کی طرف زیادہ جھکا ہوتا ہے۔ ظ۔ انصاری لکھتے ہیں: "ترجمہ اگر کامیاب ہو جائے خود تخلیقی ادب کا حصہ بن جاتا ہے۔ اس کے احتساب کا کوئی اصول وضع نہیں کیا گیا"[۱] ڈاکٹر گوہر نوشاہی کا کہنا ہے کہ "ایک زبان سے دوسری زبان میں تجربہ یا مفہوم کو منتقل کرتے ہوئے جو دقتیں پیش آتی ہیں ان کو مدِنظر رکھا جائے تو یہ بات ثابت ہوجاتی ہے

---

[۱] ظ۔ انصاری۔ زبان و بیان۔ دلّی فروری ۱۹۵۹ء

کہ ترجمہ ایک خالص شعوری اور اکتسابی عمل ہے جس کو انجام دینے کے لیے باقاعدہ ریاضت اور مجاہدے کی ضرورت ہے[1]

فن ترجمہ اور اس کی پرکھ کے تمام مباحث کو پڑھنے کے بعد مختصر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جس زبان میں جو کوئی ادب پارہ ترجمہ ہوا تو اُسے اُس کے خالق سے الگ ہٹ کے دیکھنا چاہیئے یعنی جس زبان میں ترجمہ ہوا ہے اس میں کیا وہ ایک معقول اور حساس تحریر بنی ہے یا نہیں؛ دوسرے لفظوں میں ہمیں یہ عمل دیکھنا چاہیئے کہ غالب کا پنجابی ترجمہ غالب سے الگ ہٹ کے پنجابی زبان میں بجائے خود ایک ایسی نظم یا غزل ہے جو اس کے پڑھنے والے کو اسی طرح MOVE کرتی ہے جس طرح غالب کے ایک حساس اُردو قاری کو۔ اگر ترجمے کی صورت میں ظاہر ہونے والی تحریر اپنے پڑھنے والے پہ کوئی تاثر نہیں چھوڑ سکتی تو وہ ترجمہ اپنے بنیادی مقصد یعنی شعری ابلاغ میں ناکام رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ترجمے کی پرکھ کا یہ معیار ترجمے کی کامیابی یا ناکامی کو جاننے کے لیے بنیادی حیثیت کا حامل ہے اور اسی معیار کو سامنے رکھتے ہوئے ہم کلام غالب کے پنجابی ترجموں کا ایک جائزہ لیتے ہیں۔

غالب کے پنجابی تراجم

پاکستان میں غالب کی اُردو غزلوں اور نظموں کے منظوم ترجمے کتابی صورت میں ابھی تک صرف دو ہی ہیں۔ البتہ کئی ایک شعرا نے ان کی چیدہ چیدہ غزلیات یا ایک آدھ غزل کے کچھ ترجمے کیے جو منتشر کوششوں سے زیادہ نہیں۔ پاکستان میں اس کا باقاعدہ آغاز صوفی غلام مصطفےٰ تبسم مرحوم نے غالب کے فارسی کلام کے پنجابی تراجم سے کیا۔ ان کے یہ تراجم پنجابی زبان میں پہلی کامیاب کوشش کہی جاسکتی ہے۔ لیکن صوفی صاحب نے غالب کے ترجمے کو صرف ان کی فارسی شاعری تک محدود رکھا اور کسی اُردو غزل کا ترجمہ ہمیں ان کے ہاں نہیں ملتا۔ صوفی صاحب کے علاوہ ماجد صدیقی، منشی لطیف گجراتی، احمد حسین اور

---

[1] ڈاکٹر گوہر نوشاہی "ترجمے کا فن اور پنجابی شکوہ"، پنجابی اکیڈمی لاہور

ولیفنیر رث دے ایک دو غزلوں کے ترجمے کیے لیکن اُردو غزلیات کا پہلا ترجمہ ۱۹۶۹ء میں پروفیسر دلشاد کلانچوی نے کیا جسے مکتبہ میری لائبریری نے لاہور سے شائع کیا۔ یہ مجموعہ غالب کی ۴۴ غزلیات کے منظوم ترجمے پر مشتمل ہے اور "غالب دیاں غزلاں" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ دلشاد کلانچوی ۱۹۱۶ء میں بہاول پور میں پیدا ہوئے اور تعلیم مکمل کرنے کے بعد محکمۂ تعلیم سے منسلک ہو گئے۔ "غالب دیاں غزلاں" کا ترجمہ سرائیکی زبان میں کیا گیا ہے جو پنجابی زبان ہی کا ایک لہجہ ہے اور یہ زبان ملتان، بہاولپور، خیرپور، رحیم یار خاں، سندھ اور بلوچستان کے سرحدی اضلاع میں بولی جاتی ہے۔ مشہور صوفی شاعر سچل سرمست اور خواجہ فرید کا کلام سرائیکی ہی میں ہے۔ مسعود حسن شہاب اس ترجمے کے دیباچے میں ترجمے کا مقصد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "غالب کی اُردو غزلوں کو بہاولپوری ملتانی زبان میں منتقل کرنے کی سب سے بڑی تحریک یہی ہے کہ وہ (مترجم) اُردو غزل کی اعلا اقدار سے ان لوگوں کو محظوظ و مستفید کرنا چاہتے ہیں جن کے لیے اُردو زبان اجنبی نہیں تو اپنے نکات و معارف کے اعتبار سے سریع الفہم بھی نہیں ہے۔"[1]

دلشاد کلانچوی نے فارم کے لیے جو "التزامات" رکھے ہیں۔ ان میں اصل غزلیات کے اوزان و بحور اور ردیف و قوافی کو جوں کا توں برقرار رکھا ہے۔ فارسی اور عربی الفاظ جو مشترک طور پر دونوں زبانوں میں مستعمل ہیں، انہیں بھی ملتانی بہاولپوری میں منتقل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ صرف اسما، افعال اور صفات وغیرہ میں ردّ و بدل کیا ہے مثلاً "کا" کی بجائے "دا"۔ "کی" کی بجائے "دی"۔ "ہوتا" کی بجائے "ہوندا"۔ "آگے" کی بجائے "اگوں" اور "بہت" کی بجائے "بہوں" وغیرہ وغیرہ۔[1]

واقعہ یہ ہے کہ مترجم نے اس ترجمے میں "کا" "کے" "کی" بدلنے کے علاوہ کوئی اور قابلِ ذکر کام کیا ہی نہیں۔ غالب کے اشعار کو جوں کا توں اُٹھا کے رکھ دیا ہے اور جہاں کہیں ایک آدھ جگہ ترجمے کی کوشش کی ہے وہاں مفہوم اصل سے دور ہو گیا ہے۔

---

[1] مسعود شہاب، مقدمہ غالب دیاں غزلاں۔ مکتبہ میری لائبریری ۱۹۶۹ء

معلوم ہوتا ہے کہ مترجم میں شاعری کے ترجمے کی صلاحیت ہی نہ تھی۔ غزلیات کے ان تراجم میں نہ تو وہ غالب کی فکر کو پنجابی زبان میں منتقل کر سکے ہیں اور نہ ہی ترجمے میں سرائیکی زبان کا جسے وہ ملتانی بجاول پوری کہتے ہیں۔ کوئی روپ یا فضا پیش کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں غالب کے ان تراجم کی اہمیت اس سے زیادہ نہیں کہ ان میں ترجمے کے دعوے اور مدان کے باوجود ترجمے کے فن کو سرے سے استعمال ہی نہیں کیا گیا۔ لہٰذا ترجمے کے اس پہلے مجموعے کی اہمیت محض ایک ریفرنس سے زیادہ نہیں۔ آپ صرف چند مثالوں سے ملاحظہ فرمایئے کہ اصل اور ترجمے میں کتنا فرق ہے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا — کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

ترجمہ

نقش فریادی ہے کیندی شوخی تحریر دا — کاغذی چولے دے وچ کیوں تن ہر تصویر دا

بس کہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرپا — موئے آتش دیدہ ہے حلقہ میری زنجیر کا

اتنی ہے غالب اسیری وچ وی بجاسیراں تلے — وال سڑے وانگ ہے کڑا میندی زنجیر دا

یا

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی — میری وحشت تیری شہرت ہی سہی

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے — غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

ترجمہ

عشق میکوں نئیں تاں وحشت ہی سہی — میندھی وحشت، تیندھی شہرت ہی سہی

اساں دشمن تے نسے ہیں تیندھے — غیر کوں تینڈی محبت۔ ہی سہی

آپ نے دیکھ لیا کہ ترجمے کے نام پر مترجم نے صرف اسما، افعال اور صفات کو بدلنے کی زحمت کی ہے اور ردیف، قافیے اور بحر کو بھی جوں کا توں رکھا ہے۔ ایسے ترجمے کو دیکھ کر صرف ایک ہی خیال بار ذہن میں آتا ہے کہ اگر یہ ترجمہ ہے تو پھر اس سے بہتر ہے کہ اصل ہی کو پڑھ لیا جائے۔

کلام غالب کے پنجابی ترجمے کا دوسرا منظوم ترجمہ دیوان غالب کے عنوان سے

اسیر عابد نے بارہ برس کی محنت کے بعد مکمل کیا اور جسے مجلسِ ترقی ادب لاہور نے ۱۹۸۷ء میں شائع کیا۔ اسیر عابد معلمی کے پیشے سے تعلق رکھتے ہیں اور ترجمے کی اشاعت کے وقت وہ گورنمنٹ اسلامیہ کالج (جو پہلے خالصہ کالج تھا) گوجرانوالہ میں شعبۂ اردو میں استاد تھے۔ مترجم کے بقول ترجمے کا خیال انھیں غالب کی شاعری کی تدریس کے دوران آیا، جب انھوں نے محسوس کیا کہ پڑھی پڑھائی تشریحیں اور گھڑے گھڑائے جملے بول کے طالب علموں کو بظاہر مطمئن تو کر دیتا تھا مگر میرا دل کہتا تھا کہ غالب ان نوجوانوں تک نہیں پہنچ پایا۔ ہاں البتہ جب کبھی اپنی مادری زبان پنجابی کا سہارا لے کے غالب کے شعر پر گفتگو کی تو یوں لگا کہ آج مجھے بھی اس شعر کی سمجھ آ گئی اور پڑھنے والوں کو بھی۔ چنانچہ اسیر عابد نے جون ۱۹۷۳ء کی ایک رات غالب کی مشہور غزل "یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا" ریڈیو پہ سن کے ترجمہ کر ڈالی اور جب دوستوں کو سنائی تو انھوں نے اس کوشش پہ بے تحاشا داد دی اور یوں شوق کا یہ قافلہ رواں ہوا۔ اسیر عابد کے اس ترجمے کے بارے میں احمد ندیم قاسمی دیباچے میں لکھتے ہیں:

> "اسیر عابد کے اس طرح کے سچے اور اچھے تراجم سے میں مسحور ہو کر رہ گیا۔ میں سوچنے لگا کہ جس طرح شعر کہنا قدرت کی طرف سے ودیعت کی ہوئی قوتوں کا اظہار ہے، اسی طرح اچھے شعر کا اچھا ترجمہ بھی قدرت کی اس ودیعت خاص کے بغیر ممکن نہیں اور اسیر عابد اس سے پوری طرح آراستہ ہے۔"

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

> "اسیر عابد کا ترجمہ دیکھیے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس نے غالب کو پانی کی طرح پی لیا ہے اور اسے اپنے خون میں رواں کر لیا ہے۔"

احمد ندیم قاسمی کے بقول اسیر عابد غالب کی سلیس اور بظاہر سادہ اشعار کی سادگی و پرکاری کو بھی اپنے تخلیقی ترجمے کی گرفت میں لے آیا ہے اور یہ کہ

> "اسیر عابد کے اس ترجمے نے روز روشن کی طرح ثابت کر دیا ہے کہ اردو کی انتہائی گہری اور گمبھیر شاعری کی تفہیم و تحسین پر بھی حاوی ہے

اور پنجابی تو جیسے اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی ہے۔ ترجمے کا یہ معجزہ
اسی لیے ظہور پذیر ہوا ہے۔

پنجابی زبان کے نامور شاعر اور نقاد شریف کنجاہی نے اسیر عابد کے تراجم پہ تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"پہاڑ کاٹ کر دودھ کی نہر نکالنا ہر تیشے والے کے بس کی بات نہیں ہوتی مگر غالب کے کلام کو پنجابی میں ڈھال کر اسیر عابد نے یہ کام کر دکھایا ہے"

ناقدین کی یہ آرا اسیر عابد کے تراجم کے بارے میں مبالغے سے پاک ہیں۔ بلاشبہ اسیر عابد نے کلام غالب کو پنجابی زبان کی کٹھالی میں ڈھال کر غالب کو پنجابی زبان کا شاعر بنا دیا ہے۔ ایسا شاعر جس کا اصل روپ مسخ نہیں ہونے پایا۔ جیسا کہ میں نے اس مضمون کے آغاز میں کہا تھا کہ غالب ایک بہت بڑا چیلنج ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ کسی بھی زبان کا مترجم اس پر ہاتھ ڈالتے وقت کانپ جاتا ہے، مگر اسیر عابد نے بارہ برس جس لگن اور خلوص کے ساتھ غالب کے ساتھ دن رات بسر کیے، وہ بالآخر غالب کو اردو کے کوچے سے نکال کر پنجابی زبان کے کوچے میں اس طرح لے آئے کہ دلی کے مرزا نوشہ، پنجاب کے باسی لگنے لگے ہیں۔ میرے نزدیک اسیر عابد کے ترجمے کا یہی سب سے بڑی کامیابی ہے کہ پنجابی زبان کا چولا پہن کر غالب کی شاعری سرزمین پنجاب کی چیز لگنے لگی ہے اور اردو سے نابلد پنجابی اسے پڑھ کر بہت حد تک غالب کے فکر کی گہرائیوں، خیال کی نزاکتوں، اور زبان و بیان کے حسن کا تجربہ کر سکتا ہے۔

اسیر عابد کا ترجمہ نہایت بامحاورہ ہے۔ پنجابی زبان پہ ان کے عبور اور دسترس کا ثبوت انھوں نے اپنے ترجمے میں دے دیا ہے۔ ایسے ایسے خوب صورت محاورے اور لفظی بندشیں انھوں نے استعمال کی ہیں کہ اس سے خود پنجابی زبان کے حسن اور اس کی وسعت پر حیرت ہونے لگتی ہے۔

اس ترجمے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ مترجم نے ترجمے کو محض لفظوں کی تبدیلی نہیں سمجھا بلکہ ایک تہذیب سے جنم لینے والے تخلیقی عمل کو ایک دوسری تہذیب کے اندر ڈھال

بدل کے رکھ دیا ہے کہ غالب کے تراجم اپنی الگ حیثیت میں ایک تخلیقی عمل کا حصہ معلوم ہونے ہیں۔

علاوہ ازیں اسیر عابد نے غالب کے اشعار کے مفہوم کو نہایت دیانتداری سے ترجمے میں منتقل کیا ہے اور یہ التزام برقرار رکھا ہے کہ مفہوم کی ترسیل میں لہجہ اور طرزِ بیاں مجروح نہ ہو۔ میرے نزدیک یہی وہ نازک اور مشکل مرحلہ ہے جہاں مترجم کی صلاحیت کا کڑا امتحان ہوتا ہے۔ اسیر عابد اس امتحان میں سرخرو ہوئے ہیں اور کلام غالب کے ان تراجم میں لہجہ اور طرزِ بیان کو اس سے پنجابی لہجے میں بدلا ہے کہ پنجابی آہنگ کے اندر سموئے جانے کے بعد اس میں اصل لہجے کی روح باقاعدہ جھلکتی ہے۔

اسیر عابد نے ترجمے میں بیشتر اوقات، قافیے اور بحروں کو بدل دیا ہے مگر اس کے باوجود یہ ترجمے اصل کے ساتھ ہم آہنگ نظر آتے ہیں بعض مقامات پہ مترجم نے لفظی اضافے بھی کئے ہیں، مگر اس طور پہ کہ ان سے شعر کے حُسن میں اضافے کے ساتھ مفہوم کی صحت برقرار رہی ہے۔ بلکہ ان الفاظ کے اضافے سے مطالب کی تفہیم میں آسانی پیدا ہوئی ہے۔ پنجابی ہونے کے ناطے سے اسیر عابد کے ترجمے نے میری غالب فہمی میں بڑی مدد کی ہے اور ایسے ایسے مشکل مقامات مجھ پہ آسان کر دیئے جن کو میں نے بھاری پتھر جان کر چوم کے چھوڑ دیا تھا۔ بحیثیتِ مجموعی اسیر عابد کے اس ترجمے میں غالب کی شاعری کا حسن بھی دکھائی دیتا ہے اور پنجابی دیوان انفرادی حیثیت میں اپنی اکائی کو برقرار رکھ پایا ہے۔

بایں ہمہ اس کامیاب کوشش کے باوجود مترجم کہیں کہیں اصل متن سے اس قدر دور ہو گیا ہے کہ اگر پڑھنے والے کو اصل متن کا پتہ نہ ہو تو وہ محض اس ترجمے سے شعر کے حسن اور مفہوم دونوں تک نہیں پہنچ پاتا۔ اتنے بڑے ترجمے میں اس طرح کی لغزشوں کا احتمال قابلِ فہم ہے اور ایسی لغزشیں اس وقت سرزد ہوتی ہیں جب مترجم ایک خاص طرح کی بے بسی اور لاچاری کا شکار ہو جاتا ہے یا پھر اس مجاہدے میں جس ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے اُس سے اجتناب کرنے لگتا ہے۔ بہرحال دوسرے ایڈیشن میں ایسے تمام اشعار جو غالب کے جازِ شاعری اور طرزِ بیان سے دور ہو گئے ہیں اُن پہ نظر ثانی کی جا سکتی ہے اور انہیں

اصل کے قریب لاکر ترجمے میں پیدا ہونے والے ابہام کو دور کیا جا سکتا ہے۔

میری ان آرا کی وضاحت کے لیے اسیر عابد کے تراجم سے کچھ مثالیں ضروری ہیں جن سے آپ کو اندازہ ہو سکے گا کہ وہ اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوا ہے اور کہاں کہاں اس کے قدم کمزور پڑے ہیں۔

دیوان کی اولین غزل ہی کو لیجیے، دلشاد کلانچوی نے:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا — کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

کا ترجمہ یہ کیا تھا:

نقش فریادی ہے کیندی شوخیٔ تحریر دا — کاغذی چولے دے وچ کیوں تن ہر تصویر دا

اسیر عابد کا ترجمہ دیکھیے:

چتر چیکدا اے چترکار کہڑے ۔ کیکن گُنھیا وچ تحریر سائیں
چولے کاغذی سارِیاں مورتاں دے ، بے وسیاں بے تقصیر سائیں

بس کہ ہوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیر پا — موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

دلشاد کلانچوی:

اسیری وچ وی بجا پیراں تلے — وال سڑے وانگ ہے کڑا مینڈھی زنجیر دا

اسیر عابد:

غالبؔ پنگھراں[1] وچ نہ رہواں ٹھلیا پیراں ٹھیہہ چاتیاں بھجیاں نیں
کنڈل سیکیا وال ہے سنگلی دا جیہڑی سنگلی آساں اسیر سائیں

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی — میری وحشت تیری شہرت ہی سہی

اس شعر کا دلشاد کلانچوی کا لفظی ترجمہ تو آپ ملاحظہ کر چکے ہیں، اب اسیر عابد کو دیکھیے:

مینوں عشق نہ ہویا جھلّ کھلا ای سہی — میرا جھلّ کھلارا تیری چرچا سہی

---

[1] پاؤں باندھنے کی زنجیر پارسی

قطع کیجیے نہ تعلق ہم سے، کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
ساڈے نالوں لگ لگاتے تروڑیں نہ کجھ وی نئیں بھلیا ت کھڑکا ہی

یہ مثالیں تو دونوں مترجمین کے تقابل کے لیے تھیں، اب ذرا وہ تراجم دیکھیے جہاں اسیر عابد کا ہُنر اپنے کمال پر ہے:

تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ اس میں کچھ شائبۂ خوبیِ تقدیر بھی تھا

ترجمہ

گلہ تیرے آتے میرا پھبدا نئیں، ذرا نوں نئیں مُڈھ بربادیاں دا
بیرے رُلن رُلان دے رولیاں وچ، میرے اپنے لیکھاں دی ہاروی سی

غالب:- بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

اسیر عابد: ہویا کیہ جے چم کے اکھیاں نوں لشکاں مار کے ہوئی اڈار بجلی
چنگی گل سی جے کوئی گل کردے، میرے بُلھاں دی تریہہ گھسار دی سی

غالب: پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

اسیر عابد: پھڑے جانے آں اسی ناحق بندے سیں قلماں تے تھہ فرشتیاں دے
لکھے گئے سن جدوں اعمال نامے کول ساڈا وکیل کھاروی سی

غالب: پیشے میں عیب نہیں رکھیے نہ فرہاد کو نام ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

اسیر عابد:- کسے کاروبار نوں نئیں مہنا کا ہنوں ندیئے پے فریاداں ئیں
جنہوں چڑھدی جوانی سر موت آئی اساں عاشقاں پے سزا دتی سی

غالب کی ایک سلیس غزل کے چند اشعار کا ترجمہ دیکھئے جس کے ہر دوسرے مصرعے میں ایک لفظ کا ایک لفظ کا اضافہ مترجم نے کیا ہے اور اس اضافے سے معانی کا حسن بڑھ گیا ہے :

موت کا ایک دن معین ہے — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

ترجمہ

پکی گل اے ، مرنا اک دن تھیا اے — نیند رکا ہنوں راتی جھلی آوندی نئیں

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی — اب کسی بات پر نہیں آتی

ترجمہ

آگے دل دے حالوں ہاسا آوندی سی — ہون کسے دی گلوں جھیڑی آوندی نئیں

جانتا ہوں ثوابِ طاعت زہد — پر طبیعت ادھر نہیں آتی

ترجمہ

نیکیاں متھے نیکیاں اجر و دھیرے نیں — ایسے پاسے طبع کپتی آوندی نئیں

ان ترجموں میں نیند کے لیے جھلی ، ہنسی کے لیے جھیڑی ، طبیعت کے لیے کپتی کی صفات کے اضافے کی داد کوئی پنجابی ہی دے سکتا ہے ۔

ایک اور مشہور غزل کا ترجمہ بھی اسیر عابد کے اس کمال کا نمونہ ہے کہ وہ اُردو لہجے اور بیان کو کس خوبصورتی سے اسی انداز میں ترجمہ کرتا ہے اور پنجابی محاورے کو کس چابک دستی اور ہوشیاری سے استعمال کرتا ہے :

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے — تمہی کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

ترجمہ

گل گل تے آہنا ایں کہیہ ایں ؟ ساڈوں تیرا کیہہ اے
آپے دس لخاں تیرا ایہہ بولن دا چالا کیہہ اے

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا کُرید تے ہو جواب راکھ جستجو کیا ہے

ترجمہ

جتھے سارا جثہ بلیا دل کتھے بچیا سی سواہ نوں یار پھرولن بیٹھا پچھو لبھدا کیہہ اے

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اِتراتا وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

ترجمہ

شاہ دی بہنی بہندا اے تے اڈی نئیں سو لگدی

نئیں تے دسو شہر اندر غالب دی واہ واہ کیہہ اے

ان مثالوں میں اندازِ گفتگو کے لیے بولن دا چالا اور اترانے کے لیے اڈی نہ لگنا کا محاورہ مترجم کے حسنِ انتخاب اور پنجابی زبان پر دسترس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ جہاں جہاں اضافے اچھے نہیں لگے اور وہ متن کو پھلانگ گئے ہیں، اس کی ایک مثال یہ مقطع ہے:

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کے ہو رشکِ فارسی گفتہ غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سنا کہ یوں

ترجمہ

کیوں ریختہ ڈنگدا فارسی نوں جے کوئی پچھے اسیر پنجابیاں نوں

اِک وار بٹھا کے کول اوہنوں غالب خاں دے بول سنا کہ انج

اس ترجمے میں "جے کوئی پچھے اسیر پنجابیاں نوں" ایک ایسا اضافہ ہے جس کا شعر کے اصل متن میں کوئی وجود نہیں اور اس پہ مزید ستم یہ کہ مترجم نے ترجمے میں اپنا تخلص بھی ڈال دیا ہے اور پنجابیوں کو بھی خواہ مخواہ بیچ میں لے آئے ہیں اور پھر غالب کو غالب خاں بنا دیا ہے۔ یقیناً یہ ترجمہ کمزوری ہی نہیں، متن کو مسخ کر کے اُسے مبہم بنا دیا گیا ہے ایسی اور بھی کئی مثالیں ترجمے میں موجود ہیں۔ بہر حال ایسہ عابد کی یہ کوشش پنجابی زبان میں غالب کا ایک عمدہ تعارف ہی نہیں بلکہ غالب کی شاعری کے تراجم میں اِسے ایک کلیدی حیثیت حاصل رہے گی۔

کالیداس گپتا رضا

مرزا عباس بیگ مرحوم
(خواہرزادۂ غالب)

آج تک "دعاء الصباح" کے فارسی منظوم ترجمۂ غالب کی اشاعتِ اول کا صرف ایک ہی نسخہ معلوم ہے جو غالب کی زندگی میں مطبع نولکشور سے حسب الایمائے مرزا عباس بیگ صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر لکھنؤ شائع ہوا۔[۱] غالب کے اس ترجمے سے متعلق تو کئی مضامین شائع ہو چکے ہیں[۲] مگر مرزا عباس بیگ کے حالات ابھی تک تحقیق نہیں ہوئے تھے جس کی وجہ سے کئی غلط فہمیاں راہ پا گئی تھیں۔ اس مقالے میں مرزا عباس بیگ سے متعلق بہت سا مواد جمع کر دیا گیا ہے۔

۱۷۵۰ء کے لگ بھگ مرزا غالب کے دادا قوقان بیگ کے ساتھ قبیلہ برلاس کے ایک امیرزادے مرزا جیون بیگ خاں جو حضرت سبزپوش کی اولاد میں تھے، اپنے خاندان سمیت وارد ہندوستان ہوئے تھے۔ ان کی تین اولادیں تھیں۔ مرزا اکبر بیگ، مرزا افضل بیگ[۳] اور امیر النساء بیگم۔ مرزا غالب کی بڑی بہن چھوٹی خانم (شاید غالب کی والدہ کو بڑی خانم کہہ کر پکارا جاتا ہوگا) کی شادی انھیں مرزا جیون بیگ کے بڑے صاحبزادے مرزا اکبر بیگ سے ہوئی۔ ان کے بطن سے تین صاحبزادے مرزا عاشور بیگ، مرزا عباس بیگ، مرزا جواد علی بیگ عرف مرزا مغل بیگ اور ایک صاحبزادی امانی خانم پیدا ہوئیں۔ اس مضمون کا موضوع مرزا اکبر بیگ کے منجھلے صاحبزادے اور مرزا غالب کے منجھلے بھانجے مرزا عباس بیگ ہیں۔ ان کی تاریخ ولادت کا صحیح علم نہیں مگر اندازہ ہے کہ مرزا عباس بیگ جنھیں آئندہ سطور میں ہم صرف مرزا کہہ کر پکاریں گے) ۱۸۱۲ء کے لگ بھگ دلی

پیدا ہوئے۔ وہ ۱۸۶۶ء میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ اگر ریٹائرمنٹ کے وقت ان کی عمر پچپن سال مان لی جائے تو ان کی ولادت کا سال ۱۸۱۲ء قرار پائے گا۔

مرزا نہایت حسین اور سرخ و سفید تھے۔ سانچے میں ڈھلا ہوا جسم، دراز قد اور نہایت قوی الجثہ گو عیاشی، رنگین مزاجی اور احباب پرستی کے سبب پڑھنے کا شوق کم تھا تاہم ذہین تھے۔ جب انگریزی پڑھنے کا شوق پیدا ہوا تو اس قدر پڑھ لی کہ تحریر و تقریر بخوبی سرانجام دے سکتے تھے۔ فارسی کی لیاقت معمولی تھی اور عربی سے نابلد تھے۔ رنگین مزاجی کے باوصف شعر گوئی تو ایک طرف شعر صحیح پڑھ بھی نہ سکتے تھے۔ صاحب "کارنامہ سروری" کے مطابق کچھ عرصے ماسٹر رام چندر کے بھی شاگرد رہے تھے۔ مگر یہ قرین قیاس نہیں کیونکہ ماسٹر رام چندر ۱۸۴۴ء میں دلی کالج کے مدرس مقرر ہوئے تھے اور اس وقت ان کی عمر تئیس سال تھی۔ جب کہ ہمارے قیاس کے مطابق مرزا ۳۲ سال کے تھے۔ اس کے علاوہ سکھوں کی پہلی لڑائی (دسمبر ۱۸۴۵ء) کے دوران مرزا فیروزپور (پنجاب) کے کوتوال یا تحصیلدار تھے۔ اور کئی سال پیشتر دلی چھوڑ چکے تھے۔ جس کا حال آگے آئے گا۔
ممکن ہے کبھی پرائیویٹ ٹیوشن سے بھی پڑھا ہو۔ الغرض انگریزی تحریر و تقریر کی لیاقت پیدا کر کے مرزا وسیع تر میدان کی تلاش میں رہنے لگے۔ اتفاق سے یہ موقع بھی انھیں جلد ہی مل گیا۔ ہوا یہ کہ جب ان کے حقیقی چچا مرزا افضل بیگ سلطنت مغلیہ وائسرائے سے ان امور کا تصفیہ کرانے میں ناکامیاب رہے جن کے لیے انھیں کلکتہ بھیجا گیا تھا تو انھوں نے مشہور ریفارمر رام موہن رائے کو راجا کا خطاب دلا کر تصفیۂ امور کے لیے انگلینڈ روانہ کر دیا (۱۸۳۰ء) اور خود کچھ عرصے بعد دلی واپس آ گئے۔ آتے ہوئے اپنے ساتھ ایک بنگالن "ماہ لقا" کو بھی لے آئے مگر بوڑھے ہو چکے تھے۔ زندگی نے مزید ساتھ نہ دیا۔ اور انتقال کیا۔ یہ جوان سال بیوہ مرزا کے حسن و جمال پر فریفتہ ہو گئی۔ جس کا ان کے والد ماجد مرزا اکبر بیگ نے بہت برا منایا۔ مآل کار مرزا اس عورت کو لے کر پنجاب کی طرف نکل کھڑے ہوئے اور ایک راجہ کے ہاں مصاحب خاص کی حیثیت سے نوکری کر لی۔ مگر یہ نوکری بھی جلد ہی چھوڑ دی کیونکہ راجا کے دل میں اس کے مصاحبوں نے کچھ بدگمانی پیدا کر دی تھی جو اگرچہ بعد میں غلط نکلی تاہم مرزا نے وہاں رہنا گوارا نہ کیا۔

وہاں سے سبکدوش ہو کر مرزا انگریزی عمل داری میں ستلج کے اس پار لدھیانہ اور فیروزپور

کے نواح میں پہنچے۔ یہاں ان کی انگریزی سے واقفیت، خاندانی اور ذاتی وجاہت کام آئی اور سر ہنری لارنس نے متاثر ہو کر ان کو کوتوال شہر (شاید فیروزپور) مقرر کر دیا۔ اس کے بعد کا حال ان کے بھتیجے آغا مرزا بیگ مصنف "کارنامہ سروری" سے سنیے:

"چچا (مرزا عباس بیگ) مرحوم بیان کرتے تھے کہ سر ہنری ایک وحشی مزاج مگر ادائے فرضِ منصبی میں ازحد پابندِ قواعد اور اپنے ماتحت عمال کے رفتار کردار کا نگراں تھا۔ ایک روز مرزا بازار میں ایک دکاندار سے کسی امر پر برسرِ حساب تھے اور خدمت گار ان پر چھتری لگائے ہوئے تھا کہ سر ہنری ادھر سے بگھی پر نکلا۔۔۔۔۔ اور کہا وَل نواب صاحب ہم تم پر چھتری لگائے گا۔ مرزا آکر آگے ہو لئے۔ سر ہنری نے ۔۔۔۔ ان کو کوٹھی پر حاضر ہونے کا حکم دیا۔۔۔۔ کوٹھی پر بھی انھوں نے جواب ترکی بہ ترکی دیا۔ ان کی دلیری اور صاف گوئی پر سر ہنری نے بجائے سزا تنخواہ میں اضافہ کر دیا۔ ایک روز۔۔۔۔۔ سر ہنری ان کو اپنے ساتھ لے گئے راستے میں ایک جھیل پایاب واقع تھی۔ سر ہنری اس وقت۔۔۔ افہام و تفہیم کر رہا تھا۔ مرزا نے۔۔۔۔۔۔ اختلافِ رائے کیا۔ بگھی بیچ جھیل میں پہنچ گئی تھی۔ سر ہنری نے غصہ میں آ کر ان کو گاڑی سے اتر جانے کا حکم دیا۔ یہ بھی پانی میں کود پڑے۔ ان کی یہ حرکت بھی مفید ثابت ہوئی اور فیروزپور کے تحصیلدار مقرر ہو گئے۔ یہاں بھی انھوں نے سکھوں کے مقابلے میں بڑی خیرخواہیاں کیں اور جنرل ایبٹ[9] زخمی کو میدانِ جنگ سے اٹھا لائے۔"

اس کے بعد سر ہنری لارنس کے دل میں مرزا کی عزت یہاں تک بڑھ گئی کہ ہندوستانی افسروں کے علاوہ انگریز افسر بھی حسد کرنے لگے۔ ادھر دلی میں مرزا کے اہلِ خاندان بھی ان سے سخت ناراض تھے۔ سوا ان کے بھائی مرزا مغل بیگ اور بہن آغائی خانم (غالب کا چھوٹا بھانجہ اور بھانجی) کے کوئی ان سے بات تک کرنا گوارا نہ کرتا تھا۔ "اس کی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ کل خاندانی جاگیریں بوجہ عدمِ ثبوت و تلافیِ اسناد و سرکار میں ضبط ہو گئی تھیں۔ اور عباس بیگ نے اس سلسلے میں قطعی تغافل برتا تھا۔"

مرزا اپنے عہدے اور رسوخ کے نشے میں کچھ ایسے چور ہوئے کہ شرافت کی تمام حدیں پھاند

تھے۔ رشوت خوری کا یہ عالم تھا کہ بقول خود، آٹھ آنے بھی قبول کر لیتے تھے۔ اس طرح بہت سی دولت تو اکٹھی کر لی مگر بے شمار دشمن بھی پیدا کر لیے۔

انھیں ایام میں جب کہ مرزا مغل بیگ اور رانی خانم ان سے ملنے فیروز پور آئے ہوئے تھے ایک ہمسایہ ایک چھوکری کو لایا اور کہا کہ آپ اس چھوکری کو رکھ لیں میں دو تین روز کے لئے باہر جاتا ہوں اور آکر اپنی چھوکری کو لے جاؤں گا۔ مرزا خود کچہری میں تھے۔ مرزا مغل بیگ سمجھے کہ یہ مرزا کا کوئی بے تکلف دوست ہے انھوں نے چھوکری کو زنانے میں بھجوا دیا۔ وہ شخص تو چلا گیا مگر سازش کے مطابق پولس آن پہونچی اور چھوکری کو برآمد کر کے لے گئی۔ ڈپٹی کمشنر موقع کا منتظر تھا۔ اس نے فوراً مرزا پر بردہ فروشی کا مقدمہ کھڑا کر کے انھیں معطل کر دیا۔ اس مقدمے نے اتنا طول کھینچا کہ مرزا کی تمام پونجی صرف ہو گئی۔ حتیٰ کہ وارنٹ گرفتاری جاری ہو گیا۔ ایبٹ اس وقت ۱۸۴۸ء انگریزوں کے پولیٹکل اڈوائزر کے طور پر ملتان کے علاقے میں متعین تھا۔ مرزا بھیس بدل کر اونٹ پر سوار ہو چھپتے چھپاتے رات کو ایبٹ کے پاس پہونچے اور کل ماجرا بیان کیا۔ میجر ایبٹ ان کو ساتھ لے کر ڈاک گاڑی سے لاہور پہونچا اور سر ہنری لارنس ریزیڈنٹ پنجاب سے ملا جو خود بھی مرزا کا بڑا مداح اور خیر خواہ تھا۔ چنانچہ وارنٹ کی منسوخی کا حکم جاری ہوا اور اس نے مرزا کو وہیں ٹمپل صاحب کے محکمہ بندوبست میں خدمت عطا کر دی۔

پنجاب کے انگریزی اڈمنسٹریشن میں اس وقت دو بھائی ہنری لارنس اور جان لارنس ممتاز ترین شخصیتیں تھیں۔ جان لارنس تلوار کے زور سے حکومت کرنا چاہتے تھے۔ اور ہنری لارنس عوام کی رائے سے۔ دونوں بھائیوں نے ایک ساتھ استعفا دے دیا تاکہ لارڈ ڈلہوزی ان دونوں میں سے جس کا چاہے پنجاب میں تقرر کرے۔ ظاہر ہے ڈلہوزی ایسا جابر جان لارنس ہی کو پسند کرتا۔ اس طرح سر ہنری لارنس کو پنجاب چھوڑنا پڑا۔ اور وہ وہاں سے اودھ آ گیا۔ مرزا بھی سر ہنری کے ساتھ ہی چلے آئے اور بدستور تحصیلداری کی خدمات انجام دیتے رہے۔ چنانچہ کارنامہ سروری (ص۵۳) سے اطلاع ملتی ہے کہ وہ ۱۸۵۷ء یعنی ایام غدر میں بھی ملاپور کے تحصیلدار تھے۔ "جب" باغی "سپاہیوں نے اس تحصیل پر حملہ کیا تو انھوں نے بڑی بہادری سے خزانے کو اوٹرام[۵] کے پاس روانہ کر دیا اور خود پا پیادہ بھیس بدل کر جنگل جنگل چھپتے ہوئے بلگرام پہونچ گئے۔ اہل بلگرام نے انھیں اپنے ہاں پناہ دی۔" تاہم یہاں رہ کر بھی مرزا نے انگریزوں سے باقاعدہ خط و کتابت جاری رکھی اور "باغیوں" کی حرکات

دستخط سے ان کو باربار تنبیہ کرتے رہے۔ یہاں سے انھیں فرخ آباد بھیج گیا۔ معلوم ہوتا ہے یہ واقعہ غدر فرو ہونے کے بعد کا ہے اور غدر کے دوران انگریزوں سے وفاداری کے صلے میں فرخ آباد میں بحیثیت ڈپٹی کلکٹر ان کا تقرر ہوا تھا۔ پھر جلد ہی خیر خواہی سرکار بھی لارڈ کیننگ نے علاقہ بڑا گاؤں کی جاگیر انھیں عطا کی اور چھ سو روپیہ ماہوار پر اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر مقرر کرکے سیتاپور تبدیل کردیا۔"

اس کے بعد یعنی ملازمت سے ریٹائرمنٹ (۱۹۰۰ء) تک کے حالات بڑی حد تک پردۂ خفا میں ہیں۔ نام مرزا غالب کے خطوط اور دوسرے ماخذوں سے جو کچھ معلوم کیا جا سکتا ہے وہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

فتنہ و فساد فرو ہو جانے کے بعد جب صوبہ اودھ کی ضلع بندی ہوئی تو بلگرام کو ہردوئی ضلع میں شامل کر لیا گیا تھا۔ چنانچہ چند سال سیتاپور میں رہنے کے بعد مرزا کا تبادلہ (۱۸۶۲ء) کے آخر میں یا شروع ۱۸۶۳ء میں) ہردوئی کو ہو گیا۔ غالب قدر بلگرامی کو ایک خط میں لکھتے ہیں!

"برخوردار مرزا عباس کی بدلی کی خبر میں نے پہلے ہی سنی ہے مگر یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں گئے۔ اب دریافت ہوا کہ تمہارے ہمسائے میں آئے ہیں۔ اب ان سے ملتے۔ خدا ان کو مروت کی توفیق دے۔"

قدر کے نام دوسرے خطوں سے بآسانی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خط آخر ۱۸۶۲ء یا شروع ۱۸۶۳ء کا لکھا ہوا ہے اور قیاس چاہتا ہے کہ بلگرام ہی کو بھیجا گیا تھا۔ یہاں مرزا نے قدر کو صاحب ضلع سے سفارش کرکے ہردوئی اسکول میں مدرس فارسی کرا دیا۔ قدر بلگرامی پر مرزا کی مہربانیاں آئندہ بھی جاری رہیں۔ اس کی شروعات غالب کے ایک گمشدہ سفارشی خط سے ہوئی جس کے ثبوت میں غالب کا خط بنام قدر (محررہ ۱۸۶۰ء) پیش کیا جا سکتا ہے۔

"برخوردار مرزا عباس کو دوبارہ تحریر کی حاجت نہیں اگر وہ سعادت مند ہیں تو وہی ایک خط کافی ہے ....."

(خطوط غالب از مہر ص ۵۴۹)

قدر بلگرامی کے نام غالب کا خط محررہ صبح یکشنبہ ۲۔ رمضان۔ ۲۲۔ فروری سال حال

۲۰ ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۸۶۳ء میں لکھا ہے :

"..... مرزا عباس میری حقیقی بہن کا بیٹا ہے تو پھر میں مرزا کی اولاد کا ننگ کیوں کرتا ؟ مرزا کی بی بی میری بہو ہے بیٹی نہیں تم نے جو لکھا ہے کہ میرے نواسے کی شادی ہے کیا سمجھ کے لکھا ؟ میں مرزا کی اولاد کا ننگ کیوں کرتا ! بھانجے کی اولاد پوتا پوتی ہے نہ نواسا نواسی ..... مرزا کی استدعا سے قطع نظر میرا دل بھی تو پھر لوہے کا نہیں جو اپنے بچوں کو دیکھنے کو نہ چاہے ۔ ایک بہن اس کی مجموع اولاد وہاں میرا تو وہ خانہ باغ ہے ....."

پہلے "ایک بہن اس کی مجموع اولاد وہاں" کی تشریح سن لیجئے ۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے چھوٹی خانم کے تین لڑکے تھے ۔ یعنی مرزا عباس بیگ کے علاوہ ان کے بڑے بھائی مرزا عاشور بیگ جو اپنے لڑکے مرزا احمد بیگ کے ساتھ "غدر" میں شہید کر دیئے گئے تھے اور چھوٹے بھائی مرزا جواد علی بیگ عرف مرزا مغل بیگ جو ۱۸۵۸ء کی الور کی شورش میں مع اہل و عیال نکالے گئے تھے ۔ یہ تمام افراد نیز مرزا عاشور بیگ مرحوم کی بیوی اور بچے مرزا عباس بیگ کے پاس ہی رہنے لگے تھے۔ شاید صاحبزادی (مرزا کی بہن) امانی بیگم کی اولاد میں سے بھی چند لوگ وہاں موجود تھے ۔ غالب نے اسی لئے کہا ہے کہ چھوٹی خانم کی مجموع اولاد" وہاں رہ رہی ہے ۔

اب خط کے اس جملے "میرے نواسے کی شادی ہے" پر غور کیجیے ۔ ہمیں محمد رفیع الدین بیگ وحشی ابن عاشور بیگ صناعی ، برادر زادہ مرزا عباس بیگ کے دیوان "غزلیاتِ وحشی" میں دئے ہوئے شجرۂ نسب (رت) سے خبر ملتی ہے کہ مرزا کی اولاد میں صرف ایک لڑکی تھی ۔ دگو دلیا ہوا لڑکا ۱۸۶۳ء میں محض چار سال کا تھا ۔ لہٰذا اس کی شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ اولاد سے متعلق تفصیلات آگے آئیں گی) اس سے ظاہر ہے کہ خط کے اس جملے میرے نواسے کی شادی ہے ، پڑھنا چاہئے ۔ اتفاق سے خطوط غالب کے تمام مرتبین نے یہ غلطی دہرائی ہے ۔ حالانکہ ۲۴ ۔ نومبر ۱۸۶۳ء کا خط صاف بیٹی کی شادی کی طرف اشارہ کرتا ہے ۔ ملاحظہ ہو :

"..... یہ (مرزا عباس بیگ) اپنے والدین کے خاندان کا فخر ہے اور چونکہ اس کی ماں کا اور میرا لہو اور گوشت اور ہڈی اور قوم اور ذات ایک ہے پس وہ فخر میری

عزت بھی حاصل ہوتا ہے۔ وہ دو مرزا عباس بیگ اپنے جی میں کہتا ہوگا کہ ماموں کی بیٹی کے بیاہ میں نہ آیا اور عزت نہ رہے نہ پڑا یا......"

چند سال ہردوئی میں رہنے کے بعد مرزا ۱۸۶۰ء میں یا اس سے پہلے اسی عہدے یعنی اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے طور پر لکھنؤ میں تبدیل ہو گئے۔ ۱۸۶۰ء میں ان کا لکھنؤ میں ہونا ثابت ہے۔ اس سال کا ایک خط غالب بنام قدر بلگرامی دیکھیے:

"تم قدر اور نور چشم مرزا عباس قدرداں۔ خاطر جمع رکھو نوکری تمہاری ہو جائے گی۔ صاحب کی اور راجا کی تعریف کے قصیدے واقعی گلدستے ہیں مگر مرزا کی مدح کے قصیدے کو گلدستہ نہ کہو۔ یہ تو ایک باغ ہے سرسبز و شاداب جس میں گلبن ہزار در ہزار۔ ہوادار۔ درخت بے شمار زمین سراسر سبزہ زار۔ بہت حوض۔ بہت نہریں۔ بٹی نظر نہیں آتی۔ سبزہ ہی سبزہ ہے۔ فقیر غالب تمہارا خیر خواہ اور تمہارے قدر کا دعاگو ہے۔"

صاحب سے مراد ولیم ہینڈفورڈ ڈائرکٹر تعلیمات اودھ اور راجا سے مہاراجہ مان سنگھ تاثر نگر ہے۔ یہ قصیدے کلیات قدر میں موجود ہیں۔ جو قصیدہ مرزا کی شان میں ہے "در مدح ڈپٹی مرزا محمد عباس بیگ خاں بہادر اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر لکھنؤ......" قصیدہ کا آخری شعر یہ ہے:

"گل عباس" رکھا نام ہم نے اس قصیدے کا
کریں تا مرزا عباس سن سن کر زر افشانی

اس سے ثابت ہے کہ مرزا ۱۲۸۳ھ یعنی ۱۸۶۷ء میں لکھنؤ میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے مگر یہی سال ان کی ملازمت کا بھی آخری سال معلوم ہوتا ہے۔ وہ ۱۸۶۷ء کے آخر میں پنشن پر ریٹائر ہو گئے۔ "کلیات قدر" (مع ترجمہ المصنف) میں یہ جملہ اہم ہے:

"......مرزا (عباس بیگ) صاحب پنشن پا کر لکھنؤ میں کالج مذکور (کیننگ کالج) کے ممبر ہو گئے تھے......"

اور کیننگ کالج کا قیام نومبر ۱۸۶۴ء میں عمل میں آیا تھا۔ پڑھائی شروع ہی سے جاری تھی مگر عمارت کے مکمل ہونے میں گیارہ سال لگے اور وہ ۱۸۷۸ء میں ختم ہوئی۔ تاریخی قطعہ جس کے مصرع سے تاریخ

(۱۸۶۸ء) نکلتی ہے۔ قدر بلگرامی نے بمایہ کلیات قدر صفحہ ۲۳۴ میں موجود ہے۔ مکمل اشعار پیش ہیں۔

ان میں سے چند اشعار جو تواریخی شواہد کی حیثیت رکھتے ہیں نقل کیے ہیں ؂

گورنر جنرل عالی روش لارنس صاحب نے ۔۔۔ بجہد و جہد کل اٹھارہ سو سرسٹھ نومبر میں (۱۸۶۷ء)

نوی ڈالی بنائے خیر خود کیننگ کالج کی ۔۔۔ مگر سد سکندر جس طرح وقت سکندر میں

عمارت بن چلی وہ بنتے بنتے بن گیا کالج ۔۔۔ زبانِ عدل و زر سیرونٹ سرجارج کوپر میں

نئی دل سر بہار ا بہ بہادر منصفِ لائق ۔۔۔ ہے زیبائے شجاعت دیکھیے سنگھ اسم دفتر میں

ہمایوں بہر ڈپٹی میرزا عباس خانصاحب ۔۔۔ ہیں سرکاری یہ ممبر بحر دانش جملہ ممبر ہیں

مکمل نظم وہ لکھی ہے قدر بلگرامی نے

ہیں سالِ عیسوی مقصود ہر اک مصرعٔ تر میں

سرور الدولہ آغا مرزا بیگ مصنف "کارنامہ سروری" نے مئی ۱۸۷۲ء میں بعمر ۲۴ سال اپنے عم بزرگوار مرزا عباس بیگ کی اجازت سے لکھنؤ کو خیرباد کہا اور عازم حیدرآباد ہوا۔ اب اس کے چند بیان متعلقہ کالج ملاحظہ کیجیے اور یہ حقیقت سامنے رکھئے کہ اس میں کا ہر بیان مئی ۱۸۷۲ء کے پہلے کا ہے۔

۱۔ اسی زمانے میں جب کہ کیننگ کالج قائم ہوا جنرل "بیرو چیف کمشنر اودھ نے مرزا عباس بیگ اور بابو رکھنا رکھن مکرجی کو اپنے ہم رائے کر کے قیصر باغ میں تعلقہ داران وامرائے اودھ کی تعلیم کے واسطے ایک خاص تعلیم خانہ قائم کیا جس کا نام وارڈ انسٹی ٹیوشن رکھا گیا اور تعلیم خانہ کیننگ کالج کی ایک شاخ مقرر کیا گیا ....

(اس میں) مع راقم و محمود بیگ و خداداد بیگ۔ رفیع الدین بیگ ہم کوئی ۱۸۔۱۰ طلبا تھے۔ بابو انند لال رائے ہمارے گورنر (کھنارکھن اور عم مرحوم (مرزا عباس بیگ) وزیٹر یعنی نگراں کار نامزد ہوئے .... تعطیلات میں سب طلبار اپنے اپنے علاقوں پر چلے جاتے تھے ہم چار چونکہ مقیم لکھنؤ تھے ...... ہر روز شام کو چچا صاحب مرحوم (مرزا عباس بیگ) کے ساتھ کھانا کھا کر فوراً واپس جاتے تھے۔ دن کا کھانا

کھا کر فوراً واپس جاتے تھے۔ دن کا کھانا (مرزا عباس بیگ کے) گھر سے آجاتا تھا۔"

(کارنامہ سروری ص ۲۳-۲۴)

(ب) لکھنؤ میں جب اُن (مرزا عباس بیگ) کا قیام ہوا تو جنرل ایل بیرو چیف کمشنر یعنی امیرِ ملکِ اودھ اور مہاراجہ مان سنگھ قائم جنگ صدر الصدور تعلقہ داران اودھ تھے۔ ان تینوں کی رائے سے کیننگ کالج اور ... وارڈ انسٹی ٹیوشن قائم ہوا۔ (اور) مجلس تعلقہ دارانِ اودھ قائم کی گئی جس کے صدر ... مہاراجہ مان سنگھ ... قرار پائے۔ اور بابو دکھنا رنجن معتمد یعنی سکریٹری نامزد ہوئے۔ جب مرزا (عباس بیگ) نے ... پنشن لیا تو بعد دکھنا رنجن یہ خود سکریٹری بنائے گئے ... کالج قائم ہوتے وقت تعلقہ داراں کا ایک جلسہ شورے منعقد ہوا۔ جس کے صدر خود کمشنر اودھ اور نائب الصدر مہاراجا اور معتمد مرزا (عباس بیگ) تھے ...

(کارنامہ سروری ص ۵۴)

مندرجہ بالا سے یہ قیاس کرنا غلط نہ ہوگا کہ مرزا ۱۸۶۷ء سے پہلے ہی لکھنؤ میں بطور اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر متعین ہو چکے تھے اور کیننگ کالج کی تجویز ۱۸۶۶ء یا ۱۸۶۷ء میں مکمل ہوئی جس میں شروع ہی سے مرزا چیف کمشنر آف اودھ کے صلاح کار رہے۔ ۱۸۶۷ء ہی میں جب کالج قائم ہوا تو مرزا ریٹائر ہو چکے تھے۔ اور اس کے پہلے جلسہ شورے میں انھوں نے معتمد یعنی سکریٹری کے فرائض انجام دیے۔ جب کہ بیرو اس کے صدر اور مہاراجا مان سنگھ قائم جنگ نائب صدر تھے۔ مندرجہ بالا سے یہ بھی ثابت ہے کہ قیام کالج (۱۸۶۷ء) تک مرزا کالج کی مجلسِ شوریٰ کے خاص رکن رہے۔ خیال یہی ہے کہ وہ آخر تک کالج سے وابستہ رہے ہوں گے

مرزا نے تقریباً ۶۰ سال کی عمر پاکر یک شنبہ جمادی الاول ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء) کو لکھنؤ میں انتقال کیا۔ قدر بلگرامی کے کلیاتِ قدر (ص ۲۵۲-۲۵۳) میں ایک قطعہ اور ایک رباعی ملتی ہے۔

تاریخ وفات ڈپٹی مرزا عباس بیگ خاں بہادر دہلوی

ماہ جمادی الاولےٰ یکشنبہ و دھم   شب آفتاب کے بزمیں پئے فسردہ وائے

یعنی بمرد ڈپٹی عباس بیگ خاں	بے بے گلے بباغ امارت فسردہ وائے
برخواند قدر دو بہ تاریخ ہجریش	عباس بیگ خاں بہادر بمرد دائے

۱۲۹۶ھ

ولہٗ رباعی

گور عباس جاں خراشد اے دل	از ہم جگر قدر بپا شد اے دل
خاموش کتابہ در سپہی سال امست	شاید کہ پلنگ خفتہ باشد اے دل

"بے بے گلے بباغ امارت فسردہ" اور شاید کہ پلنگ خفتہ باشد" سے جو تصویر پیدا ہوتی ہے اسے غلام حسنین قدر بلگرامی نے مدتوں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اگرچہ مرزا نے اس وقت کے امیروں کی طرح انگریزی حکام کی دل و جان سے مدد کی اور اطاعت گذار رہے تاہم ان میں ایک فطری خودداری و تمکنت بھی تھی۔ جو ہمیشہ ان کی امارت اور رعب داب میں اضافے کا باعث بنی رہی۔

جیساکہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں مرزا کی اپنی اولاد صرف ایک لڑکی تھی۔ جس کی شادی ۱۸۶۲ء میں ہوئی تھی۔ جس سے متعلق ہم غالب کے دو خط بھی پیش کر چکے ہیں۔ شادی کس کے ساتھ ہوئی اور صاحبزادی کا سال ولادت کیا ہے ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ ۱۸۴۵ء سے ۱۸۵۰ء تک یا کوئی اور سال کچھ بھی قیاس کیا جاسکتا ہے۔ اولاد نرینہ چونکہ نہیں تھی اس لیے مرزا نے اپنے بھائی مغل بیگ کے بیٹے کو گود لے لیا تھا۔ یہ داستان فیاض بیگ کے بھائی آغا مرزا بیگ مصنف "کارنامہ سروری" (صلا۱) سے سنیے جو فیاض سے گیارہ سال بڑے تھے:

> "چچا صاحب (مرزا عباس بیگ) مرحوم نے کہ اولاد نرینہ نہ رکھتے تھے ایک روز والد (مغل بیگ) مرحوم سے کہا کہ اب جو بچہ تمہارے یہاں پیدا ہو مجھ کو اس طرح دے دو کہ پھر اس سے کچھ تعلق نہ رکھو۔۔۔۔۔۔ الغرض فیاض بیگ مرحوم پیدا ہوا اور چچا نے اس کو اپنی فرزندی میں لے لیا"

فیاض بیگ ۱۸۵۹ء میں سیتاپور میں پیدا ہوئے۔ قدر بلگرامی نے تاریخ کہی۔ قطعہ چار شعر

کا ہے۔ پہلا اور آخری شعر دیے جاتے ہیں ؎

خانِ ذی رتبہ و ذی حوصلہ مرزا عباس — پسرے نامِ خدا یافتہ عالی نسبے
بشگفاں غنچۂ تاریخِ ولادت اے قدر — بردمید ایں گلِ عباس زنخلِ عجبے

۱۲۷۶ھ

مادۂ تاریخ نہایت برمحل ہے اور فیاض بیگ کے متبنّیٰ ہونے کی طرف صاف اشارہ کرتا ہے۔

فیاض بیگ کی شادی ۱۸۷۰ء میں لکھنؤ میں ہوئی۔ یہ تاریخ کہ خدائی ..... بطریق سہرا قدر نے کہی جس کا ہر مصرع تاریخی ہے۔ قدر اس وقت کیننگ کالج میں ملازم تھے۔ کل اشعار نو ہیں صرف چار شعر دیے جاتے ہیں ؎

حلقۂ شوق ہے یہ ہاتھ میں کنگنا، دلخواہ — دامنِ حسن ہے فیاض کے سر پہ سہرا
جس نے دیکھا نہ ہو خورشید میں کرنوں میں — دیکھے ان کا رخِ نایاب ہٹا کر سہرا
تاج ہے روشنیٔ الفتِ مرزا عباس — دامنِ ظلِ علمدارِ دلاور سہرا
ایک اک مصرع "تاریخی مسیحی سے ملا
کہیں اس زور کا لے قدر سخنور سہرا

(کلیاتِ قدر ص ۳۴۸)

۱۸۵۷ء کی لڑائی کے بعد تعلق داران اودھ مسلمان اور ہندو دونوں کو خاص قانون کے تحت متبنّیٰ لینے کا اختیار مل گیا تھا۔ اسی بنا پر مرزا نے فیاض بیگ کو ۱۸۵۹ء میں گود لیا تھا اور ازروئے قواعد علاقہ بڑا گاؤں کی جاگیر کا وارث اسی کو بنایا تھا"[۲]۔ فی الحال صرف اتنا معلوم ہے فیاض بیگ ۱۹۳۳ء کارنامہ سروری کی ترتیب سے پہلے انتقال کر چکے تھے۔

مرزا ابھی پنجاب ہی میں تھے کہ انھوں نے اپنے اہلِ خاندان کے برخلاف اپنا مذہب تبدیل کر لیا۔ یعنی وہ سُنی سے شیعہ ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ ایک شب انھوں نے خواب دیکھا کہ ایک چھینکے میں ایک سرِ بریدہ رکھا ہوا ہے اور ان سے کہتا ہے کہ تم اہلِ بیت سے محبت رکھو[۳]۔ برسوں بعد جب وہ پنجاب سے لکھنؤ آئے تو مشہور مرثیہ گو دبیر لکھنوی ابھی زندہ تھے۔ انھیں دیکھ کر مرزا کو فوراً یاد آگیا کہ وہ سرِ بریدہ جو خواب میں انھوں نے چھینکے میں رکھا دیکھا تھا ہم شکلِ دبیر تھا۔ اس کے بعد تمام عمر مرزا اکثر شیعہ

رہے جس کا ثبوت کئی ماخذوں سے بآسانی مل جاتا ہے"۔

مرزا ملازمت کے آخری ایام میں ریٹائرمنٹ کے بعد بھی لکھنؤ ہی میں مستقل طور پر رہے اور وہیں آخری سانس لی۔ ہمیں ان کی جائے قیام سے متعلق دو اندراج ملتے ہیں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے رسالہ اردو اپریل ۱۹۲۱ء صفحہ ۵ کے حاشیے میں لکھا ہے:

"یہ جلسہ ڈپٹی عباس بیگ صاحب کی اس کوٹھی میں ہوا تھا جو قیصر باغ کے دروازے کے بالکل سامنے تھی اور اب کھُد کھدا کر سڑک میں آگئی ہے"۔

ادبی خطوطِ غالب، میں مرزا محمد عسکری نے بھی تقریباً یہی لکھا ہے "...... اُن (ڈپٹی عباس بیگ) کی کوٹھی روشن الدولہ کی کوٹھی کے سامنے واقع تھی جو ابھی حال ہی میں کھُدی ہے......."

قدر بلگرامی کے اس قصیدے میں بھی جو انھوں نے ۱۸۶۰ء میں "گلِ عباس" کے نام سے لکھا تھا مرزا کی کوٹھی، ان کی فیاضی، اور ان کے مذہب سے متعلق اشارے ملتے ہیں۔

(کلیات قدر ص ۵۵-۵۶)

کہیں نہریں کہیں گلشن پھر آگے ہے وہی کوٹھی — جو ہے جناتِ تجری تحتہا الانہار کی ثانی

رفیع الدرجہ رفعت پست جس سے ہمتِ حاتم — وسیع الدرجہ وسعت تنگ جس سے عزم سلطانی

سجی اتنی دلہن بھی منہ چھپائے جس کو گھونگھٹ میں — ہزاروں کرسیاں میزیں جلو قصہ ہے طولانی

امیرِ وقت ڈپٹی میرزا عباس خاں صاحب — کہ جس کی ذات ہے عزت دہ نوابی و خانی

سخی ایسا کبھی رہنے نہ پائے گانٹھ میں پیسا — جو کچھ پائے بہالے جائے اس کا جوشِ فیضانی

غمِ شبیر کے نشے میں یہ مدہوش رہتا ہے — نہ آئے ہوش میں، آنکھیں نہ چھڑکیں جب تلک پانی

مرزا کے حسن و جمال، رنگین مزاجی اور رعب داب کے قصے تو سن چکے مگر ان کی کوئی تصویر

ہمارے گھر میں تھی۔ ایک تصویر مرزا فرحت اللہ کے زمانے میں ۱۹۳۱ء تک موجود تھی اب معلوم نہیں کہ کہاں ہے۔ یہ تصویر ان کی وفات کے بعد بنی ہوئی تھی اور خواجہ بدر الدین عرف خواجہ اماں نے بنائی تھی۔ (رسالہ اُردو ۱۹۳۱ء، ص...)

اب ہم ذیل میں ان نادر باتوں کا ذکر کر رہے ہیں جو ہمارے خیال میں مرزا کے کیرکٹر اور ان کے نظام کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔

اقتباسات از اُردو اپریل ۱۹۳۱ء:- (خواجہ بدر الدین خاں عرف خواجہ اماں مرحوم و مغفور، از مرزا فرحت اللہ بیگ):-

۱- "...... (لکھنؤ) کے چند رئیسوں نے خواجہ اماں (کے بھائی ڈپٹی عباس بیگ مرحوم) سے کہا کہ ہمیں کسی طرح خواجہ صاحب کا ستار سنوا دو اور اگر ممکن ہو تو یہاں کے استادوں سے ان کا مقابلہ بھی کرا دو۔ مرزا عباس بیگ (نے) ...... ترکیب یہ کی کہ ایک جلسہ کر کے لکھنؤ کے رؤسا شہر کو مدعو کیا اور اس میں وہاں کے چار پانچ مشہور استادانِ ستار کو بھی بلوایا۔ خواجہ اماں مرحوم وہیں تھے ...... استادانِ فن نے کمال دکھانے شروع کیے۔ لوگوں نے تعریفوں کے پل باندھنے شروع کیے ...... خواجہ صاحب .... کہنے لگے میاں عباس لاؤ ہم بھی بجائیں مگر ...... ہم اکیلے نہیں بجائیں گے ...... غرض ستار لایا گیا۔ انھوں نے ایک چیز چھیڑی دوسروں نے ساتھ دیا ..... ساجد بیگ (مرور الدولہ آغا مرزا بیگ کے بھائی) مرحوم کہا کرتے تھے کہ چچا خواجہ اماں کا ستار ... سن کر ...... جلسہ کی یہ کیفیت تھی کہ گویا چیونٹی کی موتیں یا دم بخود بیٹھی ہیں۔" ص...

ڈپٹی عباس بیگ مرحوم کے پاس (خواجہ اماں) اکثر لکھنؤ جایا کرتے تھے۔ لکھنؤ کی مشہور طوائف مشتری جان کا تو یہ حال تھا کہ اُدھر اس نے سنا کہ خواجہ صاحب آئے ہوئے ہیں اور اِدھر شام کو وہ بن بلائے آموجود ہوئی۔ یہ ستار لے کر بیٹھے اور اس نے نیچے سروں میں گانا شروع کیا کوئی دو گھنٹے تک یہی صحبت گرم رہی۔ انھوں نے ستار رکھا اور وہ سلام کر کے رخصت ہوئی جب تک یہ لکھنؤ میں رہتے ممکن تھا کہ شام کو مشتری کوٹھی پر نہ آجاتی ہو۔" ص۲۵۳

اقتباسات "از کارنامہ سروری"

۳ ۔ "اسی زمانے (تقریباً ۱۸۷۰ء) میں سید حسین بلگرامی (نواب عماد الملک) کالج میں اور بابو کیشب چندر و بابو گا (رسکر نب ذیلی) درجوں کے لیے مقرر ہوئے۔ چوں کہ اس وقت تک مسلمانوں میں بی اے پاس بہت کم تھے۔ سید صاحب کی قدر میرے چچا مرزا عباس بیگ بہت کرتے تھے ..... اس وجہ سے بھی کہ ان کے والد اور ان کے چچا زمانۂ غدر سے قبل نواب ضیاء الدین خاں نواب امین الدین خاں و شمس الدین خاں ..... کی تعلیم کے لیے ایک ہی جگہ ملازم تھے ..... " (ص ۳۸)

۴ ۔ " .... پنجاب (تقریباً ۱۸۴۵ء) میں ایک فقیر نے میرزا عباس بیگ کو ایک نقش دستِ غیب کا بخشا اور ان کا قول تھا کہ کل دنیاوی کامیابی ان کو اس نقش کی بدولت حاصل ہوئی تا زمانہ وفات یہ نقش وہ بعد نماز ظہر بن لکھا کرتے تھے۔" (ص ۵۰)

۵ ۔ " کالج (کیننگ) قائم ہوتے وقت (۱۸۶۴ء) ایک جلسہ شوریٰ منعقد ہوا جس کے صدر ..... کمشنر اودھ اور نائب صدر مہاراجہ مان سنگھ (قائم جنگ) اور معتمد مرزا تھے۔ اس جلسے میں ...... اس امر پر بھی بحث ہوئی کہ مدرسہ قرار پائے یا کالج اور اور ابتدا ہیڈ ماسٹر مقرر ہو یا پرنسپل ...... مرزا نے رائے پرنسپل کی دی مہاراجہ نے طنز کیا کہ ہاں مرزا صاحب آپ کے بچے (یعنی بھتیجے وغیرہ) اس میں پڑھتے ہیں اس واسطے آپ نے یہ رائے دی ہے۔ مرزا کی ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیتے تھے بیکایک جامے سے باہر ہو گئے اور جواب دیا کہ تم ایک دھوتی بند، سور بار (شوربہ) سکڑ (شکر) بولنے والا، تو معاملات تعلیم و تربیت کو کیا سمجھے؛ مہاراجا اس مرتبہ کے آدمی تھے کہ تمام تعلق داران اودھ کیا ہندو کیا مسلمان مہاراجہ کی پوجا کرتے تھے۔ یہ الفاظ سن کر دنگ رہ گئے جنرل بیرو نے انگریزی میں بہ تشدد کہا مرزا آپ پورٹمیپر ———— اپنے مزاج کو قابو میں رکھو۔

رضا: یہ قصہ طولانی ہے مختصر یہ کہ بعد میں مہاراجہ مرزا کے گھر پہونچے۔ مرزا

بہت ناراض ہوئے اور کہا۔

"برائے خدا آپ مجھ کو زیادہ تر خود میری آنکھوں میں حقیر نہ کیجئے اور میری گستاخی معاف کیجئے اور مجھ کو اپنا ایک ادنیٰ خدمت گار سمجھیے۔"

(صفحہ ۵۴، ۵۵، ۵۶)

۶۔ "راجہ امیر حسن خاں (محمود آباد) .... کے والد راجہ نواب علی خاں کا، غدر میں... انتقال ہو گیا..... اس پر شبہ بغاوت کا قائم ہو گیا تھا۔ رانی صاحبہ محمود آباد امیر حسن خاں کم سن یتیم کو اپنے ساتھ (۱۸۵۸ء۔ ۱۸۵۹ء) سیتاپور لے آئیں اور مرزا کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر فرمایا کہ مرزا صاحب اس یتیم کو آپ اپنی فرزندی میں لیجئے۔ .. ... مرزا نے راجہ کو آغوش میں لے لیا..... مرزا نے بکمال کوشش ان کا علاقہ چھڑایا اور راجہ سرکاری وارڈ ہو گئے۔ .... سیٹھ جے دیال تعلق دار بسواں نے حال میں مجھ سے کہا کہ مرزا نے جو سلوک رانی صاحبہ (محمود آباد) کے ساتھ کیا اس کے کاغذات ان کے پاس اب تک موجود ہیں......"

۷۔ "...... (مرزا عباس بیگ نے) سید حسین بلگرامی کو دوسرے روز مع اپنے خط کے اُن (میر تراب علی سالار جنگ مختار الملک) کی خدمت میں بھیج دیا۔ نواب کو ان کے خیالات پسند آئے۔ اور تین سو روپیہ ماہانہ مشاہرہ پر اپنے پاس ملازم رکھنا چاہا مگر چونکہ تین سو روپے یعنی ڈیڑھ سو کالج سے اور ڈیڑھ سو چچا (مرزا عباس بیگ مرحوم) لکھنؤ تنخواہ دیا کرتے تھے۔ سید صاحب نے انکار کر دیا... "

(صفحہ ۶۲)

۸۔ نواب وزارت پناہ (سالار جنگ) نے میرے عم بزرگوار مرزا عباس بیگ جاگیردار بڑاگاؤں ملک اودھ جو منجانب گورنمنٹ اس دربار دہلی دربار (۱۸۷۶ء-۱۸۷۷ء) میں مدعو ہوئے تھے کی ملاقات و قدم بوسی حضور پُرنور آصف جاہ سادس (اس وقت دس گیارہ برس کی عمر تھی) سے کرائی مگر جو خلعت و جواہر نواب وزارت پناہ نے ان کے واسطے تجویز کیا۔ اس کو بلا اجازت سرکار (انگریزی) قبول کرنا

ناممکن تھا اور اس کے واسطے عم بزرگوار (مرزا عباس بیگ) نے کوئی عوامی کارروائی مناسب نہ سمجھی۔"

۱۸۷۶ء ۔ ۱۸۷۷ء کا دلی دربار، ۱۸۷۷ء میں اپنے متبنیٰ مرزا فیاض بیگ کی شادی، ۱۸۷۸ء کا جلسۂ ختم تعمیر کیننگ کالج شاید آخری بڑی تقریبات ہیں جن میں مرزا پوری شان سے شامل تھے۔ انھوں نے ۱۸۷۹ء میں انتقال کیا۔

اِستدراک

۱ ۔ غالب نے ایک خط (بنام قدر بلگرامی) میں مرزا عباس بیگ کے نام کے ساتھ "خاں بہادر" لکھا ہے۔

"سیّد صاحب ۔ تم نے جو خط میں برخوردار کامگار مرزا عباس بیگ" خاں بہادر" کی رعایت اور عنایت کا شکریہ ادا کیا ہے ۔ ۔ ۔ "

قدر بلگرامی نے بھی مرزا عباس بیگ کے ساتھ "خاں بہادر" کا اضافہ روا رکھا ہے (دیکھیے کلیات قدر بلگرامی ص۵۲ اور ص۲۴۲) مگر یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ خان بہادر کا خطاب سرکار انگریزی کا عطا کردہ تھا یا محض جاہ و منصب کو دیکھتے ہوئے لوگوں نے انھیں ایسا کہنا شروع کر دیا تھا۔

۲ ۔ مرزا عباس بیگ کی صاحبزادی کا نام وجیہ النساء بیگم تھا۔ شادی مرزا کے بھتیجے یعنی مرزا عاشور بیگ کے بیٹے محمود بیگ سے سیتاپور میں ہوئی مگر کوئی اولاد نہ تھی (غالب نامہ نام آور م ص۱۹۶)

۳ ۔ مرزا کی جائے سکونت اور دیگر تعمیرات سے متعلق نادم سیتاپوری لکھتے ہیں کہ انگریزوں کے تسلط (۱۸۵۷ء) کے بعد مرزا نے سیتاپور کو مستقلاً اپنا وطن بنا لیا تھا۔ ریلوے اسٹیشن (چھوٹی لائن) کے قریب مہاراجہ کپور تھلہ کی کوٹھی خرید کر اسی میں رہ بس گئے تھے (غالب نام آور م ص۲۰۰)۔ اس کے علاوہ ایک کوٹھی قیصر باغ لکھنؤ میں بھی تھی لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد

جب قیصر باغ کا شمالی حصہ منہدم کیا گیا تو کوٹھی بھی ڈھہ گئی۔ بعد ازاں انھوں نے روشن الدولہ کے جانب جنوب اس جگہ پر جہاں اب کوتوالی قیصر باغ ہے ایک شاندار کوٹھی اور امام باڑہ تعمیر کرایا۔ کوٹھی کا بڑا حصہ تو کوتوالی قیصر باغ میں آگیا لیکن شکستہ حالت میں امام باڑہ اب بھی موجود ہے جہاں ہر سال محرم میں تعزیہ داری ہوتی ہے۔

(غالب نام آورم ص۲۰۸)

۴۔ جنگ آزادی، ۱۸۵۷ء میں نواب برجیس قدر کا ساتھ دینے کے جرم میں انگریزوں نے لونے سنگھ راجہ متولی کا بہت بڑا علاقہ ضبط کر لیا تھا اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے اپنے خیرخواہوں میں تقسیم کر دیا تھا جس میں سے علاقہ بڑا گاؤں مرزا کو عنایت ہوا۔ ظاہر ہے کہ یہ تعلقہ بہت بڑا تو نہیں ہو سکتا تھا مگر مرزا نے اپنے تدبر اور فراست سے اسے ایسا بنا دیا کہ وہ باقاعدہ تعلقداروں کی فہرست میں شامل کیا گیا۔ (غالب نام آورم ص۲۰۸)

۵۔ مرزا کے انتقال کے بعد یہ تعلقہ (مرزا کی تحریر کے مطابق جو انھوں نے اپنی زندگی ہی لکھ دی تھی) مرزا کے متبنیٰ مرزا فیاض بیگ کی ملک قرار پایا بعد ازاں مرزا فیض حسین بیگ بن مرزا فیاض بیگ اور پھر مرزا وقار علی بیگ بن مرزا فیض حسین بیگ کی طرف منتقل ہوا جو بقول نادم سیتاپوری (غالب نام آورم ص۲۰۹ مطبوعہ ۱۹۶۱ء) بقید حیات ہیں اور وقار منزل سول لائن سیتاپور میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔"

۶۔ سرور الدولہ آغا مرزا بیگ مصنف "کارنامہ سروری" نے جون ۱۹۲۲ء میں بمقام علی گڑھ انتقال کیا۔ لاش دہلی لائی گئی۔ قبر "مہندیوں" میں یعنی ایوان غالب کے قریب ہی قبرستان حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ میں ہے۔

(۷) سید افضل حسین ثابت (حیات دبیر ص ۳۸۹ و ۳۹۰) نے بھی مرزا عباس بیگ کا تذکرہ کیا ہے حاشیے میں لکھا ہے کہ "یہ حالات کچھ میں اپنے نانا مرحوم سے کچھ جناب مرزا اوج صاحب قبلہ سے سن کر لکھتا ہوں۔ میں خود بھی ڈپٹی عباس بیگ کی خدمت میں اپنے نانا مرحوم کے ساتھ بارہا گیا ہوں اور محرم کی مجلسوں میں جو ۹ بجے سے ۱۲ بجے رات تک ہوتی تھی اپنے نانا کی پیش خوانی میں کبھی کبھی سلام بھی میں نے پڑھا ہے.....۔" بیان کردہ حالات سے جو باتیں سامنے آتی ہیں وہ یہ ہیں۔

(و) مرزا بعد غدر ۱۸۵۵ء اودھ میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہو کر آئے اور "لکھنؤ میں ارب"۔

(ب) مرزا دبیر مغفور کے معتقد خاص تھے۔

(ج) مرزا شعر کہتے تھے غالباً اپنے ماموں مرزا غالب کے شاگرد تھے مگر جیسا کہتے تھے اس سے بہتر شعر کے حسن و قبیح کو سمجھتے تھے۔

(د) اکثر دبیر مرحوم کے روبرو مرزا غالب کے اشعار پڑھا کرتے تھے اور دبیر حسب مذکورہ داد دیتے تھے۔

(ر) مرزا کے نام غالب جو خطوط لکھتے تھے وہ محفوظ نہیں رہ سکے ان میں "مرزا دبیر کو سلام اور ایک نہ ایک پھڑکتا ہوا فقرہ بطور پیام (وہ د غالب) ضرور تحریر فرماتے تھے"۔

(س) مرزا کے "فرزند مرزا فیاض بیگ مرحوم حاتم تخلص (جو منصف بھی ہو گئے تھے) جناب استاذی حضرت اوج مدظلہ کے شاگرد تھے جن کے بعض سلام دفتر ماتم میں چھپے ہیں"۔

حوالے:

۱۔ یہ کتاب راقم کے ذخیرۂ غالبیات میں موجود ہے۔

۲۔ دیکھئے راقم کا مضمون "دعائے صباح" غالب کا فارسی منظوم ترجمہ (آج کل فروری ۱۹۰۵ء)

۳۔ "اردو" اپریل ۱۹۳۱ء صفحہ ۲۳۶ "خواجہ امان مرحوم" از فرحت اللہ بیگ

۴۔ اکبر شاہ ثانی کی طرف سے انگریزی دربار میں سفیر ہو کر کلکتہ میں مقیم تھے ان کے حالات پر مشتمل ایک مختصر مضمون آئندہ شمارے میں پیش ہوگا۔

۵۔ "کارنامہ سروری" صفحہ ۴۳ از نواب آغا مرزا بیگ سرور جنگ، سرور الدولہ، سرور الملک بہادر۔ یہ مرزا عباس بیگ کے چھوٹے بھائی مرزا مغل بیگ کے صاحبزادے تھے۔ ۱۸۴۸ء میں پیدا ہوئے۔ پرورش مرزا عباس بیگ کے سائے میں پائی۔ بعد میں حیدرآباد چلے گئے وہاں بہت عروج پایا۔

لہ جہاں افضل حسین ثابت کے مرزا عباس بیگ کو شاعر مرزا غالب کا شاگرد اور شعر کے حسن و قبیح سے بخوبی واقف بتایا ہے وہاں مرزا کے بھتیجے سرور الدولہ آغا مرزا بیگ کا بیان ہے کہ مرزا شعر گوئی تو ایک طرف شعر صحیح بھی نہ پڑھ سکتے تھے

نیز محبوب علی خان، آصف جاہ سادس کے اتالیق مقرر ہوکر منصب و بار خطاب سے سرفراز ہوئے۔

"کارنامہ سروری" (مطبوعہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۳۲ء) ان کے خود نوشت سوانح ہیں جسے ان کے صاحبزادے نواب ذوالقدر جنگ بہادر، بیرسٹرایٹ نے ترتیب دیا تھا۔

مولوی عبدالحق ۸۔ مئی ۱۹۵۶ء کے خط میں مولوی نصیرالدین ہاشمی کو لکھتے ہیں: ..... آپ کا کہنا صحیح ہے کہ "کارنامہ سروری" میں بہت سی باتیں غلط ہیں۔ شاید آپ کو اس کا علم نہیں کہ اس کتاب کے مسودے میں سے بعض حصّے خارج کر دیئے گئے تھے وہ ناقابلِ طبع سمجھے گئے، غلط ہونے کے علاوہ ناشائستہ بھی تھے۔ (مکتوبات عبدالحق مرتبہ جلیل قدوائی ص ۳۵۲)

ہم نے جو مواد بھی "کارنامہ سروری" سے لیا ہے۔ اسے دوسرے ماخذوں سے مقابلہ کرکے منتخب کیا ہے۔ تاکہ حتی الوسع صحیح تصویر پیش کی جاسکے (اس ضمن میں خلافت اندلس، مصنفہ نواب ذوالقدر جنگ میں باب سوانح مصنف ص ۱ تا ۸ از محمد عنایت اللہ بھی ہمارے پیش نظر رہا ہے)

۶۔ فی الحال یہ کہنا ممکن نہیں کہ مرزا دلی سے کب نکلے۔

۷۔ "کارنامہ سروری" میں "لاہور" لکھا ہے اور کہا ہے کہ وہاں اس وقت سرہنری لارنس "حاکم کل پنجاب" تھا مگر یہ درست نہیں کیونکہ سرہنری لارنس ۹ مارچ ۱۸۴۶ء کو سکھوں کی پہلی لڑائی (مدکی، فیروزشاہ، سبراؤں) کے نتیجے کے طور پر لاہور دربار کا ریزیڈنٹ مقرر ہوا تھا۔ جب کہ مرزا لڑائی کے دوران فیروز پور کے تحصیلدار تھے۔ ہنری لارنس یقیناً اکتوبر ۱۸۴۴ء میں ستلج کے اس پار ان علاقوں میں موجود تھا۔

(i) Sunset of the Sikh
(ii) Cultural History of India Vol. IX

۸۔ کارنامہ سروری ص ۵۰-۵۱

۹۔ میجر جیمز ایبٹ James Abbot یہ وہی ایبٹ ہے جس نے انگریزوں کی چال کے مطابق سکھوں کی دوسری لڑائی (۱۸۴۸-۴۹ء) کرانے میں نہایت مکاری اور چابکدستی کا مظاہرہ کیا اور اس طرح انگریز بالآخر پنجاب پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

۱۰۔ کارنامہ سروری ص ۵۱

۱۱۔ یہ ۱۸۵۱ء کی بات ہوگی۔ جب کہ اس وقت ہم ۱۸۴۴ء کے قریب کی بات کر رہے ہیں۔ کارنامہ سروری میں واقعات کے تقدم و تاخر کی طرف سے بہت بے پروائی برتی گئی ہے۔ اصل خنگی کا باعث

نو مرزا کا اپنی جوان ہنگامی ٹیپ کو بجگا ئے جاتا تھا۔

۱۲۔ کارنامہ سروری صلا

۱۳۔ سر ہنری لارنس ۴ جولائی ۱۸۵۷ء کو لکھنو ریذیڈنسی کی حفاظت کرتے ہوئے مارا گیا۔ سر جان لارنس ۱۸۶۴ء گورنر جنرل وائسرائے ہند مقرر رہا۔ ریٹائر ہونے پر لارڈ بنایا گیا۔ وہی ایبٹ جو سکھوں کی پہلی لڑائی میں زخمی ہو گیا تھا اور جسے زخمی حالت میں مرزا میدان جنگ سے اٹھا لائے تھے۔

۱۴۔ ٹمپل Sir Richard Temple آصف جاہ نہم کے زمانے میں حیدرآباد میں ریزیڈنٹ ہو گیا تھا۔ ۱۸۶۷ء میں بنگال کا لیفٹنٹ گورنر تھا۔ پھر بمبئی کا گورنر رہا۔ انڈیا کا فنانس منسٹر بھی رہا۔ اس نے تبت سے سری لنکا اور آسام سے قندھار تک سیاحت کی تھی اور تقریباً ہر سرکاری محکمے میں کام کیا تھا India in 1880 by Sir Richard Temple Page V

۱۹۰۱ء میں انگلینڈ میں انتقال کیا۔ مرزا عباس بیگ سے کمال محبت تھی (کارنامہ سروری صلا حاشیہ)

۱۵۔ اوٹرام Outram ریذیڈنٹ اودھ جو الحاقِ اودھ کے کاغذات لے کر ۷ فروری ۱۸۵۶ء کو واجد علی شاہ کے پاس گیا تھا۔

۱۶۔ غالب دسمبر ۱۸۵۸ء یا جنوری ۱۸۵۹ء کو چودھری عبدالغفور سرور کی معرفت صاحب عالم کو لکھتے ہیں:

"ہاں حضرت سچ ہے میرامین حسن خاں میرے دوست ہیں اور مرزا عباس بیگ میرا بھانجا۔ فتنہ و فساد کے زمانے میں بلگرام میں رہا اور اب وہ فرخ آباد میں ڈپٹی کلکٹر ہے..."

(خطوطِ غالب از مہر ص۴۰۲)

اس خط سے بعض محققین نے یہ سمجھ لیا کہ مرزا عباس بیگ ۱۸۵۷ء میں بلگرام میں ڈپٹی کلکٹر تھے حالاں کہ اس وقت تک وہ صرف تحصیلدار تھے۔ بلگرام میں تو ان کی حیثیت محض ایک پناہ گزیں کی تھی۔ مزید ثبوت کے لئے دیکھیۓ کلیات نثر (۱۸۹۱ء) ص۳ اور ادبی خطوطِ غالب (۱۹۳۸ء) ص۳۱۷

۱۷۔ کارنامہ سروری صلا اور صلا

۱۸۔ حکیم نواب رکن الدین وزیر وقت کی صاحبزادی اور نواب ضیاء الدین کی بہن۔ ۱۸۵۷ء کی شورش کے بعد ضیاء الدولہ کی املاک ضبط ہو گئی تھی۔ یہ اپنے وقت کا بہت بڑا امیر تھا۔ یہ بھی بامید التمداد مرزا عباس بیگ ہی کے ہاں رہا تھا بلکہ چند سال یہیں مقیم رہا (کارنامہ سروری ص۳۲)

۱۹ ۔ وقتاً فوقتاً دلی آتے جاتے رہتے تھے (کارنامہ سروری ص۲)

۲۰ ۔ خطوط غالب از مہر کے دونوں ایڈیشنوں میں ۱۲۸۲ھ مطابق ۱۸۶۵ء چھپ گیا ہے ۔ ۱۲۸۴ھ مطابق ۱۸۶۷ء ہونا چاہئے ۔ خطوطِ غالب مہیش پرشاد میں اسی طرح ہے ۔

۲۱ ۔ مرزا عباس بیگ کو عرفِ عام میں ڈپٹی ہی کہا جاتا تھا ۔

۲۲ ۔ سر جان لارنس ۔ گورنر جنرل (۱۸۶۴ء تا ۱۸۶۹ء)

۲۳ ۔ کارنامہ سروری ص۹

۲۴ ۔ کپتان بیرو barrow ۱۸۵۶ء اور ۱۸۵۷ء میں سلطنتِ اودھ کا ڈپٹی کمشنر تھا چیف کمشنر اودھ بعد میں ہوا ۔ (ii) Cultural History of India Vol. IX

۲۵ ۔ اس جلسے میں یہ طے کرنا تھا کہ ادارے کا نام مدرسہ رکھا جائے یا کالج اور ابتداً ہیڈ ماسٹر ہو یا پرنسپل ۔
(کارنامہ سروری ص۵۳)

۲۶ ۔ اس سے ظاہر ہے کہ مرزا اس وقت سیتاپور میں متعین تھے ۔

۲۷ ۔ کارخانہ سروری ص۹

۲۸ ۔ کارنامہ سروری ص۵

۲۹ ۔ کارنامہ سروری ص ۱۳ اسی صفحہ پر صاحب "کارنامہ سروری" نے مرزا غالب کے مذہب کے متعلق بھی اشارہ کیا ہے :

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (نواب صاحب نے) فرمایا کہ آپ کے خاندان میں مرزا عباس بیگ کے علاوہ (مرزا غالب) بھی تو شیعہ تھے ۔ میں نے عرض کیا کہ نیم شیعہ تھے ، محبِ اہلِ بیت تھے مگر مذہب اختیار نہیں کیا تھا ۔"

۳۰ ۔ سرور الدولہ مصنف "کارنامہ سروری" کے صاحبزادے نواب ذوالقدر جنگ نے حاشئے میں لکھا ہے کہ "یہ نقش بسم اللہ کا ہے اور والد نے مجھے بتایا ہے میں پابندی کے ساتھ لکھا کرتا ہوں ۔"

۳۱ ۔ یہ اخبار تعلقہ داران اودھ کے مفاد کے تحفظ کے لئے شائع ہوتا ہے ۔

رشید حسن خاں

بہ سلسلۂ تدوینِ کلامِ غالب

غالب کے قلم سے لکھی ہوئی بہت سی تحریریں موجود ہیں۔ اُن کے عکس بھی چھپ چکے ہیں۔ میں اِس مختصر سے مضمون میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، اُس کے لیے ساری خطی تحریروں کو یا اُن کے عکسوں کو سامنے رکھنے کی ضرورت نہیں۔ مرزا صاحب کے قلم سے لکھی ہوئی ایک دو سطروں ہی سے کام چل جائے گا۔ 'غالب انسٹی ٹیوٹ' نے جو نسخۂ دیوانِ غالب (اُردو) شائع کیا ہے، اُس کے گردپوش کے آخری صفحے پر ایک غزل کا عکس بھی چھاپا گیا ہے۔ جو بہ خطِ غالب ہے۔ اُس کا دوسرا شعر اظہارِ مدعا کے لیے کافی ہوگا۔ شعر یہ ہے۔

میں بُلاتا تو ہوں اُس کو، مگر اے جذبۂ دل
اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

عکس میں "ہوں" اور "میں" مع نونِ نقطہ دار ہیں۔ "اوسکو" اور "اوس پہ" مع واو ہیں۔ "اوسکو" ملا کر لکھا گیا ہے اور "اوس پہ" الگ الگ۔ "بن جائے" کے آخر میں یاے مجہول ہے۔ مگر اس پر ہمزہ موجود نہیں مگر "بن آئی نہ بنی" میں دونوں افعال کے آخر میں یاے معروف ہے اور "آئی" مع ہمزہ ہے "کچھ" میں ایک کھنی دارہ لکھی گئی ہے اور آخر میں ہاے مختفی بھی شامل کی گئی ہے۔ "ایسی" کو مع یاے مجہول (ایسے) لکھا گیا ہے۔ "بلاتا"، "تو" اور "ہوں" تینوں لفظوں کے پہلے حرفوں پر

پیش لگا ہوا ہے۔ "کر" ایک خاص شکل میں بنا ہوا ملتا ہے۔ اس کے مقابلے میں دیوانِ مطبوعہ میں موجودہ طریقِ نگارش کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اور اس طرح (ایسے اور مقامات کی طرح) اس شعر میں بھی کئی لفظوں کی شکلیں بدل دی گئی ہیں۔ "اوس" کو بغیر واو کے لکھا گیا ہے۔ "اوسکو" کو الگ الگ "اس کو" لکھا گیا ہے وغیرہ۔ یہاں اگر کوئی شخص یہ پوچھے کہ مرزا صاحب کی تحریر میں لفظوں کی جو شکلیں ہیں، ان کو کیوں بدل دیا گیا؟ اور یہ بھی کہ کیا اِس کا حق حاصل تھا کہ املاے مصنف کو بدل دیا جائے؛ تو اِس کے جواب میں یہی کہا جائے گا کہ املاے الفاظ میں جو تبدیلیاں کی گئی ہیں، اُن کا اصل مقصد یہ ہے کہ منشاے مصنف کو صحیح طور پر پیش کیا جا سکے۔ چوں کہ اب ہم آخرِ لفظ میں واقع نونِ نقطہ دار اور نون بے نقطہ کے تلفظ میں فرق کرتے ہیں؛ اسی طرح آخرِ لفظ میں واقع یاے معروف اور یاے مجہول کی صورت کے لحاظ سے تلفّظ کا، اور تلفظ کے واسطے سے معنی کا تعین کرتے ہیں؛ اِس لیے یہ تبدیلیاں ضروری تھیں۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا، تو غلط خواندگی کے نتیجے میں منشاے مصنف کی خلاف ورزی ہو سکتی تھی۔

اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اصل چیز ہے منشاے مصنف کا تعین اور اُس کی مطابقت۔ وہ تبدیلیاں جو اِس میں معاون ہو سکتی ہیں، یعنی صحیح طور پر منشاے مصنف کی مطابقت ان کی مدد سے حاصل ہو سکتی ہے، ان کا عمل میں آنا ضروری ہے۔ مرزا صاحب نے جب یہ شعر پڑھا ہوگا تو "بن آئی نہ بنی" نہیں پڑھا ہوگا اور "میں" کا تلفظ "مَیں" اور "ہوں" کا تلفظ "ہُوں" نہیں کیا ہوگا۔ "بن آئے نہ بنے" کہا ہوگا۔ اور "مَیں" اور "ہُوں" کہا ہوگا۔ اس زمانے میں یہ عام روشِ کتابت تھی کہ آخرِ لفظ میں شامل یاے معروف و مجہول کی صورت نگاری میں اُس امتیاز کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا تھا، جس کو آج لازماً ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ اس لیے اس زمانے میں "آئی نہ بنی" سے اِن لفظوں کا تلفظ نہیں بدلتا تھا، مگر اب چوں کہ صورت نگاری کے فرق کو ملحوظ رکھا جاتا ہے، اس لیے اب "آئی نہ بنی" لکھنے سے تلفظ بدل جائے گا اور اس سے معنویت پر بھی اثر پڑے گا۔ یوں یہ تبدیلی لازم تھی۔

یہ طریقۂ کار بہ ظاہر بہت سیدھا سادھا نظر آتا ہے، اس میں کچھ اشکال بھی نظر نہیں آتا؛ مگر واقعہ یہ ہے کہ اصل مشکل یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ میں ایک مثال سے اپنی بات کی وضاحت کرنا چاہوں گا۔ ہم "خورشید" لکھتے ہیں۔ مرزا صاحب نے نہایت وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ

صحیح املا "خرشید" (واو کے بغیر) ہے۔ "خورشید" لکھا جائے یا "خرشید"۔ اِس سے نہ تو اِس لفظ کا تلفظ بدلتا ہے اور نہ معنی پر کچھ اثر پڑتا ہے۔ اب یہاں یہ بات فیصلہ طلب قرار پاتی ہے کہ ایسی صورت میں کیا یہ لازم قرار دیا جائے گا کہ مرزا صاحب کے کلام میں "خرشید" ہی لکھا جائے۔ اگر اسے لازم قرار دیا جائے گا، تو اس کے لیے پہلے اس بات کو اصول کے طور پر ماننا ہوگا کہ کسی مصنف نے اگر وضاحتاً بعض الفاظ کے متعلق اپنے طریقِ نگارش کی صراحت کی ہے، اُس صورت میں اُس کے قول کی مطابقت لازم ٹھہرے گی، خواہ عام طور پر ان لفظوں کو مختلف طور پر لکھا جاتا ہو اور خواہ اس مصنف کا وہ قول بجاے خود غلط ہو۔ اگر اِس اصول کو مان لیا جائے، اُس صورت میں یہ بھی لازم ہوگا کہ مرزا صاحب کے ایسے جملہ اقوال کو پیشِ نظر رکھا جائے اور التزام کے ساتھ ان کی مطابقت اختیار کی جائے، وہ بجاے خود صحیح ہوں یا غلط۔ اگر تحقیق اور تدوین کے طریق کار پر نظر رکھی جائے تو اِس اصول کو قطعیت کے ساتھ ماننا ہوگا، لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ اس سلسلے میں بہت انتشار نظر آتا ہے۔ دو تین مثالوں سے اِس صورتِ حال کی وضاحت کرنا چاہوں گا۔

ایک مثال تو اسی لفظ "خرشید" سے دی جاسکتی ہے۔ مرزا صاحب نے اس املا کی تائید میں مکتوب بہ نام میر مہدی مجروح میں جو دلیل دی ہے، اہلِ علم نے اُسے درست نہیں مانا۔ بالتکرار یہ لکھا گیا ہے کہ مرزا صاحب کی راے درست نہیں تھی۔ ایک دوسری مثال فارسی میں 'ذال' کی بحث سے دی جاسکتی ہے۔ مرزا صاحب کا کہنا تھا کہ فارسی میں ذال موجود نہیں، لہذا فارسی کے ایسے سب لفظوں میں 'زے' لکھنا چاہیے۔ فارسی زبان سے عالمانہ واقفیت رکھنے والوں کا یہ کہنا ہے کہ مرزا صاحب کا یہ قول بھی درست نہیں۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، قاضی عبدالودود اور پروفیسر نذیر احمد نے اپنے عالمانہ مقالات میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ مرزا صاحب غلطی پر تھے۔

تیسری مثال اِن دونوں مثالوں سے ذرا مختلف ہے۔ مرزا صاحب نے لکھا ہے کہ "یہاں" بروزن "آہاں" فصیح نہیں، بے ضرورت نہ چاہیے۔ "یھاں" بہ ہاے مخلوط التلفظ افصح ہے" (مقدمۂ مکاتیب غالب، طبع ششم، ص ۱۵۴)۔ "وہاں" کے متعلق مرزا صاحب نے کچھ نہیں لکھا، مگر "یھاں" کے قیاس پر "وہاں" کے مخفف کو بھی "وہاں" ماننا چاہیے۔ اس قیاس کی تائید یوں بھی ہوتی ہے کہ مولانا حالی کی کتاب "یادگارِ غالب" کے پہلے اڈیشن میں (مطبوعۂ نامی پریس کان پور، سال طبع، ۱۸۹۷ء)

غالب کے اشعار میں ایسے مواقع پر ہر جگہ التزام کے ساتھ "یہاں" اور "وہاں" (مع ہائے مخلوط التلفظ) ملتے ہیں۔ مگر دیوانِ غالب کے اہم نسخوں میں عموماً ایسے مواقع پر "یاں" اور "واں" نظر آتے ہیں۔

اب ان تینوں مثالوں سے قطعی طور پر ایک مختلف صورت حال کا حوالہ دینا چاہتا ہوں۔ مرزا صاحب نے جگہ جگہ یہ صراحت کی ہے کہ فلاں لفظ میں یائے مجہول ہے یا یائے معروف۔ مثلاً تفتہ کو ایک خط میں لکھا ہے کہ یائے مصدری معروف ہوتی ہے اور مثال میں لفظ آشنائی لکھا ہے۔ پھر لکھا ہے کہ یائے توحید و تنکیر مجہول ہوگی اور مثال میں "آشنائے" یعنی ایک آشنا یا کوئی آشنا، لکھا ہے۔ چودھری عبدالغفور سرور کو ایک خط میں یہ سمجھایا ہے کہ "گفتنی" اور "گفتنے" میں کیا فرق ہے۔ انھی کو ایک اور خط میں لکھا ہے: اے کریمے کہ از خزانۂ غیب۔ ہرگز یائے معروف نہیں ہے، یائے مجہول ہے۔ یائے معروف یہاں نامقبول ہے — خدائے کہ بالا و پست آفرید۔ ایسا خدا، ایسا کریم اس تحتانی کو یائے وحدت کہو، یائے توصیف کہو، یائے تعظیم کہو، جس طرح کہو، یائے مجہول آئے گی۔"

مرزا صاحب نے تعلق کو ایک خط میں لکھا ہے: "صاحب بندہ! تحریر میں اساتذہ کا تتبع کرو، نہ مغل کے لہجے کا۔ لہجے کا تتبع بھانڈوں کا کام ہے، نہ دبیروں اور شاعروں کا۔ ایسی تقلید کو میرا سلام۔" تیغ تیز میں نون غنہ کی بحث میں ایک جگہ لکھا ہے: "اسی ۱۸ اور ۱۹ صفحے میں جہاں "کندیدن" کو غلط بتاتے ہیں اور ماند و خواند کو بروزنِ چاند غلط بتاتے ہیں اور مند و خند کو بروزنِ تُند و کُند صحیح فرماتے ہیں۔۔۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ! اہلِ ایران الف کو سلا دیتے ہیں، اور یہ لہجہ ہے، نہ قاعدہ۔ شاعر اور منشی کو تتبع قواعد کا چاہیے، لہجے کی تقلید بہروپیوں اور بھانڈوں کا کام ہے" [قاطع برہان و رسائل متعلقہ، مرتبہ قاضی عبدالودود، ص ۲۰۰]

"خرشید" کے املا اور فارسی میں ذال کے وجود کے متعلق تو یہ ثابت کر دیا گیا کہ غالب کی رائے درست نہیں تھی، مگر فارسی الفاظ میں نون غنہ اور مجہول و معروف آوازوں کے وجود کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مرزا صاحب کی رائے غلط تھی۔ اس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، اسے غلط نہیں کہا جا سکتا۔ یہ الگ الگ باتیں ہوئیں۔

اس طرح مندرجۂ بالا امثال کی روشنی میں ایسی کئی اہم باتیں سامنے آتی ہیں جن سے تدوینِ کلام

غالب کے سلسلے میں ہمہ وقت سابقہ پڑے گا۔ اب تک کلامِ غالب کے جو مختلف اہم نسخے شائع ہوئے ہیں، وہ انفرادی کارنامے ہیں۔ انفرادی کام میں یہ آسانی ہوتی ہے کہ مرتب اپنی صوابدید کے مطابق ایک طریقۂ کار کو طے کر سکتا ہے اور اس کی پابندی کو اپنے لیے لازم قرار دے سکتا ہے۔ اگر کوئی ادارہ کلامِ غالب کے تحقیقی اڈیشن مرتب کرائے اور شائع کرے، اس وقت یہ سوال پوری وسعت کے ساتھ سامنے آئے گا کہ اردو اور فارسی کلام کی تدوین میں کن اصولوں کو سامنے رکھا جائے؛ کیا فارسی کلام میں جدید ایرانی املا اور تلفظ کو اختیار کیا جائے گا، جس کی تقلید کو مرزا صاحب نے بہروپیوں اور بھانڈوں کا کام بتایا ہے، یا ہندوستانی روشِ عام کی پابندی کی جائے گی۔ اردو کلام میں "یہاں" اور "وہاں" لکھیں گے یا "واں" اور "یاں"؛ "خرشید" لکھیں گے یا "خورشید"؛ اور "گذشتہ" وغیرہ میں ذال لکھیں گے یا زے (وغیرہ)۔ ان باتوں کا واضح طور پر طے کیا جانا یوں ضروری ہے کہ طریقِ کار میں یکسانی رہے اور تدوین کے طریقِ کار کی بھی خلاف ورزی نہ ہو۔

ہندوستان میں غالب انسٹی ٹیوٹ، مرزا غالب سے متعلق سب سے وقیع اور سب سے بڑا ادارہ ہے۔ میری تجویز یہ ہے کہ ایسے تین، یا چار، یا پانچ افراد پر مشتمل ایک کمیٹی کی تشکیل کی جائے جو افراد اِن مسائل سے بہ خوبی واقف ہوں اور وہ کمیٹی جس طریقِ کار کا تعین کرے، اس ادارے کی مطبوعات میں اس کی پابندی کی جائے۔ اس طرح سب کاموں میں یکسانی بھی رہے گی اور تحقیق و تدوین کے اصولوں کی روشنی میں طریقۂ کار کا تعین بھی کیا جا سکے گا۔ اس کی ضرورت کئی وجہوں سے ہے۔ سب سے بڑی وجہ تو یہی ہے کہ اس ادارے کے مقاصد میں یہ شامل ہے کہ کلامِ غالب کے معتبر اڈیشن شائع کیے جائیں۔ اِس کے لیے یہ لازم ٹھہرے گا کہ انفرادی طریقِ کار پر انحصار نہ کرتے ہوئے صحتِ متنی کے سلسلے میں مختلف فیہ یا غیر مختلف فیہ اہم مسائل کا گوشوارہ بنا لیا جائے اور اس ادارے کی طرف سے مرتب کرائے جانے والے مجموعہ ہائے نظم و نثرِ غالب میں اس مسلّمہ اور متفقہ طریقِ کار کی پابندی کو لازم قرار دیا جائے۔

دوسری وجہ، جس نے اِس طرف میری توجہ خاص طور پر مبذول کرائی ہے، یہ ہے کہ ہندستان اور پاکستان میں غالب کے اردو فارسی نظم و نثر کے جو مجموعے بعض اداروں کی طرف سے شائع ہوئے ہیں یا وہ اہم افراد کے انفرادی کارنامے ہیں، ان میں مختلف طریقِ کار نظر

آتے ہیں۔ ایک ادارہ فارسی کلام کو جدید ایرانی بل کہ تہرانی لہجے کی مطابقت میں مرتب کراتا ہے اور دوسرا ادارہ اس کے برخلاف ہندستانی لہجے کی پابندی کرتا ہے۔ اور یہ بھی ہے کہ اصولوں کے اور طریقِ کار کے طے نہ ہونے سے ایک ہی مجلد میں کہیں کچھ ہے اور کہیں کچھ۔ تیسری وجہ جس کی بنا پر اس ضرورت کا شدت کے ساتھ احساس ہوا ہے، وہ ہے اقبال کے کلام کی اشاعت۔ اقبال صدی کی مناسبت سے کلام اقبال کے جو مجموعے شائع ہوئے ہیں، ان میں سے دو نسخے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ایک تو وہ جسے جاوید اقبال نے مرتب کیا ہے اور دوسرا وہ جسے اقبال اکادمی لاہور نے شائع کیا ہے جو پاکستان میں اقبالیات سے متعلق اہم ادارہ ہے۔ یہ دونوں نسخے باہم اس قدر مختلف ہیں کہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے اور اس کی اصل وجہ وہی ہے کہ کسی ادارے نے کلام کو تحقیقی طور پر مرتب کرانے سے پہلے تصحیح و ترتیبِ متن کے سلسلے میں اصولوں کا اور طریقِ کار کا تعین نہیں کیا، اس سے "کہیں کچھ کہیں کچھ" والی صورت حال پیدا ہوئی۔ ابھی ایسے لوگوں کا قحط نہیں جو ان مسائل پر صائب رائے دینے کے اہل ہوں۔ اور اسے محض حسنِ اتفاق سمجھنا چاہیے، اگر اس زمانے میں اس بنیادی کام کو کرلیا جائے گا تو گویا بڑا کام کرلیا جائے گا؛ ورنہ یہاں بھی وہی صورت رہے گی جو دوسرے اداروں کی مطبوعات میں بطور عموم نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر شریف حسین قاسمی

عہدِ غالب کے فارسی ادب کی خصوصیات

مشہور کہاوت ہے کہ جب چراغ بجھنے لگتا ہے تو بھڑک اُٹھتا ہے۔ عہدِ غالب کے فارسی ادب کے ساتھ بھی یہی صورتِ حال پیش آئی۔ انیسویں صدی کے نصفِ اوّل کے فارسی ادب پر سرسری نگاہ بھی اس نتیجے پر پہنچا دیتی ہے کہ کیفیت و کمیت کے اعتبار سے اس دور کا فارسی ادب گذشتہ ادوار کے مقابلے میں زیادہ وقیع ہے۔ فارسی ادب کا شاید ہی کوئی پہلو ایسا ہو جس پر اس دور کے علما، شعرا اور ادبا نے طبع آزمائی نہ کی ہو۔ اس کے علاوہ بعض ایسی کتابیں بھی اس دور میں لکھی گئیں جن کی مثال گذشتہ ادوار میں مشکل سے نظر آتی ہے۔

غالب دہلوی کے انتقال (۱۲۸۵ھ) کے بعد علامہ اقبال لاہوری واحد ایسے مفکر شاعر ہیں جن کے فارسی کلام پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے اور جن کا کلام آج بھی فارسی دنیا میں صاحبانِ نظر کی توجہ کا مرکز ہے۔ اگر علامہ اقبال نے اپنے اظہارِ خیال کے لیے فارسی کو منتخب نہ کیا ہوتا تو درحقیقت بہ آسانی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں فارسی ادب غالب کے ساتھ ہی ختم ہو گیا ہوتا۔

یہ حقیقت سب پر روشن ہے کہ ہندوستان میں شاہی درباروں نے ہمیشہ فارسی

زبان وادب کی سرپرستی کی۔ فارسی ہندوستان میں درباری زبان رہی۔ اس کے نتیجے میں علما، وشعرا و ادبا کی ایک کثیر تعداد درباروں سے وابستہ اور اپنے اپنے مخصوص میدانوں میں علمی و ادبی خدمات انجام دیتی رہی۔ چوں کہ فارسی زبان اور اس کے ادب کا دربار سے ایک اٹوٹ تعلق پیدا ہو گیا تھا، اس وجہ سے اس کی قسمت بھی اسی دربار سے وابستہ ہو گئی۔ انیسویں صدی کے وسط تک جیسے ہی انگریزوں نے مغلوں کی برائے نام حکومت بھی ختم کر دی اور مختلف ریاستوں میں آزاد اور نیم آزاد حکومتوں پر بھی انگریزوں کا غلبہ ہو گیا تو فارسی زبان و ادب بھی بتدریج زوال پذیر ہوا۔ اس کے بعد وقت گزرنے کے ساتھ فارسی زبان وادب ہندوستان میں قصۂ پارینہ بن گئے۔

مغل سلطنت کے آخری دور میں مغلوں کے بے دست و پائی کے نتیجے میں خود ان کے مقرر کردہ متعدد ریاستوں کے صوبے دار اور دیگر صاحبانِ اقتدار نے مرکزی حکومت سے اپنا تعلق توڑ لیا تھا اور آزاد و مستقل حکمرانوں کی حیثیت سے حکومت کرنے لگے تھے۔ اس وجہ سے اب صرف دہلی کا ایک دربار نہیں تھا بلکہ مختلف علاقوں میں متعدد دربار وجود میں آ گئے تھے۔ ان تمام درباروں کے مسلمان اور غیر مسلمان سربراہوں نے فارسی زبان و ادب کی سرپرستی کی۔ دہلی کے علاوہ رام پور، اودھ، حیدرآباد، بھوپال، ملتان، ٹونک، عظیم آباد وغیرہ ایسے مراکز تھے جہاں اس دور میں فارسی شعرا اور ادبا کی سخاوت مندانہ سرپرستی کی گئی۔ فارسی زبان وادب کے حامی ان ادبی مراکز کی کثرت کی وجہ سے بھی فارسی ادب کو اس زمانے میں پہلے سے زیادہ پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔

انیسویں صدی کے نصف اول (۱۸۰۱ تا ۱۸۵۷ء) میں سو کے قریب فارسی شاعر اور ادیب ہندوستان کے مختلف علاقوں میں فارسی آثار کی تخلیق میں ہمہ تن مشغول رہے۔ اس دور کے تقریباً پچاس شعرا کے فارسی دواوین اور دیگر منظوم آثار آج بھی ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کتاب خانوں میں محفوظ ہیں۔ اسی طرح تقریباً پچاس ایسے شعرا کے نام تذکروں وغیرہ میں مذکور ہیں جنھوں نے فارسی شاعری کو زندہ رکھا۔ لیکن ان کے آثار تا حال دسترس میں نہیں ہیں۔ اس دور کے شعرا نے غزل، قصیدہ، رباعی، مثنوی وغیرہ

غرض کہ تمام قدیم اور روایتی اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔

غلام محی الدین شایق (م: ۱۲۴۹/ ۴ ـ ۱۸۳۳ء)، صہبائی (م: ۱۲۷۴/ ۱۸۵۷ء) غالب دہلوی (م: ۱۲۸۶ ـ ۱۸۶۹)، شاہ نیاز احمد نیاز بریلوی (م: ۱۲۵۰/ ۵ ـ ۱۸۳۴)، جنیدو لعل شادان (م: ۱۲۶۱/ ۱۸۴۵)، مومن خاں مومن (م: ۱۲۶۸/ ۲ ـ ۱۸۵۱)، قاضی محمد صادق اختر (متولد: ۱۲۰۱/ ۷ ـ ۱۷۸۶)، محمد قدرت اللہ قدرت (متولد: ۱۱۹۹/ ۱۷۸۵)، مولانا فضل عظیم (م: ۱۸۵۷) ابن مولوی فضل امام (م: ۱۲۴۳/ ۱۸۲۸)، شاہ تراب علی تراب (م: ۱۲۷۵/ ۱۸۵۸)، مفتی صدرالدین آزردہ (م: ۱۲۸۵/ ۱۸۶۸)، مصطفیٰ خاں حسرتی، شیفتہ (م: ۱۲۸۶/ ۱۸۶۹)، صاحبِ عالم مارہروی (م: ۱۲۸۸/ ۱۸۷۱)، الفت حسین شاہ فریاد (م: ۱۲۹۷/ ۱۸۸۰)، سید مظفر علی اسیر (م: ۱۲۹۹/ ۲ ـ ۱۸۸۱)، محمد یار خاں آفی، لساون لعل شادان وغیرہ کا شمار اس دَور کے اہم اور اُستاد شعرا میں ہونا چاہیے۔

غالب کو اس دور کے فارسی شعرا میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ غالب کی فارسی شاعری اس زبان کی تقریباً ایک ہزار سالہ شاندار روایات کی امین ہے۔ وہ فارسی کو اپنی ازلی دست گاہ سمجھتے تھے۔ خود ان کے بقول وہ فارسی کے محقق تھے، اور میزان (ترازو) فارسی ان کے ہاتھ میں تھی۔ حالاں کہ قاطع برہان میں وہ لسانی اعتبار سے بعض اشتباہات کے مرتکب ہوئے ہیں، لیکن اس کے باوجود یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ انھوں نے فارسی زبان، اس کے ادب کی تاریخ، اس کے پس منظر وغیرہ کو سمجھنے اور سمجھانے کی جو علمی اور پُرجوش کوششیں کی ہیں وہ اس دَور کی علمی و ادبی تاریخ کا ایک اہم اور ناقابلِ فراموش باب ہے۔ اسی صورتِ حال کے پیشِ نظر صہبائی نے کہا تھا:

چو دیدم غالب و آزردہ را از ہند صہبائی

بہ خاطر ہیچ یاد از خاکِ ایرانم نمی آید[۱]

مومن خاں مومن کو فارسی میں وہ دست گاہ حاصل تھی کہ اہلِ ایران انھیں ایرانی سمجھتے تھے[۲]
مومن کا تعلق اس ولی اللہی خاندان سے تھا جو ہندوستان میں قرونِ وسطیٰ کی روایات کو بہ ہر صورت محفوظ اور برقرار رکھنے کے لیے سرگرمِ عمل رہا۔ اس خاندان سے ذہنی وابستگی

کی وجہ سے، ہندوستان پر انگریزوں کے روز افزوں غلبے کو خاموشی سے برداشت کرنا مومن کے لیے مشکل تھا۔ اس لیے انھوں نے اپنے ہم وطنوں کو ایک اجنبی حکومت کے تسلط کے خلاف جدوجہد کی دعوت دی:

این عیسویان بلب رسانند — جان من و جان آفرینش
تا چند بخواب ناز باشی — فارغ ز فغان آفرینش
مومن شدہ ہم زبان عرفی — از بہر امان آفرینش
برخیز کہ شور کفر برخاست — ای نقشہ نشان آفرینش[۱۲]

مومن کا یہ لب ولہجہ اور اس منظومے میں ان کا مقصد فارسی شاعری کی تاریخ میں غالب ایک امتیازی شان کا حامل ہے۔

انگریز ہندوستان آگئے، ان کا اقتدار بھی قائم ہوگیا، اس اقتدار کو مستحکم کرنے کے لیے انھوں نے ہندوستان میں قرون وسطیٰ کی علمی، ادبی، ثقافتی اور سیاسی روایات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ فارسی زبان و ادب ان روایات کے ادراک کا اہم وسیلہ تھا انھوں نے مجبوراً فارسی کی طرف توجہ کی جس کے نتیجے میں یورپ کے بعض اہل فضل کو فارسی میں دست گاہ حاصل ہوگئی اور اس دور میں فارسی ادب کی تاریخ میں پہلی بار اہل یورپ نے شعر کہے اور دیگر علمی آثار اپنی یادگار چھوڑے۔

فرانسو گوڈلین یا گوڈلیپ کوینس نے فارسی میں شعر کہے، لیکن ان کی فارسی نثر ان کی فارسی شاعری سے بہتر ہے۔ کوینس نے فارسی اور اُردو میں کئی منظوم و منثور کتابیں تالیف کی تھیں۔ جن میں ان کی مثنوی ظفر الظفر آج بھی محفوظ ہے جس میں ۱۸۵۷ء کے سیاسی حالات بیان کیے گئے ہیں[۱۳]

ولیم بیلے کی مفتاح التواریخ کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اس کتاب میں بے شمار تاریخی قطعات بیلے کی فارسی شاعری میں مہارت کے ترجمان ہیں۔ بیلے نے فارسی شاعری میں اپنی استعداد کا اس طرح کسر نفسی کے ساتھ اظہار کیا ہے:

اگرچہ مؤلف را در گفتن شعر و سخن دست گاہی نیست، اما از آنجا کہ بعضی اوقات

جہت طبع آزمائی، تاریخی چند نوک ریزاین ہیچ مدان گردیدہ، آن ہمہ را درمقام خودش در ضمن این اوراق ثبت نمود۔

اس دَور کے اکثر شاعر فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں باقاعدہ طبع آزمائی کرتے تھے جو اسی دَور کی خاصیت ہے۔ اس دور میں اُردو شاعری کو خاص طور پر اہلِ علم کی نظر میں اس درجہ اعتبار حاصل ہوگیا تھا کہ حتیٰ ایرانی الاصل شعرا نے بھی اُردو میں دواوین مرتب کیے۔ محمد رضا متخلص بہ نجم کا خاندان اسی دَور میں اصفہان سے ہندوستان منتقل ہوا تھا۔ نجم نے فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہے اور دیوان مرتب کیے۔[۵۲] یہ صحیح ہے کہ فارسی کا رواج آہستہ آہستہ زوال پذیر تھا، لیکن اس کی ادبی، علمی اور تہذیبی اہمیت سے کوئی منکر نہیں تھا۔ اس دَور میں بھی فارسی جاننے والوں اور اس کے حامیوں کی تعداد میں کوئی خاص کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ منشی عبدالکریم مؤلف تاریخ پنجاب نے اردو اخبارات کو صرف اس وجہ سے فارسی میں منتقل کیا تھا کہ فارسی اب بھی ہندوستان کی مطبوع و محبوب زبان تھی۔ اس سلسلے میں ان کے الفاظ ہیں:

چون اہلِ ہندوستان را فارسی مطبوع و مرغوبست، لہذا از اخبار اُردو درین زبان ترجمہ نمود۔[۵۳]

تعجب کی بات ہے کہ شمالی ہندوستان جہاں فارسی زبان و ادب کا صدیوں تک بول بالا رہا تھا اور جہاں اس زبان نے شعرا و ادبا، علما اور دانشوروں کے ذہن و قلم پر حکمرانی کی تھی، وہاں اس زبان کا مستقبل خطرے میں تھا۔ اس کے برخلاف جنوبی ہندوستان خاص طور پر کرناٹک میں فارسی کی طرف غیر معمولی توجہ دی جارہی تھی۔ کرناٹک کے والا جاہی نوابوں نے اس دَور میں فارسی کو ایک نئی زندگی بخشی تھی۔ والا جاہ پنجم محمد غوث خاں متخلص بہ اعظم (۱۲۵۹/ ۱۸۴۳ — ۱۲۷۲/ ۱۸۵۵) خود شاعر و ادیب تھے اور شاعروں کے زبردست سرپرست بھی۔[۵۴] انھوں نے ۱۲۶۲/ ۱۸۴۶ میں ایک مجلس مشاعرہ تشکیل دی۔ اس مجلس میں جو ہفتے میں ایک بار منعقد ہوتی تھی، صرف فارسی کا کلام پڑھا جاتا تھا۔ نواب صاحب کی اجازت کے بغیر اس میں شرکت ممکن نہیں تھی۔ شیریں سخن خاں

متخلص بہ راقم اور مولوی میران محی الدین قادری واقف اس مجلس میں حَکَم اور سید محمد خالص اس مجلس کے منشی تھے۔ مصرع طرح دے دیا جاتا تھا، صرف وہی شعرا اس مجلس میں اپنا طرحی کلام پیش کرتے جنھیں نواب صاحب کی طرف سے اجازت ہوتی۔ نواب صاحب کی طرف سے مجلس مشاعرہ میں پیش کیے جانے والے کلام پر اعتراضات کی اجازت تھی۔ اگر کسی مسئلہ پر بحث طویل ہوجاتی اور حَکَم کی مداخلت کے باوجود تصفیہ نہ ہوپاتا تو نواب صاحب سے رجوع کیا جاتا جن کی رائے سب کے لیے قابلِ قبول ہوتی۔ مرتضیٰ بینش اس مجلس کے ایک رُکن تھے۔ ان کے یہ دو اشعار اس مجلس کی کیفیت کو واضح کرتے ہیں :

گفتم غزل این بزم سخن را بہ مثل ہر یک بتیش خوش است بی عیب و خلل

شد مطلع او اعظم و مقطع راقم واقف و قدرت دو فرد چیدہ زغزل[۵۹]

اُنیسویں صدی کے شعرا کو انگریزی حسن دیکھنے کا زیادہ موقع ملا۔ بعض شعرا نے انھی میں سے صنم منتخب کر لیے۔ حالانکہ شاہ تراب علی تراب فرنگیوں کے مظالم سے خائف تھے، لیکن پھر بھی انھوں نے اسی قوم کی ایک حسینہ کو اپنے صنم خانۂ دل میں جگہ دی :

دل بزلفش ندھی، قید فرنگست تراب گو بر اعجاز مسیحی صنم انگریز است[۶۰]

انگریزوں سے ربط ضبط بڑھنے کی وجہ سے ہندوستانی بعض انگریزی الفاظ بلا ارادہ اپنی اپنی زبانوں میں استعمال کر رہے تھے۔ اس دور کی فارسی میں بھی انگریزی الفاظ استعمال کیے گئے جس کی مثال اس سے پہلے کی ہندوستانی فارسی زبان میں نظر نہیں آتی۔ اس صورتِ حال کی بہترین مثال خود غالب کی فارسی نظم و نثر ہے۔

اُنیسویں صدی کے ہندوستان میں سیاسی اور اقتصادی زبوں حالی اور بے اطمینانی کے باوجود چند ایرانی علما و شعرا و ادبا ہندوستان آئے اور اپنے اپنے مخصوص میدانوں میں سرگرمِ عمل رہے۔ بہرحال اس امر کا اقرار ضروری ہے کہ اس دور میں کوئی غزالی مشہدی، نظیری یا ابو طالب کلیم جیسا ایرانی شاعر ہندوستان میں نظر نہیں آتا جس کو فارسی شاعری کی تاریخ میں ایک خاص مقام حاصل ہو۔

میرزا محمد خان متخلص بہ نصیبی (م: ۱۲۶۱/ ۱۸۴۵) فرزند موسیٰ بیگ کو ایران کے قاجاری بادشاہ فتح علی شاہ نے فخر الشعرا کے خطاب سے نوازا تھا۔ یہ ہندوستان آ گئے اور اودھ کے غازی الدین حیدر کے دربار سے وابستہ ہو گئے[11]۔ نصیبی نے مثنوی چندارانی یا بحر وصال نظم کی جس میں ملک خورشید اور چندارانی کی عشقیہ داستان بیان کی گئی ہے[12]۔

اس دور کے شعرا و ادبا نے بڑی تعداد میں ہندوستانی داستانوں کو فارسی نظم و نثر میں بیان کیا ہے جن میں سسی پنوں[13]، مرزا صاحبان[14]، داستان کامروپ و کام لتا[15]، بیتال پچیسی[16]، ہیر رانجھا[17]، طوطی نامے کی داستانیں[18]، سنگھاسن بتیسی[19]، پدماوت[20]، سوہنی مہی وال[21]، نل دمن وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ دربار اکبری کے ملک الشعرا فیضی فیاضی نے مہابھارت کی ایک داستان نل دمن کو سب سے پہلے فارسی نظم میں بیان کیا تھا۔ اس کے بعد غالباً کسی دوسرے فارسی شاعر یا ادیب نے اسے فارسی میں بیان نہیں کیا۔ انیسویں صدی عیسوی کے نصف اول میں عبرتی عظیم آبادی نے اس داستان کو اعجاز المحبت[22] کے نام سے فارسی نثر میں بیان کیا اور اس طرح اس دور کو گذشتہ ادوار کے مقابلے میں ایک خاص ادبی امتیاز بخشا۔ اسی طرح بیتال پچیسی داستانوں کا وہ مجموعہ ہے جو سنسکرت کی معروف کتاب کتھا سرت ساگر میں شامل ہے۔ مہاراجہ مادھو کشن جنھوں نے انوار سہیلی کا پنجابی میں ترجمہ کیا تھا[23]، اس دور میں ان داستانوں کو فارسی میں منتقل کرنے کا بیڑہ اٹھاتے ہیں۔ ان کی ناوقت موت کی وجہ سے یہ پروجیکٹ نامکمل رہا۔ وہ صرف تین داستانیں فارسی میں منتقل نہیں کر سکے تھے جنھیں بعد میں ان کے بھائی اندر کشن بہادر نے ایک مقدمے کے ساتھ ۱۲۵۶/ ۴۱ – ۱۸۴۰ میں مکمل کیا۔ اس دور سے پہلے یہ داستانیں فارسی میں پیش نہیں کی گئی تھیں۔

اس دور کی یہ خصوصیت بھی ہے کہ اس میں سندھ کے تالپور شاہی خاندان کے میر صوبہ دار خان فرزند میر فتح علی خان تالپور نے فارسی دیوان کے علاوہ نظامی گنجوی کی پیروی میں ایک خمسہ نظم کیا۔ ان کی پانچ مثنویوں کے نام ہیں:

مثنوی فتح نامہ[۲۴]، مثنوی سیف الملوک[۲۵]، مثنوی خسرو شیریں[۲۶]، ماہ و مشتری[۲۷] اور جدائی نامہ[۲۸]۔

انیسویں صدی کے نصف اول میں تاریخ کی متعدد کتابیں فارسی میں لکھی گئیں۔ دنیا کی عمومی تاریخیں، ہندوستان کی تواریخ، ہندوستان کے بعض علاقوں کی تاریخ اور اسی طرح ہندوستان کے بعض حکمران خاندانوں کی تاریخ اس دور میں بار بار لکھی گئیں۔ اس دور میں جو تاریخیں فارسی میں لکھی گئیں وہ کمیت کے لحاظ سے لازمی طور پر کسی بھی گذشتہ پچاس سال کے دوران لکھی جانے والی فارسی تواریخ سے زیادہ ہیں۔ زبدۃ الاخبار تالیف غلام محی الدین قادری[۲۹]، سراج التواریخ از نور محمد[۳۰]، جامع التواریخ مصنفہ قاضی فقیر محمد[۳۱]، مرأۃ گیتی نما تالیف کریم خان مجھجری[۳۲]، مرأۃ الاحوال جہان نما[۳۳] وغیرہ وہ عمومی تاریخیں ہیں جو عہدِ غالب میں فارسی میں لکھی گئیں۔

اس وقت مرأۃ الاحوال جہان نما کا ذکر ضروری ہے۔ اس اہم تاریخ کے مصنف احمد بن محمد علی بن محمد باقر اصفہانی معروف بہ بہبہانی ہیں۔ ان کا تعلق ایران کے معروف مجلسی خاندان سے تھا۔ وہ ۱۱۹۱/ ۱۷۷۷ء میں کرمان میں پیدا ہوئے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد ۱۲۰۲/ ۸۸-۱۷۸۷ء میں ہندوستان آ گئے۔ یہاں مختلف علاقوں کا سفر کیا اور بالآخر عظیم آباد میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ بہبہانی نے متعدد کتابیں لکھیں۔ انھوں نے اپنی انیس کتابوں کا مرأۃ الاحوال میں ذکر کیا ہے۔ مرأۃ الاحوال جہان نما میں ہندوستان کی معاصر سیاسی تاریخ کے علاوہ سماجی اور ثقافتی تاریخ بھی قلم بند کی گئی ہے۔ بہبہانی نے ہندوستانی تہواروں کے بارے میں بھی اپنے مشاہدات بیان کیے ہیں۔ وہ بسنت کے بارے میں اطلاع دیتے ہیں کہ:

قبل از نوروز سلطانی یک ماہ می شود و بزرگان مجلس خود را برنگ زرد آرایند و عامۂ خلایق تمام رخوت خود را زرد کنند و بہ یک دیگر تہنیت و مبارکباد گویند۔ این نیز درمیان مسلمانان اندک رواجی گرفتہ است[۳۴]۔

بہ نام سنگھ کی تاریخ سعادت جاوید[۳۵]، کشن دیال کھتری دہلوی کی اشرف التواریخ[۳۶]

کوہ مان سنگھ کی تاریخ ممالک ہند[۳۶] منتخب التواریخ مصنفہ سدا سکھ لال[۳۷] وغیرہ ہندوستان کی عمومی تواریخ ہیں جو عہدِ غالب میں لکھی گئیں۔

محمد رضا متخلص بہ نجم کا ذکر سطور بالا میں کیا گیا ہے۔ یہ اس دور کے کثیر التصانیف عالم ہیں۔ انھوں نے بحرِ زخار کے نام سے ایک دائرۃ المعارف ترتیب دیا جو مختلف موضوعات پر متعدد کتابوں پر مشتمل ہے۔ اُردو اور فارسی میں ان کے مفقود الاثر دواوین کی طرف اشارہ کیا جاچکا ہے۔ مظاہر الادیان، مظاہر العالم، مجمع الملوک، اخبارِ ہند، نغمۂ عندلیب، مفاتیح الریاست اور زبدۃ الغرایب ان کی وہ تصانیف ہیں جن کے خطی نسخے آج بھی مختلف کتاب خانوں میں موجود ہیں اور مصنف کے علمی تبحر کا ثبوت[۳۹]۔

ہندوستان میں تاریخ نویسی کا تعلق بھی بیشتر درباروں سے تھا۔ عام طور پر بادشاہوں ان کے امرا اور وزرا کی فرمایش پر تاریخیں لکھی جاتی تھیں۔ ایسی صورت میں کسی مؤرخ کو یہ جرأت نہیں ہوتی تھی کہ وہ سماجی یا سیاسی حالات پر حتیٰ بجا تنقید بھی کر سکے۔ اس دور میں حاکمانِ وقت کے وقار اور اعتبار پر انگریزوں نے کاری ضرب لگائی۔ ان کا رہا سہا بھرم بھی ختم کر دیا۔ عام انسان بھی ان کی کس مپرسی کی حالت سے واقف ہو گئے۔ جس کے نتیجے میں اب لوگ ان کے اچھے بُرے کاموں پر اپنی رائے کا برملا اظہار کرنے لگے۔ اس دوَر کی ایک کتاب فراست نامہ[۴۰] اپنی نوعیت کے اعتبار سے فارسی تاریخ نویسی میں اس وجہ سے امتیازی شان کی حامل ہے کہ اس دوَر کے سیاسی و سماجی حالات پر شدید تنقید ہے۔ فراست نامہ دین محمد کی تصنیف ہے۔ ان کی شخصیت کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ دین محمد نے اس کتاب میں ہندوستانیوں کی علمی و فنی زبوں حالی کا ذکر اور ماتم کیا ہے۔ اور انگریزوں کی علوم و فنون میں ترقی کو سراہا ہے۔ اس کتاب میں مصنف کا لب و لہجہ نہایت سخت اور تیکھا ہے جس کی وجہ سے یہ تصنیف فارسی تاریخ نویسی میں منفرد سمجھی جانی چاہیے۔ ہندوستانیوں کی علمی عقب ماندگی کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

باوجود این تہی مغزی، لاف از دانش انگریزی زدہ، جز نقل اصلی ندارند۔ ای کاش کہ رہ بسر فراست انگریزی در ریاست و سیاست مدنی می بودند و یافتند

بدنامی می کشیدند تا به این ذلت و خواری و ناهنجاری و گرفتاری نمی رسیدند. کار امارت را بجائی رسانیده اند که باوجود دولت و ثروت غلام حلقہ بگوش و غاشیۂ عبودیت بر دوش انگریزان شدہ، شرم از نامردی و کم ہمتی خود نمی کنند[۱۴۱] دین محمد نے بہادر شاہ ظفر کو بھی نہیں بخشا اور ان الفاظ میں ان کا مذاق اڑایا کہ :

ہندوستان اگر بدولت می رسند و دست قدرت ی یابند، سہ چہار زن می کنند، بلکہ درین زمان متمولان از صدہا می گذرانند، چنانچہ الان بہادر شاہ ظفر کہ چون سلاطین دیگر دست قدرت ندارد، ہر ہفتہ نکاح جدید می نماید۔ باوجودی کہ ضعفِ شیخوخیت بر طبعش مستولی است، مگر حرصش غالب[۱۴۲]۔

مفتی علی الدین لاہوری نے عبرت نامے[۱۴۳] میں جو سکھوں کی تاریخ پر مشتمل ہے، اس دور کے دیگر مورخوں پر نکتہ چینی اور تاریخ نویسی میں ان کے جانب دارانہ رویے کی مذمت کی ہے۔ علی الدین نے بعض ایسے خیالات کا اظہار کیا ہے جن سے اس دور کی تاریخ نویسی میں بدلے ہوئے رجحان کا علم ہوتا ہے۔ اسی دور کے لالہ موہن لال کی عمدۃ التواریخ پر وہ تبصرہ کرتے ہیں کہ :

لالہ سوہن لال نامی سکنۂ لاہور کتابی درین ضمن نوشتہ کہ بہ تطویل انجامیدہ و بہ سبب ہم مذہبی و اکثر مقامات رعایت نمودہ، از نفس الامر بہ کنارہ ماندہ و در آن سوای ایجاد و ذکر ملک گیری سنگھان دیگر چیزی مندرج نیست[۱۴۴] امرناتھ پنڈت کشمیری دہلوی اور بوٹا شاہ کی تاریخ کی کتابوں کے بارے میں ان کی رائے ہے کہ :

دہم دیوان امرناتھ پنڈت کاشمیری دہلوی کتابی نوشتہ کہ آن شل وقایع سالیانہ بہ عبارت مختصر و مغلق بودہ کہ مطالعہ اش در برآوردن مطالب، شایق را بدقت می اندازد[۱۴۵]۔

بوٹا شاہ کی تصنیف[۱۴۶] کے متعلق ان کا خیال ہے کہ :

و نیز بوٹا شاہ نامی از سکنۂ لودھیانہ کتابی نوشتہ کہ باوصف متانت و رنگینی فقرات، بہ سبب تطویل اکثر مطالب در آن مہمل ماندہ و سامع را جز سمع خراشی از آن حاصلی نیست[۱۴۷]۔

غالب کی دستنبو[۴۹] فارسی نثر کی تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ غالب نے اپنی اس کتاب میں کوشش کی ہے کہ زیادہ سے زیادہ اصل فارسی الفاظ استعمال کریں اور عربی کے وہ الفاظ جو فارسی میں عام طور پر استعمال ہوتے تھے ان سے احتراز کریں۔ غالب کا یہ رویہ کس حد تک مناسب ہے اور وہ اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں، اس پر ایک مفصل بحث کی جا سکتی ہے، جس کا اس وقت موقع نہیں ہے۔

اس دور میں تاریخ نویسی کے ضمن میں اس امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ بعض انگریز حاکموں نے بھی ہندوستان کی گذشتہ اور معاصر تاریخ سے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا۔ انھوں نے مختلف ہندوستانی دانشوروں کو یہاں کی سیاسی تاریخ مرتب کرنے پر مامور کیا۔ قاضی محمد صادق اختر نے معروف مورخ الیٹ کے لیے مخزن الجواہر[۵۰]، سید محمد باقر علی خاں نے ہنری پڈکوک کے لیے تاریخ ہنری[۵۱]، التفات حسین خان نے سر ہنری رسل کی فرمائش پر نگارستان آصفی[۵۲] اور جنرل جون مالکم کے منشی عبدالرزاق نے انہی کے اشارہ پر تذکرۂ نرمل تالیف کیں[۵۳]۔

عہدِ غالب کی سیاسی تاریخ کی ایک قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ مورخین نے اپنی اپنی تصانیف میں ہندوستان کی مختلف زبانوں میں محفوظ بعض مآخذ کا استعمال بھی کیا ہے۔ حسین نوہانی نے اس دور میں جنوبی ہند میں واقع کورگ کی تاریخ کنڑی اور انگریزی زبانوں میں موجود مراجع کی بنیاد پر مرتب کی[۵۴]۔ غور طلب بات یہ ہے کہ انیسویں صدی حالانکہ فارسی کے زوال کے آغاز کا دور ہے، لیکن جنوبی ہند کے اس دور دراز علاقے میں جہاں فارسی جاننے والے بھی بظاہر کم رہے ہوں گے، راجا کے ایما پر فارسی میں تاریخ کا لکھا جانا، فارسی کے چلن اور اس کے اعتبار کا ثبوت ہے۔

انیسویں صدی میں چند سفرنامے بھی لکھے گئے۔ فارسی زبان میں یہ سفرنامے اپنے تاریخی اور سماجی مطالب کے لحاظ سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ عزت اللہ دہلی میں رہتے تھے۔ وہ یہاں سے کشمیر، تبت، چین، تاشقند، کاشغر، توقان، سمرقند اور پشاور گئے۔ ذی الحجہ ۱۲۳۸ھ/۱۸۲۳ء میں اٹک واپس لوٹے۔ مآثر عزت اللہ با

سفرنامۂ عزت اللہ[۵۵] ان کے اسی سفر کی روداد ہے۔ اس کی اہمیت کے پیشِ نظر اس کا TRAVELS IN CENTRAL ASIA کے عنوان سے انگریزی میں ترجمہ ہوا جو ۱۸۷۲ء میں کلکتے سے شائع ہوا ہے۔

علی مرزا مفتون دہلوی عظیم آباد میں سکونت پذیر تھے۔ وہ حج کے ارادے سے ۸ ربیع الثانی ۱۲۴۱/ ۶ ـ ۱۸۲۵ کو کلکتے پہنچے۔ حج سے واپسی پر وہ بندر عباس آئے جہاں سے انھوں نے شیراز، اصفہان، تہران اور مشہد کا سفر کیا۔ ایران میں اپنے سفر کے دوران انھیں گاؤں، قصبوں اور متعدد چھوٹے بڑے شہروں کو دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ اس زمانے کے قاچاری بادشاہ محمد شاہ سے بھی ملے۔ انھوں نے عمارتوں، ان پر کتبوں، ایرانیوں کی سماجی اور سیاسی زندگی وغیرہ کا غائر مطالعہ کیا اور اپنے چشم دید حالات کو ایک سفرنامے زبدۃ الاخبار فی سوانح الاسفار[۵۶] میں قلم بند کیا۔ یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ اس سے پہلے کسی ہندوستانی نے ایران کا اتنا مفصل سفرنامہ فارسی میں لکھا ہو، اس کا فی الحال علم نہیں۔ اسی طرح تاریخ یوسفی[۵۷] میں یوسف خان کلیم پوش نے پہلی بار فارسی میں انگلستان کے اپنے سفر کے حالات بیان کیے ہیں۔

کیفیات مکانات گوڑ، لکھنوتی تالیف شیام پرشاد منشی، تفریح العمارات تالیف لالہ سیل چند[۵۸]، احوال شہر اکبر آباد مصنفہ مانک چند[۵۹] سیر المنازل تالیف سنگین بیگ[۶۰] اور تذکرۂ نرمل (یعنی قلعۂ نرمل) تالیف عبدالرزاق فارسی میں وہ کتابیں ہیں جو اس دور میں لکھی گئیں اور جن میں پہلی بار صرف ہندوستانی شہروں، اور ان کی تاریخی عمارتوں کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ عرفا، علما، خوشنویسوں، امرا اور فارسی شعرا کے تذکرے بھی اس دور میں بڑی تعداد میں مرتب ہوئے۔ حتیٰ اردو شعرا کے تذکرے بھی اس دور میں فارسی زبان ہی میں لکھے گئے۔ انیسویں صدی کے پہلے پچاس سال میں تذکرے جتنی زیادہ تعداد میں لکھے گئے، اس کی مثال گذشتہ ادوار میں نہیں ملتی۔ مجموعۂ نغز[۶۱]، طبقات سخن[۶۲]، ریاض الوفاق[۶۳]، تذکرۂ سرور[۶۴]، نشترِ عشق[۶۵]، اشارات بینش[۶۶]، مصحفی کے تین تذکرے[۶۷]، نتائج الافکار[۶۸]، صبح وطن[۶۹]، آفتاب عالمتاب[۷۰]۔ وہ چند فارسی اور اردو

شعرا کے اہم تذکرے ہیں جو اس دور میں مرتب کیے گئے۔ اس کے علاوہ شاہ تراب علی تراب نے اصول المقصود، محمد ابوالحیات قادری پھلواری نے تذکرہ الکرام اور مولوی سیّد محمد علی صدپوری نے مخزن احمدی میں عرفا کے احوال بیان کیے ہیں۔

عبرتی عظیم آبادی نے اس دور میں معراج الخیال کے علاوہ جس میں اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے ۲۰۵ فارسی شعرا کا ذکر ہے، ایک دوسرا تذکرہ ریاض الافکار بھی مرتب کیا۔ ریاض الافکار فارسی کے ۱۰۱ نثر نویسوں کے تراجم پر مشتمل ہے۔ اس میں عبرتی نے فارسی ادبا کے کلام کے نمونے بھی پیش کیے ہیں۔ یہ غالباً پہلا تذکرہ ہے جس میں صرف نثر نویسوں کے احوال درج کیے گئے ہیں۔ عہدِ غالب میں سنسکرت، ہندی اور پنجابی کے علاوہ انگریزی سے بھی فارسی میں تراجم کیے گئے۔ شیخ ہنکلا نے غذاؤں اور کھانا پکانے کے طریقوں پر پہلی بار ایک انگریزی کتاب کا خوانِ نعمت کے عنوان سے ۱۲۵۲/۱۸۳۷ میں ترجمہ کیا۔

اس دور میں حتیٰ الف لیلیٰ بھی دو بار فارسی میں ترجمہ کی گئی۔ اوحد بن احمد بلگرامی اور محمد باقر خراسانی نے الگ الگ یہ ترجمے کیے۔ محمد باقر خراسانی نے دو انگریز بھائیوں ہنری اور چارلز رسل کے لیے اپنا ترجمہ مکمل کیا اور اسی مناسبت سے اسے ترجمۂ ہنریہ کا نام دیا۔

حیدرآباد کے قاضی لشکر محمد کرامت علی دہلوی نے عہدِ غالب میں عتبی کی "تاریخ امینی" کا بھی اصل عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ یہ سبکتگین اور اس کے لڑکے سلطان محمود غزنوی کی تاریخ ہے۔ کرامت علی دہلوی نے اپنا ترجمہ حیدرآباد کے وزیر اعظم اور شعرا و ادبا کے سرپرست مہاراجا چندو لعل شاداں کو پیش کیا۔

اس دور میں فارسی مکاتیب مرتب کیے گئے۔ تصوف و عرفان کے موضوع پر متعدد کتابیں بھی لکھی گئیں۔ منظوم و منثور آثار کی شرحیں لکھی گئیں۔ اس کے علاوہ اس دور میں لغت نویسی پر بھی بنیادی کام کیے گئے۔ ہفت قلزم، فرہنگ حسینی، غیاث اللغات، نخبۃ اللغات، فرہنگ فرخی، نفائس اللغات، فرہنگ جعفری، تسہیل اللغات،

خزینۃ الامثال[۵۰]، بہارِ عجم[۵۱]، قاطع برہان وغیرہ فرہنگیں اس پچاس سالہ دور میں تالیف کی گئیں ۔ غالب دہلوی کی قاطع برہان اپنی نوعیت کی منفرد لغت ہے ۔ غالب نے اس میں برہان قاطع پر شدید تنقید کی ہے ۔ قاضی عبدالودود صاحب مرحوم اور استاد گرامی جناب پروفیسر نذیر احمد صاحب نے غالب کی قاطع برہان میں وارد اشتباہات پر تحقیقی نظر ڈالی ہے ۔ اور بتایا ہے کہ اس میں خود غالب سے بھی لغزشیں ہوئی ہیں ، لیکن غالب سے پہلے کسی نے محض ایک لغت میں وارد غلطیوں کی نشاندہی کے لیے لغت مرتب کیا ہو ، اس کا علم نہیں ۔

اس دَور کی ایک دوسری منفرد فرہنگ نخبۃ اللغات ہے ۔ یہ ہندوستانی فارسی لغت ہے ۔ جس میں عربی مترادفات بھی درج کیے گئے ہیں ۔ اسے سید احمد علی خان بدایونی کے لڑکے محمد علی ملقب بہ صدر امین نے ایک طویل علمی مشقت کے بعد مرتب کیا اور ۱۲۵۰/ ۵ - ۱۵۲۴ میں اسے رچرڈ کار گلین (RICHARD CARR GLYN) کو پیش کیا۔ لغت ہندی، غرایب اللغات، تالیف شریف، مفردات ہندی وغیرہ نخبۃ اللغات کے ماخذ میں شامل ہیں ۔

فارسی گرامر، مذہب، جغرافیا، موسیقی، طب وغیرہ کے موضوعات پر بھی اس دور میں متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں ۔

آخر میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اُنیسویں صدی کے نصف اوّل میں وجود میں آنے والے فارسی کے بیشتر آثار کا ابھی اس طرح جائزہ نہیں لیا گیا ہے جن کے وہ حق دار ہیں ۔ اُمید ہے کہ ہمارے دانشور اس دَور کے فارسی ادب کا توجہ سے مطالعہ اور اس کی علمی و ادبی حیثیت کا تعین کریں گے ۔

حواشی :

۱ اس ضمن میں رک: نقد قاطع برہان، استاد نذیر احمد، ایوانِ غالب، نئی دہلی۔

۲ دیوان صہبائی، شامل کلیات، مطبع نظامی، کانپور ۱۲۹۸ھ، ص ۲۵۸

۳ سخن شعرا، مولوی عبدالغفور خان نسّاخ، نول کشور، ۱۲۹۱ھ، ص ۹۷

۴ فارسی دیوان (مومن)، ذخیرۂ شیفتہ، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ، شمارہ ۱۳۶/ ۱۰۲۔ یہ دیوان غالباً ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے

۵ اس شاعر کے بارے میں مزید تفصیلات کے لیے رک: سید محمد عبداللہ کا مقالہ، اورینٹل کالج میگزین، مئی ۱۹۴۴ء، ص ۵ ـ ۸ اور فہرست اشپرنگر، ص ۲۲۷

۶ سخن شعرا، نساخ، ص ۵۰۵۔

۷ تاریخ پنجاب تحفۂ احباب، مطبع محمدی، لاہور، ۱۲۶۵ھ، ص ۹۰

۸ نواب صاحب نے فارسی شعرا کے دو تذکرے مرتب کیے۔ صبح وطن اور گلزار اعظم یہ دونوں بالترتیب ۱۲۵۸ھ اور ۱۲۷۲ھ میں مدراس سے شائع ہو چکے ہیں۔

۹ بینش نے اپنے تذکرہ اشارات بینش (ترتیب و تحشیہ: ڈاکٹر شریف حسین قاسمی، ۱۹۷۳ء دہلی) اس شاعر اور نواب صاحب کے شعرا کے ساتھ حسن سلوک کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔

۱۰ کلیات تراب، مطبع سرکاری ریاست رام پور، ص ۲۰

۱۱ صبح گلشن، علی حسن خاں، مطبع فیض شاہجہانی، ۱۲۹۵ھ، ص ۵۲۰

۱۲ اس کا مخطوطہ رضا لائبریری، رام پور (شمارہ ۲۳ ـ ۵۹) میں موجود ہے۔

۱۳ پیر فرخ بخش متخلص بہ فرحت (رک: پنجابی قصے فارسی زبان میں: مقالۂ پروفیسر باقر، اورینٹل کالج میگزین، ۴۳ ـ ۱۹۴۴ء، ص ۲۲) اور مولانا پیر محمد اودھی (مہر و ماہ)، مطبع بحرالعلوم، ۱۲۹۵/ ۱۸۷۸) نے الگ الگ اسی صدی میں یہ داستان فارسی میں بیان کی ہے۔

۱۴ میر نصیر خاں جعفری نے یہ داستان اپنی مثنوی "میرزا صاحبان" میں بیان کی ہے، رک: تکملۂ

مقالات الشعرا، مخدوم محمد ابراہیم خلیل ٹھٹھوی تصحیح پیر حسام الدین راشدی، سندی ادبی بورڈ، کراچی، ۱۹۵۸ء، ص ۱۱۱۔

۱۵؎ پریاداس نے یہ داستان اپنی مثنوی کنور کام و کلام کام میں بیان کی ہے (مخطوط، لکھنؤ یونی ورسٹی لائبریری، شمارہ ۱۳ ۵۵ و ۸۹۱) اور چودھری کوڑامل کی مثنوی قصۂ کام روپ بھی اسی داستان پر مشتمل ہے (مخطوط، برٹش میوزیم، اگرتن، ۱۰۳۶)۔

۱۶؎ مخطوط، پٹنا یونی ورسٹی لائبریری۔

۱۷؎ مثنوی ہیرو رانجھا، نواب علی محمد خاں ولی لغاری، رک: مثنویات ہیرو رانجھا، حافظ محمود شیرانی، سندی ادبی بورڈ، کراچی، ۱۹۵۷ء۔

۱۸؎ ناصری محسن عبدالحمید نے داستانوں کے اس مجموعے کو ۱۲۵۴/ ۹ ــ ۱۸۳۸ء میں فارسی میں بیان کیا ہے۔ رک: فہرست مخطوطات کتاب خانۂ اکادمی جمہوریۂ آذربائیجان، باکو، ج ۱، ص ۱۸۴۔

۱۹؎ سداسکھ شایق نے اپنی مثنوی کان جور (مخطوط، سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد، شمارہ ۲، ۵) اور سید امداد علی اور شیو سہائے کایتھ نے اس ہندوستانی داستان کو فارسی میں بیان کیا ہے (فہرست مخطوطات فارسی، برٹش میوزیم، ج ۳، ص ۱۰۰۶، شمارہ ۱۹۲۴ ۵۹)۔

۲۰؎ امامی نے رتن سین و پدماوتی عشقیہ داستان کو ۱۲۲۲/ ۱۴ ــ ۱۸۱۳ میں مثنوی بوستان سخن میں بیان کیا ہے (مخطوط، نیشنل میوزیم، نئی دہلی، شمارہ ۲۰۸۵)۔

۲۱؎ اس داستان کا قلمی نسخہ پنجاب پبلک لائبریری، لاہور، شمارہ ۱۸۱ ــ ۹۱ میں موجود ہے۔ غالباً صالح نے اس داستان کو سب سے پہلے فارسی میں بیان کیا تھا۔ اس کے بعد علامہ زیرک اور شیخ نظام الدین سکین نے یہ داستان انیسویں صدی میں فارسی میں بیان کی ہے۔ رک: پنجابی قصے فارسی زبان میں، ص ۱۰۵۔

۲۲؎ اس کے فارسی متن کا مخطوطہ ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری، کلکتہ (شمارہ ۲۵۹) میں موجود ہے۔

۲۳؎ مخطوطہ، پٹنا یونی ورسٹی لائبریری۔

۲۴؎ مخطوطہ، خدا بخش لائبریری، شمارہ ۱۹۳۔ میر حسن علی خاں تالپور نے یہ داستان سندھی زبان

میں ترجمہ کی ہے، رک: تکملۂ مقالات الشعرا، ص ۵۶۹

۲۵ رک: سندھ کے فارسی شعرا (انگریزی)، ڈاکٹر سدا رنگانی، ص ۲۲۲ - ۲۲۳

۲۶ تکملۂ مقالات الشعرا، ص ۵۷۰

۲۷ ایضاً، ص ۵۷۰

۲۸ ایضاً، ص ۵۷۱

۲۹ مخطوطہ، ذخیرۂ سبحان، آزاد لائبریری، علی گڑھ، شمارہ ۱۲۶

۳۰ اتھے، ج ۲، شمارہ ۳۰۰۹، اسٹوری، ص ۴۸۲

۳۱ نول کشور، چاپ سوم، ۱۸۰۷ء

۳۲ ریو، ج ۲، ص ۹۹۴، شمارہ ۱۸۹۱ OR

۳۳ خدابخش لائبریری، شمارہ ۶۲۸، اس کتاب کا پہلا حصہ ایران سے شائع ہوگیا ہے۔ اس میں مجلسی خاندان کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔

۳۴ مرآۃ الاحوال جہان نما، ورق ۱۰۴ - ب

۳۵ ریو، ج ۲، ص ۹۱۳، شمارہ ۱۸۲۰ OR

۳۶ ریو، ج ۲، ص ۱۰۲۶، اس کے علاوہ رک: اسٹوری، ص ۴۸۳، ریو، ج ۱، ص ۱۰۴۲

۳۷ مخطوطہ، کتاب خانۂ ملا فیروز، بمبئی، شمارہ ۱۰

۳۸ ریو، ج ۲، ص ۹۱۴، شمارہ ۱۶۹۸ OR

۳۹ نجم کے احوال زندگی اور علمی کارناموں کے لیے رک: اسٹوری، ص ۱۴۸، ریو، ج ۲، ص ۹۱۴، مظاہر الادیان، مخطوطہ، خدابخش لائبریری، شمارہ ۱۴۵۷، ورق ۶ - الف

۴۰ ذخیرۂ سلام، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ، شمارہ ۳۸۰ - ۱۵۰، اسی کتاب کا ایک خطی نسخہ جو علی گڑھ کے نسخے سے اپنے مطالب و مشتملات کے لحاظ سے کسی حد تک مختلف ہے۔ نیشنل میوزیم میں بھی موجود ہے۔

۴۱ فراست نامہ، ورق ۳ - الف

۴۲ ایضاً، ورق ۹ - الف

۴۳ پنجابی ادبی اکادمی نے یہ کتاب دو جلدوں میں لاہور سے ۱۹۶۱ء میں شائع کی ہے۔

۴۴ لالہ سوہن لال سوری (م: ۹ - ۱۲۶۸/ ۱۸۵۲) فرزند لالہ گنپت رائے پسر لالہ حکومت رائے رنجیت سنگھ کے دربار میں وکیل تھے۔ انھوں نے سکھوں اور رنجیت سنگھ کی تاریخ عمدۃ التواریخ تالیف کی ہے۔ رک: اسٹوری، ص ۶۸۱، مصنف کے لڑکے نے یہ کتاب ۱۸۸۴ میں شائع کی ہے۔

۴۵ عبرت نامہ، ص ۲

۴۶ ایضاً، ص ۳

۴۷ غلام محی الدین ملقب بہ بوٹی یا بوٹا شاہ علوی قادری نے یہ پنجاب کی تاریخ ۱۲۵۸ھ/ ۱۸۴۲ء میں تالیف کی۔ رک: ریو، ج ۳، ص ۹۵۳، شمارہ ۱۹۲۳ ۵۴۔ اس خطی نسخے کی خود مصنف نے ۱۲۶۵ھ میں تصحیح کی تھی۔

۴۸ عبرت نامہ، ص ۳ و ۴

۴۹ غالب کی کلیات میں شامل ہے۔ ایوان غالب نے بھی یہ کتاب شائع کی ہے۔

۵۰ ریو، ج ۳، ص ۹۰۰، شمارہ ۵۴ ۱۷۵ء، اسٹوری، ص ۱۵۱، یہ کتاب لکھنؤ سے ۱۲۳۹ھ میں شائع ہوئی ہے۔

۵۱ ریو، ج ۳، شمارہ ۲۰۵۸ ۵۴

۵۲ مخطوطہ، ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری، شمارہ ۶۷، - یہ کتاب ۱۳۲۳/ ۱۹۰۵ء میں شائع ہو چکی ہے۔

۵۳ فہرست مخطوطات، آصفیہ لائبریری، ج ۱، ص ۲۲۲، شمارہ ۱۶۴، تذکرۂ نرل، حیدرآباد سے ۱۳۲۳/ ۶ - ۱۹۰۵ء میں غلام صمدانی خان کی تصحیح کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔

۵۴ مخطوطہ، ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری، شمارہ ۲۰۱

۵۵ مخطوطہ، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ، شمارہ ۴۰، اڈانبرا کی مخطوطات کی فہرست میں اسے سفرنامۂ میر عزت اللہ کا نام دیا گیا ہے، لیکن ریو، ج ۳، ص ۹۸۲ میں اسے مآثر عزت اللہ کے نام سے درج فہرست کیا ہے۔

۵۶ اس کا واحد خطی نسخہ، خدا بخش لائبریری، پٹنا (شمارہ ۶۲۱) میں موجود ہے۔ اس نسخے کی کتابت مصنف کے بھائی میرزا امیر علی شاہجہان آبادی نے خود مصنف کی خواہش پر کی تھی۔

۵۷ مخطوطہ، ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری، شمارہ ۲۸۹

۵۸ اسٹھے، ج ۳، شمارہ ۱۴۲۸

۵۹ مخطوط، خدا بخش لائبریری، شمارہ ۶۴۸، اس کتاب کا مخطوطہ احوال عمارات مستقر الخلافہ کے نام سے اسٹھے، شمارہ ۳۱، میں موجود ہے۔

۶۰ ریو، ج ۳، شمارہ ۲۰۳۰ ۵۸

۶۱ اس کے دو خطی نسخے دہلی میں ہیں۔ ایک آرکائیوز، نئی دہلی اور دوسرا لال قلعے کے میوزیم میں۔ اس کے دوسرے نسخے دوسری لائبریریوں میں بھی موجود ہیں۔ اس کا فارسی متن اور اُردو ترجمہ راقم الحروف نے ایوان غالب سے شائع کیا ہے۔

۶۲ یہ تذکرہ ۶۹۳ اُردو شعرا کے حالات پر مشتمل ہے۔ اسے سید عبدالقاسم معروف بہ حکیم قدرت اللہ قادری نے ۱۲۲۱/ ۷ - ۱۸۰۶ میں مکمل کیا۔ محمود شیرانی نے یہ تذکرہ لاہور سے ۱۹۳۳ء میں شائع کیا ہے۔

۶۳ تالیف خلیفہ غلام محی الدین قریشی، ۱۲۲۲/ ۱۸۰۷ میں مکمل ہوا۔ ایک سو اُردو اور فارسی شعرا کے احوال پر مشتمل ہے۔ رک: اسپرنگر، ص ۱۸۷، مجلۂ نگار، ۱۹۵۹ء، مقالہ پر فسور نثار احمد فاروقی

۶۴ ذوالفقار علی مست نے ۱۴۲ - اُردو فارسی شعرا کا یہ تذکرہ ۱۲۲۹/ ۱۴ - ۱۸۱۳ میں مکمل کیا۔ پروفیسر سید حسن، پٹنا یونی ورسٹی نے اسے شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالرسول خیام پور، تبریز یونی ورسٹی نے بھی یہ تذکرہ شائع کیا ہے۔

۶۵ میر محمد خان سرور نے ۹۹۶ اُردو شعرا کا یہ تذکرہ ۱۲۱۹/ ۵ - ۱۸۰۴ میں مکمل کیا۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے اسے دہلی یونی ورسٹی سے شائع کیا ہے۔

۶۶ آقا محمد قلی خان متخلص بہ عشقی نے یہ تذکرہ ۱۳ رجب ۱۲۳۳/ ۱۸ - ۱۸۱۷ میں مکمل کیا۔ اس کا ایک مخطوطہ نیشنل آرکائیوز، نئی دہلی (شمارہ ۱۰۲) میں موجود ہے۔ یہ تذکرہ تاجکستان سے شائع ہو چکا ہے۔

۶۷؎ سید مرتضیٰ بینش نے اس تذکرہ میں کرناٹک کے ۷۰ فارسی شعرا کے احوال درج کیے ہیں۔ ۱۲۶۵/ ۹-۱۸۴۸ میں مکمل ہوا۔ راقم حروف نے یہ تذکرہ شائع کر دیا ہے۔

۶۸؎ عقد ثریا، تذکرۂ ہندی اور ریاض الفصحا، انجمن ترقی اردو سے شائع ہو چکے ہیں۔

۶۹؎ قدرت اللہ قدرت نے ۵۲۹ شعرا کا یہ تذکرہ ۱۲۵۸/ ۳-۱۸۴۲ میں مکمل کیا۔ یہ بمبئی سے شائع ہو چکا ہے۔

۷۰؎ غلام محمد غوث خان نواب کرناٹک (م: ۷ اکتوبر ۱۸۵۵ء) نے کرناٹک کے ۹۲ فارسی شعرا کا یہ تذکرہ ۱۲۵۸/ ۱۸۴۲ء میں مکمل کیا۔ یہ مدراس سے ۱۲۵۸ھ میں شائع ہوا تھا۔

۷۱؎ قاضی محمد صادق متخلص بہ اختر نے ۲۶۶ فارسی شعرا کا یہ تذکرہ ۱۲۶۹/ ۳-۱۸۵۲ میں مکمل کیا۔ یہ ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے۔ راقم کا ایک مقالہ اس تذکرہ کے بارے میں غالب نامہ میں شائع ہوا ہے۔

۷۲؎ مخطوطہ، خدا بخش لائبریری، شمارہ ۶۷۹

۷۳؎ ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری، شمارہ ۲۷۷

۷۴؎ خدا بخش لائبریری، شمارہ ۱۴۱۵

۷۵؎ ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری، شمارہ ۶۰

۷۶؎ مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ، شمارہ ۲۸

۷۷؎ ریو، ج ۳، ص ۹۹۶

۷۸؎ خدا بخش لائبریری، شمارہ ۲۵۳۱

۷۹؎ بوڈلین لائبریری، شمارہ ۲۵۳۱

۸۰؎ ریو، ج ۳، ص ۹۰۰، شمارہ ۱۸۸۸

۸۱؎ تالیف نواب غازی الدین خان حیدر، ۱۲۳۴/ ۱۸۱۸ میں مکمل ہوئی۔ لکھنؤ سے ۱۲۳۰ھ میں شائع ہوئی ہے۔

۸۲؎ سید غلام حسین شیخ فرزند فتح علی رضوی کی تالیف ہے۔ رک: اتھے، ص ۲۵۴، شمارہ ۲۵۱۷

۴۳؎ محمد غیاث الدین کی یہ معروف لغت ۱۲۴۲ / ۷ - ۱۸۲۶ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی اور بارہا ایران و ہند سے شائع ہوئی ہے۔

۴۴؎ ریو، ج ۳، ص ۹۹۷؛ شمارہ ۲۰۱۲

۴۵؎ رک : مقدمۂ آصف اللغات، ج ۱

۴۶؎ نول کشور، لکھنؤ، جولائی ۱۸۹۷ء۔

۴۷؎ رک : فرہنگ نظام، ج ۵

۴۸؎ آصفیہ لائبریری، حیدرآباد، شمارہ ۸۷

۴۹؎ مطبع مصطفائی محمد خان

۵۰؎ ذخیرۂ بوہار، کلکتہ، شمارہ ۵۳۰، مطبع غوثیہ مدراس سے شائع ہو چکی ہے۔

۵۱؎ قاضی عبدالودود نے اس کی تصحیح کی اور ایوانِ غالب سے شائع کی ہے۔

ڈاکٹر ریحانہ خاتون

برہان قاطع پر خان آرزو اور غالبؔ کی تنقید کی چند مثالیں

محمد حسین بن خلف تبریزی متخلص بہ برہان کی برہان قاطع فارسی کی بہت اہم اور ضخیم لغت ہے۔ یہ فرہنگ ۱۰۶۲ھ/۱۶۵۲ء میں سلطان عبداللہ قطب شاہ کے دور حکومت میں گولکنڈہ میں مرتب کی گئی۔ یہ اپنے دور تک کی تقریباً تمام فارسی لغات میں سب سے زیادہ ضخیم ہے۔ کسی دوسری فرہنگ میں اتنے الفاظ شامل نہیں جتنے اس فرہنگ میں دستیاب ہوتے ہیں۔ اس کی ایک دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس سے پہلے کسی فرہنگ کی ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے نہیں پائی جاتی۔ اس خوبی کی وجہ سے الفاظ کی شناخت اور اس کے معانی تک جلد پہنچنا ممکن ہو جاتا ہے۔ اس میں الفاظ کے سارے معانی درج ہیں اور بعض الفاظ کے تلفظ بھی دیے گئے ہیں، اپنی ان تمام خوبیوں کی وجہ سے یہ بہت مقبول اور کئی بار زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔ ان خوبیوں کے باوجود یہ کتاب تصحیفات الفاظ اور معانی کے سلسلے میں اغلاط سے یکسر پاک نہیں ہے۔ مشہور ایرانی فاضل ڈاکٹر محمد معین نے اس کا ناقدانہ متن ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۲ء میں تیار کیا۔ جس میں ان کے حواشی بھی درج ہیں، اور جو معلومات کے اعتبار سے فارسی دنیا کے لیے ایک قیمتی سرمایہ ہیں۔ جناب پروفیسر نذیر احمد نے اپنے مقالے "برہان قاطع" میں لکھا ہے کہ "لغت برہان قاطع کی غیر معمولی شہرت اس وقت سے ہوئی جب مرزا غالب نے اس کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا۔ ان کے

اعتراضات رسالہ" قاطع برہان " میں شامل ہیں، قاطع برہان کا نکلنا تھا کہ اختلافات کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا اور بیسیوں چھوٹے بڑے رسالے غالب کی تائید یا مخالفت میں لکھے گئے۔ اس سے واضح ہے کہ انیسویں صدی کا سب سے بڑا علمی و ادبی معرکہ برہان قاطع ہی سے متعلق ہے"۔

لیکن یہ بات قابل توجہ ہے کہ غالب سے تقریباً ایک صدی پہلے یعنی ۱۱۴۸ھ/ ۳۵-۱۷۳۴ء میں سراج الدین علی خان آرزو اکبرآبادی (۱۰۹۹ھ/۸۸-۱۶۸۷ء ۱۱۶۹ھ/۵۶-۱۷۵۵ء) نے تقریباً چالیس ہزار فارسی الفاظ پر مشتمل "سراج اللغۃ" ترتیب دی۔ اس میں مصنف نے برہان کے بیشتر لغات پر تنقیدی نظر ڈالی

خان آرزو کا بنیادی مقصد فرہنگ رشیدی اور برہان قاطع کی غلطیوں کی تصحیح کرنا تھا۔ آرزو اپنی اس کوشش میں خاصے کامیاب نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اس فرہنگ میں جن مسائل سے بحث کی ہے وہ نہایت درجہ ناقدانہ ہیں۔ اس سے مصنف کی فن لغت نویسی میں غیر معمولی مہارت اور بصیرت کا پتا چلتا ہے۔ اس میں فارسی اور کتابی ہندی (سنسکرت) میں بہت مشابہت بتائی گئی ہے اور جدید طرز پر الفبائی اعتبار سے ترتیب دی گئی ہے۔ اس میں شعری شواہد کا بہت کم استعمال کیا گیا ہے۔ خود آرزو سراج اللغۃ کے مقدمے میں سراج کی تصنیف و تالیف کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"اما بعد می گوید ناواقف زبان گفتگو سراج الدین علی المتخلص بہ آرزو کہ چون پس از زبان مبارک عربی لسان فارسی را دید کہ افصح لغت است عمر گرانمایہ را صرف تحصیل آن گردانید و کتابی در حل لغات و کشف معضلات (مشکلات) این زبان چون فرہنگ رشیدی کہ تنقیح و تدقیق شر بسیار در آن بکار بردہ و برہان قاطع کہ جامع ترین کتب این فن است، نیافت، لیکن بعضی چیزھا کہ احتراز از آن در شریعت سخن فہمی واجب و در این دو کتاب بسیار بنظر آید خصوصاً در برہان قاطع کہ تصحیف و تحریف لغات و معانی را بیش از تنقیح دخل است، چنانکہ انشاء اللہ معلوم شود، لہذا بتائید الٰہی نسخہ در این باب تالیف نمودم"۔

(اس کے بعد ناواقف زبان گفتگو کہتا ہے کہ جب سراج الدین علی المتخلص بہ آرزو نے مبارک عربی زبان کے بعد فارسی کو دیکھا جو سب سے زیادہ فصیح زبان ہے۔ اپنی عمر گراں مایہ کو اس کے حاصل کرنے میں صرف کر دیا، ایک بھی ایسی کتاب اس زبان کی لغات کو حل کرنے اور مشکلات کو کھولنے کے لیے نہیں

ملتی جس سے مثل فرہنگ رشیدی جس میں تنقیح وتدقیق کے لیے اشعار کا بہت زیادہ استعمال ہوا ہے اور برہان قاطع جو کہ اس فن میں جامع ترین کتاب ہے، حل کیا جاسکے۔ لیکن بعض چیزیں جن سے احتراز کرنا سخن فہمی کی شریعت میں واجب ہے ان دونوں کتابوں میں بہت زیادہ نظر آتی ہیں۔ خصوصاً برہان قاطع جس میں تنقیح سے زیادہ لغات اور معنی میں تصحیف وتحریف کا بہت زیادہ دخل ہے چنانچہ انشاءاللہ تعالیٰ معلوم ہوجائے گا، لہٰذا اللہ تعالیٰ کی مدد سے اس باب میں ایک کتاب تالیف کی)۔

اس کتاب کی تکمیل کے وقت مؤلف کے پیش نظر فرہنگ سروری، جہانگیری، رشیدی، مویدالفضلاء، دُررِغرر، فرہنگ قوسی، برہان قاطع، فرہنگ جوینی، کشف اللغات، گلستان کی کچھ شرحیں اور مثنوی مولوی موجود تھیں۔ اتنی کتابوں سے استفادہ کرنے کے باوجود آرزو کے ماخذ دوسرے لغت نویسوں سے کم معلوم ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر صرف فرہنگ جہانگیری کو ہی لیں تو معلوم ہوگا کہ اس میں ترپن فرہنگوں سے استفادہ کیا گیا ہے، لیکن ماخذ کی کمی کے باوجود سراج اللغۃ کی ترتیب میں آرزو کی فنی مہارت کا بدرجۂ اتم ثبوت ملتا ہے۔ یہ کتاب باوجود اپنی تمام خوبیوں کے بہت زیادہ مقبول نہ ہوسکی، شاید اس کی وجہ نسخوں کی کمیابی ہو۔ اس کے نسخے رضا لائبریری رامپور، ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ، ابوالکلام آزاد عربی۔ فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ٹونک، راجستھان، ضامن لائبریری آگرہ، انڈیا آفس، لندن اور ایک نسخہ کا نصف آخر راقمہ کے پاس بھی موجود ہے جو اس کا تنقیدی متن تیار کرنے میں کوشاں ہے۔ انشاءاللہ یہ کام بہت جلد مکمل ہوجائے گا۔ ترجمہ سروری کے ضمن میں آرزو مجمع النفایس میں لکھتے ہیں۔

> " درین فن (فرہنگ) کتابی جامع تراز برہان قاطع نیست و مستنبطش فرہنگ جہانگیری وسروری وسرمۂ سلیمانی است، لیکن بعد تحقیقات بہ ثبوت پیوست کہ تصحیفات وتحریفات این کتاب زیادہ بر لغات صحیحہ است وکتابی کہ پارۂ تحقیق جوہر لفظ فارسی درآن باشد غیراز فرہنگ رشیدی نیست، وچون این عاجز ہمہ را ملاحظہ نمود، از عدم تنقیح ہر یک آگاہی یافتہ لہٰذا (سراج اللغۃ) را تالیف نمود، بعد مطالعہ کیفیتِ تحقیق وتدقیق معلوم می شود"۔

(اس فن (فرہنگ) میں برہان قاطع سے زیادہ جامع کوئی دوسری کتاب نہیں جس کا منبع فرہنگ جہانگیری، سروری اور سرمۂ سلیمانی ہے لیکن تحقیقات کے بعد یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ اس کتاب

میں تصحیفات و تحریفات بہت زیادہ ہیں اور سوائے فرہنگ رشیدی کے کوئی ایک بھی ایسی کتاب نہیں ہے جس میں فارسی الفاظ کے جوہر کی تحقیق کی گئی ہو، اور جب اس حقیر نے ان سب کو ملاحظہ کیا، اور ان میں سے ہر ایک کی عدم اطلاع سے آگاہی ہوئی تو (سراج اللغۃ) کو تالیف کیا جس کی تحقیق و دقت نظری کی کیفیت کا اندازہ مطالعہ کے بعد معلوم ہو جائے گا۔)

خان آرزو کے بعد جس اہم شخصیت نے برہان قاطع کی سخت تنقید کی وہ غالب دہلوی ہیں۔ غالب کے پیشِ نظر سراج اللغۃ بھی رہی ہو اس کا امکان کم ہے گو غالب نے قاطع برہان میں دو مرتبہ خان آرزو کا نام لیا ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں:

"و روزی پیش خان آرزو رفت و شعر خاقانی خواند و معنی پرسید:

پرویز در ترنج زر کسری و تره زرین | زرین تره کو برخوان رو کم ترکوا برخوان؟

پیداست آرزو چیزی گفته باشد۔"

اور دوسری مرتبہ لکھتے ہیں۔

"سراج الدین علی خان آرزو را بشبی از شب ہای برشگال مصرعی در ضمیر گذشت، نہ مصرعی بلکہ نشتری، نہ نشتری بلکہ سنانِ آبداری، چنانکہ نگارش ہمی پذیرد۔

می کشان مژدہ کہ ابر آمد و بسیار آمد

حقا اگر گویند کہ این زمزمہ از فغانیست یا از نظیری، کیست کہ باور نکند؛ باری، پیش مصرع بہم رسانید و ہم در آن شبِ تاریک و باد و باران نزد میرزا مظہر جان جانان رفت و خواند و آفرین شنود، و بخانہ باز آمد، پس از دو سہ روز کہ این مطلع در شہر اشتہار یافت، روزی ناگاہ خان آرزو در انجمنی با ایرانی سوداگری کہ تازہ از شیراز آمدہ بود، و با آرزو سابقۂ معرفتی داشت، برخورد و گفت، آقا، مطلعی گفتہ ام می توان شنید، ہمانا میرزا آن مطلع شنیدہ بود و فریاد داشت گفت: بخوانید و بخوانید، خانِ سادہ دل بکمال شد و مد خواند:

تند و پر شور و سیہ مست ز کہسار آمد

میرزا چون این مصرع شنید بتا: قا: خندید و گفت: دانستم کہ جناب در مصرع ثانی بہ خوابہند گفت: آرزو شگفتی فرو ماند کہ شعر نہ بدینسان می شنود بی دماغانہ گفت

"چه خواہم گفت؟ میرزا گفت "خواہی گفت کہ نرگس آمد"، زہر خندی کرد و مصرع ثانی سرود:

می کشا ن مژدہ کہ ابر آمد و بسیار آمد

شنوندہ ذوق کرد و مصرع را ستود و گفت: "پیشِ مصرع پر زیباست"[۱۱]"

قاطع برہان مرزا غالب کی اہم تصنیف ہے، اس میں برہان میں موجود بہت سے الفاظ پر تنقید اور ان کی نظر میں جو غلطیاں ہیں ان کی نشان دہی کی گئی ہے۔ پروفیسر نذیر احمد صاحب لکھتے ہیں:

"قاطع برہان میں غالب نے مولف برہان قاطع پر سخت حملے کیے لیکن ان کی نظر صرف تصحیفات تک ہی گئی، ہزوارش اور دساتیر دونوں کی اصل حقیقت ان پر واضح نہ ہو سکی تھی"[۱۲]

وہ مزید لکھتے ہیں:

مقدمہ برہان میں جن چار فرہنگوں یعنی فرہنگ جہانگیری، فرہنگ سروری، سرمہ سلیمانی اور صحاح الادویہ کا ذکر ہے ان میں سے کوئی ان کے پیش نظر نہیں صرف شرفنامہ[۱۳] منیری سے انھوں نے استفادہ کیا ہے[۱۴]

قدیم مخطوطات ان کے پاس زیادہ نہ تھے، اور بقول پروفیسر نذیر احمد:

"برہان قاطع کے نقائص کی نشان دہی جن صلاحیتوں کا تقاضا کرتی تھی غالب میں وہ صلاحیتیں نہ تھیں اس بنا پر ان کے اکثر اعتراضات بے بنیاد ہیں[۱۵]"

اس سلسلے میں یہ بات بھی نہایت اہم ہے کہ غالب کے زمانے میں فارسی کے اکثر متون کمیاب اور مطبوعہ شکل میں موجود نہ تھے اس کی بنا پر غالب پر ان کی صلاحیت کی کمی کا داغ کافی حد تک دھندلا ہو جاتا ہے۔ قاطع برہان ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۶ء میں مکمل ہوئی اور ۱۲۸۷ھ/ ۱۹۶۷ء میں قاضی عبدالودود صاحب نے اس کا ایک ناقدانہ متن ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ کی طرف سے قاطع برھان اور متعلقہ رسائل کے نام سے شائع کیا۔ مفصل حواشی وہ دوسری جلد میں علیحدہ سے شائع کرانا چاہتے تھے، لیکن موضوع کی وسعت اور اپنی علالت کے سبب وہ اپنے تعلیقات مکمل نہیں کر سکے۔

اب ذیل میں برہان قاطع کے کچھ ایسے الفاظ پیش کیے جارہے ہیں جن پرخان آرزو اور غالب دونوں نے تنقید کی ہے، سب سے پہلے برہان قاطع سے لفظ اور اس کے معنی اور اس کے بعد آرزو اور غالب دونوں کی اس لفظ کے بارے میں رائیں پیش کی جائیں گی۔

آدیش بکسر ثالث و سکون تحتانی و شین نقطہ دار آتش را گویند بباید دانست کہ چون اکثر حروف بہ یکدیگر تبدیل می نمایند بنا برآن تای آتش را بدال ابجد بدل کردہ آدش گفتہ اند، و اینکہ بفتح تای قرشت اشتہار دارد غلط مشہور است چہ این لغت در ہمہ فرہنگہا بکسر تای قرشت آمدہ است و با دانش قافیہ شدہ است، و چون بکسر تا موضوع است بنا برین بعد از دال یای حطی در آوردہ اند تا دلالت بر کسر ما قبل کند، و آدیش خواندہ شود، و بعض بہ کسر ذال نقطہ دار آوردہ اند و این نیز غلط است چہ اگر دال اصلی می بود بنا بر قاعدہ کلیہ ایشان کہ ہر دال کہ ما قبل آن الف دیا واو ساکن باشد ذال معجم است درست بود و چون این دال اصلی نیست بلکہ بدل از تای قرشت است پس ذال نقطہ دار نباشد۔[۱]

آدیش : "بہ یای مجہول و شین معجمہ بمعنی آتش و این دراصل آتیش بود بکسر تا و تا دال شدہ، و یای اشباع افزودہ ذال است برکسر ما قبل خود، و این کہ آتش بفتح تا شہرت دارد غلط است، صحیح بکسر یا ست و تفرقہ کہ میان دال و ذال گفتہ اند" (برہان قاطع سے منقول ہے) اقتضا می کند کہ آذیش بذال معجمہ باشد، لیکن این وقت منظور است کہ دال اصلی باشد و این جا بدل تا ست، دو جہ آنکہ صاحب فرہنگہا این لغت را بہ ذال منقوطہ صحیح گفتہ اند آنست کہ در زمان قدیم برزبر دال نقطہ می نہادند متاخرین آنرا خیال ذال منقوطہ کردہ اند انوری گوید۔

گرکند چوب آستان تو حکم شحنہ چو بہا شود آدیش

و سامانی آذیش بکسر ذال معجمہ گفتہ بمعنی چوب آستانہ و بہ ہمین بیت شاہد آوردہ و جہانگیری بمعنی آتش گفتہ چنانکہ مذکور شد و در تصحیح آن تکلف کردہ با آنکہ شعر برآن تقدیر نیز بمعنی محصلی ندارد، این است در رشیدی، مؤلف گوید غلط گفتن فتح کلمہ آتش از ہر کہ باشد غلط است زیراکہ با کش و خوش قافیہ کردہ اند چنانکہ در گذشت، و عجب از صاحب برہان کہ با وجود تغلیط آتش بفتح در کلمہ آذیش بہ ذال معجمہ در تفسیر و در کلمہ آتش بفتح تا گفتہ و این نیست مگر تناقص و ہم در برہان آذیش بہ ذال معجمہ بمعنی آتش غلط گفتہ بمعنی چوبی کہ بر آستانہ در استوار کنند، و بمعنی ریزہ چوب و خس و خاشاک آوردہ، و مجدالدین علی

توسی همین لفظ را بمعنی چوب آستانه گفته، لیکن برین تقدیر بیت انوری از رتبه می افتد بلکه هیچ ربط در کلام نمی ماند، چه درین صورت این معنی می شود که اگر چوب آستانهٔ تو حکم فرماید چوب آستانهٔ شحنه چو بها شود و این طرفه عبارتی و بیانی است که هرگز از بلغا که از عوام صادر نشود و اگر معنی آتش چنانکه جهانگیری گفته گفته آید هم مبالغهٔ شعر و هم نسق عبارت می نماید۔ وحق تحقیق آنچه الحال بر مولف ظاهر شده گو که مخالف قول دیگری بلکه قول خود هم باشد این است که احتمال دارد که کلمهٔ آتش بکسر تا و فتح آن هر دو درست است، اگرچه قیاس کسر آن می خواهد۔ چنانکه لفظ چرا که هر دو اعراب صحیح است، اگرچه قیاس کسر می خواهد زیراکه مرکب است از چه که کلمهٔ استفهام است و را بمعنی برای، و فتح نیز آمده چنانکه مشهور است پس آدیش به دال مہملہ بمعنی آتش که مبدل آتیش است لغت جدائی است و لفظ آتیش در استعمال متروک و مهجور گشته، و بذال معجمه بمعنی چوب آستانه وغیره بمعنی علیحده، درین صورت هیچ مخالفت نماند۔ در سامانی و جهانگیری مگر در مثال و طرفه آنکه توسی مصرع اول این بیت چنین نوشته:

گر شود مهر[۱] بر جناب، تو گرم

و این هیچ ربط به مصرع دوم ندارد و ظاهراً سهو القلم است[۹]"

آدیش: قافیهٔ آتش با دانش ادعائی است نادلپذیر، آری، در سلک قوافی سرکش و شورش هزار جا دیده ایم و تتبع کلام اساتذه به شرط تفحص می تواند دید۔ محمد حسین نظیری علیه الرحمة در غزلی که شورش و دلکش و بینش قافیه است و برآمده ردیف آتش را نیز ذیل قوافی آورده است، و زلالی خوانساری را در یک مثنوی شعریست:

یکی گفتا بدو کای یار دلکش   که مرده از عزیزان گفت آتش

آدیش را اسم آتش قرار دادن گمراهی است، و تحتانی را علامت کسره پنداشتن ناآگاهی است، اعراب بالحروف در الفاظ ترکی رسم است نه در الفاظ فارسی۔ آدیش در زبان پهلوی قدیم نفلی است جداگانه بمعنی تعظیم و تکریم۔ اسم نار در فارسی آتش است، بالف ممدوده و تای فوقانی مفتوحه، چنانکه خود نیز در تای فوقانی مع الشین آتش به تای مفتوح بمعنی آتش خواهد آمد۔ اشعار سند فتحهٔ تای آتش نوشته می شود میرحسن سادات در نزهت الارواح نویسد:

تماشای چشم به رویت خوش است   ولیکن دلم از تو در آتش است

سالکی انجانی سراید:

در بیشۂ ما شیر و کشی می باید ماکوران راعصا کشی می باید
از فقر رسیدہ بوریایی مارا اندک نقشی و آتشی می باید

آموزگاران آموزگار نظامی گنجوی می فرماید:

می کوست حلوای ہر غم کشی نہ دیدہ بجز آفتاب آتشی

سہنشاہِ قلمرو معنی سعدی راست:

میان دو تن جنگ چون آتش است سخن چین بدبخت ہیزم کش است[۲]

عرض ہے کہ مولف برہان قاطع نے آدیش کے معنی آتش بتائے ہیں اور آتش میں ت کو مکسور لکھا ہے۔ خان آرزو نے آتش کی ت کو مکسور و مفتوح دونوں بتایا ہے۔ غالب نے ت کو صرف مفتوح لکھا ہے اور کسرہ کو یکسر غلط بتایا ہے۔ رہا آدیش کا مسئلہ تو آدیش کے معنی غالب نے تعظیم و تکریم لکھا ہے جب کہ آرزو نے کہا ہے کہ آدیش دال مہملہ کے ساتھ آتش کے معنی معنوں میں ہے جو آتیش کا مبدل ہے اور یہ ایک علیحدہ لغت ہے اور آذیش ذال معجمہ کے ساتھ چوکھٹ کی لکڑی کے معنوں میں ہے اور اپنی اس بات کی تائید میں سامانی اور سروری کا حوالہ دیا ہے۔

"پروفیسر نذیر احمد نے غالب نامہ (ج م اش م، جولائی ۱۹۸۱) میں ایک مقالہ "نقد قاطع برہان،، (ص ۰، ۲) لکھا جس میں قاطع برہان پر نقد کیا ہے، اس میں آتش کی تار مثناۃ کے مفتوح یا مکسور ہونے کی بحث کی ہے اور رومی کی یہ بیت بطور شاہد نقل کی ہے:

گفت آتش من ہمانا آتشم اندر آیی تا ببینی تابشم

تابشم کی بار موحدہ مکسور ہے جس سے یہ نتیجہ گیری فرمائی ہے کہ اس کے قافیے آتشم کی تے بھی مکسور ہوگی لیکن اگر روی ساکن ہو تو اس کی حرکت ماقبل کو توجیہ کہتے ہیں اور اس کی پابندی واجب ہوتی ہے، اور اگر روی متحرک ہو تو نہ اس کی حرکت ماقبل کا کوئی نام ہے، نہ اس کی پابندی واجب ہے یعنی اس کا مختلف ہونا قافیے کا عیب نہیں سمجھا جاتا۔ رومی کی بیت مزبور میں تابشم کی شین روی تو ہے لیکن متحرک ہے۔ پس نہ اس کی حرکت ماقبل یعنی کسرے پر توجیہ کے لقب کا اطلاق ہے، نہ اس کی پابندی دیگر قوافی میں واجب ہے۔ بعبارت دیگر تابشم کی بار موحدہ کا کسرہ آتشم

کی تا رمشناۃ کے کسرے کا ایجاب نہیں کرتا۔[۲۱]

اویژہ : بازای فارسی بروزن ہمیشہ، خالص وخاصہ وپاکیزہ را گویند وشراب انگوری را نیز گفتہ اند وباین معنی بازای ہوز ہم آمدہ است[۲۲]۔

اویژہ : بزای فارسی وتیل تازی بوزن کنیزہ، بمعنی خالص وپاک وخاصہ۔ مولف گوید بخاطر می رسد کہ مخفف آویژہ بہ مدہ باشد کہ مبدل بیژہ بود وآن مرکب باشد از آب بمعنی معروف وایزہ کہ کلمۂ سبت است یعنی کسی کہ منسوب بہ آب باشد کہ عبارت از خالص وپاک است ونظیر این لفظ پاکیزہ است یعنی کسی کہ نسبت بہ پاک داشتہ باشد یعنی ہر چیز مثل جامہ وفرش وعصا کہ پاک باشند، ھذا ھوا التحقیق[۲۳]

اویژہ : بازای ہوز ہرگز نیست، ونہ اسم شراب است نہ صفت شراب، دیگر اویژہ گفتن وپاک وپاکیزہ مراد داشتن بدان ماند کہ بول (پیشاب) گویند وگلاب خواہند. تفصیل بطریق اجمال آنکہ ویژہ لفظ فارسی قدیم است بمعنی پاک وپاکیزہ وبجای خصوصاً وعلی الخصوص نیز مستعمل شود وہمچنیں پارسیان را الفی است جز الفِ وصل کہ افادۂ معنی نفی کند چنانکہ جنبان بمعنی تحرک واجنبان بمعنی ساکن، وخواستی را ترجمۂ ارادی واخواستی را ترجمۂ غیرارادی دانند، واین الف در حرکت پیرو حرف ما بعد خود نباشد وہمیشہ مفتوح بود۔ لاجرم چنانکہ ویژہ پاک را گویند اویژہ ناپاک را گویند۔ بیچارہ بگمان الفِ وصل پیش پا خورد واویژہ را چون اشتر وشتر وسمان ویژہ گمان کرد وبدین رقص الجمل پس گردانِ خود را از راہ برد[۲۴]۔

خان آرزو نے اویژ کو آویژ کا مخفف اور آبیژہ کا مبدل نیز زای ہوز سے بتایا ہے اور آب کے معنی پانی وایزہ چونکہ کلمۂ نسبت ہے یعنی وہ چیز جو پانی سے نسبت رکھتی ہو یعنی خالص اور پاک۔ غالب نے اویژہ کے لیے کہا ہے کہ وہ زای ہوز سے ہرگز نہیں ہو سکتی لیکن اس کی کوئی وضاحت پیش نہیں کی ہے بلکہ الف کو نفی کا کام کرنا بتایا ہے اور خواستی کو ارادی اور اخواستی کو غیرارادی اسی طرح ویژہ کو پاک اور اویژہ کو ناپاک لکھا ہے لیکن یہ الف نفی فارسی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، دونوں لفظ جو غالب نے لکھے ہیں اجنبان نفی جنبان اور اخواستی نفی خواستی دساتیری ہیں اور فارسی سے کوئی تعلق نہیں رکھتے، یہ سنسکرت اور ہندی کا قاعدہ ہے۔ حسب ذیل الفاظ قابل ملاحظہ ہیں۔

نیای	انیای
گیان	اگیان

گیات	اگیات
سہمت	سہمت
مر	امر
سینک	اسینک
مٹ	امٹ

اسی بناپر اَدیژہ بھی فارسی نہیں ہے (لیکن یہ طریقہ پہلوی میں رائج تھا یعنی الف بمعنی نفی)۔

بخش : بروزن کفش، حصہ و بہرہ باشد، و ماہی را نیز گویند کہ بعربی حوت باشد، و بمعنی برج هم هست خواہ برج کبوتر خواہ برج قلعہ و خواہ برج فلک[۵]۔

بخش : بوزن رخش، حصہ و بہرہ و تحقیق آنست کہ در اصل بمعنی انعام و بخشیدہ بود کہ بدین معنی شہرت گرفتہ و بخشی کہ در ہندوستان بمعنی صاحب فوج و رسالہ مستعمل است، ظاہراً از ہمین معنی ماخوذ است۔ و در برہان بمعنی ماہی کہ حوت باشد و برج نیز گفتہ اعم از برج کبوتر و قلعہ و این ہمہ سندی خواہد زیرا کہ در کتب معتبرہ نیست[۲]۔

بخش : غالب گوید مگر درخش بروزن بخش بود کہ کفش آورد، ہمانا ہمین را درخور دانست، معہذا ننوشت، و ہمی بایست نوشت کہ صیغہ امر است از بخشیدن، بالجملہ بمعنی حصہ و بہرہ مسلّم و بمعنی ماہی سندی خواہد و بمعنی برج زنہار نیست، این نابینا جایی دیدہ است کہ فلک را بہ دوازدہ بخش کردہ اند و ہر بخش را برج نامند، گمان برد کہ بخش برج را گویند یا چنین دیدہ است کہ بخش بمعنی بہرہ و برخ است، و برج فہمیدہ است، بجیرتم کہ درین تصحیف خوانی برخ را چرا فراموش کرد[۳]۔

خان آرزو نے بخش کے معنی انعام اور بخشش لکھے ہیں اور اس کی انھیں معنوں میں شہرت ہے اس کے علاوہ ہندوستان میں بخشی رسالہ و فوج کے مالک کو کہا جاتا ہے جب کہ غالب نے برہان کی طرح اس کے معنی صرف حصہ اور بہرہ کے کہے ہیں۔ ان کے نزدیک برخ جس کے معنی حصہ ہیں اس کو صاحب برہان نے غلط پڑھا اور برج کردیا۔

بسمل : بکسر اول و میم و سکون ثانی و لام، ہر چیز کہ آن را ذبح کردہ باشند یعنی سر بریدہ باشند و بہ شمشیر شدہ : را نیز گویند، و وجہ تسمیہ اش آنست کہ در وقت ذبح کردن بسم اللہ می گویند، و مردم

صاحب حلم و بردبار را هم گفته اند[۲۸]۔

<u>بسمل</u> : بکسر اول و میم، هر جانوری که آن را ذبح کرده باشند، و ذبح کردن را نیز گویند، آصفی گوید:

قاتل من چشم می بندد دم بسمل مرا تا بماند حسرت دیدار او در دل مرا

نظیر این لفظ نخچیر است که هم بمعنی شکار کردن آمده و صاحب برهان گوید که وجه تسمیه اش آنست که در وقت ذبح کردن بسم اللہ می گویند و این تصرف خوبی است اگر به ثبوت رسد و نیز معلوم شود که لفظ مستحدث است و فارسی الاصل نیست[۲۹]۔

<u>بسمل</u> : آرزو دارم که جامع برہان قاطع را بشبی در خواب بنگرم تا بپرسم که "هر چیز که آن را ذبح کرده باشند" چه معنی دارد، ذبح برای جانداران است از از بهر اشیا، دیگر آن پرسم که ذبح عبارت از گلو بریدن است اینکه توضیح ذبح به سر بریدن کردهٔ چه معنی دارد۔ باز گویم که "به شمشیر کشته شده" را بسمل گفته، و وجه تسمیهٔ بسمل آن قرار دادهٔ که "وقت ذبح کردن بسم اللہ گویند" خدا را بفرمای که هنگام شمشیر زدن بسم اللہ که می گوید و در وقت ذبح جز اهل اسلام تکبیر که می گوید۔ چون تو خود می گویی که "بسمل آن را می گویند که حین ذبح بسم اللہ گویند" لاجرم باید هر که به شمشیر کشته شود بسمل نباشد و ذبیحهٔ اقوام دیگر جز مسلمین بسمل نباشد۔ پس ازین همه پرسش گویم که ای بی خرد، لفظ بسمل مخترع فقهای اهل اسلام نیست که بهر این معنی خاص وضع کرده باشند، لغتی است باستانی و لفظی است قدیم چنانکه خرد گواه است که وضع لفظ بسمل پیش از ظهور جلوهٔ بسم اللہ است[۳۰]۔ لاجرم پارسیان از عهد کیومرث تا عصر یزدجرد چون رسم ذبح و گفتن بسم اللہ نبود، جاندار خسته و گلو بریده را چه می گفته باشند۔ اگر گوید بسمل لفظ مستحدث است اگویم مسلّم، لیکن قرار دهندگان و لفظ آفرینندگان را هرگز این وجه تسمیه در ضمیر نگذشته باشد۔ چون این حکایت انجام پذیر شود، پرسم که از عصر رودکی و فردوسی تا آن زمان که تو در آن بودهٔ بسمل بمعنی صاحب حلم و بردبار در کلام کدام سخنور دیدهٔ[۳۱]۔

خان آرزو کے نزدیک بسمل ہر ذبح کیے ہوئے جانور اور ذبح کرنے کو کہتے ہیں جس کی مثال میں لفظ نخچیر پیش کیا ہے یعنی شکار اور یہ لفظ شکار کرنے کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ اور صاحب برہان قاطع کی اس وجہ تسمیہ کو کہ ذبح کرتے وقت بسم اللہ کہتے ہیں اچھا تصرف بتایا ہے، اسی طرح غالب نے لکھا ہے کہ ذبح کرنے کے لیے گلو بریدن مناسب ہے سر بریدن نہیں، شمشیر سے

مارنے میں بسم اللہ کا کوئی موقعہ نہیں ہوتا ہے۔ بسمل باستانی لفظ ہے اور بسم اللہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے اور ان کی نظر میں بسمل بر دبار کے لیے نہیں استعمال ہوتا ہے۔

ثُغ : بضم اول وسکون غین نقطہ دار، بفارسی بت را گویند کہ عربی صنم خوانند[۳۲]۔

ثُغ : بضم وغین معجمہ بمعنی بت وصنم واصل آن فغ است بفتح فا واز آن مرکب است فغفور چنانکہ بباید واصل آن فغ بغ با بود وآن مرکب است از بغداد[۳۳]

ثُغ : ثای مثلثہ مانند ذال معجمہ نیست کہ شرف الدین علی یزدی در قطعۂ خویش از فارسی بودن آن انکار نکردہ، ہمہ برآن متفق اند کہ ثای مثلثہ در فارسی نیست، ثغ لغت فارسی چگونہ خواہد بود، ہاں فغ بفتح فای سعفص در فارسی بت را گویند[۳۴]۔

آرزو نے ثُغ کی اصل فَغ بتائی ہے جس کا مرکب فغفور ہے اور فغ دراصل بغ بای ابجد سے ہے اور بغداد اس کا مرکب ہے۔ غالب کے نزدیک ثای مثلثہ کی صورت ذال معجمہ کی سی نہیں ہے جس کے وجود کا شرف الدین علی یزدی نے اپنے ایک قطعہ میں اقرار کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ سب اس بات سے متفق ہیں کہ جب فارسی میں حرف ثای مثلثہ کا وجود نہیں ہے تو ثُغ فارسی کا لفظ کیوں کر ہو سکتا ہے۔ ہاں فغ فارسی میں بت کو کہتے ہیں۔

کارِگیا : بکسر ثالث وکاف فارسی وتحتانی بالف کشیدہ، بمعنی پادشاہ ووزیر وکار فرماد کاردان باشد، وہریک از عناصر اربعہ را نیز گفتہ اند[۳۵]۔

کارِگیا : بکسر رای مہملہ وکاف فارسی وتحتانی بالف کشیدہ در برہان بادشاہ ووزیر وکار فرماد کاردان وہریک از عناصر اربعہ ودر جہانگیری بمعنی بادشاہ وہریکی از عناصر اربعہ، مولوی فرماید :

عشق آن بگزیں کہ جملہ آنہا   یافتند از عشق او کارِگیا

دہم او فرماید :

گفت اطفال ستد این اولیا   در غریبی فرد از کارِگیا

مولف گوید صاحب ہر دو نسخہ را غلط واقع شدہ چراکہ گیا اینجا بکاف تازی است بمعنی بادشاہ، ودوم آنکہ کار گیا بدون اضافت است مقلوب گیاہی کار بمعنی خداوند کہ کار با بدون متعلق باشد وآن عبارت است از بادشاہ، وسوم آنکہ کار گیا در ہر دو مذکور بمعنی بادشاہ وعناصر نیست بلکہ در بیت اول بمعنی

کار بادشاہ است کہ عبارت است از سلطنت و در بیت دوم بمعنی کاری است کہ تعلق است بہ عناصر پس در این دو بیت گیاست بکاف تازی بہر دو معنی مذکور، و ترکیب اضافی است و صاحب جہانگیری این در یک لفظ تصور نمودہ و آن خطاست [۳]۔

کارگیا : حرف ثالث رای قرشت است، ہرآئینہ باید کہ کار مضاف و گیا بکسرہ کاف پارسی مضاف الیہ باشد درین صورت لازم می آید کہ معنی گیا پرسیدہ شود۔ اگر از من پرسند گویم کہ گیا بکاف پارسی کمسور در زبان فارسی جز تخفیف گیاہ معنی ندارد، و گیا بالفتح اگرچہ در فارسی معنی ندارد لیکن در ہندی صیغۂ ماضی است ترجمۂ رفت، و نام شہری است در قلمرو بنگالہ۔ ای دکنی این گیا بکاف عربی مفتوح است، کی بمعنی خداوند و مالک و کیا مزید علیہ و کارکیا بسکون ثالث کہ رای قرشت است بمعنی خداوندکار چون دہ کیا بمعنی مالک دِہ [۳]۔

خان آرزو کی تحقیق کے مطابق صاحب برہان و جہانگیری دونوں ہی سے غلطی واقع ہوگئی ہے کیوں کہ کیا کاف عربی سے ہے جس کے معنی بادشاہ ہیں اور دوسرے یہ کہ کارکیا میں (ر) ساکن ہے اور یہ مقلوب ہے کیا ہی کار کا جس کے معنی ہیں وہ مالک جس سے کام کا تعلق ہو یعنی بادشاہ، اور تیسری بات یہ کہ مذکورہ بالا دونوں ابیات میں بادشاہ اور عناصر کے معنوں میں نہیں ہے بلکہ پہلی بیت میں بادشاہ کا کام یعنی سلطنت ہے اور دوسری میں وہ کام جو عناصر سے متعلق ہوتا ہے، پس ان دونوں بیتوں میں گیا کاف تازی سے ہے۔ غالب کی نظر میں بھی گیا غلط ہے بلکہ اس کی جگہ گیا ہونا چاہیے اور ساتھ ہی دوسرا حرف یعنی (ر) ساکن ہے مکسور نہیں، کیونکہ کار مضاف اور گیا مضاف الیہ نہیں ہوسکتا اور گیا کا کاف مفتوح ہے یعنی کَی جس کے معنی مالک کے ہیں۔ غالب کے نزدیک اگر کاف مکسور ہے تو یہ گیاہ کا مخفف ہے اور ہندی میں گیا جانے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے، اس کے علاوہ بہار میں گیا ایک جگہ کا نام ہے۔ اس طرح یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ غالب و آرزو دونوں کے پیش نظر یہ لفظ کارِگیا ہے گیا نہیں اور حرف (ر) کو دونوں نے ہی ساکن بتایا ہے۔

میو : با ثانی مجہول بروزن دیو، بمعنی موی باشد کہ عربان شعر خوانند و در بعض از بلاد تاک انگور را گویند یعنی درخت انگور [۳]۔

بیو : بروزن دیو، مؤلف گوید کہ اگر این لفظ صحیح باشد تعب موی خواہد بود مانند دبوزہ و

دردیزہ، ودر برہان بمعنی تاک انگور گفتہ لیکن بدین معنی مواست بدون یا، ودر ہندی نام قومی کہ مصداق این بیت خواجہ نظامی است:

دو ہندو برآید ز ہندوستان   یکی دزد باشد یکی پاسبان

ودر واقع ازین برادر دزد باشد ودیگری پاسبان ودر ہر دو فن کامل[۳۹]

میو: بروزن دیو، بمعنی موی می نویسد ونمی داند کہ بمعنی موی معنی ندارد۔ این قلب موی است،[۴۰]
آرزو کا کہنا یہ ہے کہ اگر یہ لفظ صحیح ہے تو موی کا قلب ہو گا جیسے دریوزہ ودردیزہ اور برہان میں جو انگور کی بیل بتایا ہے وہ مو کے معنی ہیں جس کے آخر میں ی نہیں ہے۔ ہندی میں ایک قوم کا نام ہے۔ غالب کے نزدیک میو موی کے معنی میں نہیں ہیں بلکہ یہ موی کا قلب ہے۔

ھُوس: باثانی مجہول بروزن طوس، بمعنی ہوا وہوس باشد[۴۱]۔

ھَوس: بفتحتین، توسی میل طبیعت نوشتہ درین صورت بوالہوس مرکب از کلمۂ عربی وفارسی باشد والف ولام بر لفظ فارسی آمدہ واین بعید است، پس حق تحقیق آنست کہ ھوس در عربی بمعنی جنون است در عشق ناتمام وخواہش نفس کہ گویا مرضی است سودایی بمجاز اطلاق کردہ اند تا غایتی کہ شہرت گرفتہ واینکہ در کلام بلغا، مقابلۂ عشق وھَوس واقع شدہ نیز دلالت دارد کہ عشق ملکۂ فاضلہ است وہَوس کہ عشق ناتمام است از رزایل بلکہ از امراض است، وبرین تقدیر عربی الاصل خواہد بود وبہذا از یاب کیمیا را مہوس خوانند کہ آدمی را در ہوس وجنون می اندازد لیکن در فارسی ہوس بواو مجہول بمعنی خواہش درآرند وآمدہ چنانکہ درجہانگیری تصریح کردہ، ودر ہندی نیز بہمین معنی لیکن بفتح اول وسکون دوم واین چندان تفاوت ندارد، وبعضی در فارسی بمعنی امید گفتہ اند واین ہم ہمان است پس حق تحقیق آنست کہ ہوس بفتحتین بمعنی خواہش فارسی وہم چنین ہُوس بواو مجہول بمعنی مذکور وبمعنی جنون عربی است[۴۲] وبوالہوس لفظ عربی، وھَوس در آن مجازاً بمعنی عشق ناتمام وخواہش ومیل طبعی است اگر گوید کہ الف ولام گاہی بر الفاظ فارسیہ نیز آرند چنانکہ درویش والہ ہروی گوید۔

زد الخورشید بن شد خراسان

وحال اینکہ بیا ونون کہ خاصہ عرب است تشبیہ کردہ، مولف گوید این قسم تصرف در دو وجہ است. یکی آنکہ مدعای تابر اظہار صناعی خود باشد باوجود علم مخاطب کہ آن در واقع درست نیست واین

اظہار باوجود علم متکلم نیز باشد وآنچہ کردہ است نفس الامری نیست چنانچہ در مصراع مذکور کہ ہم چنین در بیت دانشمند عالی:

گل مگر لاف انا الیار بہ گلشن زدہ است بر سر شاخ خیال سر منصور کنم

لفظ انا الیار ہمان عالم است واز ہمین عالم است مصرع تاریخی کہ مرزا عبدالقادر بیدل در تولد فرزند بادشاہ مرحوم مظلوم محمد فرخ سیر غازی گفتہ:

النوید آفتاب عالمتاب

دوم آنکہ اظہار صناعی خود نباشد، پس درین صورت اتباع روزمرہ دانان واجب است. ولفظ بوالہوس از عالم دوم است نہ از اول و فرق این دقیق است خیلی نازک فہم باشد کہ دریابد.[۴۳]

ہوس: درطوس واو مجہول کجاست، بالجملہ ہُوس با ہای مضموم و واو مجہول بمعنی ہَوس کہ بفتحتین است، کجاست؛ اگر در کلام ابن یمین نشان دہند، این نیز دانند کہ آن بحسب ضرورت است ودر تحقیق حقیقتِ لغت رعایت ضرورت ضرورت ندارد، ومعہذا دفع این اعتراض کہ ہوس را بواو مجہول رقم کردہ وطوس را ہموزن آوردہ ہیچ گونہ صورت ندارد، طوس نام پہلوانی بودہ است از گردان ایران، واسم شہری است از بلاد خراسان و واو معروف است نہ مجہول، واین نیز اندیشند کہ شعر ابن یمین مطلع نیست، فردیست از قطعہ، و قوافی این قطعہ توس و فردوس است بدین دلیل تغیر اسکان وتحریک رسم است، وتبدیلِ سکون وحرکت مع تبدلِ اعراب طرفگی دارد، وعظمای عجم طرفگی رامکروہ ومردود شناسند، شعر ابن یمین این است:

رزم بر رزم اختیار مکن ہست مارا بخود ہزاران ہوس

حرکت را بسکون بدل کردہ است نہ مفتحہ را بضمہ، توس را ہُوس بوزن حَوض گفتہ است نہ ہوس بوزن کوس.[۴۴]

۱: خان آرزو نے ہَوس کو فتحتین سے لکھ کر سارا مسئلہ ہی حل کر دیا۔ ان کی تحقیق کے مطابق ہوس فارسی میں خواہش کے معنوں میں اور عربی میں جنون ہے اور ہوس بمعنی عشق ناتمام مجاز ہے۔ غالب نے قاطع برہان میں یہ اعتراضات کیے ہیں کہ طوس میں واو معروف ہے پس ہوس اگر واو مجہول سے ہے تو طوس کا ہموزن کیونکر ہوگا۔ اگر ابن یمین کے کلام میں ہُوس اول مضموم

تسلیم بھی کرلیا جائے تو یہ شعر کے تقاضے کو پورا کرنے کے لیے ہے۔
ہے کہ ھَوس انگریزی کو طوس کے ہم وزن لکھنا چاہیئے۔

۲ : اگر ابن یمین کے کلام میں ھوس میں اول مضموم تسلیم کرلیا جائے تو اس کو ضرورت شعری کہیں گے۔ پس یہ علیحدہ لغت قرار نہیں پاسکتا۔

۳ : ابن یمین کا شعر مطلع نہیں بلکہ کسی قطعے کا فرد ہے، اس قطعے کے دوسرے قوافی توس اور فردوس ہیں حرکت و سکون کا تغیر یعنی (ھَوَس کا ھَوْس بروزن توس کردینا) مروج تھا۔ ابن یمین کا شعر یہ ہے :

رزم بر بزم اختیار مکن | ھست مارا بخود ہزاران ھوس

اس میں حرکت کو سکون سے بدل دیا گیا ہے، فتحے کو ضمے سے نہیں یعنی ھَوس سے ھَوْس بروزن حوض ہے نہ بروزن کوس۔

اس بیان کا سب سے قدیم ماخذ فرہنگ جہانگیری ہے۔ وہیں سے مولف برہان نے یہ اطلاع حاصل کی ہے، اس نے خود اپنی طرف سے کوئی نئی بات پیدا نہیں کی جہانگیری کا بیان یہ ہے :

" ھوس " باول مضموم و واو مجہول بمعنی امید باشد؛ ابن یمین راست :

درقدح کن زحسبِ بط خونی | ہمچو روی تذرو و چشم خروس
رزم بر بزم اختیار مکن | ہست مارا بخود ہزاران ھُوس[۴۶]؛

فرہنگ سروری[۴۷] میں یہ ہے۔

"ھوس بروزن کوس، در فرہنگ[۴۸] بمعنی ھوس باشد۔ مثالش این بیت ابن یمین آوردہ"
(اس کے بعد وہی دو بیتیں نقل کی گئی ہیں جو جہانگیری میں منقول ہیں) آگے اسی فرہنگ میں ہے :

"دبخاطر می رسد کہ ھوس بمعنی[۴۸] امید باشد چہ باین قطعہ این معنی انسب ست[۴۹]"

فرہنگ رشیدی میں بھی اسی کی تکرار ملتی ہے، ملاحظہ ہو۔

" ھوس بواو مجہول، ھوس باشد ابن یمین گوید :

رزم بر بزم اختیار مکن الخ[۴۹]

حاشیہ میں اضافہ ہے :

"در بعضی نسخ ھُوس و ھوسہ بالضم و واو مجہول"

فرہنگ معین میں آیا ہے :

ہوس [illegible] تصرفی از عربی [illegible] ھوس آرزوی نفسانی :

درقدح کن ز حسن لطف خوئی ہمچو روی تذرو چشم خروس

رزم دزبزم اختیار مکن ہست مارا بخود ہزاران ھوس "

برہان قاطع کے حاشیہ میں ڈاکٹر محمد معین نے یہ لکھا ہے کہ ھوس لغت عربی ہَوَس کا محرف ہے، اس کے بعد جہانگیری اور رشیدی کے حوالے سے ابن یمین کے دو شعر نقل کیے ہیں (حالانکہ رشیدی میں صرف ایک ہی بیت ہے)

اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ لفظ ھوس جو تمام قدیم فرہنگوں سے غیر منضبط ہے اس کی بنیاد صرف ابن یمین کے ایک شعر کی قرأت پر ہے لیکن اس کے باوجود کسی مصنف نے ابن یمین کے قطعے کی چھان بین نہ کی۔ تعجب ہے ڈاکٹر معین سے کہ عربی کی محرف شکل بتانے کے باوجود وہ مسئلہ کی اصل حیثیت پر بحث نہ کر سکے۔ میں نے (نذیر احمد) مسلم یونیورسٹی کے کتب خانے میں ابن یمین کے کلام کے چار قلمی نسخوں کا مطالعہ کیا، ان میں تین نسخے ایک ترتیب کے ہیں اور ان تین فرہنگوں میں منقول قطعہ موجود نہیں، یہی حال تہران کے مطبوعہ نسخے کا بھی ہے، ایک نسخہ جدید ہے جو مولانا حبیب الرحمن خان شیروانی کے ذخیرے میں ہے، شیروانی صاحب کی ایک تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ بھاول پور کے کتب خانے کے ایک نہایت معتبر اور قدیم نسخے کی ہو بہو نقل کی ہے، اصل کی اس حد تک پیروی کی گئی ہے کہ اکثر مقامات پر قدیم املائی اصول کے تتبع میں دال و ذال کا فرق ملحوظ رکھا گیا ہے، اس لیے ظاہر ہے کہ نسخہ منقول عنہ ممکن ہے کہ خود شاعر کے عہد کا نسخہ ہو، بہر حال اس نسخے میں حسب ذیل قطعہ موجود ہے :

اے دریغا کہ عمر شد بفسوس از لبت ناستاندہ داد ہوس

ساقیا گلشن از نسیم بہار گشت آراستہ چو روی عروس

در قدح شد ز حلق بط خونی | مهجوری تذرو و چشم خروس
رزم بر بزم اختیار مکن | هست ما را بخود هزار ہیوس
ہرگز ابن یمین عوض نکند
نغمۂ چنگ را کوس[۵۱]

نسخہ منقول عنہ کی پیروی میں کاتب نے بھی نقطوں کا با قاعدہ اہتمام نہیں کیا ہے خصوصیت سے پہلی اور چوتھی ابیات کے دوسرے مصرعوں کے تقریباً سارے الفاظ نقطوں سے عاری ہیں اس بنا پر ان کی قرأت مشتبہ ہو سکتی ہے۔ پہلی بیت کے دوسرے مصرعے کا قافیہ ہیوس ہے اس کے معنی امید، آرزو، طمع، چشم داشت کے ہیں۔ مثلاً سروری[۵۲] لکھتا ہے۔

"ہیوس بیای حطی بوزن عروس طمع و امید باشد بچیزی از ہر نوع کہ باشد اش حکیم انوری گوید:

گربہ بہ ہیوس نتوان کرد | ہم درین بیشہ بو دشیر عرین

ہم او فرماید:

بہ ہیوسی از جہان دانی کہ چون آید مرا | ہم چنان کز بارگین کردن امید تری

و ابن یمین نیز گوید:

ہر کرا ہمت بلند بود | راہ یابد بمنتہای ہیوس

و در نسخۂ حلیمی بمعنی تواضع و چاپلوسی نیز آمدہ "

اب رہا چوتھے شعر کے دوسرے مصرعے کا قافیہ جو بادی النظر میں ہیوس ہی ہو سکتا ہے، اس لیے کہ اسی سے معنی درست ہو سکتے ہیں، یعنی ای دوست بزم آراستہ کر رزم کا کوئی محل و مقام نہیں، مجھ کو تجھ سے ہزار آرزوئیں ہیں۔ "ھوس" سے وزن بگڑ جاتا ہے اور اسی وزن کو پورا کرنے کے لیے مولف ہذا کو "ہزار" کے بجائے "ہزاران" کرنا پڑا ہے، میرے پیش نظر نسخے کی یہ واضح صورت ہے۔ یہی قرأت اس نسخے کی ہے جس کی رو سے لغت نامہ میں یہی بیت منجملہ اور مثالوں کے درج ہوئی ہے:

"ہیوس: امید و امیدواری و آرزو و از مصدر ہیوسیدن"

"و ہر چند کہ صوای وی از آن منقطع باشد دنیای آخر ہیوس ثواب آن جہانی باشد"

ای پہلوان کامروا اختیار دین　　　ای خلق را بہ بخشش و انعام تو ہوس
(محمد بن ہمام شہاب الدین)

کزین نامہ ہم گرنہ رفتی ہوس　　　سخن گفتن تازہ بودی فسوس　(نظامی)

رزم بر بزم اختیار مکن　　　ہست مارا بخود ہزار ہوس　(ابن یمین)

با عقل کار دیدہ بخلوت شکایتی　　　میکردم از شکایت گردون پر فسوس

گفتم جو را وست کہ ارباب فضل را　　　عز عزیز می رود اندر سر ہوس　(ابن یمین)

اس تفصیل سے واضح ہے کہ غُوس کوئی لفظ نہیں، صحیح لفظ ہوس ہے، صاحب فرہنگ سے اس لفظ کے پڑھنے میں غلطی واقع ہوگئی اور ان کی اس غلط خوانی سے یہ لفظ دوسری اور فرہنگوں مثلاً فرہنگ رشیدی، مجمع الفرس سروری، برہان قاطع وغیرہ میں راہ پاگیا، ورنہ اس کی کوئی بنیاد نہیں۔ حیرت اس بات پر ہے کہ سارے فرہنگ نویس جہانگیری کی روایت کو باوجود سقیم ہونے کے دہراتے رہے اور کسی کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ وہ ابن یمین کا دیوان دیکھ لیتا تاکہ اصل واقعہ اس کی نظروں سے اوجھل نہ رہ جائے۔ دور جدید کے فرہنگ نویس بھی اسی روایت پرستی کے شکار ہیں[۵۴]۔''

یاختن : بروزن ساختن بمعنی بیرون کشیدن باشد مطلقاً و برآوردن تیغ از غلاف و بمعنی زدن و انداختن و آشکارا کردن و پرسیدن و سوال نمودن ہم ہست۔[۵۵]

یاختن : بوزن ساختن در بعضی فرہنگہا بمعنی برکشیدن اعم از شمشیر از غلاف یا چیز دیگر از چیز دیگر مرادف آختن و قصد کردن و دست دراز نمودن بہ چیزی، و در سروری بمعنی زدن و انداختن و آشکار کردن و پرسیدن سوال آوردہ، مولف گوید تحقیق آنست کہ بمعنی حرکت کردن و حرکت دادن است، و معنی دیگر محتاج شواہد آرند و یاختن مبدل آختن است[۵۶]۔

یاختن ، بمعنی بیرون کشیدن می نویسد و نمی دانند کہ آن آختن است بالف ممدودہ، ہمانا کہ چون یا زد مضارع آنست[۵۷]۔

خان آرزو نے یاختن کے معنی حرکت کرنے اور حرکت دلانے کے لکھا ہے اور یاختن کو آختن کا مبدل بتایا ہے۔ غالب کا خیال ہے کہ یہ یاختن کے بجائے آختن ہے۔ اس طرح یہاں بھی

آرزو و غالب نتیجے کے اعتبار سے بہت مشابہت رکھتے ہیں۔

خان آرزو و غالب کے یہاں کچھ ایسی قدریں مشترک ملتی ہیں کہ جن پر روشنی ڈالنا بہت ضروری سمجھتی ہوں۔

خان آرزو نے توافق لسانین کے نظریے کو پیش کیا اور مجموعی طور پر انھوں نے جو باتیں بیان کی ہیں ان میں بڑی حد تک صداقت کا عنصر پایا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ نظریہ اب بہت عام ہو چکا ہے لیکن اب تک کی معلومات کے مطابق آرزو اس نظریے کے بانی ہیں اور ان کی بدولت ہی سب سے پہلے روشناس ہوا ہے۔
غالب خود بھی اس بات کے قائل تھے کہ فارسی اور سنسکرت میں اتنا زیادہ توافق پایا جاتا ہے کہ ان کا شمار کرنا بہت مشکل ہے۔ آرزو نے ان الفاظ کو بھی الف بائی ترتیب کے اعتبار سے فارسی کے اور دوسرے الفاظ کے ساتھ بیان کیا ہے جب کہ قاطع برہان میں غالب نے آخری ۵۸ صفحات میں توافق لسانین کے تحت جو الفاظ آتے ہیں ان کی ایک طویل فہرست درج کی ہے۔ میں یہاں پہلے سراج جو اصل میں برہان سے ہی نقل کیے گئے ہیں اور پھر قاطع برہان سے کچھ الفاظ نمونے کے طور پر ناظرین گرامی کی خدمت میں پیش کر رہی ہوں۔

کنگر : بکسر اول نام سازی است و این در اصل کنگری بود[59]، پس مخفف بود، لیکن کنگری ہندی است و می تواند کہ از عالم توافق لسانین باشد[60]۔

کھند : بفتح اول و سکون دال بمعنی شکر، و قند معرب[62] آن مولف گوید در اصل کھنڈ[63] بکاف ہندی و دال ہندی است کہ تلفظ آن بر غیر ہندی دشوار است، پس این لفظ ہندی الاصل باشد[64]۔

<u>کملہ</u> : بفتح بوزن حملہ، در برہان[65] ابلہ و نادان باشد، مولف گوید بزبان ہندی پنجابی نیز بمعنی دیوانہ و آشفتہ مزاج است، پس از عالم توافق لسانین باشد[66]۔

<u>کملی</u> : بفتح اول جلبہ پشمینہ کہ درست و خشن باشد و فقرا و درویشان پوشند[67] و بزبان ہند[68] نیز ہمین است[69]۔

دُشت[۱] بہ دال مضموم بی تغیرِ صورت در ہر دو زبان بمعنی مکروہِ طبع و ناپاک۔ جال[۱] در ہر دو زبان بمعنی دام، تال[۲] در ہر دو زبان بمعنی آبگیر و تالاب مزید علیہ، ڈول[۳] بمعنی ظرفی کہ بدان از چاہ آب کشند فارسی باستانی است کہ در ہندی بدال ثقیلہ (ڈال) شہرت دارد۔ سر[۴] در ہر دو زبان بمعنی جسم و کالبد است۔

توافق لسانین کے ہی تحت فارسی اور عربی کے ہم رشتہ زبان ہونے کا تصور ملتا ہے، جہاں تک اس نظریے کا تعلق ہے آرزو نے اس سلسلے میں جو باتیں لکھیں، وہ دراصل غلط فہمی پر مبنی ہیں، عربی اور فارسی ہم رشتہ زبانیں نہیں ہوسکتیں، عربی سریانی اور فارسی آریائی خاندانوں سے متعلق ہیں۔ یہ دو الگ الگ خاندانوں کی زبانیں ہیں۔ جو تاریخ کے کسی قدیم ترین دور میں بھی ایک نہیں تھیں، وہ فارسی اور عربی کے چند لفظوں کی مماثلت سے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ مماثلت کسی اتفاق کا نتیجہ نہیں ہوسکتی مگر جن فارسی لفظوں کو انھوں نے عربی لفظوں کا مماثل بتایا وہ دراصل فارسی لفظ ہی نہیں ہیں بلکہ وہ پہلوی زبان کی ایک املائی صورت ہے جن کو اصطلاح میں ہزوارش کہتے ہیں جس کے لغوی معنی گزارش اور شرح کے آتے ہیں لیکن اصطلاحاً اس کے مخصوص معنی ہیں۔ پہلوی زبان میں بہت سے سامی الفاظ کی کتابت تو آرامی تلفظ کے اعتبار سے ہوتی لیکن پڑھتے وقت اس کا متبادل پہلوی لفظ پڑھا جاتا ہے مثلاً جلتا لکھتے اور پوست پڑھتے ہیں، ملکا لکھتے ہیں اور شاہ پڑھتے ہیں، اپ لکھتے ہیں اور پیت پڑھتے ہیں، اخ لکھتے ہیں اور برات پڑھتے ہیں۔ واضح ہو کہ یہ سامی کلمات عربی سے مشابہ ہیں جلتا جلد ہے، ملکا ملک ہے اور اپ اور اخ تو دونوں زبانوں میں یکساں ہیں اس طرح انگریزی میں بھی e.g. لکھتے ہیں اور For example پڑھتے ہیں i.e لکھتے ہیں اور that is پڑھتے ہیں۔

فارسی فرہنگ نگاروں میں خان آرزو سے کافی پہلے سے ہی یہ روایت چلی آرہی ہے اور سب سے پہلے جمال الدین حسین انجوی شیرازی (صاحب فرہنگ جہانگیری، ۱۰۱۷ھ/۱۶۰۸ء میں اس سلسلے میں غلط فہمی کا شکار ہوئے، ان کو کسی زرتشتی کے پاس ایک قدیم کتاب کے کچھ اوراق نے گمراہی میں مبتلا کردیا۔ انھوں اس کتاب کے تمام لغتوں کو زند و پازند کے لفظ قرار دے کر اپنی فرہنگ میں شامل کرلیا اور ان الفاظ کو ایک الگ فصل میں درج کیا اس سے ظاہر تھا کہ وہ اگرچہ ان کو زند و پازند

کے الفاظ سمجھتے تھے، لیکن ان کی اصل سے ناواقفیت کی بنا پر ان الفاظ کو فارسی کے اصل الفاظ قرار دینے میں تامل تھا کیونکہ ان کی عجیب وغریب شکلیں فارسی کے اصیل لفظوں کے سانچے میں ٹھیک سے نہیں بیٹھتی تھیں، مگر صاحب برہان قاطع نے ان ہزوارش شکلوں کو زند و پازند کے لفظ قرار دیتے ہوئے اپنی فرہنگ میں حروف تہجی کے اعتبار سے فارسی کے اصیل لفظوں کے شانہ بشانہ کھڑا کر دیا اور اس طرح فارسی زبان کو سخت نقصان پہنچایا اور آگے چل کر ان کی ہی پیروی میں خان آرزو نے بھی ان کو زند و پازند کے الفاظ قرار دے کر پہلے اپنی کتاب "مثمر" اور پھر "سراج" میں شامل کر لیا اور چونکہ غالب پر بھی ہزوارش کی اصل حقیقت واضح نہ ہو سکی تھی اس لیے انھوں نے بھی اس روایت کو آگے بڑھایا۔ ان کی تحریروں کی بدولت ان لفظوں کا کچھ زیادہ ہی رواج ہوا۔ اب ذیل میں صرف دو لفظوں کو بطور نمونہ پیش کیا جا رہا ہے۔

<u>مشمشا</u> : بمعنی زرد آلو کہ بعربی مشمش گویند[5]۔

<u>مشمشا</u> : بلغت زند و پازند نوعی از زرد آلو باشد[6]۔

<u>مشمشا</u> : بفتح اول و میم و سکون ثانی، گویا بر وزن درہوا بلغت زند و پازند نوعی از زرد آلو می نویسد، آگاہی طلبان آگاہ باشند کہ گفتار دگنی درین مقام پوچ، یادر ہواست، این ہمان مشمش است بروزن کشمش بمعنی خوبانی کہ نوعی از زرد آلو است[7]۔

دراصل زرد آلو اس کے معنی نہیں بلکہ یہ زرد آلو کا ہزوارش ہے۔ لفظ مشمشا کا پہلوی میں کوئی وجود نہیں ہے یہ محض زرد آلو کے لکھنے کی شکل ہے۔ پہلوی میں زرد آلو محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

<u>بیل و بیلا</u> ، بکسر چاہ کہ بتازی بیر خوانند[8]۔

<u>بیل و بیلا</u> : بلغت زند و پازند بمعنی چاہ[9]۔

<u>بیل و بیلا</u> : بلغت زند و پازند بمعنی چاہ کہ بعربی بیر خوانند[10]۔

دراصل چاہ اس کے معنی نہیں بلکہ یہ چاہ کا ہزوارش ہے لفظ بیل یا بیلا کا پہلوی میں کوئی وجود نہیں ہے یہ چاہ کے لکھنے کی شکل ہے۔ لفظ چاہ پہلوی میں محض ہزوارش کے طور پر آیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ خان آرزو نے بھی غالب کی طرح برہان قاطع کی تنقید کی ہے، دونوں کہیں کہیں

ہم خیال اور اکثر ہم خیال نہیں ہیں۔ لیکن میں اپنے میں دونوں کے درمیان محاکمہ کرنے کی اہمیت نہیں رکھتی، میں نے دونوں کے اقوال پیش کر دیے ہیں۔ ناظرین خود فیصلہ کر سکتے ہیں لیکن اس بات میں شبہ نہیں کہ غالب، آرزو اور برہان دساتیر اور مزدارش کی حقیقت سے ناواقف تھے اور لغت نگاری کے فن کے لحاظ سے یہ بڑا نقص ہے۔

۱: حواشی: خان آرزو کی سراج اللغۃ پر مشہور مستشرق بوخمین نے ۱۸۶۸ میں ایک مضمون جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال شمارہ ۳۰ حصہ ا میں شائع کیا ہے لیکن تلاش کے باوجود راقمہ کو مذکورہ شمارہ حاصل نہ ہو سکا۔

۲: سراج اللغۃ، خطی نسخہ ٹونک، ورق الف۔

۳: تالیف جمال الدین حسین انجوی شیرازی۔

۴: تالیف محمد قاسم ابن حاج محمد سروری کاشانی در ۱۰۲۸۔

۵: تالیف اوحدین اصفہانی۔

۶: مجمع النفائس، تذکرۂ شعرای فارسی، سدۂ دوازدہم تصحیح عابد رضا بیدار، شائع کردہ خدا بخش لائبریری پٹنہ۔

۷: قاطع برہان در رسائل متعلقہ، مرتبہ قاضی عبدالودود، شائع کردہ صد سالہ یادگار غالب کمیٹی دہلی۔ ۱۹۶۷ء ص ۱۵۸۔ ۱۵۹۔

۸: ۔ دیوان خاقانی میں یہ شعر مع دو اور شعروں کے اس طرح آیا ہے۔ طبع سجادی ص ۵۰۳:

کسری و ترنج زر پرویز و تره زرین ۔۔۔ بر باد شده یکسر با خاک شده یکسان

پرویز بهر خوانی زرین تره آوردی ۔۔۔ کردی ز بساط زر زرین تره را بستان

پرویز کنون گم شد زان گمشده کمتر گوی ۔۔۔ زرین تره کو برخوان رو کم ترکو برخوان

۹: ۔ قرآن کریم کی آیت کی طرف اشارہ ہے: سورۃ الدخان ۴۴، آیت ۲۵ بعد کم ترکوا من جنٰت و عیون ۔ و زروع و مقام کریم ۔ و نعمۃ کانوا فیہا فاکہین ۔

"وہ لوگ کتنے ہی باغ اور چشمے اور کھیتیاں اور عمدہ مکانات اور آرام کے سامان جس میں وہ خوش رہا کرتے تھے چھوڑ گئے۔"

۱۰ : ایضاً ص ۱۵۸

۱۱ : ایضاً ص ۱۵۹

۱۲ : نقد قاطع برہان مع ضمائم، پروفیسر نذیر احمد، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء، ص ۳

۱۳ ۔ شرفنامہ منیری یا فرہنگ ابراہیمی از ابراہیم قوام الدین فاروقی ۸ ۸ ھ

۱۴ : ایضاً ص ۳

۱۵ : ایضاً

۱۶ : قاطع برہان ص ۲۲

۱۷ : رک دیوان انوری چاپ مدرس رضوی ج ۱ ص ۲۶۸

۱۸ : دیوان چاپ مدرس رضوی میں مصرع اس طرح ہے : ،، درکند چوب آستان تو عکم،،

۱۹ : سراج

۲۰ : قاطع برہان ص ۱۵ ۔ ۱۶

۲۱ : یہ عبارت ایک ذہن محقق صادق (شمس آبادی) کے خط سے نقل کی گئی ہے جو انھوں نے نذیر صاحب کو ۱۰ نومبر ۱۹۸۱ کو شمس آباد سے ان کے مقالے کے سلسلے میں لکھا تھا۔ اور اسی ذیل میں آخر میں لکھا تھا کہ معیار الاشعار کے آخر میں قوافی فارسی کے عیوب کی بحث دی گئی ہے، اسے ملاحظہ کیا جا سکتا ہے اس قول کی صداقت کے لیے ۔

۲۲: برہان قاطع ص ۱۸۸

۲۳: سراج اللغۃ

۲۴: قاطع برہان ص ۴۱

۲۵: برہان قاطع ص ۲۰۳

۲۶: سراج اللغۃ

۲۷: قاطع برہان ص ۴۳

۲۸: برہان قاطع ۲۸۰

۲۹: سراج اللغۃ

۳۰ : مروی ہے کہ سب سے پہلے جو چیز حضرت آدم علیہ السلام پر نازل ہوئی وہ بسم اللہ شریف ہی تھی اور اسے ہی وہ تلاوت کرتے تھے جس کی وجہ سے ان کا گناہ بخش دیا گیا اس کے بعد بسم اللہ شریف اٹھالی گئی۔ اس کے بعد حضرت نوح علیہ السلام پر نازل ہوئی جس وقت حضرت نوح علیہ السلام سفینہ میں تھے۔ تو بسم اللہ شریف کی تلاوت کرتے تھے اور اسی کی برکت سے ان کی کشتی جودی پہاڑ پر ٹھہر گئی تھی۔ اس کے بعد بسم اللہ شریف اٹھالی گئی۔ اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام پر نازل ہوئی جس کی برکت سے آگ گلزار بن گئی پھر بسم اللہ شریف کو اٹھالیا گیا۔ اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل کی گئی جس کی برکت سے انھوں نے فرعون اور اس کے لشکر پر غلبہ پایا اور دریائے نیل میں راستہ بنایا مگر اب بھی بسم اللہ شریف اٹھالی گئی اور پھر حضرت سلیمان علیہ السلام پر نازل کی گئی جس کی تاثیر سے تمام جن وانس اور وحوش وطیور کو ان کے تابع وفرمان بنایا اور وہ جس وقت جس چیز پر بسم اللہ شریف پڑھ کر پھونک دیتے تھے وہ چیز ان کی تابعدار ہو جاتی تھی، بعد ازاں بسم اللہ شریف کو پھر اٹھالیا گیا۔ اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل کیا جس کی برکت سے وہ مردے تک کو زندہ کر دیتے تھے مگر اب پھر اٹھالیا گیا اور سب سے آخر میں ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی اور اس کی برکت سے اسلام کو فتح عظیم حاصل ہوئی۔

عملیات تسخیر قلوب، صوفی محمد اشفاق حسن صابری چشتی قادری خادم آستانہ نادر وقیہ، ریاست رامپور۔ یوپی، بسعی اہتمام کارپردازان میسرز رتن اینڈ کو تاجران کتب، دریبہ کلاں، دہلی ص ۲۷، ۲۸-۲۹ ـ

۳۱ : قاطع برہان ص ۵۰

۳۲ : برہان قاطع ص ۵۳۹

۳۳ : سراج اللغۃ

۳۴ : قاطع برہان ص ۶۶

۳۵ : برہان قاطع ص ۱۵۰۰، برہان کے حاشیہ میں "کار کیا" دیا گیا ہے۔

۳۶ : سراج اللغۃ

۳۷ : قاطع برہان ص ۱۰۹

۳۸ : برہان قاطع ص ۳۰۸۳

۳۹ : سراج اللغۃ

۴۰ : قاطع برہان ص ۱۲۰

۴۱ : برہان قاطع ص ۲۳۹۳

۴۲ : سراج اللغۃ

۴۳ : قاطع برہان ص ۱۴۴

۴۴ : - جہانگیری ج ۲ ص ۲۱۳۵

۴۵ : - سروری کی کئی روایتیں ہیں، آخری روایت جہانگیری (تالیف ۱۰۱۷ھ) کے بعد کی تقریباً ۱۰۲۸ھ کی ہے۔

۴۶ : یعنی جہانگیری لیکن اس میں حوس کے بجائے امید ہے۔

۴۷ : نہ جانے سروری کو کیوں کر یہ دھوکا ہوا اس لیے کہ خود جہانگیری میں "امید" ہی ہے

۴۸ : ج ۳ ص ۱۵۲۵

۴۹ : طبع تہران ج ۲ ص ۱۵۰۸

۵۰ : ج ۴ ص ۲۳۹۳

۵۱ : نسخۂ ذخیرۂ حبیب الرحمن خان شیروانی (علی گڑھ) ص ۹۵، ۹۶،

۵۲ : طبع تہران ج ۱ ص ۱۵۲

۵۵ : برہان قاطع ص ۲۴۱۲

۵۶ : سراج اللغۃ

۵۷ : قاطع برہان ص ۱۴۴

۵۸ : ایضاً ص ۷، تا بعد

۵۹ : برہان قاطع ۱۷۱۲ : بکسر اول و ثالث، نام سازی است و آن را بیشتر مردم ہندوستان [illegible] گویند

[illegible] چوبی است بلند که بر آن دو تار بسته است و بر هر طرف چوب کدو بسته [illegible] فرہنگ [illegible]

۔۔ رمن کنج میں دن بنایو جھولت ہے پیاری، ہندی شبد کوش ساگر ص ۴۱۰

۔۔ : آدمی یا جانور کا پورا جسم، تن، بدن، شبد کوش ساگر ص ۵۰۸

۔۔ : سراج اللغۃ۔

۔۔ : برہان قاطع ص ۲۰۱۷۔

۔۔ : قاطع برہان۔

۔۔ : سراج اللغۃ۔

۔۔ : برہان قاطع ص ۳۳۹۔

۔۔ : قاطع برہان ص ۲۳۱۔

ڈاکٹر وحید قریشی

خوف زدہ غالب اور عصری صورتحال

غالب کی ذہنی زندگی اور حقیقی زندگی کے درمیان فاصلے تھے۔ ان کا ذہنی ماحول ایک میرزادے کا تھا۔ بلند نژادی و نسبت کے ساتھ ساتھ احساسِ یتیمی اور چھپا ڈھکا خوف دونوں اونچے سروں میں بات کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ وہ ایک بہت اونچا آئیڈیل تراشنے پر مجبور ہیں۔ آئیڈیل کا خمیر جاگیردار طبقے کے معیاروں پر مشتمل ہے۔ غالب ذہناً اسی جاگیردار طبقے کے فرد تھے۔ ان کی آرزوؤں نے ایک مثالی دنیا بنائی تھی جسے اپنی ذات کے گرد سجائے رکھنے کا شوق انھیں طرح طرح کے نقوش بنانے پر مجبور کرتا تھا۔ انھیں کئی جتن کرنے پڑتے تھے۔ اپنے اجداد کے عالی نسبی کے بار بار ذکر سے دراصل وہ اپنے آپ کو یہ باور کرانے کی سعی کرتے تھے کہ وہ حاکم ترک نسل سے ہیں۔ برتری کے خیال سے جو فی الاصل احساسِ کمتری ہی ہے۔ وہ اپنی روزمرہ کی زندگی کو حقیقت میں بدلنے کے لیے قرض کا سہارا لیتے ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ غالب کے گھر میں اخراجات اس عیاشی کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ خوف نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا، سبب شاید یہ تھا کہ ابتدا میں غالب کو خاندان کے مالی رحم و کرم پر جینا پڑا اور دیگر افرادِ خاندان کے مقابلے میں کم حیثیتی کے سبب ان کو دستار با غالب کا اپنے بارے میں رویہ زیادہ اہم ہو گیا۔ وہ عرفی کی طرح بزرگی شان کی بار بار اپنا ذکر کرنے لگے۔ عرفی غالب کا پسندیدہ شاعر تھا۔

شاعری میں محبوب کی بجائے اپنی ذات اہم ہوگئی. مولانا حالی کا کہنا ہے کہ غالب عام راستے سے
ہٹ کر چلتے تھے۔ انھوں نے وہ شعری اسلوب وضع کیا جس کا محرک قوی بہ ظاہر ذہنی ناآسودگی
کو سمجھا جا سکتا ہے۔ غالب کا شعری سرمایہ اسی ذہنی ناآسودگی کی ایک منقلب صورت ہے۔
زود حس غالب کے ہاں یہ حالت زیادہ تند و تیز بھی ہو جاتی ہے. جذباتی زندگی کا مسلسل مد و جزر
غالب کو بے قرار رکھتا ہے۔ اس کی شدید ترین شکل وہ ہے جب وہ اپنے مخالفین کے خلاف ہر سطح
کی گفتگو کرتے ہیں. معرکۂ کلکتہ سے لے کر برہان قاطع کی بحث تک ایک جذباتی ردِ عمل چھایا ہوا
ہے. ذاتی محرومیاں کس حد تک اس آتش بیانی کا باعث ہیں — ناآسودگی کا یہ منفی اظہار غالب کی
جذباتی اور جنسی محرومیوں کا پرتو سمجھا جائے تو زندگی کو عصری حوالے سے دیکھنا ضروری ہوگا۔
کلامِ غالب میں سیاہ اور سرخ رنگوں کا بہ کثرت استعمال ان کی جنسی ناآسودگی کا بالواسطہ اظہار ہی
تو ہے. بچپن کی شادی، بیوی کے اعزہ کا عمومی طرزِ عمل، اولاد سے محرومی کے پے در پے صدمات
اور گھر دامادی سے فرار کی جذباتی نوعیت واضح ہے۔ یہ حالات کس حد تک حقیقی تھے؟ اور کہاں
تک غالب کے ذاتی اضطراب کا رنگ اس میں شامل تھا جو انھیں مبالغے کی حدوں تک لے گیا؟
اس کی نشان دہی ممکن نہیں۔ غور طلب بات یہی ہے کہ غالب کی داخلی ہل چل جب خارج میں آئی
تو مبالغے کا عنصر ذاتی ردِ عمل کے طور پر راہ پا گیا۔ انھیں عمر بھر یہ ملال رہا کہ ان کی زندگی میں مناسب قدر
نہیں ہوئی مرنے کے بعد ہی اس کی نوبت آئے گی حالاں کہ غالب کا شمار اپنے عہد کے نام ور شعرا میں ہوتا
تھا. ہاں یہ دوسری بات ہے کہ خواہشِ شہرت کا معیار وہ نہ تھا جس کے غالب خواہش مند تھے. انھوں نے اپنے
طرزِ عمل سے یہی ثابت کیا کہ وہ مظلوم ہیں اور ان کی نہیں ہوئی. ناآسودگی
کا مرکزی نقطہ یہی احساس ہے جس نے انھیں داخلی اضطراب میں مبتلا رکھا۔ ان کی سوچ کا یہ دھارا
ماحول سے بھی منسلک ہے. مغل تمدن تیزی سے روبہ زوال تھا. بہادر شاہ ظفر کی شان و شوکت جو
شعرا نے بیان کی ہے اور جو کچھ تاریخ بتاتی ہے دونوں میں بین فرق ہے. اصل زندگی اور زندگی کے
بارے میں آئیڈیل پسندی کے مابین ان فاصلوں کا احساس تو ادب اور تاریخ کو آمنے سامنے رکھ کر ہی
[illegible] ہے۔ اہلِ قلعہ کی سابقہ شان و [illegible] حالت میں فرق تھا۔ ضعفوں کی تخفیف ہو چکی معیار [illegible]
گیا تھا۔ [illegible] کا [illegible] — [illegible] انگریز سے وظیفہ خوار بنتے تھے شہنشاہ و عالم کی نظر

میں وہ خراج تھا۔ یہ دیکھ کر تو قدرت کی ستم ظریفی کا قائل ہونا ہی پڑتا ہے۔ شعرائے عصر سابقہ تمدنی زندگی اور حالیہ اصل زندگی کے درمیان تخیل کی مدد سے تیرتے نظر آتے ہیں۔ غالب اپنے معاصرین کی نسبت زیادہ حساس تھے اس لیے ان کے ہاں شناوری کا یہ مظاہرہ زیادہ بلند ہے جس میں غم کی لہر بھی ہے۔ غالب نواب نہ تھے لیکن اپنے آپ کو عمر بھر نواب سمجھتے رہے۔ ان کا گھرانہ معمولی تھا لیکن آئیڈیل سسرالی تھا۔ غالب کے ماہانہ اخراجات ان کے وسائل سے زیادہ تھے۔ اس کی توجیہہ بظاہر یہی ہو سکتی ہے کہ اصل حقائق اور آئیڈیل کے درمیان بہت فاصلہ ہے۔

۱۸۵۷ء سے قبل جدید مغربی اثرات ظاہر ہونے لگے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارتی پالیسی کے سبب کبھی بڑی بڑی تبدیلیاں نہیں آئی تھیں ورنہ ایک فعال طبقے کے طور پر درمیانی طبقے کا الگ سے ظہور نہیں ہوا تھا۔ تمدنی سطح پر تبدیلی کا احساس خفی غالب کو تھا۔ انھوں نے مغربی تمدن کی برتری کو بہ نظر استحسان دیکھا اگرچہ اس طرح نہیں جس طرح سر سید احمد خاں اور ان کے رفقا نے دیکھا۔ شعر و ادب میں وسعت کی خواہش تو غالب میں ہے لیکن موضوعات میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں ملتی۔ دوسرے یہ کہ ان کی زندگی کا آخری دور تھا جب ذاتی غم و الم میں وہ ٹوٹ کر رہ گئے تھے۔ غالب کا انتقال (عصری شہادتوں کے مطابق) حرکت قلب بند ہونے سے ہوا جس کا بنیادی سبب ذیابیطس کا مرض تھا۔ وہ بد پرہیز بھی تھے۔ آموں کے بہ کثرت استعمال نے ان کے شکر اور نتیجۃً فشار خون کا درجہ بہت بلند کر رکھا تھا۔ قوت مدافعت ادھیڑ عمر کے آغاز ہی میں ختم ہو چکی تھی اس لیے غالب کی زندگی کے آخری ایام کئی امراض کی بنا پر بیرونی زندگی سے بہت حد تک کنارہ کشی اور ذاتی افکار میں گم ہو جانے پر مبنی تھے۔ اپنی بے بسی اور بے چارگی پر غالب کڑھتے تھے اور بعض اوقات ان کی جھلاہٹ خود رحمی کی صورت میں ظاہر ہوتی اب وہ اپنی مصنوعی امارت پر استہزائی جملے بازی بھی کرنے لگے۔ یہ اعصابی انحطاط میں ممکن ہے جگر کی خرابی کا حصہ بھی ہو لیکن اس کے شواہد نہیں ملے۔ وہ اپنی ذات کے خول میں سمٹ کر رہ گئے۔ یہی خوف زدہ شخص کا دفاعی حربہ ہے۔

جب برطانوی اقتدار کی آنکھیں کھل رہی تھیں غالب کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں تاج برطانیہ کو اقتدار کی منتقلی ان کی زندگی کے آخری ایام میں ہوئی لیکن پوری زندگی تو قرون وسطیٰ ہی میں بسر ہو گئی۔ غالب کا شعور جدیدیت کا احساس خفی رکھتا تھا لیکن نئے طرز احساس کے باوجود غالب قرون وسطیٰ

کے تمدنی افکار کے نمائندے تھے۔ ان کی شاعری قدیم تمدنی زندگی کی عکاسی ہے۔ انسان کا جو پیکر غالب کے ہاں ملتا ہے اس میں "انا" کے عمل سے ایک نرالا پن ہے، ایک احتجاج ہے، تازگی ہے، حرارت ہے۔ غالب نے زندگی کی موم بتی کے دونوں سروں کو جلا کر دیکھا اس لیے ان کا لہجہ روایتی اور رسمی نہیں تجربے کی تہ داری ہے۔

غالب نے شعری روایت کو حقانیت سے نکال کر دوبارہ وسط ایشیائی تہذیبی شعور سے ہم آہنگ کرنے کی سعی کی۔ ان کا شعری انسان تمدنی لحاظ سے ایران اور وسط ایشیا کا باشندہ ہے ماضی قریب کی بجائے ماضی بعید میں لگائی گئی یہ جست محض ندرت کا اظہار نہیں اپنے آپ کو زمانی لحاظ سے دوسری دنیا میں لے جانے کا عمل بھی ہے، یہ ایک تخیلی زقند ہے۔ مادی زندگی سے نکل کر تخیل کی دنیا میں بس جانے کا عمل ہے۔ ٹھوس مادی حقائق سے گریز کی صورت یہ بھی تو ہے کہ انسان ذہنی زندگی بسر کرنے لگے۔ اس دنیا میں غالب کے لیے اپنی انا کی بہتر طور پر پرداخت ممکن تھی نیز فکری توانائی زیادہ صحت مندی سے سرگرم سفر رہ سکتی تھی۔ ماضی قریب سے ماضی بعید کا جو ذہنی سفر غالب کے لیے تازگی کا پیغام لایا۔ اس شعورِ آگہی میں یہ احساس بھی نمایاں ہے کہ وہ ایران کی زبان میں یعنی اپنے آبا کی زبان میں شاعری کر رہے ہیں اور ہندی تمدنی اثرات سے آزاد ہیں۔ ہندی فارسی شعری روایات کے غالب مخالف تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ عمر بھر اس سے دامن بھی نہ بچا سکے۔ وہ ہندی فارسی گو شعرا کو حقیر جانتے تھے اور تخیلی سطح پر ایرانی استاد بھی تراش لیتے ہیں۔ ان کی نظر میں دساتیر خالص فارسی نثر کی نمائندہ کتاب ہے لیکن خود غالب کی نثر ابوالفضل کے نثری اسلوب سے الگ نہیں۔

لسانی اعتبار سے غالب ان سب خرابیوں کے پیرو کار تھے جو ہندی نژاد ادبا کی فارسی میں پائی جاتی تھیں۔ انھیں اپنا تشخص اردو شاعری میں نہیں فارسی شاعری ہی میں ملتا ہے اور وہ اسی پہ ناز کرتے ہیں۔

بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگِ من است